الشجاع
کراچی
سالنامہ
۱۹۶۸ء

فنس

قومی صحت و صفائی کے لئے
فنس
کی ۱۸ سالہ خدمات

کھٹمل، لال بیگ
اور کیڑوں مکوڑوں
کے لئے

مکھی، مچھر اور تمام
اڑنے والے کیڑوں
مکوڑوں کے لئے

تمام صفائی
کے لئے

فنس واحد جراثیم کش ہے جو میونسپل، زراعتی اور عوامی اداروں کو بڑی مقدار میں سپلائی کیا جاتا ہے۔

اسٹینڈرڈ فنس آئل کمپنی

ڈی-۳۳، ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای ـــ کراچی ـــ ۱۶
فون: ۶۳۱۰۷ ـــ تار کا پتہ۔ فنس ـــ شاخیں: لاہور، ڈھاکہ
ممبر نیشنل پسٹ کنٹرول ایسوسی ایشن ـــ امریکہ

ORIENT

دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا

❋

عمر رفتہ

❋

خان بہادر نقی محمد خاں
خورجوی

کی خود نوشت سوانح حیات

❋

ضخامت ۵۰۳ صفحات
قیمت فی جلد سات روپیہ

ملنے کا پتہ
ماہنامہ الشجاع مینسفیلڈ اسٹریٹ صدر کراچی

صابنوں میں ایک سے ایک بہتر سلسلہ
Lily
SOAP
FLAKES
ZULFEQAR
INDUSTRIES LTD.
ملبوسات کیلئے مثالی
Beauty
SWAN
جراثیم کش
ہر مقصد کیلئے
موزوں ترین
صابن
عمدہ۔ بہتر اور بہترین
ہم آپ کی خدمت میں دھونے اور نہانے کے معیاری صابنوں کا سیٹ پیش
کرتے ہیں جنہیں حفظانِ صحت کے جدید ترین اصولوں پر تیار کیا جاتا ہے۔
ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ۔ کراچی
THAVER

انفرادی توجہ یونائیٹڈ بینک کا بنیادی اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قلیل مدت میں ہماری کامیابی بڑی نمایاں تصور کی جاتی ہے۔ آج ملک کے طول و عرض میں ہماری ۹۰۰ سو سے زائد شاخیں پھیلی ہوئی ہیں جو عوام تک جدید بینکاری کی تمام سہولتیں پہونچا رہی ہیں۔

آپ کے لئے بہتر خدمت اور سودمند مواقع فراہم کرنے کے لئے ہماری انفرادی توجہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ اس جد و جہد میں دورِ جدید کی سائنسی ترقی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ مشینوں سے آراستہ شاخیں، دنیا کے اہم مالی مرکزوں سے ٹیلی پرنٹر کا رابطہ، کراچی، لاہور، راولپنڈی، ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں کمپیوٹر بیورو سب ہی آپ کے مسائل حل کرنے کیلئے موجود ہیں۔

آپ کا کاروبار چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، اپنے بینکاری کے مسائل خوش اسلوبی سے حل کرنے کے لئے ہمیں خدمت کا موقع دیجئے۔

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

قائم شدہ ۱۹۵۹ء

UBL-93-183-68-UD. LINTAS 80

"غالباً کوئی دوسری ایئرلائن ایسی نہیں جو ایک نئے ملک کی تعمیر و ترقی میں اتنی بھرپور امداد دینے میں پی آئی اے کا مقابلہ کرسکے"

— اینڈریو ولسن
ڈیفنس اور ایوی ایشن کارسپانڈنٹ
اخبار "آبزرور" لندن

وہ اپنے حالیہ شائع شدہ مضمون میں کہتے ہیں:۔
"پی آئی اے کے موجودہ ہوائی بیڑے پر نظر ڈالنے سے ہمیں صرف اس کی وسعت ہی پر حیرت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کس طرح اس نے ہمیشہ قابلِ اعتماد آرام دہ اور اعلیٰ کارکردگی کے طیاروں کے حصول میں برابر کوشش کی ہے جو مختلف پروازوں میں استعمال کئے جا سکیں۔"

"ایک طرف تو پی آئی اے نے اندرونی اور بین الاقوامی پروازوں کا جال بچھا کر ملک کے مواصلاتی نظام کی ترقی میں مدد دی تو دوسری طرف اس نے ملک کی ٹیکنالوجی کے لئے بھی ایک بنیاد ڈال کر اتنی ہی اہم خدمت انجام دی ہے"
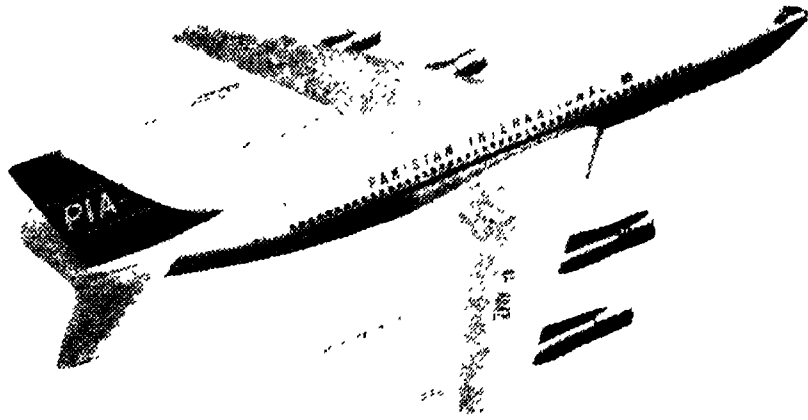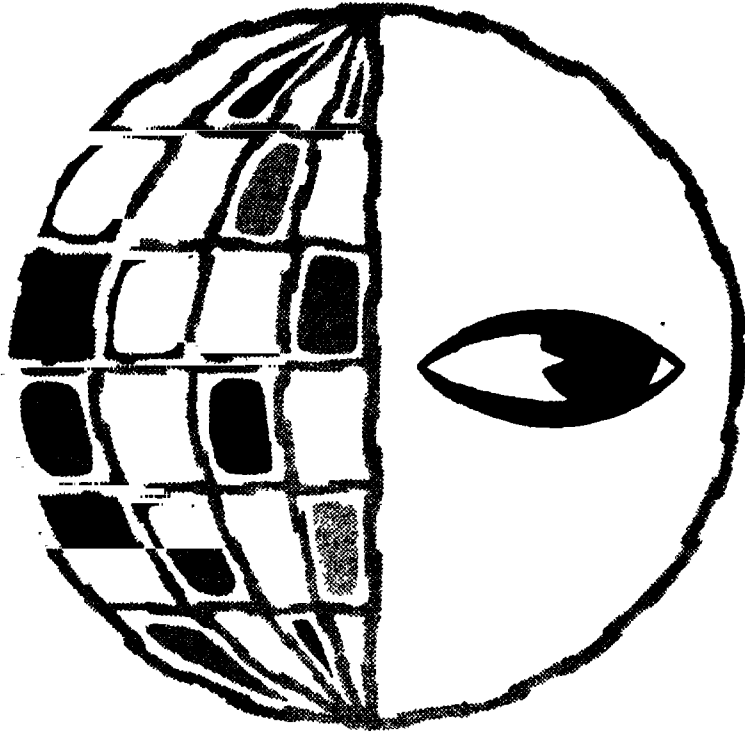
"اسکی کارکردگی کی سب سے نمایاں مثال کراچی ایئرپورٹ پر انجینیرنگ کا کارخانہ ہے جہاں گرد و غبار سے محفوظ ایئرکنڈیشنڈ ورکشاپ میں عظیم جیٹ ٹربائن سے لیکر چھوٹے الیکٹرونک پرزوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے جن پر جدید طیاروں کے تحفظ کا انحصار ہے"

" اور اسی طرح پی آئی اے نے جدید مینیجیریل تکنیک کی بھی نئی بنا ڈالی ہے۔"

" اگر یہ سچ ہے کہ ترقی یافتہ مواصلاتی نظام سیاسی اور جغرافیائی بندشوں کو توڑ دیتے ہیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ پی آئی اے اور پاکستان نے اس امر کی سچائی کو منوا دیا ہے۔"

تبت ٹوتھ پیسٹ
کے ذریعے یقینی ہے!
تبت ٹوتھ پیسٹ طبی اصولوں کے مطابق بہترین اجزائے تیار کیا جاتا ہے۔
یہ گھر کے ہر فرد کے دانتوں کو صاف اور صحت مند رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔
TIBET
کوہ نور کیمیکل
کمپنی لیمیٹڈ
کراچی۔ ڈھاکہ

men, women and children everywhere are saying
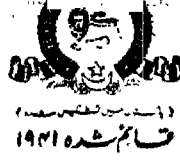
اِن کی تعلیم!
ان کا
مستقبل!

ضروری ہے کہ آپ اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم اور بہتر مستقبل کے لئے ابھی سے روپیہ بچانا شروع کر دیں اور یہ کوئی
ایسا مشکل بھی نہیں۔ حبیب بینک میں صرف ۵ روپے سے سیونگ اکاؤنٹ کھل جاتا ہے اور آپ کی
جمع شدہ رقم منافع کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ پھر آپ کو کہیں دُور جانا بھی نہیں پڑتا۔
حبیب بینک کی پاکستان میں ہر جگہ شاخیں موجود ہیں جن کو آپ بہتر خدمت کیلئے ہمیشہ مستعد پائیں گے۔
روپیہ بچانے کی عادت ڈالیئے اور جلد ہی حبیب بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھولیئے۔
اپنے بچوں کی تعلیم، اپنے خاندان اور مستقبل کی خوشحالی کے لئے۔

حبیب بینک لمیٹڈ

پاکستان میں ۵۲۵ سے زائد شاخیں

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ای/جی وی ۶۶۶۹ - ۹۴/۸ - مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۱ء
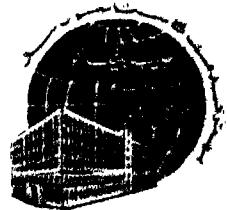
۱۹۶۸ عیسوی

☆ ترتیب ☆

ایس ایم غیاث الدین　　سلمان الارشد

زیرِ اہتمام

سلطان کلیم

☆ طابع وناشر ☆

ایس ایم شجاع الدین

قیمت سالنامہ ۲/۵۰ زرِ سالانہ =/۵

مشرقی پاکستان میں ہوائی ڈاک سے ۔ قیمت سالنامہ =/۳ روپے

شعبۂ نشرواشاعت

ٹائمز پریس

مینسفیلڈ اسٹریٹ صدر کراچی ۔ فون ۵۵۲۱۲

ایس۔ایم شجاع الدین پرنٹر پبلشر نے ٹائمز پریس صدر کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الشجاع صدر کراچی سے شائع کیا

سالنامہ

۱۹۶۸ء

جلد ۱۶ ——— شمارہ ۸، ۹

ترتیب

افسانے

غزلیں

طنز و مزاح

ڈرامے

ناقابل فراموش

علاقائی زبانوں کی کہانیاں

غیر ملکی کہانیاں

سائنسی کہانی

تبصرے

مشرقی پاکستان میں ـــــ سالنامہ ہوائی ڈاک سے ـــــ تین روپے

التماس

الشجاع کو شائع ہوتے سولہ سال ہوچکے ہیں، اس طویل مدت میں "الشجاع" نے کوئی ادبی کارنامہ تو انجام نہیں دیا البتہ اپنے محدود وسائل کے باوجود عوام کے شعور کو بلند کرنے اور ملک میں مطالعہ کا شستہ و پاکیزہ ذوق پیدا کرنے کی سعی ضرور کی ہے۔ یہ امر ہمارے لئے باعثِ طمانیت ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے ممتاز فنکاروں اور دانشوروں نے "الشجاع" کی ان خدمات پر اظہارِ پسندیدگی فرماتے ہوئے فراخدلی سے ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔

گزشتہ سولہ سال میں عام نمبروں کے علاوہ "الشجاع" کے خصوصی شمارے بھی شائع ہوئے ہیں۔ یہ تو ہم نہیں کہتے کہ یہ نمبر اُردو رسائل میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے تھے لیکن یہ کہنے میں ہم حق بجانب ہیں کہ یہ نمبر مستقل قدروقیمت کے حامل تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی جنگِ آزادی نمبر، ترکی نمبر، ایران نمبر، ایلزبتھ نمبر، آبکاری نمبر اور آئین نمبر کی مانگ ہے۔

ان نمبروں کے علاوہ ادارہ "الشجاع" نے پاکستان میں سب سے پہلے زندہ شخصیتوں پر عبدالحق نمبر شائع کرکے ایک صحت مند روایت کا آغاز کیا تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ تجارتی نقطہ نظر سے ہی سہی بہرحال "الشجاع" کی اس صحت مند روایت کو دوسرے رسالوں نے اپناکر آگے بڑھایا۔

خوب سے خوب تر کی جستجو، "الشجاع" کا نصب العین ہے۔ چنانچہ سالنامہ کی ترتیب میں اس امر کو ہم نے خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ اس میں شائع ہونے والی ہر تخلیق بہترین کے مفہوم سے قریب تر ہو۔ ہمیں افسوس ہے کہ محدود صفحات کی بنا پر سالنامہ میں فنکاروں کے حالاتِ زندگی شائع نہیں ہو سکے۔ انشاءاللہ ہم اس کی تلافی "خود نوشت سوانح حیات نمبر" پیش کر کے کریں گے۔

ہم ان تمام فنکاروں کے سپاس گزار ہیں جنہوں نے ہماری درخواست پر اپنی تازہ ترین غیر مطبوعہ تخلیقات سے "الشجاع" کو نوازا۔ اور بروقت تخلیقات ارسال فرماکر ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود ہم نے صوری و معنوی اعتبار سے اس سالنامہ کو "الشجاع" کی سولہ سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی روایات کا آئینہ دار بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہم اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہیں اس کا فیصلہ آپ بہتر طریقہ پر کر سکیں گے۔ سالنامہ کے بارے میں ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

آپ کا مخلص
شجاع الدین
ناشر

سلیمان اریب

افضل صدیقی

بلراج کومل

شمیم احمد

محمود ہاشمی

احمد جمال پاشا

فرید جاوید

مخمور سعیدی

کمار پاشی

بسیشر پردیپ — ابراہیم ـیـف — ـمن سروس

ـنم رومانی — ـظر امامی — جمیل زبیری

زکی انور

صہبا وحید

حسن اجمل مسرت

ترنم شمار شاد

خمار انصاری

خورشید جامی

سلمان [illegible]

سرور جمال

افضل صدیقی

ہمارے تہذیبی مسائل

ہمارے ہاں مذہب سے جتنی بے تعلقی بڑھ رہی ہے
اسی قدر تہذیبی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں

ہمارے ملک میں کلچر کی تعریف متعین کرنے میں جتنی الجھنیں پیش آئی ہے اس سے کہیں زیادہ الجھنیں قومی تہذیبی روایات اور خود کلچر کی نشاندہی کرنے میں اب تک پیش آ رہی ہیں۔ ۲۱ سال کے اندر یہاں خالص پاکستانی کلچر کی کوئی سمت متعین نہیں ہو سکی ہے۔ نہ وہ جذباتی آویزش ختم ہو سکی ہے جو ایک ملک اور اس کے مخصوص سماج سے کٹ کر ایک بالکل نئے سماج میں جس کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی تھی خود کو ضم کرنے کے سلسلہ میں ہوتی رہی ہے تہذیبی روایات کی بنیاد ماضی میں خاندانی پس منظر اور جدید تقاضوں کی روشنی ہی میں پڑتی ہے کوئی فرد نہ تو ماضی سے خاندانی روایات اور قومی آداب و رسوم سے خود کو بالکل الگ تھلگ کر سکتا ہے اور نہ بندھی ٹکی روایات سے منہ موڑ کر نئی اور بدلیسی روایات کو قطعی طور پر اپنانے کا حوصلہ اس میں پیدا ہوتا ہے اس کا نتیجہ ایک نفسیاتی کشمکش کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور یہی نفسیاتی کشمکش اور جذباتی آویزش نہ تو مخصوص قومی مزاج بننے دیتی ہے اور نہ قومی کلچر کی کوئی سمت متعین ہو پاتی ہے۔

پاکستان میں تین نسلیں زندگی گذار رہی ہیں، ان تینوں نسلوں کے مزاج، عادات و اطوار اور تہذیبی رجحانات میں نمایاں فرق ہے۔ ایک نسل تو وہ ہے جسے "اگلوں وقتوں کے لوگ" کہا جاتا ہے۔ جب پاکستان بنا تو چالیس سال تک کی عمر کے یہ لوگ جن کی عمر اب ساٹھ سال ہو چکی ہے۔ مخصوص تہذیبی اقدار کو اپنے سینے سے لگائے ترک وطن کر کے نئے وطن میں آئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور نسل تھی جس کی عمر پندرہ سولہ سال تھی اور جو اب ۳۶ ۳۷ سال کی ہو چکی ہے۔ زندگی کو آرام سے بسر کرنے کے دونوں عادی تھے کہیں کوئی ہلچل یا اضطراب نہیں تھا، بلکہ سکون اور ٹھہراؤ تھا جسے اب جمود کہا جاتا ہے۔

نئے وطن میں آئے تو ماضی کی ساری روائتوں کا تار و پود بکھر چکا تھا جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھیں، قدیم روائتوں کو یکسر ترک کر کے نئی اقدار کو اپنانے کے لئے انہیں شدید ذہنی اور روحانی کرب سے گذرنا پڑا۔ یہ کرب اب تک ان پر غیر شعوری طور سے طاری ہے۔ تیسری نسل وہ ہے جو پاکستان ہی میں پیدا ہوئی جو پاکستان کی علامت ہے۔ مستقبل کی معمار ہے۔ اس نسل کی عمر انیس بیس سال ہے یہ عمر ویسے بڑی خطرناک ہوتی ہے چہ جائیکہ اس عمر کے نوجوانوں کو ایک دم سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلاب آفریں اور ہیجان

عہد میں سانس لینا پڑا۔ تہذیب و ثقافت کی دنیا میں
لادینیت کی رو کے ساتھ یہ نسل بہہ چلی۔ اس کی ایک
وجہ تو وہ معاشی بحران ہے جو ہمارے ہی ملک میں نہیں
بلکہ دنیا کے بہت سے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں
میں شدت سے جاری ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ نئی نسل
اپنے آباؤ اجداد اور ماضی کی روایات کے سہارے اپنے
وجود کا اثبات نہیں چاہتی۔ روایات سے بیگانگی اور
بیگانگی سے بھی زیادہ بے خبری نے "بے سہارے پن"
کا اذیت ناک احساس نوجوان نسل میں پیدا کر دیا ہے اور
اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم اپنے آپ کو بزدل اور
بے بس سمجھنے لگے ہیں۔ یہ احساس عام ہونے لگا ہے کہ
ہمارے ہونے کی کیا اہمیت ہے ہم نہ ہوتے تو کونسا
فرق پڑ جاتا۔ زندگی عناصر کا واقعی سب سے بڑا فراڈ
ہے۔ اس نئی نسل پر سب سے بڑی مصیبت یہ آن پڑی
کہ قیام پاکستان کے بعد کوئی قومی تحریک نہ ابھر سکی۔ قومی
تعمیرِ نو کے دھارے سے نئی نسل کو ہم آہنگ کرنے کی جو
مہم سرکاری طور پر چلائی گئی وہ ناکام ہو گئی۔ کیونکہ اس
مہم میں کوئی دلکشی یا ترغیب نہیں تھی اور بیرونی تہذیبی
عوامل اس نسل پر بڑی شدت سے یلغار کر رہے تھے۔
یہ تیسری نسل پہلی نسل کی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں
دوسری نسل ان دونوں نسلوں کے بیچ میں پھنس کر
بے بس ہو گئی ہے۔ کوئی واضح نقطۂ نظر کوئی منفرد
مطمع نظر اور قومی تحریک نہ ہو تو افراد کی ذہنیت
کیفیت انتشار اور انفعال کا شکار ہو جاتی ہے۔ مطمع نظر
کے نہ ہونے کے اسباب میں بھی اپنی روایات سے بیگانگی
اور بے خبری کا بہت بڑا دخل ہے۔ ہم جس خطہ میں رہتے
بستے ہیں اس کی تاریخ کیا ہے۔ یہ علاقہ کون کونسی
تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کون لوگ کن عادات
واطوار کے لوگ بستے تھے۔ ان کے مشغلے کیا تھے؟
حقیقت اور صداقت کی تلاش میں ان کا طرزِ عمل اور
طرزِ فکر کیا تھا؟ اور جب ایک تہذیب نے دوسری
تہذیب کے لئے جگہ خالی کی تو اس نے اپنی کونسی روایات
نئی تہذیب کو منتقل کیں اور نئی تہذیب نے ان روایات
کو اپنے عصری تقاضوں کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ کیا
اور یہ ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکنے کی صورت میں اس خاص
روایت کی موت کس طرح واقع ہوئی۔ پڑھے لکھے لوگوں
نے گزشتہ چند برسوں میں ان موضوعات پر پہلے سے
غور و فکر کیا ہے اور لکھا ہے۔ مگر یہ لوگ نئی نسل کی رہنمائی

کامنصب نہ سنبھال سکے۔ اپنے آپ کو اور اپنی نسلوں کو اپنی تاریخی تہذیبی اور فنی روایات سے باخبر رکھنا ایک ایسی قوم کے لئے بیحد ضروری ہے جو اپنے خاص اسلوب میں عزّت و وقار کی زندگی بسر کرنے کا عزم رکھتی ہو مشکل یہ آپڑی ہے کہ جدّت کو روایت سے بغاوت کے مترادف قرار دے ڈالا گیا ہے اور نئی نسل کے ساتھ باغیوں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ یہ نسل اسی وجہ سے بے بسی۔ مایوسی اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہی ہے۔

ہمارے ہاں روایات کو جدید ذہنوں پر من وعن مسلط کر دینے والوں کی بھی کمی نہیں۔ انہوں نے روایات کو دینی اصولوں کا سا درجہ دے رکھا ہے انہیں یہ توفیق کبھی نہیں ہوئی کہ اگر روایات کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو ایک تدریجی سلسلۂ عمل ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس میں ہر روایت میں ترمیم و اضافہ اور قطع و برید کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یوں ماضی کی کسی بھی روائت کے خد و خال ماضی قریب میں وہ نہیں تھے جو آج ہیں اور ماضی بعید میں وہ نہیں تھے جو ماضی قریب میں نظر آتے ہیں۔ اگر روایت کو جامد تصوّر نہ کر لیا جائے تو اسے جاری رکھنے کے سلسلہ میں بعض عنصر کے تعصب میں نمایاں کمی ہو سکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے روایت کی نوعیت اور ماہیت کو سمجھنے کی سخت ضرورت ہے اور اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ روایت اور ورثے میں امتیاز کیا جائے۔ تہذیبی روایت تہذیبی ورثے سے مختلف ہے۔ کسی بھی قوم کا تہذیبی ورثہ اس قوم کی روایت نہیں ہوتا ورنہ ان روایات کے مظاہر کا نام ہے جو اپنا تاریخی کردار ادا کر کے ختم ہو چکی ہیں اور جنہوں نے نئی اور بہتر روایات کے کے لئے اپنی جگہ صدیوں پہلے خالی کر دی تھی۔ ہمارے ہاں روایت اور ورثے کو آپس میں خلط ملط کر دیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ

یہ نکلتا ہے کہ جب لوگ ورثے کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کر پاتے تو یہ لوگ روایت سے بھی بدک اٹھتے ہیں۔ ورثہ بھی ہمیں تعلیم دے سکتا ہے اور اپنی تہذیبی انفرادیت کی تقسیم میں ہمارا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف روایت ہمارے گھروں۔ بازاروں دفتروں اور اداروں میں باقاعدہ زیر عمل رہتی ہے۔ ورثہ جامد ہے، اور روایت متحرک لیکن دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اس سے نئی نسل کو بے خبر نہیں رکھا جا سکتا۔

ہمارے تہذیبی ورثے اور روایت کی بنیاد مذہب

پر رکھی گئی ہے۔ یہاں مذہب سے جتنی بے تعلقی بڑھ رہا ہے اتنی قدر تہذیبی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ آداب معاشرت میں انقلاب آ رہا ہے۔ زندگی بسر کرنے کے سلیقہ اور رکھ رکھاؤ کا فقدان نظر آتا ہے یورپ میں مذہب سے بغاوت اور عورت و مرد کے آزادانہ ملاپ کے نتیجہ میں جنسی بے راہ روی کا جو طوفان اٹھا ہے اس کا اثر ایشیائی ملکوں اور خصوصاً ہمارے ملک کی نئی نسل پر بھی پڑا ہے غیر ملکی فلموں۔ ٹیلی ویژن اور لٹریچر کے ذریعہ مغربی تہذیب کے اثرات ہماری جدید نسل پر پڑ رہے ہیں۔ تعلیمی

المتجاع

اداروں میں مخلوط تعلیم نے بے راہ روی کو اور راہ دکھائی ہے۔ یورپ نے مسیح کو چھوڑا اور لادینیت اختیار کی۔ یہ لادینیت اس نے ایک بہتر اخلاقی ضابطے کے طور پر اختیار نہ کی تھی۔ بلکہ اس لئے اختیار کی کہ اسے اپنی ہوا سے نفس کی تسکین کی صورت نظر آئی تھی۔ یورپ نے مذہب کو اس لئے چھوڑا کہ مذہب ایک تنظیم اور پابندی کا نام ہے، یہ آدمی پر ایک ضابطہ زندگی بسر کرنے کا عائد کرتا ہے لیکن جب انسان میں ہر زنجیر کو بوجھ اور ہر پابندی کو صلیب سمجھنے کا رجحان پیدا ہو جائے تو اس کے لئے انارکی اور دہشت کے سوا اور کوئی اسوۂ عمل باقی نہیں رہتا۔ یہ انارکی اور بے راہ روی مغرب کی جواں سال نسل میں ازخود نہیں پیدا ہوئی۔ بلکہ یہ اس تاریخی رجحان کی تخلیق ہے جس کی بنیاد مذہب سے بیزاری پر استوار ہوئی ہے اور جس کو روشن خیالی کا نام دیا گیا ہے اور یہ روشن خیالی اور آنادانہ روی جدیدیت کی ہر روایت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کا رجحان، مذہب سے بے تعلقی اور ان سب کے نتیجہ میں انفعالی کیفیت کا غلبہ ہماری اپنی نسل میں بھی در آیا ہے۔ سب سے زیادہ غدر خود انہوں نے مچایا ہے جن کی کوئی کل ابھی تک سیدھی نہیں ہو سکی۔ اس طبقہ نے تہذیبی انتشار زیادہ پیدا کیا ہے۔

ایک طرف تو یہ روایت کہ عورت ڈولی میں بیٹھ کر گھر سے باہر نکلتی تھی اور یہ ڈولی بھی کئی پردوں رہتی تھی خسر کو برسوں تک بہو کا چہرہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا بہنوں اور بیٹیوں کے سر سے دوپٹے اپنے باپوں اور بھائیوں کے سامنے کبھی نہ اترتے تھے۔ بیٹا باپ سے آنکھ

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

عالمِ عرب کا مستقبل!

ابھی تک ہر عرب ملک کے عوام اپنے آپ کو ملّتِ اسلامیہ کا حصہ سمجھتے ہیں

مشرقِ وسطٰے کے مسلم ممالک جن حالات سے گذر رہے ہیں، ان کو کسی اعتبار سے خوش آئند سیاسی طور پر اطمینان بخش یا عزائم ملّی کا آئینہ دار نہیں کہا جا سکتا۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد سے ایک طرف عرب مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے اپنی قومی جدوجہد کے مختلف اہم مراحل دینی معتقدات اور جذبات کے سہارے طے کرنے کی کوشش کی ہے، دوسری جانب ان کے ہاں علاقائی عصبیت، اشتراکی اور مغربی اذہان کی کشمکش، قوم پرستانہ تصورات، سماجی انتشار، آمرانہ رجحانات اور بیرونی فتنے اس جدوجہد کو اپنے آدرش سے دور لے جانے کے لئے مستقل برسرِ پیکار ہیں۔ آج عالمِ عرب کے قریب قریب سارے فعال عناصر عدمِ توازن، باہمی رقابت اور اپنی یا غیروں کی مخاصمت کے شکار ہیں۔ موجودہ صورتِ حال کے پس منظر میں احیائے اسلام کی تحریکوں کے ماند پڑ جانے سے نفاق، خود غرضی، محلاتی انقلابات اور صاحبانِ اقتدار کا ذاتی پروپیگنڈہ خاصے نمایاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب عرب مسلمانوں میں سے ایک تعلیم یافتہ

اور متمول گروہ معاشی ترقی کے عنوان سے خالص مادی بنیادوں پر نظامِ حکومت چلانے کا خواہاں ہے اور اس نے نہ صرف متعدد مراکز اور اداروں پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے بلکہ اُسے مقامی غیر مسلموں اور سماج دشمن عناصر کی حمایت بھی حاصل ہے اور بیرونی طاقتیں بھی اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں تو کس صورت سے اس کی منظم مخالفت ممکن ہے، بالخصوص ایسے حالات میں کہ آزادیٔ تحریر و تقریر پر سخت پابندی ہے اور عوام بنیادی حقوق سے بڑی حد تک محروم ہیں۔

حالات شاید اتنے بُرے نہ ہوتے اگر کچھ عرب ممالک میں آزادانہ انتخابات کے تحت یا افہام و تفہیم اور مصلحت و مشورہ کی بنیاد پر مقبول اور نمائندہ حکومتیں قائم ہوتیں اور دستور اور قانون کی اوّلیت اور اہمیت حاکم و محکوم دونوں کے لئے یکساں ہوتی۔ بدقسمتی سے سیاسی تبدیلی کے وہ تمام ذرائع جو کسی تہذیب یافتہ اور با اصول معاشرہ میں رائج ہوتے ہیں بیشتر عرب ممالک میں شجرِ ممنوعہ

متحدہ عرب جمہوریہ (مصر)

رقبہ: تین لاکھ ۸۶ ہزار مربع میل آبادی: تین کروڑ ۶ لاکھ
یوم انقلاب: ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء طرزِ حکومت: سوشلسٹ جمہوریہ (واحد پارٹی)
قومی اخراجات: ۱ ارب ۳۱ کروڑ مصری پونڈ
تعلیم: ابتدائی تا یونیورسٹی مفت یونیورسٹیاں: چھ
بیرونی امداد: بیس کروڑ پونڈ (صرف روس سے اسوان ڈیم کے لئے)
افواج: بری فوج ایک لاکھ ۶۰ ہزار اس کے علاوہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار والنٹیر ریزرو
بحری فوج ۱۱ ہزار، ۶ ڈسٹرائر ۶ ساحل کی حفاظت کے جہاز ۱۲ عدد
سب میرین ۴۴ تارپیڈو لانچ
ہوائی فوج ۱۵ ہزار ۶ سو ہوائی جہاز ستر بمبار طیارے ۲۸۰ لڑاکو طیارے
جنگ ۱۹۶۷ء کے نقصانات: جنگی طیارے ۳۵۶ ٹینک ۷۰۰
۱۵ ہزار سپاہی مع اسلحہ

شام

رقبہ : ۷۱ ہزار ۲۲۸ مربع میل — آبادی : ۵۵ لاکھ

یومِ آزادی : ۱۰ مارچ ۱۹۴۶ء — طرزِ حکومت : سوشلسٹ جمہوریہ

قومی اخراجات : ۲۲ کروڑ پونڈ — تعلیم : مفت تعلیم کا منصوبہ زیرِ غور ہے

یونیورسٹیاں : دو

بیرونی امداد : ۵۰ کروڑ شامی پونڈ (صرف روس فرات ڈیم کے لئے)

افواج : بری فوج ۵۰ ہزار ۶ سو درمیانی سائز کے ٹینک

ہوائی فوج نو ہزار ۔ ایک سو ۴۰ جنگی طیارے

جون ۱۹۶۷ء کے نقصانات : ہوائی جہاز ۶۰ ۔ ۲ ہزار سپاہی مع اسلحہ

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اختیار و بالادستی مفاد پرست اور گروہ بند سیاستدانوں، پولس اور فوج کے افسروں اور رؤسا اور صنعت کاروں کے حق میں محفوظ ہے۔ علماء، محققین، بے لوث سماجی کارکن، ماہرانِ فن اور خادمانِ وطن ناقابلِ اعتنار ہیں۔ اگر سیاسی اصلاح اور معاشرتی ترقی کے عنوان سے کچھ عناصر کام کرنا بھی چاہتے ہیں تو ان کی تدابیر کو ناکام بنادیا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ کیفیت یہ ہوتی جارہی ہے کہ مغرب زدہ اور اشتراکیت سے متاثر طبقہ عربوں کی روایات اور دینی اقتدار کا کھلم کھلا مذاق اڑاتا ہے۔ اور بعض عرب ممالک میں جہاں حکومت شعائرِ اسلامی سے بالکل بے پروا ہو چکی ہے، ان لوگوں کی سرپرستی کی جاتی ہے اور رہی سہی کسر خود اربابِ حل وعقد پوری کردیتے ہیں۔

ہماری بدقسمتی کہ اس طوفان کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے گو وہ حالات جو مشرقِ وسطےٰ میں صیہونی جارحیت کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں، ہماری تمام تر توجہ کے مستحق ہیں۔ ہم اس معاملہ میں بھی مستقل غفلت برت رہے

الشجاع

ہیں۔ اور بھٹکے ہوئے راہی کی طرح دوسروں کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ آپس میں اتفاق اور یگانگت کی جانب پہلا قدم بھی اٹھانے کے لئے آمادہ نہیں ہیں اور اتحاد کے نعرہ کی تکرار کے باوجود نہ عرب زعماء آج تک باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل کے لئے جمع ہوئے ہیں اور نہ ان کی کسی پالیسی اور رویہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ضبط اور مفاہمت اور اس ایثار کے لئے آمادہ ہیں، جس کی پیروی قرآن وسنت کے مطابق مسلمانوں کے لئے لازمی ہے۔ یہ حقیقت کتنی اندوہناک ہے کہ سارے ذرائع اور وسائل کے باوجود اور پھر سب سے بڑھ کر رشد وہدایت کی امانت کے دعویدار ہوتے ہوئے بھی عرب کوئی موثر طاقت، کوئی قابلِ تقلید معاشرہ، کوئی مثالی تحریک بنتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

مشرقِ وسطےٰ میں دولت کی پیداوار کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا اس کی تقسیم اور مناسب استعمال کا مسئلہ ہے۔ قطر، ابوذہابی، بحرین، کویت، سعودی عرب، ایران، شام، لیبیا، تیونیسیا، الجیریا، مراکش وغیرہ کی تیل کی آمدنی اور دیگر معدنیات ووسائل

اُردَن

رقبہ : ۳۷ ہزار مربع میل — آبادی : ۲۱ لاکھ

یومِ آزادی : ۲۵ مئی ۱۹۴۶ء — طرزِ حکومت : بادشاہت

قومی اخراجات : ۵ کروڑ اردنی دینار

تعلیم : ابتدائی مفت — یونیورسٹی : ایک

بیرونی امداد : ساڑھے تین کروڑ امریکی ڈالر اور ۴۰ لاکھ برطانوی پونڈ سالانہ جن کی فراہمی جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کی وجہ سے معطل کردی گئی۔ پانچ کروڑ پونڈ کی مدد سعودی عرب، لیبیا اور کویت سے ملی۔

افواج : بری فوج ۵۵ ہزار ڈھائی سو ٹینک اور ۴۵ ہوائی جہاز

جون ۱۹۶۷ء کے نقصانات : جنگی جہاز ۶۰، ۸ ہزار سپاہی مع اسلحہ

عراق

رقبہ:- ایک لاکھ ۵۹ ہزار دو سو ۴۰ مربع میل	
آبادی:- ۸۵ لاکھ	یوم آزادی:- ۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء
طرز حکومت:- سوشلسٹ جمہوریہ	قومی اخراجات:- ۵۰ کروڑ عراقی دینار
تعلیم:- مفت	یونیورسٹی:- پانچ
افواج:- بری فوج ۸۰ ہزار، ۳ سو ٹینک	
ہوائی فوج دو سو ۲۰ جنگی طیارے	
جون ۱۹۶۷ء کے نقصانات:- نصف ہوائی فوج	

سے ان علاقوں کو بہت تھوڑی مدت میں با ضابطہ فلاحی ریاستوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ان کے امداد و تعاون اور باہمی ترقیاتی منصوبوں سے دوسرے مسلم ممالک بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں ان ممالک میں آبادی کا مسئلہ بھی کسی خطرہ کا پیش خیمہ نہیں ہے اور وسائل اور ذرائع کے اعتبار سے ان کی آبادی نہ بہت کم ہے اور نہ بہت زیادہ اگر ایک تعمیری پروگرام کے تحت ان ممالک میں ریلوں اور سڑکوں کے جال بچھا دیئے جائیں اور ان کو ایک دوسرے سے ملا دیا جائے، مزید جدید طریقوں سے آبپاشی اور زراعت کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جائے اور علمی تحقیقی مراکز اور کتب خانے عام کر دیئے جائیں تو معیار زندگی میں کئی گنا فرق واقع ہو سکتا ہے۔

دفاعی نقطۂ نظر سے بھی ان ممالک کی افواج کی تعداد اور اسلحہ کی مقدار ایسی نہیں ہیں کہ دشمن انہیں لقمۂ تر سمجھے اور جب جی چاہے نگل جائے۔ ثقافتی اور تمدنی لحاظ سے ہر چند کہ غیر مسلموں اور مغربی اور اشتراکی نظریات کے ماننے والوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے حالات کو بہت ابتر کر دیا ہے تاہم ابھی تک ہر عرب ملک کے عوام اپنے آپ کو ملت اسلامیہ کا حصہ سمجھتے ہیں اور اسلام ہی کو سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے ہیں

مرکزی طور پر یا باہمی مشورہ کے ذریعہ احیائے ملی کی کوئی کوشش ان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے میں اور اپنے دین کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے آمادہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ عربوں کی خاصی آبادی شہروں میں یا صنعتی مراکز میں قیام پذیر ہے، جہاں تعلیم کا تناسب اور معیار بڑھتا جا رہا ہے اور اخبارات و رسائل اور ریڈیو اور ٹیلیویژن فروغ پا رہے ہیں، اس پوری آبادی کو ایک اسلامی معاشرہ برپا کرنے کی غرض سے کسی نظم کے تحت لانا دشوار تو ہو سکتا ہے لیکن ناممکن نہیں۔

سارا معاملہ سیاسی اختلافات اور خود غرضانہ روش کا ہے جس کی وجہ سے اتحاد اور یکجہتی کی کوئی عملی شکل نہیں بن پائی، مصر اور شام کی حکومتیں سعودی عرب اور اردن کی بادشاہتوں کی کس طرح ہمنوائی کریں جب ان کے درمیان اخلاقی اقدار قومی نصب العین اور طریق زندگی پر اتفاق رائے ہی نہ ہو۔ ایک جانب اشتراکیوں کے حلقہ بگوش قوم پرست عناصر ہیں جن کی باگ ڈور آمروں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگ غیر اسلامی افکار و نظریات کے مبلغ ہیں اور سوشلزم کے نام پر وہ سماجی تبدیلیاں لا رہے ہیں جو حریت اور تصورات دین کے منافی ہیں، دوسری جانب چند مطلق العنان حکمران ہیں۔ جن کے درباروں کو مسلم تہذیب سے ایک رسمی سا تعلق ہے لیکن جو اسلامی مساوات اور رواداری

سوڈان

رقبہ:- ۱۰ لاکھ مربع میل	آبادی:- ایک کروڑ ۵۰ لاکھ
یوم آزادی:- یکم جنوری ۱۹۵۶ء	طرز حکومت:- جمہوری ریپبلک
قومی اخراجات:- ساڑھے آٹھ کروڑ سوڈانی پونڈ	
تعلیم:- مفت	یونیورسٹیاں:- ۳
بیرونی امداد:- ۴ کروڑ امریکی ڈالر	
افواج:- بری فوج ۱۱ ہزار	

الجیریا

رقبہ:- ۹ لاکھ ۱۹ ہزار ۵ سو ۹۵ مربع میل

آبادی:- ایک کروڑ ۲۰ لاکھ یوم آزادی:- یکم جولائی ۱۹۶۲ء

طرز حکومت:- سوشلسٹ جمہوریہ (واحد پارٹی)

قومی اخراجات:- ایک ارب ۴۳ کروڑ الجیرین دینار

تعلیم:- بجٹ کا ۲۵٪ فیصد تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔

یونیورسٹیاں:- دو

افواج:- بری فوج ۶۰ ہزار اس کے علاوہ والنٹیر ریزرو ۴۵ ہزار

ہوائی فوج ۵۰ جنگی طیارے (بیشتر روسی مگ)

کے تصور سے اور خدا کے دین کی سربلندی کے لئے جہاد اور قربانی کے جذبہ سے ناآشنا ہیں۔ گو داخلی طور پر انہیں خود مختاری حاصل ہے لیکن بین الاقوامی معاملات میں قوم پرست آمروں کی طرح یہ بھی بڑی طاقتوں کے دست نگر ہیں۔ غضب یہ ہے کہ یہ دونوں طرز ہائے حکومت عوام میں مقبول اور محبوب بننے کے داعی ہیں جبکہ ان کی اصل حیثیت کا تعین اور ان میں کوئی بنیادی رد و بدل عوام کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔

عربوں کی آپس کی رنجش سے ان کے مسائل بہت پیچیدہ اور خطرناک صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کے درمیان اختلافات صرف کالم گلوچ ہی تک محدود نہیں، ان کے جھگڑے کہیں معمولی فسادات اور جھڑپوں کا روپ اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً الجیریا اور مراکش کا سرحدی تنازعہ اور خونناک جنگوں کی شکل میں رونما ہوتے ہیں جیسے کردوں کا ہنگامہ یا یمن کا قضیہ۔ اس قسم کی خانہ جنگی سے فلسطین کی بازیابی، اور صحرائے سینا اور دریائے اردن کے مغربی ساحل سے اسرائیلی فوج کے انخلا کے مسائل کیسے طے ہو سکتے ہیں۔ اگر عرب اپنی مرکزیت اور وحدت ملی کو چھوڑ کر اپنی ساری قوت اور صلاحیت اپنے ہی بھائیوں کو پچھاڑنے کے لئے وقف کر چکے ہیں تو صیہونی استبداد اور روسی اور امریکی سامراج کی سازش کا مقابلہ کیونکر ممکن ہے؟ بد قسمتی سے مصر اور شام کے اسلام پسند عناصر جو اسرائیل سے نپٹنے کے لئے ایک موثر عوامی قوت ہو سکتے تھے اور جن کے تعاون کی ان ہنگامی حالات میں سب سے زیادہ ضرورت تھی، تحفظ اور نفاذ دین کی سرگرمیوں کے جرم کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہیں۔ تدبر، فراست اور قوت ایمان کے عملی مظاہر کے بجائے دوسری طاقتوں پر مکمل اعتماد دکھانا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ قومی نقطۂ نظر سے عرب دنیا کے سخت ترین مسائل کا حل تلاش ہی نہیں کیا گیا۔ باوجود اس امر کے کہ عرب اتحاد کا نعرہ شب و روز بلند کیا جاتا ہے۔ اس کے حقیقی مظاہر یکسر ناپید ہیں۔ آج تک جون ۱۹۶۷ء کے المیہ کا مداوا کرنے کی کوئی سعی صحیح معنیٰ میں نہیں ہوئی اردن کی مملکت آئے دن صیہونی حملوں کو برداشت کرتی

اسرائیل (مقبوضہ فلسطین)

رقبہ: ۷ ہزار نو سو ۹۳ مربع میل (۲۶ ہزار مربع میل مزید جنگ کے نتیجہ میں)

آبادی:- ستائیس لاکھ (مسلمان تین لاکھ)

یوم قیام:- ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء طرز حکومت:- جمہوری ریپبلک

قومی اخراجات:- سوا تین ارب اسرائیلی پونڈ

جنگ کے اخراجات:- چار کروڑ بیس لاکھ اسرائیلی پونڈ

تعلیم:- لازمی ابتدائی تعلیم مفت تا یونیورسٹی

بیرونی امداد:- ۲ ارب امریکی ڈالر (بطور امداد) امریکہ اور یورپ کے یہودیوں کی جانب سے، پونے دو ارب امریکی ڈالر امریکی حکومت کی جانب سے ساڑھے تین ارب امریکی ڈالر مغربی جرمنی سے (بطور تاوان جنگ عظیم دوم)

افواج:- بری فوج ۴۰ ہزار اس کے علاوہ ۲ لاکھ ۳۰ ہزار والنٹیر (ریزرو) ۸ سو ٹینک

بحری فوج ۳۰ ہزار۔ ۲ تباہ کن جہاز، ۴ سب میرین پٹرول شپ وغیرہ

جون ۱۹۶۷ء کے نقصانات:- ۵۰ ہوائی جہاز ۶۱ ٹینک ۶۶۹ سپاہی

ہے اس کی سرحدی آبادی بے سروسامان اور برباد ہے، جہاں پہلے لہلہاتے کھیت تھے وہاں ویرانی طاری ہے۔ سینکڑوں بستیاں نہ صرف اس علاقہ میں جو صیہونیوں کے زیر نگیں ہے تاراج کر دی گئیں بلکہ نواحی علاقہ جو ابھی تک آزاد ہے۔ دشمن کی مستقل شرپسندی اور حملوں کا شکار ہے۔ غزہ میں بے پناہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ لاکھوں مسلمانوں کو اپنے مکانوں اور زمینوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہر ماہ ملک بدر کئے جاتے ہیں معمولی مطالبات کی سزا موت ہے۔ یہ سب کچھ روز روشن کی طرح ہر مسلمان پر عیاں ہے اور عرب ریڈیو اور پریس ہمہ وقت مغربی استعمار اور صیہونی سامراج کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں، لیکن اتحاد اور اشتراک تعاون پر آمادگی صرف زبانی ہے، اس کا عملی ثبوت مہیا کرنا باقی ہے اسرائیل کیل کانٹے سے لیس مسلمانوں کی حمیت و غیرت کو برابر للکار رہا ہے۔ اس کے عزائم ڈھکے چھپے نہیں رہے ہے، وہ ترکی کے سرحدی علاقوں سے لے کر، دمشق، بابل، خیبر حتیٰ کہ مدینہ منورہ تک پر قبضہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسرائیل کے عزائم اور کارروائیوں کا ہمارے پاس کیا جواب ہے؟ اس مسئلہ کی حیثیت عالم اسلام کے مستقبل کے لئے کلیدی ہے۔ فلسطین کا المیہ صرف عالم عرب تک محدود نہیں۔ مراکش الجزائر اور تونس کی حکومتیں اگر اس خام خیال میں مبتلا ہیں کہ وہ اسرائیل کی بڑھتی ہوئی قوت کا ہدف نہ بنیں گی یہ نادانی ہے کیونکہ اسرائیل کا منشا مشرق وسطیٰ میں اپنے آپ کو ایک استعماری قوت کی حیثیت سے قائم کرنا ہے اور اس مقصد میں کامیابی کے لئے وہ دور اور نزدیک کی سب مسلم ریاستوں کو جس سے کسی موقع پر مزاحمت کی توقع ہو سکتی ہے کمزور اور بے دست و پا کرنے کا خواہاں ہے۔ الجزائر کی خاموشی شام کے کھوکھلے اعلانات، اردن کی آہ و بکا مصر کے طویل تبصرے اور سعودی عرب کی حکمت عملی سب عربوں کے انتشار اور حقیقت سے فراریت کی غمازی کرتے ہیں۔ کاش وہ دیکھ سکیں کہ ان کے لئے اسلام ہی واحد پناہ گاہ ہے۔

ہمارے تہذیبی مسائل

صفحہ نمبر ۲ کا بقیہ

ملا کر بات نہ کر سکتا تھا۔ اور اب یہ عالم ہے کہ اسی نسل کے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں مخلوط پارٹیوں میں ٹوئسٹ اور چاچا رقص کرتی ہیں۔ باپ کے ساتھ بیٹھ کر بیٹے کا شراب پینا معیوب نہیں بلکہ روشن خیالی کی دلیل ہے۔ بیٹی کا اپنے باپ کی آنکھوں کے سامنے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رقص کرنا، باپ کی رگ حمیت کو نہیں پھڑکاتا۔ فیشن پریڈ سماجی زندگی کا لازمہ بن گئی ہے۔ لباس کی تراش خراش عریانی کی حد حل کو پھلانگ گئی ہے۔ اگر مذہب کا کوئی پاس ہوتا قرآنی تعلیمات کا کوئی اثر ہوتا۔ اپنے پیغمبر کے فرمودات کا کوئی لحاظ ہوتا تو بے حیائی کا یہ طوفان کیوں امنڈتا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ہم نے مذہب کو چھوڑ کر اپنی تہذیبی روایات کو یکسر ترک کر کے مغربی تہذیب کو اپنی زندگی میں رہنما بنا لیا ہے اسی ہیجان کے باعث ہمارا اپنا کوئی قومی مزاج و کردار نہیں بن سکا۔ نہ قومی جذبہ ہماری زندگی پر حاوی ہو سکا اور نہ تہذیبی مسائل سلجھ سکے۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

ادب اور فلسفہ پر ایک خاص بات

بڑا شاعر اور بڑا فلسفی ایک ہی معیارِ فکر اور ایک ہی ذہنی سطح پہ ہوتے ہیں

میں اس موضوع پر کبھی پہلے بھی مفصل اظہارِ خیال کر چکا ہوں مزید لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ پروفیسر ابواللیث صدیقی صاحب نے گزشتہ دنوں الٰہ آباد میں تقریر کرتے ہوئے ایک ایسی بات کہی جو ادب اور فلسفے کے تعلق کے سلسلے میں اتنی گمراہ کن ہے جتنی اردو کے مبتدیان تنقید عام طور پر کیا کرتے ہیں. موصوف نے فرمایا کہ فلسفے سے شاعر کی عظمت میں کیا اضافہ ہو جاتا ہے اگر فلسفے سے آشنا ہونا ہے تو اس فلسفی کو پڑھئے جس سے شاعر نے فلسفہ لیا ہے۔ شاعر سے اس کا کیا تعلق ہر قسم کی باتیں شاعری یا ادب کی ماہیت اور اس کی عظمت سے اس قدر ناواقفیت کا ثبوت دیتی ہیں کہ جس کی حد و انتہا نہیں ہے کسی محض نقاد سے یہ امید نہ کرنا کہ وہ ادب کو اس طرح سمجھے گا جیسے کہ وہ نقاد کو سمجھنا ہے عبث ہے۔ اس وجہ سے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ وغیرہ کی یہ رائے ہے کہ کسی صنف ادب کا بہترین نقاد اس صنف کا عامل ہی ہو سکتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مسلم ہے کہ محض عالم یا پروفیسر نقاد بھی توجہ کے قابل ہو جاتا ہے اگر اسے تمام تنقیدی نظریات کا علم ہو اور اتنی فہم ہو کہ وہ انھیں سمجھ سکے۔ پروفیسر موصوف کی رائے شاعری یا ادب کے بنیادی نظریے جو عام طور پر مشرق اور مغرب میں ہمیشہ سے مسلم الثبوت ہے ایسی ناواقفیت کا ثبوت دیتی ہے کہ جاننے والوں کے ہوش اڑ جائیں اور سعدی کا شعر یاد آتے ۔

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد

معاملہ بالکل شروع سے چلا آرہا ہے۔ افلاطون نے شاعر کو اپنی عینی جمہوریہ سے نکال دیا تھا کیونکہ وہ اس کے حساب وہ عکس کے عکس کا پجاری تھا یعنی فلسفی نظر نہیں رکھتا تھا۔ ارسطو نے نہایت مودبانہ طریقہ پر اپنے استاد سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ شاعری تاریخ سے زیادہ فلسفیانہ ہے کیونکہ تاریخ کا موضوع مخصوص چیزیں ہیں جبکہ شاعری کو آفاقی چیزوں سے سروکار ہے یعنی شاعر یا ادیب کو عینی مملکت میں داخل ہونے کا حق اسی وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ اس دائرے میں داخل ہو جائے جس میں فلسفی ہوتا ہے اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ ادب زندگی کی ترجمانی ہے ہاں ترجمانی کے طریقے مختلف روایات اور مختلف افراد کے ساتھ اتنے مختلف ہیں کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں رہ گئی ہے مگر اس ترجمانی کے مدارج ہیں جو ترجمان کی ذہنی سطح کا اظہار کرتے ہیں۔ سطح ذہن سخت ناہموار ہے لیکن اس سطح کے دائرے مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں ہی مختلف لوگوں کی رایوں کو ہم مختلف دائروں میں رکھ سکتے ہیں۔ کسی خاص موقع پر ایک جاہل اور احمق بھی اپنی رائے کے بغیر نہیں رہتا مگر اس سے زیادہ ذہین اور واقف کار شخص جو رائے دیتا ہے وہ صاف طور پر اونچی سطح کی معلوم ہوتی ہے اسی طرح ادیب بھی ایک بات کہہ سکتا ہے یا ایک قصہ بیان کر سکتا ہے جو محض جذباتی اور سنسنی خیز ہو اور دوسرا اسی کو اس طرح کہے کہ سب نئے طبق روشن ہو جائیں۔ یہ معاملہ معیار فکر Standard of thought کا ہے۔ افلاطون چھوٹے شاعروں پر نظر رکھ کر اور ان میں فکر کی پست سطح ، دیکھ کر انھیں عینی جمہوریہ سے باہر نکال دیتا ہے۔ ارسطو اعلیٰ ترین شاعروں پر نظر رکھ کے

ہوئے یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کے یہاں بھی فکر کی وہی سطح ہے جو فلسفیوں کی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ فلسفیوں سے کم قابلِ وقعت نہیں ہیں۔ افلاطون اور ارسطو کے لئے سب سے بڑا انسان فلسفی تھا۔ آج کل اس لفظ کے معنے اور اس سے وابستہ مناسبتوں میں فرق ہو گیا ہے یونانی "فلسفی" سے ایسا اعلیٰ مفکر مراد لیتے تھے جیسا ہم لفظ "پیغمبر" سے لیتے ہیں ہم فلسفی اسے کہتے ہیں جو خیال concept سے تعلق رکھتا ہو اور بحث کے ذریعہ مختلف خیالات کو مربوط کر کے ایک نظریہ بنائے۔ برخلاف اس کے شاعر کو تصور یا image سے سروکار ہوتا ہے اور وہ مختلف تصورات کو جمع کر کے ایک نیا عالم تخلیق کرتا ہے اس معنی میں شاعر اور فلسفی ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوئے مگر خیال اور تصور کی ذہنی سطح دونوں کے یہاں برابر ہو سکتی ہے۔ افلاطون سمجھتا تھا کہ فلسفی کا خیال ہی آفاقی ہو سکتا ہے ارسطو نے سمجھایا کہ شاعر کا تصور بھی آفاقی ہوتا ہے۔ اس وقت یہ رائے مسلم ہے کہ افلاطون خود فلسفی سے زیادہ شاعر تھا۔ کیونکہ اس کی عینی جمہوریہ کے اہم ترین خیالات بحث سے نہیں بلکہ تصورات سے ادا ہوئے ہیں۔ مثلاً حق اور اس کے عکس میں فرق کرنے کے لئے اس نے مدلل بحث کرنے کے بجائے غار کی تشبیہ استعمال کی ہے جس کی دیواروں پر حقیقی دنیا کے عکس پڑتے ہیں اور یہی صورت اس نے مجازی دنیا کی بتائی ہے۔ اصل فلسفی ارسطو تھا جو شاعری اور ٹریجڈی کو بھی منطق اور مابعد الطبیعات کی کسوٹی پر کستا ہے اور شاعر کو بھی فلسفی کا ہم پلہ دیکھتا ہے۔ میں ارسطو اور افلاطون سے شروع کر رہا ہوں۔ کیونکہ تمام تنقید کی یہ بنیاد ہیں اور ان ہی سے یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ شاعر کے تصورات کی وقعت کا معیار فلسفی کے خیالات ہو سکتے ہیں۔ بڑا شاعر اور بڑا فلسفی ایک ہی معیار فکر اور ایک ہی ذہنی سطح پر ہوتے ہیں فرق صرف یہ ہوتا ہے دونوں اپنے تجربہ کو جو ایک ہی بلندی کی چیز ہے مختلف ذرائع سے سامنے لاتے ہیں یعنی فلسفی خیال اور بحث سے اور شاعر تصورات اور مکمل تصویر سے بعد کے تجربہ سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ شاعر کی مخصوص صلاحیت تو تصورات بنانے میں ہے مگر وہ اپنی ارتقا کو جب تک پورا نہیں کرتا جب تک کہ اس کے تصورات میں فکری عنصر شامل نہ ہو جائے اس کا مطالعہ انگلستان کے جوان مرگ شاعر جون کیٹس JOHN KEATS کے حالات سے ہوتا ہے۔ اس کی پہلی پہلی نظمیں محض احساساتی تصورات سامنے لاتی ہیں۔ جو ایک قسم کی سنسنی تو ضرور پیدا کرتے ہیں مگر کوئی گہرا اثر نہیں رکھتے مگر رفتہ رفتہ اس کے یہاں سنسنی کم ہوتی جاتی ہے اور فکر کا عنصر زیادہ ہوتا جاتا ہے چنانچہ —— "اوڈس" ODES میں وہ پورے طور پر مفکر ہو جاتا ہے اور حسن میں حق کی تصویر نمایاں کرنے لگتا ہے اور اب وہ اول درجہ کے شاعروں میں گنے جانے کے قابل ہو جاتا ہے اس کی آخری نظم جسے وہ نامکمل چھوڑ کر ہی مر گیا ہمارے سامنے شاعر کا ایک نقشہ لاتی ہے جس میں فن و فکر کی وہ اعلیٰ آمیزش ہے جو عظیم شاعر کا طرۂ امتیاز ہے۔ نظیر اکبر آبادی ایسے عوامی شاعر جو کبھی الاپتے پھریں وہ شاعری ضرور ہوئی مگر اعلیٰ شاعری نہیں ہوئی ہمارے یہاں شاعری کا لفظ اعلیٰ شاعری کے لئے استعمال نہیں ہوتا اسی لئے جو سچ مچ اعلیٰ شاعر ہمارے یہاں پیدا ہوا اس کو کہنا پڑا۔

مری نوائے دو رنگی کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

ہم عام طور پر محرمِ رازِ درونِ مے خانہ لفظ کو سمجھتے ہیں یونانیوں کیلئے ایسے آدمی کیلئے فلسفی تھا۔ ارسطو نے جب شاعر کو بھی فلسفی ثابت کیا تو اس کا مطلب تھا کہ شاعر بھی یہی ہو سکتا ہے اور آج جبکہ علم نفسیات کی ترقی نے مختلف فطرتوں کو جاننے کے لئے زیادہ واضح کر دیا ہے اور ایک طبقہ "انٹلکچولز" کا ہے جس کے ہاتھ میں ہی آئندہ کے انسان کی نجات ہے ہم اسی ادیب کو ادیب کی دنیا میں داخلہ دیتے ہیں اور جو رازِ درونِ میخانہ کا محرم ہو اسے اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں جتنا نیا وہ [illegible] محرم [illegible] یہ کہنا کہ ہمیں فلسفہ چاہیے تو فلسفی کے پاس جائیں، شاعر کے پاس جانے سے کیا فائدہ یہ ثابت کرتا ہے کہ نقاد کے دماغ میں فلسفہ اور شاعری کی دو الگ الگ دکانیں لگی ہوئی ہیں جو چیز ایک میں بکتی ہے وہ دوسری میں نہیں بکتی لہٰذا ایک چیز کا خریدار اگر دوسری چیز کی دکان پر جائے تو احمق ہے۔ اصل میں ایسے نقادوں میں دکھی تو

ظاہر ہے جو تخلیق کرنے والے میں نہیں ہوتی اور جس کی بنا پر دونوں جنسوں کے تعلق کو جبلی طریقہ پر سمجھتا ہے تعجب انگیز کمی عام کی نظر آتی ہے جو مطالعہ کرنے والا عام ذہن سے بھی حاصل کر لیتا ہے اور اسی مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں فکر و فن کا آہنگ اسے اہم حقیقت نظر آنے لگتا ہے۔

دنیا کے سب سے بڑے فلسفی شاعر دانتے اور رومی ہیں۔ دانتے نے اپنی نظم میں رومن کیتھولک مذہب کو مکمل تخلیقی صورت دیدی۔ رومی کی مثنوی کے بابت کہا جاتا ہے ؎

مثنوی مولوی معنوی ؎
ہست قرآں در زبان پہلوی ؎

تو اس پر یہ کہہ دیا جائے کہ ان شاعروں کو کیوں پڑھا جائے وہ آسمانی کتابیں نہ پڑھی جائیں جو ان کا ماخذ ہیں اس کا جواب رومی نے خود دیدیا ہے وہ کہتے ہیں

من ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیش سگاں انداختم

شاعر ہی فلسفہ کا مغز نکال لاتا ہے اور اسے اس طرح زندہ کر کے پیش کر دیتا ہے کہ انسان احساسات کے ذریعہ ہی اس تک پہنچ جاتا ہے۔ انجیل ہو قرآن ہو یا زندگی ان میں ہر قسم کے علم کا مواد ہے۔ فلسفہ بھی ان سے اخذ ہوتا ہے اور شاعری بھی صرف یہ ہے کہ ادراک کی قوت میں فلسفی اور شاعر ایک ہی درجہ پر ہوں۔ جدید دنیا کا سب سے اہم فلسفی شاعر گوئٹے ہے۔ امریکی فلسفی سنتیانا کی رائے کے مطابق اس نے ان سب خیالات کو جو نشاۃ الثانیہ سے ابھرتے چلے آرہے تھے جمع کر کے ایک تخیلی صورت دیدی۔ بہت سے سوالوں میں جو اٹھائے گئے تھے ایک یہ بھی تھا کہ "بدی" یا "شیطنت" کیا ہے۔ فلسفیوں نے اپنی بحثوں سے اس سوال کے جواب میں جو کچھ ثابت کیا تھا وہ گوئٹے نے مفسٹوفلیس کے کردار میں جمع ہی نہیں کر دیا بلکہ دائمی طریقہ پر زندہ کر دیا۔ ہم اگر ان سب فلسفیوں کو پڑھیں تو دور کو سمجھاتے رہ جائیں گے اور سرانہ ملے گا مگر مفسٹوفلیس کی حرکات اور باتیں ہمارے تخیل پر ثبت ہو جاتی ہیں اور ہر وقت پر جب بیکھا ہمارے اشیاء

سامنے آتی ہے تو وہ یاد آتی ہیں ہم اسے پہچان کر الگ ہو جاتے ہیں مثلاً ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی جو ہر بات سے انکار ہی انکار کرتے تھے ان سے تھوڑی دیر کی باتیں کر کے مجھے مفسٹوفلیس کا یہ کہنا یاد آیا۔

ICH BIN DER GIEST ꟷER STET VENEINT

"میں وہ روح ہوں جو ہمیشہ انکار ہی کرتی ہے"۔

اور میں سمجھ گیا کہ یہ صاحب بدی کی طرف رجوع ہیں اور خطرناک ہیں گوئٹے نے مفسٹوفلیس کے کردار کی بنیاد فلسفیانہ نظریہ پر رکھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ سنگدلی کے سوا اور کوئی گناہ ہے ہی نہیں کیونکہ یہی سب گناہوں کی جڑ ہے۔ مفسٹوفلیس کا کردار ایک نفسیاتی جذباتی اور تخیلی اثر رکھتا ہے جو کسی کتبہ یا بحث سے پیدا ہو سکتا ہے در اصل بات یہ ہے کہ فلسفی کیسے خیالات اور نظریات بناتا ہے مگر اس کو سمجھنے والے چند اس کے ایسے فلسفی ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کے خیالات زندہ ہو کر زندگی میں اسی وقت داخل ہوتے ہیں جبکہ شاعر یا ادیب ان کی تخلیق کرے ہمارے مذہبی فلسفہ میں "لعنت" کا لفظ بہت استعمال ہوتا ہے اور اس کو سمجھانے کے لاتعداد طریقے استعمال کئے ہیں مگر اس پر مولانا روم دو مصرعوں میں جو کچھ کہہ دیتے ہیں وہ ان تمام فلسفوں پر بھاری ہے۔

لعنت آں باشد کہ خود بینش کند
حاسد و گرم بین و بدکینش کند

کچھ ذہن ایسے ضرور ہوتے ہیں جو تصورات سے زیادہ خیالات کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ انھیں فلسفے کی طرف ضرور جانا چاہئے۔ اور شاعری کو نظر انداز کر دینا چاہئے مگر جو شاعری سے شوق کا دعویٰ کرے اس کا یہ کہنا کہ فلسفہ کیلئے شاعر کے بجائے فلسفی کے پاس جاؤ شاعری اور فلسفہ دونوں سے حیرت انگیز ناواقفیت کا ثبوت ہے

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں شاعری کا مقام گویوں بھانڈوں اور اسی قسم کے دربار میں تفریح بہم پہونچانے والے لوگوں میں رہا۔ کسی نے یہ دیکھنے کی کوشش تک نہ کی کہ ان میں تفریحی پہلو کے علاوہ بھی کچھ ہے اور اس تفریحی پہلو کو ہی سب کچھ سمجھا۔ عام طور پر اب بھی شاعری کو پست ہی قسم کی کوئی چیز سمجھا جاتا ہے۔

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

جمیل جالبی

تَوبَتہُ النّصُوح

خیال جبُ انسانی فکر کا حِصّہ بن جاتا ہے تو افراد اور قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں!

سرسیّد تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی۔ اِس کا اثر اُن لوگوں پر بھی گہرا پڑا جنھوں نے اسے رَد کیا اور اُن پر بھی جنھوں نے اسے قبول کیا۔ یہ تحریک مسلمانوں کو بیدار کرنے، انھیں جدید تعلیم سے روشناس کرنے اور بدلتی زندگی کا شعور حاصل کرکے مہذب اور ترقی یافتہ دنیا کے دوش بدوش چلنے کا راستہ دکھانے کی تحریک تھی۔ اس کا اثر اتنا گہرا، اتنا دور رس تھا کہ گزشتہ سو سال میں مسلمانوں کی جتنی ذہنی، فکری، مذہبی، سیاسی، ادبی اور تعلیمی تحریکیں اٹھیں ان میں سرسید کی تحریک مرکزی حیثیت رکھتی ہے اس دور کے سارے لکھنے والوں نے سرسید کے خیالات کو قبول کیا اور اپنی تحریر و تقریر سے اسے آگے بڑھایا۔ حالی نے مسدس لکھی تو اس میں اس تحریک کی رُوح موجود تھی۔ شبلی نے مشاہیرِ اسلام کی سوانح لکھیں تو اس میں سرسید کا شعور موجود تھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اسلامی ناول لکھے تو ان کے سامنے بھی یہی مقصد تھا۔ نذیر احمد نے ناول لکھے تو ان کے سامنے بھی افراد کے اخلاق کی درستی اور معاشرت کی تہذیب اور اصلاح کا مقصد تھا۔ وہ مراۃ العروس ہو یا ابن الوقت، رویائے صادقہ ہو یا توبۃ النصوح، سرسید کی فکر ہر جگہ جاری و ساری نظر آتی ہے۔

نذیر احمد نے ہر قسم کی تصانیف قلم بند کیں۔ قرآن اور قانون کے ترجمے بھی۔ لیکچر اور مضامین بھی۔ لیکن اردو ادب میں ہمیشہ رہنے والا اضافہ ان کی وہ افسانوی تصانیف ہیں جن میں عام زندگی کے حقائق کو افسانے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ نذیر احمد کی سب سے

اشتہار

اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے تمام ہم عصروں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ واقعیت پسند ہیں اور دنیا کی ان حقیقتوں پر نظر رکھتے ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں ہمارے سامنے آتی ہیں اور جن کو صحیح معنی میں حقیقی زندگی کہا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے تخلیق کیے ہوئے کردار آج ہماری زبان، ہمارے محاورہ و روزمرہ کا حصہ بن گئے ہیں۔ اصغری بیگم، اکبری بیگم، سگھڑ پن اور پھوہڑ پن کی علامتیں ہیں۔ ابن الوقت دنیادار اور غلط راستہ پر پڑ جانے والے انسان کی علامت ہے۔ ظاہر دار بیگ آج بھی اسی طرح گلی کوچوں بازار ہاٹ میں ہمیں قدم قدم پر نظر آتے ہیں اور انھیں ہم ظاہر دار بیگ کے ذریعہ ہی پہچانتے ہیں۔ نصوح ایک ایسے انسان کی حیثیت رکھتا ہے جو پہلے ایک عام آدمی کی طرح ساری برائیوں اور دینی و دنیاوی خرابیوں کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے لیکن اچانک ہیضہ کے مرض میں مبتلا ہو کر جب وہ قیامت اور میدانِ حشر کو خواب میں دیکھتا ہے تو اس کے اندر احساس اور فکر کی ایسی بنیادی تبدیلیاں آتی ہیں کہ وہ ایک نیک، پاکباز، سچا اور دیندار انسان بن جاتا ہے۔ خیال جب انسانی فکر کا حصہ بن جاتا ہے اور وہ اس پر سرگرم عمل ہوتا ہے تو افراد اور قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں نصوح اس عمل کی بہترین مثال ہے۔ ہر معاشرہ کی خرابی اور بدعنوانیوں کا بنیادی سبب یہی ہے۔ کہ وہ معاشرہ اور اس کے افراد کسی بات، کسی خیال پر پوری طرح ایمان نہیں رکھتے۔ تذبذب انھیں تضاد کے کنوئیں میں دھکیل دیتا ہے۔ اور بے اصولی بے عملی

خودغرضی اور خودحفاظتی ان کا مزاج بن جاتی ہیں۔ اگر کسی معاشرہ میں زندگی کا صُور پھونکنا ہے تو ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس معاشرہ میں مقصد اور منزل کی آگ روشن کی جائے اور پھر عمل از خود ایک قوت بن کر سارے معاشرہ کو بدل کر رکھ دے گا۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ناول "توبۃ النصوح" فکر کے اسی گوشے کو سامنے لاتا ہے اور نصوح کا کردار اسی لئے ہمارے لئے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

"توبۃ النصوح" کا قصہ سیدھا سادا ہے۔ دلی میں ہیضہ پھیلتا ہے اور اتنا زور پکڑتا ہے کہ ہر طرف موت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ نصوح بھی ہیضہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالت بیماری میں اپنے باپ کو خواب میں دیکھتا ہے کہ روز قیامت اور میدان حشر ہے۔ وہاں کی حالت دیکھ کر جب بیدار ہوتا ہے تو اس کے اندر تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے اور وہ نہ صرف اپنی اصلاح کرتا ہے بلکہ اپنی بیوی، اپنے بچوں کی اصلاح بھی شروع کرتا ہے۔ نصوح کے دو بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کا معاملہ تو آسان رہتا ہے لیکن بڑے لڑکے اور لڑکی کی اصلاح کا عمل ایسی ایسی پیچیدگیوں سے گزرتا ہے کہ نصوح اور اس کی بیوی کو دوپہر کے چھکے چھوا دیتا ہے۔ آخر کار نصوح کامیاب ہوتا ہے۔ بڑا لڑکا کلیم جو بے قابو تھا۔ برسوں کے بعد زندگی میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھا کر بستر مرگ پر اپنے کئے پر شرمندہ و شرمسار ہو جاتا ہے۔

قصہ بظاہر بہت معمولی ہے۔ لیکن نذیر احمد نے جس طور پر اسے پیش کیا ہے جس طرح دلچسپی کو شروع سے آخر تک قائم رکھا ہے جس طرح انسانی نفسیات کے راز کھولے ہیں اور جس طرح مذہب، اخلاق، معاشرت، تہذیب اور مقصد حیات کے مختلف عناصر کو یکجا کر کے کہانی کی وحدت میں سمویا ہے اس عمل نے توبۃ النصوح کو اردو ادب میں ایک کلاسیک کا درجہ دے دیا ہے۔

بے شک نذیر احمد کے توبۃ النصوح کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قصہ ایک متوازن اتحاد کے ساتھ آیا ہے اور وعظ بھی اس طرح آتے ہیں کہ قصہ کا تسلسل مجروح نہیں ہوتے ہیں۔ نصوح کا خواب اردو ادب میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ کلیم کا کردار تمثیل کے درجے سے اٹھ کر ایک ٹائپ بن جاتا ہے اور پرانی زوال پذیر تہذیب کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ ظاہر دار بیگ ظاہرداری اور طنز و مزاح کی دلکش تصویر بن کر ہمارے لئے ایک زندہ کردار بن جاتا ہے اور ہم ظاہر دار بیگ کو عام زندگی میں تلاش کرنے لگتے ہیں۔

توبۃ النصوح ایک ایسا ناول ہے جسے ہر بڑے اور چھوٹے کو پڑھنا چاہیئے۔ اس سے ایک تو انسان کے خیالات پر ایسا گہرا اثر پڑتا ہے کہ وہ خرابیوں سے بچنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے اور دوسرے زندگی میں مقصد کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں بچوں کے کردار بھی ہیں، بڑے بوڑھوں کے بھی۔ اس طرح ہر عمر کے انسان کی نفسیات اس ناول میں ملتی ہے ـــــ اور پھر وہ لوگ جو زندگی میں مقصد کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جن کے فکر اور خیال کوئی معنی نہیں رکھتے ان کے لیے توبۃ النصوح میں مزاح، طنز، زبان و بیان کا چٹخارہ اور کوثر و تسنیم میں دھلے ہوئے محاوروں کی چاشنی تفریح طبع کا سامان بہم پہنچا سکتی ہے۔ کمال یہ ہے کہ جیسا کردار ویسی زبان۔ جیسا موقع ویسا مکالمہ اب ذرا میاں نصوح کے چھوٹے لڑکے سلیم کی بات سنئے اور دیکھئے کہ اصلاح سے پہلے ان کا کیا حال تھا۔

"عین انھی کے دروازے پر لڑائی ہوئی سخت کلامی کے بعد گالی گلوچ تک نوبت پہنچی پھر مار کٹائی ہونے لگی۔ لڑکا مجھ سے تھا گزور، اڑنگے پر چڑھ جیا ایک پٹخنی دیتا ہوں چاروں شانے چت پھر تو میں اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور سچا کو ایسے گھسے دیئے کہ یاد ہی کئے ہوں گے۔"

زبان و بیان کی چاشنی موضوع کے ساتھ مل کر ایک وحدت بن گئی ہے اور اسی تخلیقی عمل نے اسے سدا بہار بنا دیا ہے ـــ انسان فانی ہے لیکن اس کی تخلیق لافانی ہے اور نذیر احمد کا شاہکار توبۃ النصوح بھی انہی لافانی تصانیف میں سے ایک ہے جو زمانے کے گرم و سرد سے محفوظ آب حیات پی کر ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

اودھ پنچ کے ادبی معرکے اور منشی سجّاد حُسین

منشی سجاد حسین کا نام آتے ہی اودھ پنچ کا نام ذہن میں اُبھر آتا ہے اور اودھ پنچ کا نام آتے ہی اردو شعر و ادب، صحافت و تنقید اور طنز و مزاح کا ایک پورا دور نظر سے گزر جاتا ہے، منشی سجاد حسین پہلے شخص ہیں جنہوں نے مغربی اصولوں پر اردو میں صحافت کا آغاز کیا۔ وہ مشرقی علم و فن کے ساتھ ساتھ مغربی علم و فن سے بھی واقفیت رکھتے تھے اور ان دونوں رنگوں کے امتزاج سے ایک نیا رنگ پیدا کر لینے کا ہنر بھی انھیں آتا تھا، بیس اکیس سال سے زیادہ عمر نہ رہی ہوگی جب انھوں نے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نامی ہفت روزہ اخبار لکھنؤ سے جاری کیا۔ یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس میں بعض سنجیدہ تحریروں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کو خصوصیت سے جگہ دی گئی۔ اس سے پہلے اردو شاعری میں شہر آشوب اور ہجویات کی شکل میں طنز و ظرافت کے نمونے تو ملتے ہیں لیکن غالب کے خطوط کو چھوڑ کر نثر میں طنز و ظرافت کا سراغ نہیں ملتا گویا اردو نثر میں منشی سجاد حسین اور ان کے اخبار اودھ پنچ کے ذریعہ طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں کا رواج عام ہوا ہے۔

اودھ پنچ میں منشی سجاد حسین تنہا نہ تھے، ان کی شخصیت میں ایسی کشش تھی کہ اس عہد کے بہت سے ممتاز اہل قلم ان کے گرد جمع ہو گئے تھے چنانچہ اکبر الٰہ آبادی، نواب سید محمد آزاد، تربھون ناتھ ہجر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی کسمنڈوی اور احمد علی شوق اودھ پنچ کے خاص لکھنے والوں میں تھے۔ یہ سب اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں اور اودھ پنچ کی تحریریں، تقریباً سو سال بعد آج بھی انھیں کے سبب اہمیت رکھتی ہیں۔

اودھ پنچ، صحافت اور ادب دونوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، ہماری صحافتی تاریخ میں کارٹونوں کا استعمال سب سے پہلے اودھ پنچ کے ذریعے، منشی سجاد حسین ہی نے کیا۔ یہ اخبار، حکومت اور عوام کے درمیان ایسے رابطے کی حیثیت رکھتا تھا جس سے عوام اور حکومت دونوں مطمئن تھے مدیر اودھ پنچ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے عہد کے بعض [illegible] و سماجی مسائل کو اس خوبی سے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا کہ ایک طرف پڑھنے والے لوٹ پوٹ گئے اور دوسری طرف حکومت و صاحبانِ اقتدار بھی ان کی تحریروں پر توجہ دینے پر مجبور ہو گئے اودھ پنچ کی صحافت کی سب سے بڑی خصوصیت حق بیانی اور [illegible] تھی۔ انیسویں صدی کے آخری دہائیوں میں جبکہ بیرونی سامراج پنجہ حد درجہ قوی تھا منشی سجاد حسین نے بعض ایسے تنقیدی [illegible] اپنے اخبار میں شائع کئے ہیں جو اس وقت کے دوسرے صحافیوں کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ اودھ پنچ ہی کی صحافتی روشنی کا [illegible] کہ اردو صحافت بہت جلد اصلاحی اور تعمیری راستے پر لگ [illegible] اور مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام [illegible] اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ آسمانِ صحافت کے چاند [illegible] سورج بن کر چمکے۔

ادب کے سلسلے میں اودھ پنچ کے چار معرکے خاص طور پر یاد رکھے جائیں گے۔

پہلا وہ جس میں رتن ناتھ سرشار کی تصنیف "فسانۂ آزاد" کی زبان کو طنز کا نشانہ بنایا گیا۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں نے فسانۂ آزاد کی زبان پر یہ اعتراض کیا کہ یہ بیگمات اودھ کی زبان نہیں بلکہ ان کی کنیزوں اور خادماؤں کی زبان ہے۔ ہر چند کہ یہ اعتراضات وزنی نہ تھے لیکن منشی سجاد حسین اور اُن کے رفقائے کار نے اس سلسلے میں ایسا طومار باندھا کہ برسوں کے لیے "فسانۂ آزاد" موضوعِ سخن بن گیا۔ اس معرکے میں، آخری جیت، رتن ناتھ سرشار ہی کی ہوئی اس لئے 'فسانۂ آزاد' کی مقبولیت پر اودھ پنچ کے اعتراضات کا کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ اس کی اہمیت و مقبولیت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ یہ ضرور ہوا کہ منشی سجاد حسین کے اعتراضات کی بدولت، ادب کو صحافتی میدان میں اُترنے کا موقع مل گیا گویا، اودھ پنچ ادب اور ادب کے موضوعات کو محفلِ خاص سے نکال کر مجمع عام میں لے آیا۔ اور شعر و ادب کی تحسین و تفہیم عام و خاص دونوں کے لئے آسان ہو گئی۔

اودھ پنچ نے دوسرا ادبی ہنگامہ منشی الطاف حسین حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" کے سلسلے میں برپا کیا۔ منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ کے لکھنے والے شروع ہی سے سرسید کے سیاسی مسلک کے خلاف تھے حالی چونکہ سرسید کے اکھاڑے کے نمایاں پہلوان تھے اور ان کی حکمت عملیوں کی تائید میں بہانگ دہل حصہ لیتے تھے اس لئے "صاحبانِ اودھ" اُن سے بھی ناراض تھے چنانچہ مولانا حالی پر اہلِ اودھ پنچ کی یہ پھبتی بہت مشہور ہے کہ

سیّد میاں کا حال حضرتِ حالی سے پوچھئے
غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھئے

جب مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں اُردو شاعری کی بُرائیاں گنوائیں تو اودھ پنچ کے لکھنے والوں نے اسے اپنی ذات و صفات پر حملہ قرار دیا، چنانچہ حالی پر لعن طعن کی بارش ہونے لگی اور اودھ پنچ کے سرورق پر نیک سیرت حالی کے سلسلے میں یہ شعر چھپنے لگا کہ

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

حالی کے سلسلے میں بھی، زیادتی، اودھ پنچ کی طرف سے تھی، حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں، لکھنوی شعراء پر نہیں بلکہ شاعری کے اُس فرسودہ اور مبتذل رنگِ سخن پر اعتراض کیا تھا، جو اُردو کے شعری قالب کو بے روح کئے دے رہا تھا، یہ ضرور تھا کہ اس بحث میں جو مثالیں دی گئی تھیں، ان کا تعلق زیادہ تر دبستان لکھنؤ ہی سے تھا، لیکن حالی کے اندازِ اعتراض سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مریض کے نہیں مرض کے دشمن تھے، اُن کے اعتراضات و مباحث کا اتنا تعلق لکھنؤ یا اہلِ لکھنؤ سے نہ تھا جتنا کہ شاعری کی حقیقت اور اس کی روح سے تھا۔ یہ محض اتہام ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر، دلّی کے مقابلے میں، لکھنؤ کو لعن طعن کا نشانہ بنایا ہے۔ اہلِ اودھ پنچ کی طرح، اُن کی ادبی تنقید کا دائرہ بھی الفاظ و تراکیب یا محاورات کے غلط و صحیح ہونے تک محدود نہ تھا، حالی کی نظر اُن حدود سے بہت آگے تھی، وہ شعر کی ظاہری صورت یا ہیئت پر نہیں بلکہ شعر کی ماہیت و افادیت پر نظر رکھتے تھے اور انھیں کے تحت شعر و ادب پر اچھا یا برا ہونے کا حکم لگانے کے قابل تھے، یہی وجہ ہے کہ اودھ پنچ کا ہنگامہ تاریخ کے صفحات میں تقریباً دفن ہو گیا لیکن حالی کی دکھائی ہوئی راہ، روز بروز کشادہ اور مقبول ہوتی گئی، لیکن اس معرکے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عقلیت و افادیت کے باب میں، سرسید و حالی کے انتہاپسندانہ نقطۂ نظر کا وہ زور رفتہ رفتہ کم ہو گیا، جسے اگر بے روک ٹوک آگے بڑھنے کا موقع ملتا تو بہت ممکن تھا کہ شعر و ادب کے جمالیاتی عناصر کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا، اور ظاہر ہے کہ یہ بات، ادب یا ادیب کسی کے حق میں بھی مفید ثابت نہ ہوتی۔

منشی سجاد حسین نے داغ دہلوی کی شاعری پر بھی اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر داغ کے کلام کی

خامیاں نکالی گئی تھیں، ان خامیوں کا تعلق بھی صرف الفاظ و محاورات کی صحت و عدم صحت سے تھا لیکن اودھ پنچ کا جو ادبی معرکہ خاص طور پر شہرت رکھتا ہے وہ دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" سے متعلق ہے، اس معرکے کا آغاز عبدالحلیم شرر کی جانب سے ہوا، عبدالحلیم شرر کے اعتراضات کا جواب صاحبان اودھ پنچ "خصوصاً چکبست کے قلم سے دیا گیا۔

اسی لئے یہ ہماری ادبی تاریخ میں معرکہ شرر و چکبست کے نام سے مشہور ہے۔ ہوا یہ کہ منشی برج نرائن چکبست نے گلزار نسیم کا ایک عمدہ اڈیشن ۱۹۰۵ء میں شائع کیا اور نسیم کی مثنوی نگاری پر ایک جامع مقالہ بھی بطور دیباچہ سپرد قلم کیا۔ اس دیباچہ میں چکبست نے یہ بھی لکھا کہ

"جس وقت یہ مثنوی تیار ہوئی اس کا حجم بہت زیادہ تھا جب آتش کے پاس اصلاح کے لئے گئے تو انہوں نے کہا ایسے بھائی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھے گا؟ یا تم پڑھوگے کہ تم نے تصنیف کی ہے یا میں اصلاح کے خیال سے ایک مرتبہ دیکھ جاؤں گا۔ استاد کی بات دل پر اثر کر گئی۔ مثنوی کی نظر ثانی کی۔ جتنے بھرتی کے شعر تھے نکال ڈالے بلکہ جو مطلب چار شعروں میں ادا ہوتا تھا اس کو اختصار کے ساتھ ایک ہی شعر میں ادا کر دیا۔ اس صورت پر گلزار نسیم کو خس و خاشاک سے پاک کیا اور آتش کے پاس لے گئے۔ استاد نے شاگرد کی محنت پر آفریں کہا اور اصلاح کا قلم اٹھایا۔ لیکن اکثر اصلاحیں نسیم نے نہ مانیں اور اشعار کو اپنی اصل حالت میں رہنے دیا۔"

مولانا عبدالحلیم شرر نے چکبست کے اس بیان کی آڑ لے کر اپنے پہلے تبصرے میں لکھا کہ

"مجھے معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ کہ انتخاب و اختصار کا یہ آخری عمل اور تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا .... بلکہ یہ مثنوی اصل میں آتش کی ہے، انہوں نے پنڈت دیا شنکر کو کہہ کر دی ہے۔"

شرر کا یہ تبصرہ مارچ ۱۹۰۵ء کے دلگداز میں شائع ہوا۔ اس کے جواب میں چکبست نے لکھا

"جس رنگ میں گلزار نسیم کہی گئی ہے آتش نے اپنی زندگی میں اس رنگ میں ایک شعر بھی نہیں کہا...... آتش کی طبیعت کا رنگ خاص آمد ہے۔ ان کی زبان سے شعر اس طرح نکلتا ہے جیسے کمان سے تیر۔ برعکس اس کے گلزار نسیم میں ہر شعر، شروع سے آخر تک آورد کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، یہ رنگ برا ہو یا اچھا ہو...... مگر اس سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت ہے چنانچہ یہی رنگ ان کی غزلوں کے گہرے مضامین سے بھی شبنم کی طرح ٹپکتا ہے۔"

شرر کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ "اس مثنوی کی زبان اہل لکھنؤ کی زبان نہیں ہے۔"

اس کے جواب میں چکبست نے لکھا

"حضرت شرر نے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ کوشش تو یہ ثابت کرنے کی کر رہے ہیں کہ گلزار نسیم، میں نسیم کا کلام برائے نام ہے یا برابر نہ ہونے کے ہے اور جو کچھ اس کو فروغ حاصل ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ یا تو اس پر آتش کی زیر دست اصلاح ہے یا آتش نے خود اسے تفنن طبع کے طور پر تصنیف کیا اور پھر یہ اعلان بھی شائع کرتے ہیں کہ گلزار نسیم کی زبان، لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ آتش نے اس کی اصلاح میں غور و فکر سے کام لیا ہے اور نہ وہ اس کے مصنف ہو سکتے ہیں جس وقت آپ کا خیال گلزار نسیم کے محاسن کی طرف جاتا ہے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس مثنوی کا بہترین حصہ آتش کے دور قلم کا نتیجہ ہے۔ جب حضرت شرر کو گلزار نسیم میں معائب تلاش کرنے کی فکر ہوتی ہے تو اس وقت آپ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ نسیم کی تصنیف ہے اور اس لئے اس کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے شرر کے اس اعلان کی اشاعت کے قبل اساتذہ لکھنؤ یہ بات تسلیم کر چکے ہیں کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف شاعر منشی امیر احمد مینائی

"امیر اللغات" میں زبان و محاورہ کی بحث میں گلزارِ نسیم
کے سیکڑوں شعر سند کے طور پر پیش کئے ہیں۔ اب اس سے
بڑھ کر گلزارِ نسیم کی زبان کے مستند ہونے کا ثبوت کیا ہو سکتا
ہے"

شرر نے مثنوی کے بعض الفاظ و محاورات اور
ترکیبوں پر بھی اعتراضات کئے تھے۔ ان سب کے جوابات
چکبست نے انتہائی محنت و جانفشانی سے دیئے اور اکثر
اعتراضات کے جواب میں دوسرے اساتذۂ فن کے
یہاں سے سندیں پیش کیں۔ نتیجۂ شرر کو اس معرکہ میں شکست
ہوئی اس لئے کہ منشی احمد علی شوق قدوائی اور مولانا
حسرت موہانی جیسے سنجیدہ حضرات نے شرر و چکبست کے معرکہ کے
بعد اس سلسلے میں جو غیر جانب دارانہ رائیں دیں۔ وہ
چکبست کے تائید میں تھیں۔ گویا یہ پہلی ادبی معرکہ تھا جس
میں اودھ پنچ کے معاونین حق بجانب بھی تھے اور فاتح بھی
اس معرکہ کے بعد گلزارِ نسیم کی تصنیف کا قضیہ ہمیشہ کے لئے
طے ہو گیا اور بقول منشی سجاد حسین "لکھنؤ کے بھنگڑ خانوں کے
سوا یہ بات اور کہیں سننے میں نہیں آئی کہ گلزارِ نسیم آتش کی
تصنیف ہے۔"

اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا تھا ۱۹۱۳ء میں
بند ہو گیا لیکن اس کا غلغلہ اس کے بند ہو جانے کے بعد بھی
ایک عرصہ تک رہا۔ اس کی فتوحات و اثرات کا اندازہ
اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی تقلید میں متعدد پرچے
نکالے گئے، مثلاً پنجاب پنچ، بنگال پنچ، دہلی پنچ، سرپنچ
بادا آدم پنچ، راجپوتانہ پنچ اور دکن پنچ وغیرہ۔
لیکن مولوی مدن کی سی بات کسی میں پیدا نہ ہو سکی
جو قبول عام ادب و صحافت کے میدان میں، اس کے مدیر
کی بدولت اودھ پنچ کو حاصل ہوا وہ کسی دوسرے پنچ کو میسر
نہ آیا اودھ پنچ کی مقبولیت اور اہمیت بے سبب نہیں تھی
منشی سجاد حسین، صرف صحافی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ ادیب
قابل قدر طنز نگار اور ایک اچھے ناول نویس بھی تھے۔ اُن
کے ناولوں میں ہمارے ناقدین اور محققین نے حاجی بغلول
احمق الذی، طرحدار لونڈی، کایا پلٹ، میٹھی چھری،
حیات شیخ چلی اور پیاری دنیا کے نام گنوائے ہیں لیکن حقیقت
کچھ اور ہے۔ ان میں سے صرف حاجی بغلول، میٹھی چھری، کایا
پلٹ اور احمق الذی، منشی سجاد حسین کی تصنیف ہیں۔ حیات
شیخ چلی جس کا شمار ہمارے ادیبوں نے سجاد حسین کے ناولوں
میں کیا ہے دراصل سجاد حسین، انجم کسمنڈوی کی تصنیف ہے
یہ ناول نہیں بلکہ شیخ چلی سے متعلق مشہور روایات کا مجموعہ
ہے۔ اس کی تقریظ منشی سجاد حسین نے ضرور لکھی تھی، غالباً
اسی لئے یہ اُن کے نام سے منسوب ہو گئی۔ پیاری دنیا کے متعلق
بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ منشی سجاد حسین کی تصنیف
ہے اس لئے کہ اس پر اس کے مصنف کے نام کی جگہ صرف "ایک
دنیا دار" لکھا ہوا ہے۔ طرحدار لونڈی بھی اُن کے نام سے مختلف
مطبعوں سے شائع ہوئی ہے۔ لیکن یہ مرزا احمد بیگ طرار لکھنوی کی
تصنیف ہے۔ اس طرح صرف چار ناول، حاجی بغلول، احمق
الذی، کایا پلٹ اور میٹھی چھری، اُن کی تصانیف میں رہ
جاتے ہیں۔ ان ناولوں میں سب سے زیادہ شہرت حاجی بغلول
کو حاصل ہوئی۔ حاجی بغلول ایک ایسا کردار ہے جو سرشار کے
"خدائی فوجدار" کی طرح زندہ رہنے والا ہے۔ حاجی بغلول
پرانے طرز کے آدمی ہیں اور مضحکہ خیز حیثیتوں سے ہمارے
سامنے آتے ہیں، اُن کی سنجیدگی، عمل کی دھن، خودداری،
غیر معمولی احساس برتری اور ہمہ دانی سے کسی شخص کو انکار
نہیں ہو سکتا لیکن یہ چیزیں حدود سے متجاوز ہو جانے کے
سبب، خود حاجی صاحب کو تماشا بنا دیتی ہیں، وہ دوسروں
پر ہنسنے کی جتن کرتے ہیں لیکن اُن کے عمل سے ان سے مضحکہ
خیز پہلو نمایاں ہوتے ہیں، وہ خود دوسروں کے قہقہوں کے
مرکز بن جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ابتدار سے لیکر آخر تک قائم رہتا
ہے اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ پڑھنے والا ذرا دیکے

لئے بھی بوجھ نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ آخر آخر اُن کا بے گناہ کردار
ہمارے قہقہوں کا مظلوم نظر آنے لگتا ہے اور ہمیں اُن کی حالت
پر رحم سا آنے لگتا ہے، گویا یہ طربیہ ناول، معنوی اعتبار سے
ایک المیہ پہلو بھی رکھتا ہے۔

منشی سجاد حسین، لکھنؤ کی صاف ستھری اور رنگین و
لطیف زبان لکھنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں حقیقت یہ
ہے کہ اُن کے ناولوں میں دلکشی و جاذبیت کے آثار، اُن
کے انداز تحریر ہی نے پیدا کئے ہیں، بات یہ ہے کہ ناول کی
فنی خصوصیات میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے اور جس پر
سارے ناقدین کا اتفاق ہے وہ اس کے انداز بیان کی
سادگی و دلکشی ہے۔ ناول کا موضوع اور پلاٹ خواہ کتنا ہی
اہم اور فلسفیانہ کیوں نہ ہو، جب تک بیان کرنے والے کا قلم
جادو کا اثر نہ رکھتا ہو، وہ قاری کی توجہ کا مرکز نہیں بنتا۔

منشی سجاد حسین کا انداز، حد درجہ سادہ و پرکار ہے اور
چونکہ اس سادگی و پرکاری میں مزاح و ظرافت کی چاشنی
بھی شامل ہے اس لئے اس کا اثر دو چند ہو گیا ہے کسی قسم
کا کردار ہو، کسی قسم کا واقعہ ہو اور کسی قسم کی تفصیل ہو سب
کو منشی سجاد حسین اپنے انداز تحریر سے جاندار بنا دیتے ہیں
چکبست نے اُن کے متعلق بہت صحیح لکھا ہے

"منشی سجاد حسین کا طرز تحریر سب سے الگ ہے
مضمون کیا ہیں چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے
ذخیرے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا مصنف سے
گفتگو کر رہا ہے۔ یہ طرز تحریر، اُن کی جملہ تصانیف کا خاصا
ہے اور اسی کی بدولت اُن کے ناول اور اُن کی تحریریں اب
بھی بڑے چاؤ سے پڑھی جاتی ہیں۔"

ادب اور فلسفہ

صفحہ ۲۸ کا بقیہ

پڑھ لکھ جانے سے اگر کوئی فرق پیدا ہوتا ہے تو بیکار اس پست پہلو
ہی کو تک بے شک اہم ٹھیرایا جائے میں پہلے کہیں کچھ کہہ چکا ہوں
کہ انسان دو قسم کے ہیں ایک "علوی" ایک "سفلی" اور پہلے درجے
کے انسان بہت کم ہوتے ہیں شاعری کی قوت اپنی جگہ گوناگوں
انسانی صفات میں سے ایک ہے مگر جو شاعر سفلی درجہ کا ہوتا ہے
وہ ان قوتوں کو سفلی عوامل ہی میں استعمال کرتا ہے یعنی علم اور
عامیانہ باتوں کو تخیل یا حسین زبان کا جامہ پہنا دیتا ہے علوی تو اعلیٰ ترین
علم اور اعلیٰ ترین خیالات سے معمور ہوتا ہے یعنی فلسفی خیالات کو
حسن سے ہم آہنگ کر دیتا ہے لہٰذا شاعر کا فلسفی ہونا اس کی علویت
کی دلیل ہے۔ اردو کا کوئی شاعر اتنا فلسفی نہیں ہوا جتنا اقبال بعض

اور مشرق کے ہر فلسفے پر انھوں نے غور کیا اور ان کا عطر نکال کر
حسین اور پُرزور الفاظ میں رکھ دیا۔ اور اسی وجہ سے
وہ آفاقی شاعروں کے ساتھ شمار کئے جانے کے قابل ہیں ہم فخر
کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری بھی اسی علویت سے ہمکنار
ہوئی جو آفاقی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس وقت ضرورت
ہے کہ اصناف نثر مضمون۔ افسانہ۔ ناول بھی اسی علویت تک
پہنچیں اور ادب بھی انسان کے اعلیٰ ترین عوامل میں شمار ہو۔ اس
سلسلے میں نقاد کا بھی یہ کام ہے کہ "علوی ادب" کو سراہے نہ یہ
کہ نظیر اکبر آبادی کی سفلی شاعری کو خواہ مخواہ بڑھانے کے لئے
ایسے عذر لنگ تلاش کریں جس سے ادب کی علویت پر ضرب لگے

ابن فرید

دیومالا اور علامت

"— اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰؑ نے پہاڑ سے اُترنے میں دیر کی تو وہ ھارُونؑ کے پاس جمع ہو کر اُس سے کہنے لگے کہ اُٹھ ہمارے لئے دیوتا بنا دے۔ جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے اس مرد موسیٰؑ کو جو ہم کو ملکِ مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا ○ ھارُونؑ نے اُن سے کہا تمھاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اُتار کر میرے پاس لے آؤ ○ چنانچہ سب لوگ اُن کے کانوں سے سونے کی بالیاں اُتار اُتار کر اُن کو ھارُونؑ کے پاس لے آئے ○ اور اُس نے اُن کو اُن کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے اے اسرائیل یہی تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملکِ مصر سے نکال کر لایا ○ یہ دیکھ کر ھارُونؑ نے اس کے آگے قربان گاہ بنائی اور اُس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لئے عید ہوگی ○ اور دوسرے دن صبح سویرے اُٹھ کر انھوں نے قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گزرانیں۔ پھر اُن لوگوں نے بیٹھ کر کھایا پیا اور اُٹھ کر کھیل کود میں لگ گئے ○۔" (خروج — ۳۲ : ۱ — ۶)

✲

بنی اسرائیل جو نسلاً بانسل سے قبطیوں کی غلامی و محکومی میں اصنام پرستی کے عادی ہو چکے تھے، فراعنہ کے سیاسی استبداد سے نجات پانے کے باوجود اُن کے اعتقادات و توہمات کی غلامی سے نجات نہ پا سکے، چنانچہ موسیٰؑ کی عارضی غیر حاضری کے دوران ہی گوسالہ پرستی کا رعب اُن پر دوبارہ طاری ہو گیا اور انھیں یہ گمان ہونے لگا کہ قبطی تسلط سے نجات دلانے والا "بچھڑا" ہی ہے، چنانچہ وہ انھیں رسوم و رواج کی طرف رجعت کر گئے جو صدیوں سے اُن کی روزمرہ زندگی کا وطیرہ بنے ہوئے تھے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے صرف اتنا ہی نتیجہ اخذ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ خروج کے صدیوں بعد جب یہودی اپنے گم شدہ صحیفے کو اپنی یادداشت سے مرتب کرنے لگے تو وہی پرانی گرہ اُن کے اندر پھر عود کر آئی۔ وہ یہ بھول گئے کہ ھارُونؑ تو خود موسیٰؑ کے شریکِ کار تھے اور نبی ہونے کی وجہ سے توحید کے علمبردار تھے وہ اصنام پرستی کی طرف کیسے مائل ہو سکتے تھے۔ لیکن چونکہ انھیں اپنے توہمات کو تقدس عطا کرنا تھا اِس لئے اِس فعل کو سامری سے منسوب کرنے کے بجائے ھارُونؑ سے منسوب کیا۔ اس طرح جب موسیٰؑ پہاڑ سے واپس آکر ھارُونؑ کو لعن طعن کرتے ہیں تو اسرائیلی راوی قاری کی ہمدردیوں کو موسیٰؑ و ھارُونؑ دونوں سے وابستہ کر دیتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ موسیٰؑ کا غضب کمزوری ہے یا ھارُونؑ کی کم ہمتی —! توحید اور اصنام پرستی کے دوراہے پر اسرائیلی قوم ابتداء سے آخر تک کھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسا کیوں ہے —؟ اس کا جواب اُن تہذیبی اور فکری عوامل میں ملے گا جو سرزمین مصر پر بنی اسرائیل کی فکر کی تشکیل کے ذمّہ دار تھے۔ ایک عرصے وہ اساطیری توانائی کے اسیر تھے۔ اچانک جب انھیں اپنے ماضی کو خیرباد کہنا پڑا تو وہ فکری طور پر دیوالیے ہو گئے۔ نئی فکر اور نیا نظامِ حیات اُن کے لئے اتنا اجنبی ثابت ہوا کہ وہ اس کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہ کر سکے۔ چنانچہ اُن کے لاشعور میں دبی ہوئی خواہش بار بار سر اُبھارتی

رہی اور وہ ہمیشہ اس موقع کی تلاش میں رہے کہ قبطی رسوم و رواج کو اپنے نئے معاشرت میں ضم کر لیں۔ دیت مُوطفے" دیومالائی سرمایہ سے یکسر عاری تھا، اور یہ قوم بغیر اس سرمایہ کے اپنی زندگی کو ویران و بے مایہ تصور کرتی رہی۔ چنانچہ اس نے خود اپنی دیومالا تشکیل دینے کی کوشش کی۔ قبطی قوم سے نفرت پُرانے گوسالوں کو پھر سے زندہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، لیکن ذہنی مرعوبیت گوسالہ پرستی سے آزاد بھی نہیں ہونے دیتی تھی۔ اس لئے اس قوم نے خود نئی دیومالا کو جنم دیا جس کی جڑیں بہرحال قبطی دیومالا میں تھیں۔

دیومالا کے لئے اسرائیلی مزاج کے مطالعہ سے ابتداء کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی جو قومیں شروع سے ہی صنم پرست رہی ہیں اُن کے یہاں مزاج تسلسل ملتا ہے، لیکن اسرائیلی قوم توحید اور شرک کے معاملہ میں ہمیشہ ترک و اختیار میں مبتلا رہی ہے۔ اس لئے اس قوم کے مزاج کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ توہم سے استدلال تک سفر آسان نہیں۔ انسان بار بار مڑ کر ماضی کی طرف دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مجبوری اور ناکامی کو حوصلہ اور یقین کے ذریعہ رفع نہیں کر پاتا بلکہ ہر مرتبہ ہیبت، شوکت اور عظمت کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ وہ فتح جو وہ خود اپنی تدبیر اور فراست کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے، اُسے صرف اپنی خواب آگیں خواہشات، آرزوؤں اور تمناؤں کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ راون جیسے پُرغضب اور قوی رشی کو شکست دینے کے لئے ھنومان ہوا میں اڑتا ہے اور اپنی دُم سے مشعل کا کام لیتا ہے جو پورے لنکا کو بھسم کر دیتی ہے۔ گِل گامیش بھی ہنومان کی طرح دُم دار ہستی ہے اور مافوق الفطری صفات سے مزیّن۔ پیرو (PERU) تہذیب کا ہر انسان سورج ونشی ہے، اس لئے عام پیرو وَن اُسے نظر اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ یونانی ہیرو جب میدان جنگ میں اترتا ہے تو اُس کے دیوتا بھی اس کے دشمن کے دیوتاؤں سے برسرپیکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے فتح صرف مادّی انسان پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ دیوتاؤں کی جنگ فتح و شکست کا فیصلہ کرتی ہے۔ جمشید "خوب رمہ" برف اور پانی کے طوفان سے نسلِ انسانی کو اس لئے

بچانے جاتا ہے کہ "ھُرمزد" نے ایک خاص انداز کا قلعہ بنانے کے لئے خود جمشید "خوب رمہ" کی رہنمائی کی تھی۔

دیومالا کے مطالعہ سے بنیادی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تمام اساطیر بیانیہ ہوتی ہیں۔ ان کے قصّوں میں کوئی منطقی ربط نہیں ہوتا۔ ان میں غالب عوامل ماورائے مادّہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا سارا عمل (ACTION) انسان کی قدرت و تدبیر کے دائرہ سے باہر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ظلمت کے دَور کا انسان جو کچھ عملاً نہیں کر پاتا۔ اُسے تمثیل و تمثال کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔ دلیل و برہان کے وہ گوشے جو اس وقت تک اس کے لئے تاریک رہے ہیں انہیں وہ اس طرح روشن کرتا ہے کہ کائنات کے نظامِ حیات اور معاشرہ کے نظم و آہنگ میں کچھ ایسی ہستیاں دخل انداز ہو جاتی ہیں جن کے بارے میں وہ خود بھی کچھ نہیں جانتا البتہ وہ ان سے خائف بہت ہوتا ہے۔ ان دیومالائی ہستیوں کی صفات کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا علاوہ اس کے کہ ان کے اندر جو بھی صلاحیت ہوگی وہ بدرجۂ اتم ہوگی، لیکن پھر اس کے لئے یہی سوال اُٹھتا ہے کہ وہ صلاحیتیں کیا ہیں ۔۔۔؟ ان صلاحیتوں کی تلاش میں وہ پہلے اپنی ذات پر نظر ڈالتا ہے اور پھر اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے۔ اس مشاہدہ و مطالعہ میں اسے جو کچھ بھی صفات کے طور پر نظر آتا ہے اُسے تمثیلی انداز میں نقطۂ عروج پر پہنچا دیتا ہے۔ مثلاً اندر دیوتا اپنی ہیئت و اطوار کے معاملے میں قریب قریب انسان ہے۔ اس کے اندر تمام خوبیاں انسانی ہیں لیکن وہ انسان کی طرح خامیوں سے مبرّا بھی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اس عالمِ موجودات میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں۔ بڑھاپا آنے پر باپ کو بیٹے کے لئے جگہ خالی کر دینی چاہئے لیکن سیٹرن (SATURN) نے ایسا نہیں کیا چنانچہ زیوس (ZEUS) نے تمام انسانی ریشہ دوانیوں سے کام لیتے ہوئے اپنے بوڑھے باپ سیٹرن کو کائنات کی خدائی سے بے دخل کر دیا اور خود اس کی جگہ تمام دیوتاؤں کا دیوتا بن کر بیٹھ گیا۔ دورِ ظلمت کا انسان بھلا یہ کیسے تصوّر کر سکتا تھا کہ خدا بوڑھا ہو جائے اور پھر بھی خدائی کرتا رہے۔ بڑھاپے کو بہرحال جانی

[illegible] جگہ خالی کرنی ہوگی۔ اس لئے یوزر سے خدا کو بھی دستبردار ہونا ہوگا۔ یہ مثال اس امر کو بھی واضح کر دیتی ہے کہ دیومالا کے تمثیلی انداز بیان سے کیا مراد ہے۔ زیوس کے ہاتھوں سیٹرن کی بے دخلی ضعف پر ہمت و توانائی کی برتری کی علامت ہے۔ اس طرح ایک دیومالا علامتی انداز میں زندگی کے بہت سے حقائق و تجربات کو پیش کر دیتی ہے۔

اس کے قبل ہم اس امر کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ دیومالا کبھی بھی حقائق کو اس طرح پیش نہیں کرتی ہے جس طرح کہ وہ ہیں بلکہ ان حقائق کے بیان میں انسان کی یہ خواہش بدرجۂ اتم کارفرما ہوتی ہے کہ وہ ہر جزو کو اس کے کمال پر پہنچا کر پیش کرے تاکہ واقعہ کی تفصیل بحیثیت کل مثالی ہو۔ کیونکہ مثالی شے یا واقعہ ہی ایسا ہو سکتا ہے جس میں کوئی خامی نہ ہو۔ صرف اسی صورت میں دیومالائی کردار انسانی کرداروں سے برتر اور بالاتر ہو سکتے ہیں، لیکن دورِ ظلمت کا انسان یہ محسوس نہیں کر پاتا کہ اس کوشش کے باوجود وہ زمانی و مکانی ابعاد (SPACE — TIME DIMENSIONS) سے اونچا نہیں اٹھ پاتا۔ مثلاً پیبرو قوم کا سب سے بڑا دیوتا بیل ہے۔ سمیری قوم کا بادشاہ جو دیوتا بھی ہے بن مانس نما ہے۔ لیکن آریا قوم میں بن مانس یا بندر (ہنومان) انسان (رامچندر) کا طابع و مطیع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دراوڑی تہذیب کی دیومالا کے سلسلہ میں جو اشارات ہمیں موئن جو دڑو۔ ہڑپا۔ اجنتا۔ ایلورا۔ کھجوراہو وغیرہ کے آثار میں ملتے ہیں وہ غالب طور پر مدنی ہیں لیکن اسی دور کی آریائی دیومالا غالب طور پر دیہی اور خانہ بدوشانہ ہے۔ اس طرح مکانی بُعد (SPACE DIMENSION) ہر سرزمین اور قوم کی دیومالا میں تنوع پیدا کر دیتی ہے۔ ہر سرزمین کی قوم اپنے تجربات، تاثرات اور جذبات کو ہی اپنا حصار استناد (FRAME OF REFERENCE) بناتی ہے، چنانچہ اس کے دیوی، دیوتا اور ماحول اس کے ماضی اور اس کی خواہشات یعنی اس کے متوقع مستقبل کے انتہائی وفادارانہ طور پر عکاس ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے دیومالا کو ابتدائی انسان کے تجربات، فکر اور ارتقا کی اگر تاثراتی تاریخ کہا جائے تو حق بجانب ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تاریخ زمانہ کا تعین نہیں کرتی اور نہ واقعات کے تسلسل کو قائم رکھتی ہے، پھر بھی اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائی انسان اپنی کامرانیوں اور ناکامیوں کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات اور تاثرات کو بھی پوری دیانت داری کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ اب یہ دورِ حاضر کے مؤرخ کی ناکامی ہے کہ وہ خارجی زاویہ سے اس تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت داخلی عوامل کو اصل واقعات سے الگ نہیں کر پاتا۔

دیومالا کے مطالعہ کے لئے جہاں اس پہلو پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ تمثیل و تمثال کا تجزیہ مکانی بُعد کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے وہاں وہاں اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ زمانی بُعد (TIME DIMENSION) کا تعین بھی پوری احتیاط کے ساتھ کیا جائے۔ کیونکہ کوئی بھی حقیقت صرف ایک بُعد (DIMENSION) پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ زمانی تسلسل (TIME CONTINUUM) بہت سے ایسے عناصر کو بھی اپنے دھارے میں شامل کر لیتا ہے جو کسی قوم یا تہذیب کے لئے اجنبی ہوتے ہیں لیکن مستقل ربط کی وجہ سے اُن کی اجنبیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس قوم یا تہذیب کے لئے مانوس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس قوم کی فکر رسوم اور رواج کا جُزو بن جاتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال دراوڑی اور آریائی تہذیبوں کے امتزاج سے پیش کی جا سکتی ہے۔ آریائی قوم ابتداءً موحد تھی، وہ مظاہر قدرت کی پوجا نہیں کرتی تھی، اس کے لئے گائے کا تقدس اور آگ، پانی، ناگ وغیرہ کی الوہی حیثیت کے کوئی معنی نہیں تھے۔ لیکن دراوڑی تہذیب سے قریب آنے کے بعد اس نے رفتہ رفتہ اُس پوری دیومالا کو اپنا لیا جو دراوڑی تھی۔

اگر زمانی و مکانی ابعاد کو پیش نظر رکھا جائے تو دیومالا کے تمثیلی پہلو کا مطالعہ زیادہ آسان اور قابل فہم ہو جاتا ہے۔ دیومالا کے کردار بالعموم حقیقی ہوتے ہیں، لیکن ان سے جذباتی لگاؤ انہیں رفتہ رفتہ مافوق الانسان اور آخرکار الوہی ہستی بنا دیتا ہے۔ انہیں بنیادی کرداروں کے گرد تخیلی اور وضعی ہستیوں کا ایک حلقہ تیار ہو جاتا ہے جن کی اپنی کوئی حیثیت انفرادی طور پر نہیں ہوتی بلکہ وہ مرکزی ہستی کی کسی صفت یا اس قوم و تہذیب کی کسی خواہش و تمنا کا استعاراتی مظہر ہوتی ہیں۔ استعارہ کی تفصیل ایک مکمل تصویر کی شکل اختیار

کرتی ہے جسے ہم تمثیل کہتے ہیں۔ ان تمثیلوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے
جو مربوط ہو کر دیومالا بن جاتا ہے۔ یعنی دیومالائی تفاصیل من و عن ویسی
نہیں ہوتی ہیں جیسی کہ وہ ہمیں بادی النظر میں معلوم ہوتی ہیں، بلکہ
وہ جذباتی و تاثراتی تجربات کا استعاراتی اظہار ہوتی ہیں۔

دیومالا اور علامت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک
دیومالا بحیثیت کل علامت نہیں ہوتی، اور نہ علامت بن سکتی ہے،
تہ ایک ہی دیومالا سے متعدد استعارے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ دیومالا
رجحان بیانیہ ہوتا ہے لیکن علامت کا میلان جامعیت کی طرف
وتا ہے۔ دیومالا جس بات کو پھیلا کر سمندر بنا دیتی ہے، علامت اُسی
وایک قطرہ میں سمیٹ لیتی ہے۔ دیومالا مستقبل کے لئے ایک خواہش
آرزو کی صرف ایک جھلک رکھتی ہے۔ لیکن علامت ماضی سے حال
رحال سے مستقبل کی طرف اسی وجہ سے سفر کرتی ہے کہ وہ جامع
از میں یہ بتانا چاہتی ہے کہ جو کچھ ہے وہ کیا تھا اور اسے کیا ہونا
ہئیے۔ مثال کے طور پر صرف اُس اقتباس کو پیش نظر رکھیے جو مضمون
ے شروع میں درج کیا گیا ہے۔ یہودی ذہن کے لئے موسیٰؑ
حید کی علامت ہیں، "بچھڑا" بُت پرستی یا شرک کی علامت اور
ہارونؑ توحید و شرک کے درمیان تذبذب کی علامت ہیں، لیکن
ری تاریخ جو آدمؑ سے قبل مسیح تک یہودی صحیفوں میں
ملی ہوئی ہے وہ ایک علامت نہیں بن سکتی۔ اسی طرح اس تاریخ
مختلف مقامات یا مرحلے آتے ہیں جن کا یہودی قوم کو سامنا کرنا
اہے وہ صرف خواہش و تمنا ہیں۔ لیکن موسیٰؑ، هارونؑ،
"بچھڑا" (اس خاص موقع پر) پوری توانائی کے ساتھ اس اقتضا
مائندگی کرتے ہیں جو بے سروسامان ہونے کے بعد بھی یہودی
ترک نہ کر سکی یہ توانائی اور اقتضار، علامت کی ایک اور بنیادی صفت
جس سے دیومالا بحیثیت مجموعی محروم ہوتی ہے۔

دیومالا حالانکہ واقعات و تجربات کو تمثیلی انداز میں پیش
ہے لیکن اس کا انداز بیان اتنا واضح اور متعین ہوتا ہے کہ ایک
سے ایک ہی معنی اخذ ہو سکتے ہیں، گویا ایک شے دوسری شے
بدل ہوتی ہے۔ لیکن علامت اپنی جامعیت کی وجہ سے
ہمہ پہلو ہو جاتی ہے۔ ایک ہی علامت بیک وقت کئی اوصاف کی مظہر
ہو سکتی ہے، مثلاً موسیٰؑ صرف توحید ہی کی علامت نہیں ہیں بلکہ
بصیرت، تدبر اور عزم و رہنمائی کی بھی علامت ہیں۔ ان کے برخلاف
بچھڑا تذبذب، خوف، ظلمت اور رجعت کی علامت ہے۔ اس
طرح ایک علامت اپنے معنی کے لحاظ سے مختلف سطحوں کی حامل ہوتی
ہے اور ہر سطح دوسری سطح سے ایک قابلِ استدلال تعلق رکھتی ہے۔ علامت
کی ان سطحوں کی وجہ سے ایک حُسن یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر قاری اپنے
زمانی و مکانی رشتہ کے چوکھٹے میں اپنی فہم و ادراک کے مطابق معنی اخذ
کرتا ہے مثلاً میں نے مذکورۂ صدر سطور سے جو معنی اخذ کئے ہیں بہت
ممکن ہے کہ وہ آپ کے لئے زیادہ قابلِ قبول نہ ہوں اور آپ کے
ذہن میں کچھ دوسرے پہلو روشن ہو رہے ہوں۔ اسی وجہ سے علامت
کو بدل نہیں کہا جا سکتا، وہ نمائندہ ہے۔ یہ نمائندگی زمانی و مکانی
ابعاد کے مطابق ہمیشہ بدلتی رہے گی۔ البتہ یہ تبدیلی اتنی زیادہ نہیں
ہوگی کہ ایک ہی زمان و مکان میں یکسر نئے معنی اخذ ہوں بلکہ ابعاد کی
تسلسل بہرحال قائم رہے گا۔ اسی وجہ سے دیومالا توہم کے زیادہ قریب
اور علامت استدلال سے زیادہ نزدیک ہوگی۔ بہ الفاظ دیگر پورے
اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامت جب بھی کسی دیومالا سے اخذ
ہوگی تو زمانی و مکانی امتداد کے ساتھ عقلی معنویت کی طرف پیش قدمی
کرے گی، اور توہم میں تعقل کے گم شدہ عناصر کو تلاش کر کے منظرِ عام
پر لانے کی کوشش کرے گی۔ یہ کوشش و کاوش ہی علامت کا رشتہ
ماضی سے قائم رکھنے کے باوجود ایک سوچے سمجھے مستقبل کی آرزو مندی
کا پیش خیمہ ہوگی۔

دیومالا اور علامت کا رشتہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ماضی کا
رشتہ حال اور مستقبل سے! دیومالا علامت کے لئے ایک قرطاس
(CANVAS) فراہم کرتی ہے۔ علامت اس قرطاس پر معنی خیز
خطوط کھینچ دیتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر دیومالا پس منظر کا فریضہ انجام
دیتی ہے اور علامت اس مرکزی نقش کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے
جس کی وجہ سے پوری تصویر میں ایک حسین معنویت پیدا ہو جاتی ہے
جس طرح بغیر پس منظر کے بعض اوقات تصویر اپنی معنویت کھو

(باقی صفحہ ۔۔۔)

۳ ع

سلیم احمد

اردو غزل

غزل ہی عجمی اسلامی تہذیب کی ایک بہت بڑی دین ہے

پتہ نہیں کہ یہ بات اونٹ پر کوئی الزام ہے یا نہیں کہ اس کے کوہان ہوتا ہے اور سینگ نہیں ہوتے۔ لیکن غزل پر یہ اعتراض ضرور ہے کہ اس میں تسلسل نہیں ہوتا یا انتشار رہتا ہے۔ عشق و عاشقی کے مضامین ہوتے ہیں۔ شمع ہوتی ہے۔ پروانہ ہوتا ہے۔ بلبل ہوتی ہے گل ہوتا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ردیف اور قافیہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس الزام کا جواب اس طرح دیا کہ مسلسل غزلیں لکھنے لگے یا مربوط مضامین اختیار کئے۔ بعض نے عشق و عاشقی کو طلاق دی اور سیاست کو گھر میں ڈالا — کچھ ایسے بھی تھے کہ شمع اور پروانہ۔ گل و بلبل کی جگہ نئی علامتیں لائے

اور یوں بھی ہوا کہ لمبی لمبی ردیفیں پرانے لکھنؤ یا بگڑتی ہوئی دلی کے سپرد ہوئیں اور یار لوگ غیر مردف غزلیں کہنے لگے۔ مجھے اصلاح طوائفاں کی تحریک پر اعتراض نہیں ہوا تو اصلاح غزل پر کیوں ہو۔ یہ سب کچھ تو بہت اچھا ہوا لیکن پوچھنے کی ایک بات پوچھی نہیں گئی۔ غزل میں یہ سب خامیاں ہیں تو یہ کم بخت صنف سخن ماقبل سے اب تک عروس سخن کیوں بنی رہی ہے اور اس کی کیا وجہ ہے کہ ہماری زبانوں میں شاعری کی ابتدا اور انتہا اسی پر ہوتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہاں پہنچ کر کلیم الدین احمد مسکرائیں گے اور کہیں گے کہ دیکھا میں نے بے سبب نہیں کہا تھا کہ ہمارے شعراء میں قوت تعمیر کی کمی ہے اس لئے وہ نظم کی بجائے غزل اختیار کرتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی جواب نہیں ہوا ہم نے پانچ روپیہ کی دیہاڑی مانگی تھی کلیم الدین احمد صاحب نے اٹھارہ کا نوٹ دکھا دیا۔ سوال یہ ہے کہ قوت تعمیر کیوں نہیں ہے۔ اور حافظ میں قوت تعمیر نہیں ہے اور مثال کے طور پر کلیم الدین احمد صاحب میں ہے تو پھر یہ کیا کوئی ایسی چیز بھی ہے جس کی تمنا کی جائے یا جس کے نہ ہونے پر افسوس ہو اور پھر کلیم صاحب کا یہ جواب بھی پورا جواب نہیں ہے۔ پورا جواب اس وقت ہوگا جب آپ یہ بھی بتائیں کہ اس میں عشق و عاشقی کو مرکزی حیثیت کیوں حاصل ہے۔ اور علامتوں کا ایک مقررہ نظام کیوں ہے اور اس بات کو کیوں مستحسن خیال کیا جاتا ہے کہ بات ردیف قافیے کے اندر رہ کر کی جائے۔ غالباً ان سب کا مجموعی جواب قوت ایجاد کی کمی ہے۔ اچھا میر میں، غالب میں، مومن میں قوت ایجاد کی کمی تھی۔ تو قوت ایجاد کی زیادتی کس میں ہے نظم نگاروں میں؟ صاحب اپنی یہ قوت ایجاد اپنے پاس رکھیں، اور مجھے میر تقی میر بننے کا کوئی نسخہ بتائیں۔ اصول پرستی بڑی اچھی چیز ہے اور ہمیں بہرحال اسے سراہنا چاہیے لیکن ایک درزی نے یہ اصول بنایا کہ اس کا بنا ہوا کوٹ جس آدمی کے نہیں آئے گا وہ آدمی نہیں کہلائے گا۔ بھئی آدمی بننے کے لئے صرف کوٹ پہننا ضروری نہیں۔ قوت تعمیر، قوت ایجاد، تسلسل کلام، تنظیم فکر، الفاظ تو بہت بڑے بڑے ہیں مگر ان میں کوئی گھپلا ہو جاتا ہے جب ان کی مدد سے غزل کی نفی کی جاتی ہے۔ ہمیں غور کرنا پڑے گا کہ یہ گھپلا کیا ہے؟

اب تک میں نے دو سوال اٹھائے ہیں تیسرا سوال ہے کہ اصناف سخن کا اپنی تہذیب سے کوئی تعلق ہوتا ہے؟

اور فنی اور جمالیاتی اصول کہاں سے برآمد ہوتے ہیں۔ معاف کیجئے گا
سوال ذرا کچھ قبل از وقت ہے اور کچھ ٹھوس قسم کا ہو گیا ہے لیکن شاید
ایک مرکزی اہمیت کا سوال ہے اور دوسرے سب سوال اسی
سے نکلنے کی شاخیں ہیں۔ ہمیں اس سوال کا جواب مل جائے تو
شاید ہم یہ بھی پتہ چلا سکیں کہ جن باتوں کو ہم مستحسن کہتے ہیں وہ مستحسن
کیوں ہیں؟ اور جن باتوں کو دوسرے مستحسن کہتے ہیں وہ غزل کے
سلسلہ میں ہمارے کام کیوں نہیں آتیں۔

لیکن اس سوال پر غور کرنے سے پہلے اپنے اونٹ کا ایک
دو کوہان اور دیکھتے چلیے۔

جوش صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ غزل میں خیالات
اور جذبات کے بجائے الفاظ شاعر کی رہنمائی کرتے ہیں جو ایک
غیر منطقی طریقہ ہے۔ اختر حسین رائے پوری صاحب کا کہنا ہے کہ
غزل کی ہیئت شہنشاہی دور کی یادگار ہے جس میں مطلع بادشاہ
کا قائم مقام ہے اور دوسرے اشعار درباریوں کی نمائندگی
کرتے ہیں جبکہ شاعر کا مقام سب سے آخری صف میں ہے کیونکہ
مقطع غزل کے آخر میں آتا ہے۔ آل احمد سرور صاحب کہتے
ہیں کہ غزل میں انفرادیت کے پھولنے پھلنے کی گنجائش نہیں اور یہ
پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے کے دور میں ہمارے کام نہیں آ سکتیں اور
ایک اعتراض تو میں بھول ہی گیا۔ کہا جاتا ہے کہ غزل میں سماجی
شعور نہیں پایا جاتا۔ آپ ان اعتراضات پر غور کریں تو معلوم ہوگا
ان میں سے بعض ہیئت سے متعلق ہیں، بعض مواد سے اور
بعض تخلیقی طریقۂ کار سے۔ گویا اعتراض کرنے والوں نے اعتراض
کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا ہے۔ ہمیں غزل پر غور کرتے ہوئے ان
سب گوشوں پر نظر رکھنی پڑے گی۔

اچھا تو اب سب سے پہلے تیسرے سوال پر غور کیجئے ــ
اصناف سخن کا تہذیب سے کیا تعلق ہوتا ہے اور فنی اور جمالیاتی
اصول کہاں سے برآمد ہوتے ہیں؟ یہ سوال ذہن میں قائم کرتے
ہی آپ کو بعض مبہم قسم کی آوازیں اپنے کانوں میں گونجتی سنائی
دیں گی مثلاً ہر قوم کا ایک [illegible] یا ہر تہذیب کے جدا
[illegible] شجاعت

جدا تنقیدی معیار ہوتے ہیں۔ یا مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق
ہے۔ یا غزل مشرقی صنف سخن ہے اور اسے مغربی اصول تنقید
سے نہیں جانچا جا سکتا۔ یہ سب باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں،
مگر ان میں وضاحت کی بہت کمی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان پر
مناسب غور نہیں کیا گیا۔ غزل کے مخالفوں کا جوش و خروش
دیکھ کر ایک بات سوجھی تو ہے مگر پوری روشنی نہیں ملی۔ ہر قوم
کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اچھا تو ہماری قوم کا مزاج کیا ہے اور
غزل سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ہر تہذیب کے جدا جدا تنقیدی
معیار ہوتے ہیں۔ ہمارا تنقیدی معیار کیا ہے اور غزل اس پر کس
طرح پوری اترتی ہے۔ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق مگر مغرب
کے مغرب ہونے کے کیا معنی ہیں اور مشرق کی مشرقیت کیا ہے
وغیرہ وغیرہ...... پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ کہ آپ جب زندگی
کے ہر شعبہ میں مغرب کی طرف بڑھ رہے ہیں تو صرف غزل کے سلسلے
میں مشرق پر کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں یہ سوال ہے
کہ تنقید کے کچھ آفاقی اصول ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو غزل ان پر
کیسے پوری اترتی ہے ــ ہاں تو ذکر تھا تہذیب اور اصناف
سخن کے تعلق کا۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ فنی اور جمالیاتی اصول کہاں
سے برآمد ہوتے ہیں۔ مثلاً کلیم الدین احمد صاحب نے جن تنقیدی
اصولوں کو اپنا رہنما بنایا ہے ان کی اصل کیا ہے۔ یہاں کلیم الدین
احمد صاحب کا ذکر صرف بطور ایک مثال کے کیا گیا ہے تاکہ ایک
نقطۂ نظر کی پوری وضاحت ہو جائے۔

کلیم الدین احمد صاحب اردو میں کلاسیکی مغربی تنقید
کے سب سے ہوشمند نمائندے ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی تنقید
کے اصولوں پر پورا غور و فکر کیا ہے اور انھیں وضاحت اور
قطعیت کے ساتھ اپنی تنقیدوں میں استعمال کیا ہے۔ وہ ان
نقادوں میں سے نہیں ہیں جو کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا
لے کر بھان متی کی طرح کنبہ جوڑتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی
خوبی ان کا واضح اور مربوط نقطۂ نظر ہے۔ ہم یہاں یہ سوال
نہیں اٹھائیں گے کہ خود مغرب کی رومانوی تنقید ان اصولوں کو

[illegible] یا مغرب کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر ان [illegible] تک پورے اترتے ہیں۔ ہم یہاں صرف یہ غور کریں گے کہ مغربی کلاسیکی تنقید کے یہ اصول کہاں سے برآمد ہوئے ہیں؟

فنی اور تنقیدی اصول جمالیات کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ لیکن جمالیات بھی کوئی قائم بالذات چیز نہیں ہے۔ اس کی اساس اس تصورِ حقیقت پر ہوتی ہے جو کسی تہذیب میں پایا جاتا ہے یعنی جمالیات چند غیر جمالیاتی تصورات کی تابع ہوتی ہے۔ کلاسیکی مغربی جمالیات کا اصل اصول "وحدت فی الکثرت" کا تصور ہے۔ اس تصور کو جب فن کی دنیا میں لایا جاتا ہے تو توازن، تناسب اور ہم آہنگی کا نظریہ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن تناسب، توازن اور ہم آہنگی کے تصورات اجزار کے تصور سے قائم ہوتے ہیں۔ اس لئے اس تصور میں وحدت اور کثرت یا کل اور اجزار کا امتزاج ہو جاتا ہے۔ ارسطو نے کُل کی تعریف یہ کی ہے کہ یہ تین اجزار پر مشتمل ہوتا ہے۔ ابتدا، انتہا اور درمیان اور تینوں اجزار آپس میں اتنے مربوط ہوتے ہیں کہ ان میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی کیونکہ کمی بیشی کے معنی یہ ہوں گے کہ اجزار کا کل سے تعلق ناگزیر نہیں تھا۔ اس طرح ایک فن پارے کی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ ایک وحدت یا کل ہو۔ اس کے اجزا باہم مربوط ہوں۔ ان میں تناسب، توازن اور ہم آہنگی پائی جائے ان کی ایک ابتدا ایک انتہا اور ایک درمیان ہو۔ اور یہ سب اجزار اتنے ناگزیر ہوں کہ ان میں کوئی کمی بیشی نہ کی جا سکے۔ کلاسیکی مغربی جمالیات کا یہ فارمولا اتنا مکمل اور جامع ہے کہ فن کی کوئی شاخ اس سے مستثنیٰ نہیں۔ موسیقی، مصوری، شاعری فنِ تعمیر، اقلیدس کی اشکال۔ ریاضی کی مساواتیں سب پر وحدت فی الکثرت کے اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ اب کلیم الدین احمد کے چند فقرے دیکھئے جن سے معلوم ہوگا کہ ان کے تمام تنقیدی اصول اور معیارات اسی فارمولے سے پیدا ہوئے ہیں۔

"نظم ہی وہ چیز ہے جس میں بلند ترین قسم کی وحدت پائی جاتی ہے" ۔۔۔ "رقص میں ایک حسین توازن اور کامل اتحاد کا اثر ہے۔" ۔۔۔ "یہ تین اجزار تین نہیں رہتے یہ ایک دوسرے اور اور تجربوں سے گھل مل کر ایک ہو جاتے ہیں" ۔۔۔ "نظم بہت سے اثرات، جذبات، تصورات، نقوش اور الفاظ سے مرکب ہوتی ہے اور یہ کثرت باقی نہیں رہتی وحدت سے بدل جاتی ہے۔" ۔۔۔ "نظم کے مختلف اجزار میں ربط و تسلسل ہوتا ہے خیالات و جذبات کی ابتدا، ترقی اور انتہا ہوتی ہے اور یہ تینوں حصے بہت صاف صاف دکھائی دیتے ہیں۔" یہ اور اس قسم کے بے شمار فقرے کلیم الدین احمد کی تحریروں میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ ان سے ان کے اصولوں اور معیاروں کی وضاحت ہوتی ہے اور ان کی تنقید میں قطعیت پیدا ہوتی ہے۔ پھر جب انھیں اصولوں کی روشنی میں وہ غزل کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو منفی خیالات پیدا ہوتے ہیں ۔۔۔ "غزل کی بے ربطی مسلم ہے"، ۔۔۔ "غزل میں قصیدہ اور قطعہ کی بہ نسبت تسلسل کی کمی ہے" ۔۔۔ "کثرت جذبات میں وحدت تخیل کا وجود نہیں" ۔۔۔ "غزل میں ربط، اتفاق اور تکمیل کی کمی ہے یہی ربط، اتفاق اور تکمیل تہذیب کا سنگ بنیاد ہیں۔" چنانچہ ان سب باتوں سے کلیم الدین احمد نتیجہ نکالتے ہیں کہ

"غزل نیم وحشی صنف سخن ہے"

ظاہر ہے کہ یہ خیالات ہوائی نہیں ہیں۔ ان کے پیچھے ایک پورا تنقیدی نظام، ایک پورا جمالیاتی نظریہ، ایک پورا فلسفۂ حیات ہے۔ اور لکھنے والے نے ان خیالات کو نیم دلی سے قبول نہیں کیا۔ اپنی پوری توجہ اور بصیرت سے انھیں اختیار کیا ہے۔ اس لئے "اردو شاعری پر ایک نظر" کے دیباچہ نگار کا یہ کہنا برحق ہے کہ "اس مقالہ میں" جن اصولوں کی میزان پر اردو شاعری کو تولا گیا ہے وہ بھی خود ساختہ نہیں ہیں۔ یہ معیار تمام متمدن دنیا میں تسلیم کرلئے گئے ہیں۔ ان کا تعلق ان جذبات و تخیلات سے ہے جو ہمیشہ ہزاروں نیرنگیوں میں یکرنگی کا جلوہ دکھلاتے ہیں۔ اس لئے یہ کتاب دراصل ان حضرات کے لئے لکھی گئی ہے جو اسے متانت اور سکون قلب کے ساتھ پڑھ کر اگر انھیں کسی خیال سے اختلاف

تو اس کا سنجیدگی کے ساتھ جواب دیں اور اگر اتفاق ہے تو اس کی راہبری سے مستفید ہوں۔۔

لیکن پھر غزل .... ؟

غزل میں تو واقعی یہ سب خامیاں موجود ہیں!!

جو لوگ کہتے ہیں کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، اور غزل مشرقی صنفِ سخن ہے اس لئے اسے مغربی اصولِ تنقید پر نہیں جانچا جا سکتا۔ کیا وہ سکونِ قلب اور متانت سے ان خامیوں کو خوبیاں ثابت کر سکتے ہیں یا ان کی کوئی ایسی تاویل کر سکتے ہیں جسے "متمدن دنیا" تسلیم کر لے ؟۔ یہاں پہونچ کر مجھے اپنے ذاتی خیالات پر شرم آنے لگتی ہے۔ تہذیبی تصورات کا جواب انفرادی پسند اور ناپسند سے نہیں دیا جا سکتا۔ پھر ایک مشکل یہ بھی ہے کہ غزل مجھے عزیز ہے۔ لیکن وہ اصول جو مغربی کلاسیکی تنقید کی دین ہیں وہ بھی مجھے کم عزیز نہیں۔ پھر فیصلہ ہو تو کیسے ہو۔ اس کے علاوہ ایک معنی میں میں ان اصولوں کو آفاقی بھی تسلیم کرتا ہوں۔ یہ اصول نہ ہوں تو قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور دیگر اصنافِ نظم کی تنقید ممکن نہ رہے۔ غزل کی حمایت کی پچ میں کوئی ان اصولوں سے کیسے دستبردار ہو سکتا ہے۔

تو صاحب ثابت ہوا کہ اونٹ کا کوہان غلط۔ اور "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی"۔ کی پھبتی صحیح!!

لیکن ۔ اور میں اس لیکن پر زور دینا چاہتا ہوں۔

غزل کا مسئلہ میری یا کسی کی انفرادی پسندیدگی کا مسئلہ نہیں ہے۔ غزل عجمی اسلامی تہذیب کی ایک بہت بڑی دین ہے۔ فارسی اور اردو کے عظیم ترین شعراء نے اسے اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے اور اس حد تک اسے عروج دیا ہے کہ فارسی اور اردو شاعری کے ذکر سے غزل ہی ہمارے ذہن میں آتی ہے۔ تو کیا اس کے معنی یہ ہوئے کہ عجمی اسلامی تہذیب ہی میں کوئی خرابی کی صورت مضمر ہے ؟ دیکھئے بات کہاں سے کہاں پہونچی۔ اب سوال کی صورت یہ بنی کہ کیا عجمی اسلامی تہذیب کی جمالیات کا اصل اصول "وحدت فی الکثرت" نہیں ہے یا وحدت فی الکثرت کے علاوہ کوئی اور اصول بھی کام کر رہا ہے ؟

میں نے کہا ہے کہ جمالیات کوئی قائم بالذات چیز نہیں ہے۔ اس کی اساس ایک غیر جمالیاتی تصورِ حقیقت پر ہوتی ہے۔ یہ تصور ہے کہ کائنات کی کثرت میں ایک وحدت کام کر رہی ہے۔ صرف کلاسیکی مغربی تہذیب کا تصور نہیں ہے دنیا کی اور بڑی بڑی تہذیبوں میں بھی یہ تصور اپنی پوری شرح و بسط کے ساتھ ملتا ہے مثلاً ہندو، چینی اور اسلامی تہذیبیں بھی اسی حقیقتِ واحدہ پر زور دیتی ہیں جو شدتِ ظہور سے مخفی ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ایک حقیقت پر نظر ڈالنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں مثلاً ایک طریقہ یہ ہے کہ عالمِ کثرت سے وحدت کی طرف سفر کیا جائے۔ یہ اندازِ نظر صعودی ہے۔ دوسرا نزولی اندازِ نظر یہ ہے کہ وحدت سے کثرت کی طرف آیا جائے۔ عجمی اسلامی تہذیب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے اپنی جمالیات میں نزولی اندازِ نظر کی جگہ بھی نکالی ہے۔ غزل کی پیدائش اسی تہذیب کی اسی قابلِ فخر انفرادیت کا نتیجہ ہے۔ غزل میں وحدت فی الکثرت کے بجائے کثرت فی الوحدت کا تصور کام کرتا ہے — حقیقت صرف یوں ہی نہیں ہے کہ عالمِ کثرت کے پیچھے حقیقتِ واحدہ جلوہ گر ہے۔ بلکہ یوں بھی ہے کہ حقیقتِ واحد عالمِ کثرت میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ پس ایک نظر کثرت میں وحدت کا مشاہدہ کرتی ہے اور دوسری نظر وحدت میں کثرت کا۔ غزل اس دوسری نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور ان معنوں میں ایک عظیم تہذیبی کارنامہ ہے کہ حقیقت پر نظر ڈالنے کا یہ طریقہ دوسری تہذیبوں کے فنی اور جمالیاتی اصولوں میں کارفرما نہیں ہوا ہے۔

اب عجمی اسلامی جمالیات کے اس مرکزی اصول کو سمجھ لینے کے بعد ایک نظر غزل کے اصولوں پر ڈالئے۔ غزل میں وحدت کی نمائندگی تو غزل کا وزن، ردیف کی یکسانیت اور قافیوں کی ہم آہنگی سے ہوتی ہے لیکن چونکہ غزل کا اثر زور وحدت کی بجائے کثرت پر ہے اس لئے غزل کا اصول یہ ہے کہ اس کے ہر شعر میں ایک مختلف مضمون ہو اور مضمون واحد کے تسلسل

کے بجائے کثرت مضامین سے کام لیا جائے۔ اسی اصول کی وجہ سے تکرار قافیہ غزل میں عیب ہے۔ کہ اس سے کثرت کا نقشہ مجروح ہوتا ہے۔ پھر ایک قافیہ اگر مطلع میں آئے تو معیوب ہے کہ یہ بھی اصول کثرت کے خلاف ہے کسی کا شعر ہے

کس قدر بوقلموں جلوہ ہے اپنا محبوب
اک تجلی بھی نہیں ہوتی ہے تکرار کے ساتھ

غزل میں حقیقت واحدہ کی بوقلمونی دکھائی جاتی ہے اور اس طرح کہ تجلی میں تکرار نہ ہو، فراق صاحب جب کہتے ہیں کہ پوری کائنات خود ایک غزل ہے تو اس کا مفہوم یہی نکلتا ہے کہ جس طرح کائنات میں حقیقت واحدہ مظاہر کثیر میں جلوہ گر ہوئی ہے اسی طرح غزل بھی بوقلموں محبوب کا جلوہ رنگا رنگ ہے۔ اپنی یکتائی کے باوجود عالم کثرت میں ہزار در ہزار تجلیات کے ساتھ ظاہر ہوا ہے آپ نے دیکھا مضامین کی بے ربطی تسلسل کی کمی، وحدت تخیل کی عدم موجودگی غرض ربط اتفاق اور ترتیب کا نہ ہونا غزل کا عیب نہیں غزل کی خوبی ہے اور یہ نیم وحشی دماغ کا کارنامہ نہیں بلکہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی تہذیب کی شان انفراد کا شاخسانہ ہے۔

اِں تو غزل کا اصول کثرت فی الوحدت ہے اور نظم کا اصول وحدت فی الکثرت ہے۔ نظم میں کائنات کی کثرت وحدت بن جاتی۔ غزل میں کائنات کی وحدت کثرت بن جاتی ہے۔ نظم کا اصول اتحا میں ہم آہنگی ہے۔ غزل کا اصول ہم آہنگی میں اختلاف ہے۔ نظم ایک کثرت ہے کہ حقیقت واحد کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ غزل ایک حقیقت واحد ہے کہ کثرت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ او نظم اور غزل دونوں اعلیٰ ترین تہذیبوں کے ذرائع اظہار ہیں۔

چلئے ہمارے اونٹ کے کوہان کا ایک جواز تو نکلا اب ہم اس باقی کلوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کریں گے۔

(اردو غزل کے مطالعہ کا ایک حصہ)

دیومالا اور علامت ——— صفحہ ۳۹ کا بقیہ

کھو دیتی ہے اُسی طرح بغیر پس منظر کے علامت کی ابلاغی صلاحیت مجروح ہو جاتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوتا بلکہ دیومالا میں جذباتی پہلو جو تنوع پیدا کرتا ہے علامت اس سے بھی محروم ہو جاتی ہے اور جمود اور کھردرے پن کا شکار ہو جاتی ہے۔ مثلاً آبِ حیات، خضر اور سکندر کے بارے میں جو اساطیر مشہور ہیں اُن سے واقفیت کے بغیر بہت سے اشعار کے معنوی حُسن کی داد نہیں دی جا سکتی۔

علامت جب بھی دیومالا کو پس منظر بنائے گی یا اُسے عرصۂ حیات (LIFE SITUATION) کے طور پر استعمال کرے گی تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ایک وسیع تمدنی و تہذیبی ورثہ کی نمائندگی وہ انتہائی اجمال کے ساتھ کر دے۔ اور قاری اپنی انسیت کی بنا پر نہ صرف اُن معنیٰ تک پہنچ جائے جو علامت ساز کا منشا ہے بلکہ اپنے جذباتی و تاثراتی تجربات کی بنا پر کچھ اور نئے معنیٰ کو بھی جنم دے سکے

محمود ہاشمی

ہربرٹ ریڈ اور ہم

جز اکلّاہ ! جسمانی عمر کے تقاضوں کے باعث ادب اور فن کی راہ میں اپنی پسپائی، خستہ پائی، گم گشتگی اور درماندگی کو پناہ بنا لینے والے معمر اور نیم معمر بزرگوں کے تنبیہی احکامات و آگاہی کا لبادہ اوڑھ کر برآمد ہونے والی جھلاہٹیں بھی اس لئے قابلِ قدر ہیں کہ انسانی عزائم اور ذہن و افکار کے عروج و زوال کی تاریخ کو سمجھنے میں ان سے مدد ملتی ہے، اور انسانی نفسیات کی ایک مخصوص اور بار بار تجربے میں آنے والی صورتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن معمر اور نیم معمر بزرگوں کی اس خستہ پائی، گم گشتگی اور برگشتگی میں اُن کے نوعمر یا درمیانی عمر کے ہم صفیر ہمیں انسانی ذہن اور افکار کی بجائے حیاتیاتی سائنس کے اس نظریے سے روشناس کرانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں کہ بعض انسانوں میں حواس اور دماغ سے زیادہ حیوانی جبلتیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایسے لوگ REPTILES کی طرح اگلوں کے تعاقب اور تقلید کو ہی اپنے تحرک کا جواز بنا لیتے ہیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ REPTILES کی ایک خاص قسم ایسی ہے، جو متوازی خطوط میں نہیں، بلکہ ایک دائرے میں حرکت کرتی ہے، اس لئے ان میں سے کسی انفرادی REPTILE کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یکسں کا پیش رو ہے۔ اس طرح تقلید و پیروی کے فطری تقاضے کسی امتیاز کے بغیر پورے ہوتے رہتے ہیں۔

مذکورہ خصوصیات رکھنے والے بزرگوں اور ان کے ہم حرکتوں کے علاوہ ایک قسم ایسے بزرگوں کی بھی ہے، جو نہ جسمانی عمر کے عالی الشبابت نظام سے متاثر ہوتے ہیں اور نہ مادی مفادات کے بتدریج حصول کے لئے یا اپنی شہرت کے تحفظ کی خاطر اپنی بزرگی کو کاسۂ طلب بناتے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں، جن کی عمر گزرے ہوئے ایام اور اُن کی عظمتوں کے ساتھ شمار میں نہیں، بلکہ ذہنی زندگی کے سفر میں، وقت کے عمومی عقائد پر فتح پانے میں بسر ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں قسم اول کے بزرگوں کی سی خصوصیات دستیاب نہ ہونے کے سبب ہم انھیں صرف بزرگ نہیں بلکہ اپنے عہد کا جینئس کہتے ہیں۔

پاکستان و ہندوستان جیسے کثیر الخلقت ملک ہیں، قسم اول کے بزرگوں اور ان کے ہمراہ اُن کے ہم سفر REPTILES کی کثرت ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ آج بھی اردو کے ادبی ماحول میں ہمیں ایسے ہی کئی بزرگوں اور اُن کے ہم صفیروں سے آئے دن سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف خالص ماہ و سال کی بجائے ذہن کے وسیلے سے پہچانے جانے والے بزرگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور شاید اس مسئلے کا تعلق براہ راست جدید ادب اور جدید ادب کے مباحث سے ہے۔

ہمارے سرور صاحب (آل احمد سرور) کی شکل و صورت سے مشابہت رکھنے والے ایک بزرگ کی تصویر میرے سامنے ہے یہ ہربرٹ ریڈ (HERBERT READ) ہیں جن کا ابھی ۱۹۶۸ء میں (پچھتر برس کی عمر میں) انتقال ہوا ہے۔ میں اس بزرگ کا پیروکار تو نہیں، لیکن اس کے جینئس سے استفادہ کرنے والا ایک ایسا اجنبی ہوں، جو اس بزرگ سے صرف اس کی تحریروں

کے ذریعے ہی متعارف ہے۔ مختلف اوقات میں جاری رہنے
والے مطالعے کی روشنی میں کہنا چاہتا ہوں تو شاید میری زندگی کا ایک
سال ہربرٹ ریڈ کی رفاقت میں بسر ہوا ہے۔ اس ایک برس کی
رفاقت کے نتیجے میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ پچھتر سالہ شخص ہمارے
یہاں کے بزرگوں کی طرح کا بزرگ نہیں ہے — یہ وہ شخص ہے
جو نصف صدی تک جدید ترین ذہنی محرکات کے ساتھ، اوڈیسیوس
(ODYSSEUS) کے نوجوان اور ذہین بیٹے تیلماخوس (TELEMACHUS) کی طرح تخلیق و اظہار کے پیچیدہ اور پُرخطر جنگلوں میں
فنونِ لطیفہ اور ادب کے نئے مفاہیم کی جستجو میں سرگرداں رہا ہے
یہ وہ شخصیت ہے، جس نے بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے نئے
انسان کا، اس کے معاشرے اور اس کے فنی عوامل کا، اور فنونِ لطیفہ
کی بدلتی ہوئی قدروں اور نئی سے نئی تحریکات کا سراغ لگایا ہے۔
ان تحریکات کی روح اور ان کی عظمت کو اپنے جینیئس کے وسیلے سے
دوسروں سے روشناس کرانے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن ادب و
فن کے نئے تصورات پر بحث کرتے ہوئے ہمارے یہاں کے جسمانی
بزرگوں کی طرح کبھی اپنے تعصبات یا اپنی کدورتوں کی نکاسی کے
لئے مواقع تلاش نہیں کئے۔ یہی وہ ہربرٹ ریڈ ہے، جو ٹی۔ ایس
ایلیٹ اور رابلین بیٹ کے معاصر اور دوست کی حیثیت سے،
دنیا کی دو بڑی جنگوں کے درمیان، انسانی تہذیب کے مٹتے ہوئے
رشتوں اور فنونِ لطیفہ کی متواتر تبدیلیوں کا گواہ رہا ہے، اور جس نے
اپنے ذہن اور اپنی شخصیت کو ماہ و سال کی زنجیروں کا محکوم نہیں
بنایا، جس نے مرتے دم تک ہر نئی ادبی تحریک اور ہر نئے فنی رجحان
کو سمجھنے، سمجھانے اور اس کی خصوصیات سے مستفید ہونے کی کوشش کی ہے۔

اس معمر شخصیت سے میرا ایسا رشتہ ہے، جس کی بنیاد 'عقیدہ'
نہیں 'علم' ہے۔ چنانچہ ہربرٹ ریڈ کی وفات کی خبر پڑھ کر مجھے
ایسا محسوس ہوا، جیسے اپنے اور اپنے عہد کے مزاج دانوں اور
شناساؤں میں سے کوئی انتہائی محبوب شخصیت ہم سے جدا ہو گئی
ہے۔ اس غائبانہ رفاقت کے احساس کے ساتھ جب میں نے
ہربرٹ ریڈ کی عمر کا حساب لگایا تو اپنی زبان اور اپنے یہاں کے
مشاہیر

کچھ ایسے بزرگ اور نیم بزرگ اشخاص کا اور ان کے ڈالے ہوئے
دانے پر گردش کرنے والے اُن REPTILES کا بھی خیال آیا،
جن کا ذکر ابتدا میں کر چکا ہوں۔ مجھے ان اشخاص سے ہربرٹ ریڈ
کا موازنہ مقصود نہیں بلکہ ہربرٹ ریڈ کی خصوصیات کے ان
پہلوؤں کا ذکر مقصود ہے۔ جو علمی اور ادبی کارناموں کے علاوہ
اب اس کی موت کے بعد، اس خاص پس منظر میں نمایاں یا
منکشف ہوئے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں ایک دوست کے اکسانے پر میں نے ہربرٹ ریڈ
کا مطالعہ شروع کیا تھا، اور اسی زمانے میں ہربرٹ ریڈ کی
تصانیف میں سے مندرجہ ذیل کتابوں کے مطالعے کے بعد ہربرٹ ریڈ
پر ایک مختصر سا تبصرہ بھی لکھا تھا۔

1. ENGLISH PROSE STYLE.
2. THE SENSE OF GLORY.
3. FORM IN MODERN POETRY.
4. THE INNOCENT EYE.
5. THE MEANING OF ART.

اس کے بعد سے وقتاً فوقتاً ہربرٹ ریڈ کی دیگر کتابوں اور مضامین
کے مطالعے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

پچھتر برس کی زندگی میں ساٹھ سے زائد کتابوں کی تصنیف و
تالیف کا قابلِ رشک کارنامہ انجام دینے والے اس شاعر، ناول
نگار اور ناقد کی زندگی، شخصیت اور فن کے متعلق میں کسی قسم کی
رائے کے اظہار کا مجاز نہیں ہوں۔ لے دے کر صرف چند تاثرات
ہیں، جنہیں اپنی زبان، ادب اور موجودہ ادبی ماحول کے پس منظر
میں اس لئے قابلِ قدر اور قابلِ اظہار سمجھتا ہوں کہ ان کا تعلق ہربرٹ
تخلیقی ذہن کے اس بے لوث انسانی خلوص سے ہے، جس کا نعم البدل
دنیا کی اور کسی قیمتی شے یا نظریئے کی صورت میں میسر نہیں آسکتا۔

ہربرٹ ریڈ کی پیدائش ۱۸۹۳ء میں یارک شائر
کے ایک ویران اور بنجر دیہات میں ہوئی تھی۔ سولہ برس کی عمر میں
ہربرٹ نے لیڈس (LEEDS) کے صنعتی شہر میں ایک بینک میں

ملازمت شروع کی، پھر یہیں سے فوج میں بھرتی ہوگیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں ہربرٹ ریڈ نے ایک کیپٹن کی حیثیت سے کشت و خون اور ہیبتناک تباہیوں کے جو واقعات دیکھے ان کا ردِ عمل ہربرٹ ریڈ کی اتفاقی نظموں میں موجود ہے، جو اسی زمانے میں IN RETREAT (عالم پسپائی) کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی تھیں۔

ہربرٹ ریڈ کی سوانحی یادداشتوں پر مشتمل کتاب THE INNOCENT EYE اور ابتدائی دور کے ناول THE GREEN CHILD سے ہربرٹ ریڈ کے ذاتی، اور ہمارے عہد کے اس اجتماعی المیہ کا اندازہ ہوتا ہے، جو شہروں اور صنعتوں کے وجود میں آنے کے بعد انسان کی فطری معصومیت کے زوال کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یارک شائر کے دیہات سے لیڈس کے صنعتی علاقے میں آجانے کے بعد ہربرٹ ریڈ نے اس معاشرے اور اس زندگی کو دیکھا جو تمام حواس، تمام ترحسیت اور جمالیاتی احساس کو مٹا دینے کے درپے تھی۔ جس کے جلو میں آنے والی نسلوں کے لئے ایک ذہنی اضطراب و کش مکش اور تہلیت کے علاوہ مسرت اور معصومیت کا کوئی خوش آئند پیغام نہیں تھا۔ پھر وہ پہلی جنگِ عظیم ہے، جس کے بھیانک تجربات اور مشاہدوں نے ہربرٹ ریڈ کو انتہائی الم ناک جذباتی ردِ عمل میں مبتلا کر دینے کے بعد ایسی نظمیں لکھنے پر مجبور کیا، جس کی مثال ہمارے یہاں کی ترقی پسند شاعری میں بھی موجود نہیں ہے۔

بیسویں صدی میں جنگ، مشینی تشدد، اور اس تشدد کی دہشت، نیز حسن و عظمت کے درمیان شروع ہونے والی اس کشمکش نے ہربرٹ ریڈ کی ذہنی نشوونما اور مزاج کی تعمیر میں خاص حصہ لیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہربرٹ ریڈ نے ہماری کائنات میں بتدریج قابض ہوتی ہوئی زہریلی فضا سے انسانی افکار و خیالات اور فنونِ لطیفہ کے سرمائے کو بچانے کے لئے ——— انسان کے تخئیل اور اس کے ذہنی محرکات کو فن کی ابدی سلامتی سے روشناس کرانے کے لئے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ان ادبی اور فنی تحریکات کی تفسیر و تشریح میں بسر کیا، جن کا تعلق جدید ذہن سے ہے، اور جو ادب و مصوری میں سمبالزم، سرئیلزم، دادا ازم، ایمجزم، کیوب ازم وغیرہ کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ اپنے عہد کے اس عظیم انسانی فریضہ کی تکمیل کے لئے

ہربرٹ ریڈ نے کیرکے گارڈ، برگساں، کروچے، شلر، مارکس، فرائڈ اور یونگ کے نظریات سے بھی استفادہ کیا، اور عہد کے جدید فنکاروں کے کارناموں کو بھی اپنا معیار بنایا، نیز خود اپنی تخلیقات اور وابستگی سے بعض تحریکات کی نشوونما میں حصہ لیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۲۲ء میں ہربرٹ ریڈ نے عجائب خانے میں ریکارڈ کیپر کے طور پر ملازمت شروع کی، اور باقاعدہ طور پر علمی اور ادبی تصانیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ [illegible] تک ہربرٹ ریڈ کی تقریباً پندرہ کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ [illegible] تصانیف میں REASON AND ROMANTIC-ISM کے علاوہ وہ پانچ کتابیں بھی شامل ہیں، جن کا ذکر میں اپنے ابتدائی [illegible] کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔

۱۹۳۱ء میں ہربرٹ ریڈ کو ایڈن برگ یونیورسٹی میں فائن آرٹ کے پروفیسر کی آسامی پر مامور کر دیا گیا لیکن ہربرٹ ریڈ کو یہ پیشہ پسند نہ آیا، اور ۱۹۳۳ء میں ہی وہ پروفیسر شپ سے سبکدوش ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ان کے ہم نوا کتنے ناقدوں اور معلموں کی کاروباری ادب نوازی کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔ اسی سال ہربرٹ ریڈ کو برلنگٹن میگزین (BUR-LINGTON) کی ادارت کے فرائض سونپ دیئے گئے۔ اس میگزین کی ادارت کے زمانے کا ایک واقعہ ہے جس کا عکس ہمیں جدید اردو ادب سے تعلق رکھنے والے بعض حالیہ واقعات میں بھی نظر آسکتا ہے۔

ایک صاحب جو فوج میں ہربرٹ ریڈ کے ساتھی تھے انھیں پٹھانی انداز کی خود پسندی کے ساتھ شاعری کا شوق تھا۔ قدیم انگریزی شاعری کی پرستش کرتے تھے۔ اور ایک دلچسپ بات یہ کہ نیوٹن کو علم الشعر کا باوا آدم سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نیوٹن نے اپنی کتاب "اوپٹکس" (OPTICKS) میں شاعری اور قوسِ قزح کے درمیان جو رشتہ ظاہر کیا ہے، وہی شاعری کی ماہیت ہے۔ ہربرٹ ریڈ کے جدید تصورات سے موصوف کو سخت چڑ تھی۔ اور ان کا خیال تھا کہ یہ نوجوان شہرت کی خواہش میں بزرگوں کی روایت سے منحرف ہو رہا ہے۔ ہربرٹ ریڈ سے موصوف کی رقابت اتنی بڑھی کہ جنگ کے

موصوف نے اپنا بیشتر وقت اور سرمایہ ہربرٹ ریڈ کی مخالفت میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ ہربرٹ ریڈ نے ورڈس ورتھ کے متعلق ایک مضمون میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا کہ :-

" ورڈس ورتھ کو احساسِ ندامت کا نفسیاتی عارضہ تھا۔ انقلابِ فرانس کے زمانے میں ورڈس ورتھ، این ویلن نامی ایک خاتون سے عشق کرتا رہا۔ اس خاتون کے بطن سے ورڈس ورتھ کی ایک ناجائز لڑکی بھی پیدا ہوئی تھی۔ ورڈس ورتھ نے اس خاتون سے نہ شادی کی، اور نہ کبھی اپنی بیٹی سے ملاقات کے لئے اس کے پاس گیا۔ اس احساسِ جرم ضمیری نے ورڈس ورتھ کی شاعری کو خاصا نقصان پہنچایا ہے"

ہربرٹ ریڈ کے اس بیان پر موصوف اس قدر برہم ہوئے کہ ہربرٹ ریڈ کے خلاف پوسٹر بازی شروع کر دی۔ لیکن لوگوں نے موصوف کو اُن کی جہالت کا احساس دلاتے ہوئے، تمسخر کا نشانہ بنایا اور مجبوراً انھیں پوسٹر بازی کا سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ لیکن رقابت کی آگ سرد نہ ہو سکی۔

جنوری ۱۹۱۸ء میں ہربرٹ ریڈ نے جدید شاعری کے حق میں DEFINATION TOWARDS A MODERN THEORY OF POETRY کے عنوان سے ایک مضمون، " آرٹ اینڈ لیٹرس " (ART AND LETTERS) میں شائع کرایا تھا۔ ہربرٹ کے مخالف نے یہ مضمون پڑھا، اور نئے جوش و خروش کے ساتھ ایک نیا مورچہ قائم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ موصوف نے ہربرٹ ریڈ کے خلاف ایسے پمفلٹ نکالنے شروع کر دیئے، جن میں بیشتر مواد کچھ ایسے ہی دلائل پر مشتمل ہوتا تھا، جیساکہ ہمارے یہاں آج کل جدید ادب اور جدید شاعری کی مخالفت میں بعض " دلچسپ " مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ موصوف کئی برس تک، وقفے وقفے سے اس طرح کے پمفلٹ لکھتے اور شائع کراتے رہے۔ برلنگٹن میگزین کی ادارت کے زمانے میں شاعر موصوف نے ہربرٹ ریڈ کی مقبولیت سے بھڑک کر ایک نوجوان طالب علم کو تیار کیا کہ وہ اس کے نام سے بھی ہربرٹ ریڈ کے خلاف کتابچے لکھیں گے، اور یہ طالب علم اپنے دوستوں کے ہمراہ انھیں تقسیم کرے گا۔ چنانچہ مجازی نام سے ذاتی الشہامات

قسم کے غیر ادبی مواد پر مشتمل کتابچوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہربرٹ ریڈ نے اپنے ایک اداریہ میں ان کتابچوں کی اصلیت اور غرض و غایت بیان کرتے ہوئے تمسخر آمیز انداز میں لکھا کہ :

" مسٹر ایکس (شاعر موصوف) کو کتے پالنے کا شوق چرایا ہے غالباً مسٹر ایکس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ راہ چلتے لوگوں پر غرّانے والے کتوں کا علاج وہ معمولی سی گولی ہو سکتی ہے، جو سوّر کی چربی میں لپیٹ کر انھیں دی جا سکتی ہے۔ "

مسٹر ایکس، ہربرٹ ریڈ کے یہ جملے پڑھ کر جھنجھلا اُٹھے اور اشتعال کے عالم میں ایک ایسی حماقت آمیز تحریر کو کتابچے کی صورت میں شائع کرا ڈالا جس سے وہ خود، اُن کی شاعری اور ہربرٹ ریڈ کی مخالفت کا سرچشمہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو گیا۔ موصوف نے اپنے اس آخری کتابچے میں ہربرٹ ریڈ کو نیوٹن، ورڈس ورتھ اور دوسری بڑی شخصیتوں پر کیچڑ اُچھالنے والے گھٹیا آدمی سے تعبیر کیا۔ اور ہربرٹ ریڈ پر ہتک اور توہین کا الزام لگاتے ہوئے لکھا تھا کہ " وہ کتابچہ جو ایک طالب علم کے نام سے شائع ہوا ہے، اس کا مصنف میں ہوں لہٰذا کتا مجھے کہا گیا ہے۔ " شاعر موصوف کے اس کتابچے کی اشاعت کے بعد ہربرٹ ریڈ سے ان کی مخالفت تو لوگوں کے قہقہوں کے سیلاب میں بہہ گئی — البتہ اس طالب علم اور مسٹر ایکس کے مابین ایک مدت تک تحریری جنگ جاری رہی۔

۱۹۳۹ء میں ہربرٹ ریڈ نے برلنگٹن میگزین کو بھی چھوڑ دیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران، ایک بار پھر انسانی درندگی کی تباہی پر آنسو بہائے اور تہذیب انسانی سے دست و گریباں ہونے والی اس نئی طاقت کے فروغ کا اندازہ لگایا جو سیاست اور پروپیگنڈے کے ذریعہ تمام دنیا پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ ہربرٹ ریڈ کی تصانیف میں THE PHILOSOPHY OF ANARCHISM اور ایک طویل نظم A WORLD WITHIN A WAR کے علاوہ TO HELL WITH CULTURE اسی دور کی یادگار ہیں۔

ہربرٹ ریڈ کی باقی زندگی مصوری، فنونِ لطیفہ، ادبی تنقید

دبی رجحانات کی تحقیق و تشریح اور شاعری کے ان کارناموں کی تاریخ
ہے جو ہربرٹ ریڈ کو ایک عہد ساز شخصیت بناتے ہیں۔ ان
رناموں کے علاوہ نجی زندگی سے متعلق صرف ایک قابل ذکر حوالہ
درہے اور وہ یہ کہ ۱۹۵۳ء میں ہربرٹ ریڈ کو سر کا خطاب
یا گیا تھا۔

بیسویں صدی میں فنون لطیفہ کے مبصر و مورخین میں
ربرٹ ریڈ کے علاوہ ایسی شخصیتیں بہت کم ہیں، جنہوں نے فلسفہ،
سیات اور اپنے عہد کے جینئیس کے اشتراک سے جدید تخلیقی ذہن
ی تفسیر و تشریح میں حصہ لیا ہو۔ مصوری کے موضوع پر اور
صوصیت کے ساتھ مصوری کے جدید رجحانات کے متعلق) ہربرٹ ریڈ
ی کتابیں نہ صرف یہ کہ مستند سمجھی جاتی ہیں بلکہ تخلیقی ذہن کے ارتقا،
ی تاریخ کسی دوسرے شخص نے اتنی محنت اور اس قدر ذہنی وابستگی
کے ساتھ نہیں لکھی ہے۔ مصوری اور فنون لطیفہ کے مبصروں میں
ربرٹ ریڈ کے علاوہ صرف راجر فرائی (ROGER FRY) کا
م لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہربرٹ ریڈ نے اپنی مندرجہ ذیل تصانیف
کے ذریعہ فنونِ لطیفہ کی تفسیر و تنقید میں جو نئی راہیں نکالی ہیں وہ
رف اور تنہا ہربرٹ ریڈ کا حصہ ہیں۔

1. THE MEANING OF ART. (1931,
2. ART AND INDUSTRY. (1934
3. ART AND SOCEITY. (1937
4. THE PHILOSOPHY OF MODERN ART.
5. ICON AND IDEA (1955

مصوری اور بت تراشی سے متعلق ان تصانیف کے علاوہ
ربرٹ ریڈ نے ایک کام اور بھی کیا ہے جو "مہ جبینانِ افلاک" کو مژدہ
نانے والے سردار جعفری کے لئے ایک مژدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سردار جعفری نے گفتگو (شمارہ ــ ۲) کے اداریہ میں
مالیات کے ایسے نظریے کی تشکیل پر زور دیا تھا۔ جو جسمانی محنت
ر ذہنی محنت کو یا بہ الفاظ دیگر فنونِ لطیفہ (FINE ARTS)
اور فنونِ مفیدہ (USEFUL ARTS) کو منقسم نہ کرے یا اس تقسیم
کو ختم کر دے۔ ہربرٹ ریڈ نے جسمانی محنت اور ذہنی تخلیق کی تقسیم
کو ختم کرنے کے لئے تو کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا ــــ البتہ جس
طرح فنون لطیفہ کے بارے میں لکھا ہے، بالکل اسی طرح، فنونِ
مفیدہ کے بارے میں بھی کچھ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ظروف
سازی کے فن پر ہربرٹ ریڈ کی ایک مکمل کتاب موجود ہے۔

علاوہ ازیں، ہربرٹ ریڈ نے اپنی تصنیف (THE
GRASS ROOTS OF ART) میں جسمانی محنت
کے باعث تعمیر پانے والے فنی شاہکاروں اور دستکاریوں
کے متعلق فنی نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے آج کی دنیا میں فن
کے فطری عوامل کی موت پر رنج و غم کا بھی اظہار کیا ہے۔ ہربرٹ ریڈ
کے نزدیک ہمارا عہد دراصل پلاسٹک کا عہد ہے، پلاسٹک کے
نقلی نمونے، ربر کے پہیئے، متحرک مشینیں، ریڈیو اور دوسرے
اوزار، ہتھیار، انسان کے ذہن اور ہاتھوں کو نیست و نابود
کرتے جا رہے ہیں۔ اگر انسانی ہاتھ، تعمیری اور تخلیقی کاموں میں
مصروف نہ ہوں تو یہ قتل و غارت گری اور نفسانی خواہشوں
کی تکمیل میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں انسانی ہاتھوں کو کرومیم،
نائلون اور پلاسٹک کے اس جہنم زار سے آزاد کرانا ہوگا۔ انھیں
ان کا کھویا ہوا وقار اور ان کی عظمت دوبارہ ودیعت کرنی ہوگی
یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم انسانی ہاتھوں کو اس جدید
شہر کے عذاب سے نجات دلائیں جو جنگ کا کارخانہ بن چکا ہے
جہاں کے مکان محض رہائشی مشین ہیں۔ یہی شہر نسلِ انسانی کے قاتل ہیں
مصوری پر ہربرٹ ریڈ کی سب سے زیادہ مبسوط اور جامع تصنیف
"موجودہ دور کا آرٹ" (ART NOW) ہے، جو ۱۹۶۰ء میں
شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ہربرٹ ریڈ نے اٹھارویں صدی
سے بیسویں صدی کے وسط تک نظریۂ فن کی تبدیلیوں کا اور نئی
فنی تحریکات کا تاریخی، نفسیاتی اور فلسفیانہ جائزہ پیش کیا ہے
جو ذہنِ انسانی کی بلوغت اور ارتقا کی نشان دہی کرتا ہے۔ جدید
آرٹ کے ارتقائی جائزے کی ابتدا میں ہربرٹ ریڈ نے لکھا ہے:

" اس کتاب کے پہلے باب میں، میں فلسفۂ ادب کی ان تبدیلیوں کا سراغ لگانا چاہتا ہوں، جو جدید آرٹ کے لئے راہ ہموار کرنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں اسی کی روایت کا جائزہ لینے کے لئے تنقید میں تجربی طریقۂ کار کی ابتدا سے رجوع کرنا پڑے گا۔ اسی طرح ہمیں آرٹ میں رفتہ رفتہ ظہور میں آنے والے "تنوع کا" اور فنکاروں کی تخلیقی لگن کے اظہار سے مفکرین کی بڑھتی ہوئی مصرانہ دلچسپیوں کا اندازہ ہوگا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ قدیم اسالیب تخلیقی اظہار کے لئے کیوں ناکافی ثابت ہوئے۔ اور کس طرح یکسر فنا ہو گئے۔ نیز یہ کہ اب ایک نیا علم ظہور میں آچکا ہے جسے آرٹ کی سائنس کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا علم ہے جس کا تعلق اب صرف فلسفۂ جمال سے نہیں ہے۔ اس میں جو عناصر کار فرما ہیں ان کی تصدیق، تاریخ سے، علم الانسان سے، مذہب اور نفسیات سے، علم الاشکال اور لسانیات سے نیز ہر اس علمی وسیلے سے ہو سکتی ہے جس کا تعلق انسانی جذبات اور ان کے اظہار کی کیفیتوں سے ہے "

آرٹ کی اس نئی سائنس کی دریافت اور تشکیل میں ہربرٹ ریڈ نے رینالڈس، کروچے، ہردر، کانٹ، شلر اور ہیگل سے برگساں تک ان تمام اہم مکاتیب فکر کا جائزہ لیا ہے، جو مختلف فنی رجحانات کا سرچشمہ ہیں۔ ہربرٹ ریڈ کے خیال میں برگساں کے بعد جس مفکر نے فن جدید اور اس کے فلسفے کو منتہائے کمال تک پہنچایا ہے، وہ ارنسٹ کیسیرر (ERNST CASSIRER) ہے جس کا عہد (۱۸۷۴ — ۱۹۴۵) اس صدی کا عظیم تغیر آفریں عہد ہے۔ ہربرٹ ریڈ نے تمام تر شواہد کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ ہمارے عہد کا تخلیقی اسلوب اور مزاج علامتی ہے اور ارنسٹ کیسیرر نے اپنی تصنیف (PHILO-SOPHY OF SYMBOLIC FORMS) کے ذریعہ ادب اور فنونِ لطیفہ کو ایک انقلاب آفریں اور نئے نظریۂ خیال سے روشناس کرتے ہوئے، ہمیں آج کے تخلیقی فن کی ایک نئی اور خود مختار آزاد دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ اس عہد کے علامتی مزاج کی تشریح کرتے ہوئے ہربرٹ ریڈ نے کہا ہے:-

" فن اور تخلیق کے متعلق، پہلی بار اس نظریئے کی تشکیل ہوئی ہے کہ فن پہلے سے وجود رکھنے والے حقائق کے تیار مال کی نقالی نہیں، بلکہ حقیقت کی دریافت ہے۔ دریافت کا یہ عمل علامتی ہیئت کے ذریعہ ہی معرضِ اظہار میں منتقل ہوتا ہے۔"

بیسویں صدی کے علامتی اسلوب کی خصوصیات کے علاوہ اس کتاب میں ایکسپریشن ازم، کیوب ازم، ایبسٹریکٹ آرٹ اور سرریلزم کے سرچشموں کی دریافت کے علاوہ ان رجحانات کو جس ہمدردانہ وابستگی سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اپنے یہاں عصری ادب کے رجحانات سے بغض رکھنے والے یا اپنی نامرادی اور ناتوانی کے باعث سمبالزم یا سرریلزم جیسے الفاظ کو کسی خوفناک سمندری جانور کی صفت سمجھنے والے، ان آزورانِ علم و فن کا خیال آتا ہے جو کسی منصف نظام والے ملک میں ہوتے تو شاید بار برداری کے کام پر مامور کر دیئے جاتے۔

ہربرٹ ریڈ نے سمبالزم پر مختلف زاویوں سے بحث کی ہے بیسویں صدی میں جدید نفسیات، فلسفے، منطق، ریاضی اور ادب میں مفہوم کی اس نئی منطق کے روز افزوں اثرات کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح سرریلزم کے بارے میں، علمی اور نفسیاتی مباحث سے سرریلزم نے اس انقلابی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے جس نے قدیم اخلاقیات، روایتی اور مجہول عقلیت پسندی، اور انسانی بصیرت کے سابقہ محدود تصور پر کاری ضرب لگائی ہے اور ہمیں نئی دنیاؤں کی غیر منصوبہ بند دریافت کے لئے حوصلہ بخشا ہے۔

ART NOW میں سرریلزم سے متعلق اس فنی بحث کے علاوہ ہربرٹ ریڈ نے اسی موضوع پر ایک کتاب (SURREA-LISM -1936) مرتب بھی کی ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ سرریلزم کے فلسفے پر ایک مستقل مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دیباچے میں ہربرٹ ریڈ نے سیاسیات اور مارکسزم کے ذریعہ بھی، سرریت کے رجحان کی وضاحت کی ہے۔ مکتبی ناقدوں کے ان اعتراضات کا

جواب بھی دیا ہے ، جو بظاہر تو سرریلزم پر اعتراض کی حیثیت رکھتے ہیں ، لیکن اُن کی تہہ میں انسانی احساس تخیّل اور نفسیات سے لاعلمی ، جدید علوم سے بے تعلقی اور بیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی شعور سے محرومی کی شہادت موجود ہے ۔

شیخ سعدی کے طرز پر معلم اخلاق اور حالی کی طرح مصلحینِ قوم کی فہرست میں شمار ہونے کے خواہش مند ، اردو کے نیم پختہ سماجی نقادوں نے ادھر "تنہائی" کا نام لے کر خاص غوغائی تحریریں شائع کرائی ہیں ۔ ہربرٹ ریڈ نے اپنے ایک مضمون (THE MODERN EPOCH IN ART) میں نئے رجحانات اور نئے رویوں کا جائزہ لیتے ہوئے ، اس سماجی اور سیاسی پس منظر کی وضاحت کی ہے ، جس کے باعث ہمارے عہد کے فنکار کو لفظ مفہوم اور ترسیل کے درمیان پیدا ہو جانے والی خلیج کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔

" تنہائی کا مسئلہ ایسا ہے ، جس سے صرف فنکار ہی روشناس ہوا ہے ، پال کلی نے انتہائی کرب کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے کہ لوگ ہم سے بے تعلق ہیں ، اور ہم تنہا ہیں ۔ لیکن تنہائی کے احساس پر فنکاروں کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں ہے یہ تو ایسا ہی ہے ، جیسے مرغِ بادنما کو ایسے وقت میں اپنا رُخ نہ بدلنے پر الزام دیا جائے ، جبکہ ہوا کا وجود ہی نہ ہو ۔ (تاہم یہ صحیح ہے کہ مرغِ بادنما کی ایک قسم ایسی بھی ہے ، جس کا رُخ محض اس وجہ سے نہیں بدل پاتا کہ اس کے قلابے زنگ آلود ہوتے ہیں میرا اشارہ مکتبی طرز کے فنکاروں کی جانب ہے) ہمارا عہد ہزاروں مختلف النوع قوتوں کی تخلیق کا عہد ہے اور ان قوتوں میں اقتصادی رجحانات کو اولیت دینے میں مارکست غلط نہیں ہیں ۔ لیکن چالیس برس سے زائد عرصہ تک ، شدید ترین کوششوں کے باوجود ، انتشار پر مشتمل ، فن کی کسی نئی ہیئت کی تشکیل میں سوویت یونین کی ناکامی ، اس بات کا ثبوت ہے کہ فنکاروں پر جبراً کسی خاص تخلیقی تحریک کو ٹھونسنا ممکن نہیں ہے فنکار اور سماج کے درمیان ہم آہنگی کے لئے ہمیں ابھی انتظار کرنا پڑے گا ۔

الشجاع

شاید ایک طویل عرصہ تک ـــ اس وقت تک جب فن اور سوسائٹی کے درمیان کسی توانا رشتے کی تجدید ممکن ہو سکے جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ، جدید فنی تخلیق ، ایک علامت ہے اور علامت اپنی ماہیت کے اعتبار سے ، صرف محرمانِ علم و فن کے لئے ہی قابلِ فہم ہو سکتی ہے (تاہم علامت انتہائی پُراسرار طور پر بعض نامحرموں کو بھی متاثر کر سکتی ہے ۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے ، جب وہ علامت کو اپنے لاشعور کی گہرائی تک منتقل کر سکتے ہوں) عام لوگ زیادہ سے زیادہ استعارے سے ہی مستفید ہو سکتے ہیں ۔ لیکن اس صورت میں بھی عوام استعارے کے آزاد مفہوم پر ایمان نہیں لاتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام میں محض روایتی انداز کی سوجھ بوجھ ہوتی ہے ۔ اسی باعث تخلیقی فن کے خواصی (ARISTOCRATIC) عوامل اور جدید معاشرے کے جمہوری ڈھانچے کے درمیان جو خلا پیدا ہو گیا ہے ، اس کا پُر ہونا آسان نہیں ہے ۔ لیکن فن کے خواصی عوامل اور معاشرے کا جمہوری ڈھانچا ، یہ دونوں چیزیں ، انسانیت پرستی کے لبادے میں ظاہر ہو سکتی ہیں ، فرق صرف یہ ہے کہ ایسی صورت میں معاشرے کے پیشِ نظر محض نمائش ہوتی ہے ، اور فن اس لبادے کو اپنا مامن بناتا ہے ۔ اس دور کے حساس فنکار جانتے ہیں کہ ان کا عہد کس قدر بھیانک طوفان کی زد میں ہے ۔"

ذہنی بصیرت اور تجزیاتی بصارت کے وسیلے سے عمر کا ارتقائی سفر طے کرنے والے اس معمر شخص کی ایسی ہی تجزیاتی اور حقیقت افروز تحریریں ، ہمارے روایتی معلموں اور نقادوں کو کم از کم یہ سبق تو ضرور سکھاتی ہیں کہ وہ زنگ خوردہ قلابوں والے مرغِ بادنما کی طرح بت بن کر نہ رہ جائیں اور یہ کہ تخلیقی حس کا مطلب شانے کی تھپکی نہیں ، فہم و شعور کے اعتراف کی وہ منزل ہے ، جس کے جواب میں معاشرہ صرف زہر کا پیالہ ہی پیش کر سکتا ہے

ہربرٹ ریڈ کی " ادبی تنقید " بھی اس لحاظ سے اہم ہے کہ ہمارے یہاں کے بعض روایت پسند ، اور راسخ العقیدہ نقاد ،

اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ادبی تنقید میں ہربرٹ ریڈ کا تعلق، کالرج کے ہیئتی مکتب فکر سے ہے۔ لیکن روایت پرستی یا عقیدت مندانہ روش کے برخلاف اجتہادی رویہ اپنایا ہے، اور کالرج کی تقلید کو ہی اپنا مسلک نہیں بنایا، لیکن ہیئتی نظریہ شعر کو ان تبدیلیوں سے ہم کنار کیا ہے، جو فرائڈ، یونگ، ہیوم اور سارتر کی تعلیمات کے ذریعہ فن کی دنیا میں ایک انقلاب کا باعث بنی ہیں۔ جدید نفسیات کے اشتراک سے ایک نئی سائنٹفک تنقید کی بنیاد رکھنے میں، ہربرٹ ریڈ کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔

کالرج نے تخئیل (IMAGINATION) اور تصور (FANCY) کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کرتے ہوئے دونوں کی وضاحت کی تھی اور تخلیق شعر کو تازی تخئیل کا عمل قرار دیا تھا۔ ہربرٹ ریڈ نے کالرج کے اس نظریے کو جدید نفسیات کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد منظم ہیئت (ORGANIC FORM) کو تخئیل (IMAGINATION) اور تجریدی ہیئت (ABSTRACT FORM) کو تصور (FANCY) سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہربرٹ ریڈ نے کالرج کو محض تتبع کے لئے، یا اس کے خیالات کو محض تکرار کے لئے منتخب نہیں کیا، بلکہ اپنے ادبی سفر میں کالرج کو ایک محور سمجھ کر نئی سمتوں کی جستجو کی، اور اپنے ممدوح کے نظریات کو بھی فن کی تازہ دنیاؤں میں لاکھڑا کیا۔

ہربرٹ ریڈ نے اپنے دو مضامین میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے تنقیدی نظریات سے انحراف کرتے ہوئے علم الشعر، شاعر کی ذہنی، داخلی اور لاشعوری شخصیت، نیز محرکات اور خارجی تعصبات کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا مطالعہ اردو ادب کے قارئین کے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے ان مضامین میں ایک مضمون "شیلے کی حمایت میں" (IN DEFENCE OF SHELLEY) ہے، جو ایلیٹ کے ایک ایسے مضمون؎ کے جواب میں لکھا گیا ہے جس میں ایلیٹ نے شیلے کی شاعری کو عنفوانی جذبات کی ناپختہ شاعری سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرا مضمون "شاعر کی شخصیت" (THE PERSONALITY OF THE POET) ہے جو ایلیٹ کے اسی موضوع سے متعلق ایک مقبول ترین نظریے سے کسی قدر انحراف کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

مذکورہ دونوں مضامین میں ہربرٹ ریڈ نے بنیادی طور پر نفسیات کے اصولوں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن اپنے استدلال کی تشکیل میں فلسفۂ ادب کے اُن تمام تصورات سے بھی مدد لی ہے جو ایک فیصلہ کن تنقیدی مضمون کے لئے ضروری ہیں۔ شیلے سے متعلق مضمون کی ابتدا میں ہربرٹ ریڈ نے تنقیدی تعصبات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"شیلے ہمیشہ اپنے دشمنوں سے دوچار رہا۔ ان دشمنوں اور مخالفوں میں بیشتر تعداد اُن لوگوں کی تھی جنہیں ہم سیاسی نوعیت کے حریف کہہ سکتے ہیں۔ ادبی نقطۂ نظر کے برخلاف ان حریف ناقدوں نے شیلے کے سماجی اور اخلاقی تصورات کی جگر بندی کی ہے، اور تصورات میں ایسے تخریبی عناصر ڈھونڈ نکالے ہیں جن کی مخالفت کے لئے قانون اور روایت کی تمام تر قوتوں سے کام لیا جاسکے۔ یہاں ہمیں ان حریف ناقدوں کے متعلق کچھ نہیں کہنا۔ کیونکہ شیلے سے متعلق مباحث میں اب ان ناقدوں کا کوئی وجود باقی نہیں ہے۔ اس لئے بھی کہ شیلے کو شاعر کی حیثیت سے عالمگیر مقبولیت حاصل ہے۔ اور اس کی شاعری اب ہمارے کلچر کا حصہ بن چکی ہے۔ شیلے کو معزول کرنے کے لئے اب صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اس کی دہریت یا مزاجیت کو یا دانش ورانہ بے راہ روی کی کسی ملزمانہ روش کو ثابت کر دیا جائے۔ شیلے کی معزولی کے خواہش مند نقاد کو اب اس اعتماد کے ساتھ اس کے شاعرانہ مرتبے اور مقام پر یلغار کرنی پڑے گی کہ اس کے بعد شیلے اپنے خطرناک فتنوں کے پشتارے سمیت خاموشی کے ساتھ فن کی دنیا سے ہمیشہ کے لئے نابود ہوسکے۔"

ہربرٹ ریڈ کے مذکورہ دونوں مضامین کا موازنہ اگر ایلیٹ

؎ *The use of poetry and the use of criticism.*

کی تحریروں سے کیا جائے، تو یقیناً یہ دونوں شخصیتیں ہم عصر ہونے کے علاوہ ہم پلہ بھی معلوم ہوتی ہیں بلکہ ان دونوں مضامین میں ہربرٹ ریڈ کے دلائل زیادہ بھرپور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جدید انگریزی تنقید میں ایلیٹ کا جو مرتبہ ہے وہی مرتبہ ہربرٹ ریڈ کا بھی ہونا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہے بیشتے کے تمام حریفوں اور مخالفوں کی مبارزطلبی کے لئے اس طویل مضمون کے باوجود اور ایلیٹ کے نظریۂ IMPERSONALITY کے جواز میں نفسیاتی دلائل اور تخلیق شعر کے متوازن اور مکمل فلسفے کو ایک ہی مضمون میں تمام تر جزوی مباحث کے ساتھ پیش کر دینے کے باوجود، ہربرٹ ریڈ کو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے معیار کا ناقد نہیں مانا جاتا۔ عجیب بات ہے کہ ہربرٹ ریڈ کے مقابلے میں بہت کم کتابوں کے مصنف ناقدوں کا مرتبہ زیادہ ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے ہاں کے ادبی REPTILES اسے بزرگ شکنی سے تعبیر کریں —— لیکن یہ ایک ایسی زبان کے ادب کی سچائی ہے، جس کے لکھنے والے بزرگ، ہمارے یہاں کے بعض بزرگوں کی طرح خودی کے خوگر اور خود پسندی کے اسیر نہیں ہیں، یہ اس زبان کے فنکار کی روداد ہے، جس کے پڑھنے والے محض مرعوبیت اور عقیدت کے لئے ہی مطالعہ نہیں کرتے۔ یہ ایک علمی اور ادبی صداقت ہے جسے ہربرٹ ریڈ یا ان کے مداح کسی سیاسی طرز کے الزام سے مٹانے کے خواہش مند نہیں ہیں۔

لیکن کیوں ——؟ اس لئے کہ ہربرٹ ریڈ نے اپنی تمام زندگی ادب و شعر اور فنونِ لطیفہ کے ان مسائل کو حل کرنے میں صرف کی ہے جن کا تعلق ابہام و تفہیم اور ترسیل کے مسائل سے ہے، جن کا دائرہ عمل تشریح اور توضیح ہے۔ اس لئے ہربرٹ ریڈ کو ناقد سے زیادہ ادب اور فنونِ لطیفہ اور خصوصاً جدید ذہن کے شارح اور مفسر کی حیثیت سے قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن احترام یا عقیدت کے باعث اس کے مرتبے کو غلو آمیزی سے مکدر نہیں کیا جاتا۔ ہربرٹ ریڈ کو ایلیٹ یا کلینتھ بروکس یا ایلین ٹیٹ پر فوقیت نہیں دی جاتی۔ میرا خیال ہے کہ ہربرٹ ریڈ کی عظمت کے اعتراف میں اس غفلت پر حیرت زدہ ہونے سے زیادہ اردو والوں کے لئے انتہائی حیران کن واقعہ یہ ہے کہ ہربرٹ نے کبھی صرف اپنے اصول پر تکیہ کرتے ہوئے، یا خود کو سب سے زیادہ مستند اور صحیح سمجھتے ہوئے، ادب کے نئے نظریات، ادیبوں اور فنکاروں کی نئی نسلوں اور جدید رجحانات کے خلاف کسی قسم کے بزرگانہ تعصب کا یا کسی قسم حقارت کا اظہار نہیں کیا۔ اور شاید یہی وہ سبق ہے جو ہمیں ہربرٹ ریڈ سے سیکھنا ہے۔ کہ فنکار کسی جامد نقطۂ نظر کا محافظ یا کسی فنی ضابطے کا مجاور نہیں، بلکہ فنی اظہار کے پراسرار جنگلوں میں خود کو گم کر دینے والا، اور پھر اپنی جستجو کرنے والا ایسا فرد ہے، جو نتائج، مفادات اور تعصبات سے بے نیاز ہے۔ ہربرٹ ریڈ نے اپنی کتاب —— A COAT OF MANY COLOURS میں بودلیر اور ورلین کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے اپنے اسی نقطۂ نظر کو پیش کیا:

> "حقیقی فن، عرفانِ ذات ہے، فنکار کو فن کے معبد میں اس طرح قدم رکھنا چاہئے، جیسے دار الاستخارہ میں داخل ہوتے ہیں، وہ دار الاستخارہ، جہاں وینس کے زخموں کے علاوہ ہر ایک شے کے متعلق مشورہ کیا جاتا ہے"

ہربرٹ ریڈ کی زندگی حقیقی فن کے اسی تصور میں اور عرفانِ ذات کے اسی عمل میں بسر ہوئی۔

اردو ادب کی موجودہ روش کے مطابق اب ایک آخری سوال اور ہے جو بعض لوگ ہربرٹ ریڈ اور اس کے کارناموں کے سلسلے میں دریافت کر سکتے ہیں —— اور وہ یہ کہ ہربرٹ ریڈ سی آئی اے کا ایجنٹ بھی تھا یا نہیں؟ نیز اس کی تصانیف کی اشاعت کے لئے سی آئی اے نے گرانٹ دی یا نہیں ——؟ اس سوال کا جواب میرے پاس تو نہیں ہے البتہ ہمارے بعض ادبی منجم اس کا جواب دے سکتے ہیں —— کیونکہ یہ موضوع اور یہ مسئلہ ان سے ہی متعلق ہے۔

تنقید

ڈاکٹر ابو محمد سحر

نظیر اکبر آبادی اور ان کے نقاد

نظیر نے جو اسلوب اختیار کیا وہ عوام کی زندگی سے ماخوذ تھا

جب کسی شاعر کو غیر شاعرانہ طور پر اس کا مناسب مقام نہیں دیا جاتا تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کی شاعری کا اعتراف بھی شاعرانہ رنگ میں کیا جاتا ہے اور تنقید افراط و تفریط کا شکار ہو جاتی ہے۔ دورِ جدید میں نظیر اکبر آبادی کی عظمت کا اعتراف جس گرمجوشی سے کیا گیا وہ ماضی کے خلاف ایک طرح کا ردِ عمل تھا۔ لیکن اس کا ذہنی پس منظر کچھ اس قسم کا تھا کہ اُردو شعرا کے اہم قدیم تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ کچھ تذکروں میں ان کا ذکر ہے تو ان کی شاعری کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں ملتی آزاد کے سامنے ان کے کچھ اشعار آئے تھے جو میرے پہلو مارتے ہیں۔ لیکن اس خیال سے کہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ میر کے پایہ کے شاعر تھے۔ انھوں نے آبِ حیات میں یہ اشعار بھی پیش نہیں کئے۔ حالی کی نظر بھی ان خزانۂ الفاظ کی وسعت پر پڑی لیکن وہ اپنے دیوان کے مقدمے میں یہ کہہ کر گزر گئے کہ ان کی زبان کو اہلِ زبان کم مانتے ہیں۔ اس ماحول میں سب سے پہلے پروفیسر عبدالغفور شہباز عظیم آبادی نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ "زندگانیِ بے نظیر" اور کلیاتِ نظیر شائع کیا۔ اس کے بعد دیوانِ نظیر مرتبہ محمود اکبر آبادی منظرِ علم پر آئی اور رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ ادبِ اردو میں نظیر کو ایک ممتاز درجہ دیا۔ بظاہر اسی کے لگ بھگ اردو تنقید نے ان کو از سرِ نو دریافت کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ "نگار" کا نظیر نمبر شائع ہوا جس میں کئی اہم ناقدین نے حصہ لیا۔

نظیر پر جس وقت نقد و تبصرہ کی مسلّمہ سطح پر قلم اُٹھایا گیا اس وقت اردو تنقید کی کشمکش تاثراتی اور نظریاتی میلانات کے درمیان ہچکولے لے رہی تھی اور تحقیق و تنقید دو الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ اگرچہ بعض ناقدین نے ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر خاصی تیر بہدف رائیں ظاہر کیں مثلاً نیاز فتح پوری نے انھیں ایک ایسا "چٹکلے باز" شاعر قرار دیا جس کے پاس ہر عمر اور ہر طبقے کی دلچسپی کا سامان موجود تھا مجنوں گورکھپوری نے لکھا کہ "نظیر ہندوستان کے شاعر تھے اور ہندوستان کی جمہوری زندگی کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اسالیبِ بیان اور لب و لہجہ کو عوام سے ہم سطح رکھا۔" احتشام حسین رضوی کے مطابق "نظیر کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود عوام میں سے تھے۔ انھیں میں سے اُٹھے اور انھیں کے دکھ درد، ہنسی خوشی اور افکار و تاثرات میں شریک بنے۔" اختر اورینوی نے یہ رائے دی کہ "نظیر کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ہے۔" تاہم تاثرات کے جوش اور نظریات کی پرچھائیں میں نشانے پر بیٹھنے والے تیروں کے ساتھ ساتھ جابجا تیرِ ہوائی بھی چل گئے۔ مجنوں گورکھپوری کا مضمون "نظیر اکبر آبادی اور اردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز" اس کا ایک دلچسپ نمونہ تھا کیونکہ اس میں انھوں نے نظیر کی شاعری کے متعلق اپنے بچپن کے ارتسامات کو بڑھاپے کی دلیلوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس رو میں تذکروں، قدیم و جدید اردو شاعری

اور خود نظیر کی شاعری کے بارے میں کچھ ایسے قطعی فیصلے صادر کر دیئے جو کسی قدر غور و تامل کے محتاج تھے۔

یہ صحیح ہے کہ انیسویں صدی تک تذکروں اور تنقید میں نظیر کو نہ تو اتنی جگہ دی گئی اور نہ عام طور پر وہ مرتبہ دیا گیا ہے جس کے وہ مستحق تھے لیکن یہ سمجھنا درست نہیں کہ اس وقت تک سرے سے ان کی شاعرانہ حیثیت تسلیم نہیں کی گئی تھی۔ ان کے شاگرد قطب الدین باطن اور گلستانِ بے خزاں کے مؤلف جنھوں نے ان کو مومن و غالب پر ترجیح دی ہے۔ انیسویں صدی کے دوسرے تذکروں کی ایک اچھی خاصی تعداد ایسی ہے جس میں کسی نہ کسی حیثیت سے ان کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ سرور، مجموعۂ نغز از قدرت اللہ قاسم، طبقات السخن از شیخ غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی، گلشن بے خار از شیفتہ، گلدستۂ نازنیناں از کریم الدین، خوش معرکۂ زیبا از سعادت خان ناصر، طبقات الشعرائے ہند از کریم الدین و فیلن (گلستان بے خزاں سے پہلے)، گلشن ہمیشہ بہار از عبد العلیم نصر اللہ خان خویشگی، گلستان سخن از مرزا قادر بخش صابر، سخن شعرا از عبد الغفور نساخ اور شمیم سخن از عبد الحی صفا بدایونی۔ مغربی تذکرہ نگاروں میں تاسی اور اشپرنگر نے بھی ان کا ذکر کیا ہے اور فیلن نے تو انھیں بڑی اہمیت دی ہے لیکن ان کا معیار نقد جداگانہ تھا۔ تاہم فیلن کا ذکر اس لحاظ سے ضروری ہے کہ معلوم نہیں کس نے ان کو یہ باور کرا دیا تھا کہ "ہندوستان کی لفظ پرستی اس کو سرے سے شاعر ہی تسلیم نہیں کرتی" جیسا کہ نظیر کی توصیف سے پہلے انھوں نے اپنے لغاتِ ہندوستانی و انگریزی کے دیباچے میں لکھ دیا ہے۔

انیسویں صدی کے بہت سے تذکروں میں نظیر کے ذکر کی موجودگی خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو اس کا ثبوت ہے کہ ان کی شاعرانہ حیثیت کے لوگ اس زمانے میں بھی معترف تھے اس کے علاوہ گلستان بے خزاں بلکہ گلشن بے خار سے پہلے کے بعض اہم تذکروں میں نہ صرف ان کا ذکر ہے بلکہ ان کی شاعری کی تعریفیں بھی ملتی ہیں۔ عمدۂ منتخبہ میں نواب اعظم الدولہ سرور لکھتے ہیں۔

"نظیر تخلص میاں ولی محمد و شیخ از شعرائے مشاہیر مستقر الخلافۂ اکبرآبادی بہ معلم گری اقامت بسر می برد و مشتاق قدیم است و مثلش دراں شہر بالفعل کم است ...."

مجموعہ نغز (جلد دوم) میں قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں۔

"شیخ ولی محمد اکبرآبادی است وے شاعرے است دیرینہ مشق کہ بالفعل دراں نواح علم استاذی می افرازد.. .. .."

تذکرۂ بے جگر (قلمی) میں خیراتی لعل بے جگر نے بھی لکھا ہے۔

".. .. .. شخصے است در فن خود بے نظیر و شاعرے کہ وضعش خارج التحریر قطرہ فشانی کلک مشکینش فی الحقیقت گوہر باری است و ریشہ دوانی فکر رنگینش ادرا بلاشبہ مشابہ باد بہاری.. ... چراکہ نخچہ گوہر آبدار از اقسام شاعری تاحال کہ عمر شریفش قریب بہ شصت سال رسیدہ، بسلک نظم کشیدہ ہمہ بر زبان دارد.."

ان تذکروں میں دوسری خاص بات یہ ہے کہ نظیر کی ذاتی زندگی یا شاعری کی کسی پہلو سے کوئی مذمت نہیں کی گئی ہے۔

انیسویں صدی کے خاتمے تک نظیر کے کلیات کے کم سے کم تین ایڈیشنوں میں اشاعت بھی اردو کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ان کے کلام کی مقبولیت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ گلستان بے خزاں کی روشنی میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کسی تذکرہ نگار نے ان کو کوئی بڑا درجہ نہیں دیا تھا۔ قطب الدین باطن نے ان کی تعریف میں صرف حق شاگردی ادا نہیں کیا ہے بلکہ شیفتہ کے مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑے ہونے میں قدردانِ سخن ہی میں سے ایسے لوگوں کی رائے سے تقویت حاصل کی ہے جن کی نظر میں نظیر کا ایک شاعرانہ وقار تھا۔ اس اعتبار سے ان کے یہ الفاظ بڑے معنی خیز ہیں کہ "پچاس برس کا عرصہ ہوا جب ہادیٔ شعرا کا فکرِ سخن میں دور آخر تھا۔ فی زمانا بہت نغز شعرائے حال نے بوجھ کر چھوڑ دیئے

نواب جتنے متقدمین شاعر تھے سب امرا اور شرفا تھے حال اچھے ٹھہرے۔
ان شواہد کے پیشِ نظر جب بیسویں صدی کے اہلِ قلم کی ایسی تحریریں ملتی ہیں جن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے یا تو ان کو نظر انداز کر دیا ہے یا ان کو بازاری شاعر قرار دیا ہے یا جن میں یہ بحث اٹھائی گئی ہے کہ "کوئی بڑا شاعر اتنا گمنام نہیں۔" یا "نظیر کے متعلق ایک متنازعہ فیہ امر یہی ہے کہ آیا وہ شاعر ہیں یا نہیں" تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ لطف یہ ہے کہ انھیں حضرات نے ان کی قناعت و استغنا کے باب میں فخریہ بیان کیا ہے کہ "لکھنؤ کے نواب" اور "راجہ بھرت پور" نے ان کو طلب کیا لیکن وہ نہیں گئے۔ لیکن کسی نے اتنا غور نہیں کیا کہ اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو ان سے بھی ان کی شاعرانہ اہمیت ہی کا پتہ چلتا ہے کیونکہ ان کو بندر نچانے کے لئے طلب نہ کیا گیا ہوگا۔ رہ گیا شیفتہ یا کچھ اور تذکرہ نگاروں کا ان کی سوقیت اور ابتذال کی مذمت کرنا تو یہ کچھ ایسا بے بنیاد نہ تھا کیونکہ یہ عیوب نہ صرف خواص بلکہ عوام الناس کے معیار سے بھی ان کے کلام میں غیر متناسب حد تک موجود تھے۔ اور اس وقت اس سے کہیں زیادہ فحش اور مبتذل اشعار ان کے کلام میں تھے جتنے اب ان کے مطبوعہ کلیات میں شامل ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کا یہ خیال کہ

"جس چیز کو ہم ابتذال بتاتے ہیں وہی نظیر کا فن ہے۔ یہ اصل میں دو عقیدوں اور معیاروں کا سوال ہے۔ عام طور سے ہم شاعری کو خواص کی دنیا کی چیز سمجھتے رہے ہیں اس لئے اس کے جتنے اصول و اسالیب مرتب ہوئے وہ خواص کی معاشرت سے ماخوذ کئے گئے ہیں۔ نظیر کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ شاعری کو عوام کی زندگی کی چیز سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا وہ عوام کی زندگی سے ماخوذ تھا۔"

اس غلط مفروضے کی غمازی کرتا ہے کہ عوام کی زندگی اور ابتذال لازم و ملزوم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو عوام کی زندگی ابتذال کی مترادف ہوتی ہے اور نہ خواص کی معاشرت شائستگی کا دوسرا نام۔ نام نہاد خواص کے شعرا مثلاً میر، سودا، انشاء، مصحفی، جرأت اور رنگین وغیرہ کے کلام میں ابتذال کی کمی نہیں۔ جس طرح خواص کی معاشرت ابتذال سے مبرا نہیں ہوتی اسی طرح عوام کی زندگی بھی تہذیب و شائستگی کے اپنے معیار رکھتی ہے۔ نظیر کے کلام کا ایک حصہ عوام کے معیار سے بھی مبتذل تھا اور اس کی گرفت نری خواص پسندی نہیں کہی جا سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ شیفتہ اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں کے ذہن میں ابتذال اور بازاری کا تصور اس سے زیادہ وسیع ہوگا لیکن شیفتہ کے جس قول کو ان کا سب سے بڑا جرم قرار دیا گیا ہے اس کے سمجھنے میں اتنی احتیاط نہیں روا رکھی گئی جتنی انھوں نے اس کے سپرد قلم کرنے میں برتی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں۔

"اشعار بسیار دارد کہ بزبان سوقین جاریست
و نظر بآں ابیات در عداد شعرا نشایدش شمرد،
اما برعایت ابیات منتخب قطع نظر کردہ شد۔"

اس عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شیفتہ کے سامنے نظیر کے دو طرح کے اشعار تھے۔ وہ جو بازاریوں کی زبان پر تھے اور دوسرے منتخب اشعار۔ اور ان کو شعرا میں شمار نہ کرنے کا حکم انھوں نے صرف اول الذکر قسم کے اشعار کے اعتبار سے لگایا نہ کہ ان کی پوری شاعری کے اعتبار سے۔ وہ نظیر کے ان اشعار کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ لگا سکے جو بقول ان کے سوقین کی زبان پر جاری تھے لیکن ان پر یہ الزام بے بنیاد ہے کہ انھوں نے نظیر کو سرے سے شاعر ہی تسلیم نہیں کیا۔

شیفتہ یا کسی دوسرے قدیم تذکرہ نگار کی بالغ نظری سر آنکھوں پر لیکن ان سے یہ توقع بے سود تھی کہ وہ نظیر کی شاعری کو اس طرح دیکھتے جس طرح وہ بیسویں صدی میں دیکھی جا سکتی تھی لیکن جس حد تک وہ ان کے ساتھ انصاف کر سکتے تھے اگر اس میں بھی کوتاہی ہوئی تو اس میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی بے راہ روی

کا دخل بھی بہت کم نہ تھا اور دہاں کی بھی شاعری میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کو عام بندش سے اختلاف کے باوجود اردو کا روایتی مذاق سخن اور معیار نقد بغیر کسی پس و پیش کے اس سے زیادہ قبول نہ کرتا جتنا اس نے قبول کیا۔

نظیر کے جدید نقادوں میں سے بعض نے اپنے نو دریافت موضوع کی پرستش میں نہ صرف گزشتہ مذاق سخن اور معیار نقد کی غیر ضروری حد تک مذمت کی بلکہ انھوں نے ساری اردو شاعری کو بناوٹی، تخیلی، زندگی سے دور اور غیر ملکی خیالات و اسالیب بیان کا مجموعہ قرار دیا۔ یہ محض اس لئے کیا گیا کہ ان کی شاعری کو حقیقی، زندگی سے قریب اور ہندوستانی ثابت کرنا تھا۔ حالانکہ ہمارے یہ قابل احترام نقاد جیسا کہ ان کی دوسری تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے اسی اردو شاعری کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتے تھے اور ان کے لیے یہ مشکل نہ تھا کہ وہ اس پر خط تنسیخ کھینچے بغیر نظیر کی عظمت کا لوہا منوا لیتے لیکن انھوں نے ستم تو یہ کیا کہ نظیر سے بہت سی ایسی باتیں منسوب کر دیں جن کی ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکتی تھی۔ مجنوں گورکھپوری کی چند آراء ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) "انھوں نے اردو شاعری میں اجتہاد کیا اور ایسا اجتہاد جس کو روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔"

(۲) "نظیر کو اردو شاعری کی کوتاہیوں کا احساس اس وقت ہوا جبکہ ان کے آگے پیچھے کی دنیا میں کسی کو بھی ان کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔"

(۳) "انھوں نے مصحفی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں سے بالکل الگ اپنا ایک رنگ نکالا۔ اس لئے کہ یہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مروجہ اردو شاعری کو نہ ملکی رسوم و روایات سے کوئی تعلق ہے اور نہ عوام کی زندگی سے اور مقدس الہامی کتابوں کی آیات کی طرح ہمیشہ ایک چیدہ اور برگزیدہ لوگوں کے حلقے کی چیز بنی رہے گی۔"

(۴) "وہ جانتے تھے کہ خیالات انسان کو بہلا کر دنیا سے آپ دگل سے دور لے جاتے ہیں جہاں سے کہ پھر انسانی ہمدردی باقی رہنے نہیں دیتے۔"

(۵) "وہ نہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کی شاعری موضوع اور زبان دونوں کے اعتبار سے عوام کی زندگی اور ان کے جذبات و خیالات سے قریب سے قریب ہو بلکہ جہاں تک ہو سکے خواص کی دنیا سے دور اور ان کے لئے غیر مانوس ہو۔"

مجنوں گورکھپوری کے مضمون میں اس طرح کے بیانات اور بھی ہیں انھوں نے ان میں نظیر کی شاعری کی جو صفات بیان کی ہیں ان میں سے بعض ایک حد تک سچائی رکھتی ہیں لیکن ما بقی قصد، عقیدہ اور شعور وغیرہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے نظیر کے واقعی اور مستند حالات زندگی کی قلت پر نظر ڈالی جائے یا ان کے کلام کی کثرت پر اس طرح کے دعووں کے ثبوت میں کوئی معمولی سی دلیل ملنا بھی محال ہے۔

نظیر نے اردو شاعری میں کوئی ایسا "اجتہاد" نہیں کیا جو روایات سے بالکل غیر متعلق ہو۔ ان کو اردو شاعری کی کوتاہیوں کا کوئی "احساس" نہیں ہوا۔ ان کا فن جس وقت تکمیل کی منزل پر پہنچ چکا تھا اس وقت لکھنؤ کا دبستان وجود میں بھی نہ آیا تھا کہ وہ اس سے بالکل الگ اپنا ایک رنگ نکالنے کا قصد کرتے انھوں نے اپنی شاعری کو خواص کی دنیا سے دور رکھنے اور اسی کے لئے غیر مانوس بنانے کی دانستہ کوئی کوشش نہیں کی۔ اپنی شاعری کا ایک بڑا حصہ اسی زندگی اور ذوق سخن کا آئینہ دار ہے جس کو انکی قصیدہ خوانی کیلئے خواص کا لیبل لگا کر سوختنی قرار دیا گیا۔

اردو شاعری کے تمام روایتی مضامین، اسالیب بیان، تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور علامات نظیر کے کلام میں موجود ہیں۔ صنعت پرستی، محاورہ بندی، قافیہ پیمائی اس طرح کے دوسرے لوازم جو اس زمانے کی شاعری میں پائے جاتے تھے ان کو بھی مرغوب تھے۔ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب سے انھوں نے مطلق کوئی اجتناب بھی نہیں کیا بلکہ اس سلسلے میں تو انھوں نے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

بیگم تاج فرخی

مولوی نذیر احمد کی آخری تصنیف

اُمہات الامہ

شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی تصنیفی زندگی کا آغاز ناول سے ہوا تھا۔ لیکن ناول ان کے یہاں مقصدیت اور اصلاحِ معاشرت کا علمبردار ہے۔ ادبی تصنیف نہیں۔ لیکن آخر میں وہ طبیعت کے فطری رجحان کی وجہ سے مذہبی تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مشغول ہو گئے تھے۔ چنانچہ ترجمۃ القرآن مجید کے بعد انھوں نے "ادعیۃ القرآن" مرتب کی اور پھر "الحقوق والفرائض" کے نام سے مسلمانوں کی پوری زندگی اور حقوق و فرائض کے بارے میں مبسوط کتاب تیار کی۔ "الحقوق والفرائض" کے بعد مولوی صاحب نے اجتہاد میں خالص اسلامی اصولوں کو دلائلِ عقلی اور شواہدِ مستند سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ دراصل اسے علم کلام کی ایک اہم تصنیف سمجھنا چاہیے۔ لیکن اس نقطۂ نظر سے اجتہاد پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔

اجتہاد کی تصنیف سے فارغ ہو کر مولوی نذیر احمد نے "اُمہات الامہ" تصنیف کی۔ اس کے بارے میں خود مولوی نذیر احمد کا بیان ہے "کئی برس ہوئے گوجرانوالہ کے ایک پادری صاحب مذہبی مناظرے کے پیرائے میں حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی آزادی عمل میں لائے کہ اپنے رسالہ میں پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ان کی بیبیوں کے بارے میں بڑی زبان درازی کی جس سے جمہور مسلمین کی دل آزاری ہوئی۔ مسلمان جگہ جگہ استغاثہ و جلدی کی تیاریاں کرنے لگے۔ اور جگہوں کا حال تو معلوم نہیں دلی سے کچھ لوگ فریاد لے کر شملے گئے۔ بارے پادری صاحب کی کتاب کی اشاعت حکماً بند کر دی گئی۔ اس اثنا میں سرسید احمد خاں مرحوم و مغفور بھی پادری صاحب کی کتاب کا جواب لکھ رہے تھے۔ وہ پورا نہیں ہونے پایا تھا کہ سید صاحب انتقال فرما گئے۔ ہم نے تو پادری صاحب کی کتاب دیکھی اور نہ سید صاحب کا ادھورا جواب۔ مگر اتنی بات پہلے سے معلوم ہے کہ پادری صاحب نے سخت زبانی کے سوائے اعتراض میں کوئی نئی بات اپنی طبیعت سے تو ایجاد کی نہ ہوگی۔ اعتراض تو نہیں مگر جواب خود قرآن میں موجود ہے۔ جواب کا ہونا دلالت کرتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت بھی پیغمبر صاحب کی زندگی میں بعض لوگ زن و فرزند کے تعلقات کو خلافِ شانِ پیغمبر سمجھتے تھے اور ان ہی تعلقات کی وجہ سے جنابِ رسالت مآب کی رسالت کے منکر تھے۔ غرض پرانا اعتراض ہے۔

اور علمائے اسلام نے اس کے دنداں شکن جواب بھی دیئے ہیں۔ مگر مسلمان ہو کر اپنے پیغمبر کے تقدس کو اپنے مقدور بھر اور اپنے طور پر واجبی حمایت کیے بغیر ہم سے نہیں رہا جاتا اور یہ بات بھی ہے کہ اعتراض کسی مسلمان کے کان میں پڑے اور اس کو جواب نہ آتا ہو تو جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس کی نسبت خیال فاسد ہو کر سوئے ادب دل میں بیٹھ جائے تو ایمان کے جاتے رہنے کا خوف ہے۔" مولوی نذیر احمد کا یہ بیان بہت اہم ہے۔ اس سے ان کے نقطۂ نظر کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔ عیسائی مبلغین کے اعتراضوں کا مقصد مسلمانوں کی دل آزاری، ان میں احساسِ کمتری پیدا کرنا اور مذہبی اعتقاد سے [illegible] مسلمانوں

[illegible] اور نفسِ مضمون کے بارے میں
فیصلہ کرنا ادب کے طالب علم کا منصب نہیں۔ یہ کام ان لوگوں کا
ہے جو مذہب سے خصوصی واقفیت رکھتے ہیں۔ ہم صرف یہ کہہ
سکتے ہیں کہ امہات الامہ کا موضوع اور نفسِ مضمون دونوں
اسلام کے تقاضے سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ اور ان سے ہمیں
ان اعتراضات کا بڑا واضح اور معقول جواب مل جاتا ہے جن کی گونج
آج بھی کہیں کہیں سنائی دیتی ہے۔ البتہ یہ تصنیف ایک اور لحاظ
سے ادب کے طالب علموں کے لیے توجہ اور دلچسپی کا سبب بنی
ہے۔ مولوی نذیر احمد نے اپنی تصنیفی زندگی کی ابتدا ناول نگاری
سے کی۔ ان کا اسلوب عربی اور انگریزی سے گرانبار ہونے
کے باوجود روزمرہ اور محاورے کا عوامی اسلوب ہے جس نے
آہستہ آہستہ ان کے یہاں ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی یہی
اسلوب آگے چل کر اردو ناول اور افسانے کا اسلوب بنا۔ لیکن
ناول اور افسانے کا اسلوب ہر قسم کی تصانیف کے سلسلے میں موثر
نہیں ہو سکتا۔ ہر سخن موقع اور ہر نکتہ مقامے دارد والی بات ہے
علمی مطالب کو ادا کرنے کے لیے جوشِ جذبہ اور روزمرہ اور
محاورے کے بجائے سیدھے معقول اور علمی اندازِ بیان کی ضرورت
ہوتی ہے۔ تاکہ علمی خیالات بہ آسانی واضح ہو سکیں۔ وضاحت
تشریح اور بلاغت اچھی نثر کے امتیازی اوصاف ہیں۔ لیکن مولوی
نذیر احمد نے اپنی ہر تصنیف میں اپنے انفرادی اسلوب سے کام لیا
اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزمرہ اور محاورے کی دھن میں وہ اپنی
مذہبی تصانیف میں بھی بعض موقعوں پر ایسی زبان اور محاورے
استعمال کر گئے ہیں جو مذہبی تقدس کے شایانِ شان نہیں تھے۔
اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مولوی نذیر احمد ادب و آداب اور احترام
کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ آمدِ کلام کے جوش میں وہ ان باتوں کی
طرف کوئی توجہ نہیں کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امہات الامہ
میں انھوں نے بعض مقامات پر ایسے الفاظ اور محاورے استعمال
کیے جنھیں عام مسلمانوں نے پسند نہیں کیا۔ اور پھر ہمارے ہاں
جو دستور ہے کہ رائی کا پربت اور تل کا پہاڑ بن جایا کرتا ہے
دینی مولوی نذیر احمد کے ساتھ ہوا۔ لیکن کسی نے اس جذبہ پر غور
نہیں کیا۔ جو اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہوا تھا۔ مصنف
کے خلوصِ عقیدت پر کسی نے غور نہیں کیا۔ گرفت ہوئی تو چند
الفاظ پر۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ نیت اور
جذبے کو کون دیکھتا ہے

امہات الامہ کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ اس کی تفصیل بابائے
اردو مولوی عبد الحق مرحوم نے بیان کی ہے۔ یہ تفصیل بہت
دلچسپ اور عبرت انگیز ہے میں اسی کو یہاں نقل کرنا مناسب
سمجھتا ہوں مولوی صاحب لکھتے ہیں۔

> "بڑے اور نامور لوگوں پر اکثر اپنے معاصروں
> کے ہاتھوں بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں۔
> مولانا بھی آخری عمر میں اس سے نہ بچے امہات الامہ
> کا شائع ہونا تھا کہ دلی میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا
> مولوی تو پہلے ہی سے ان سے جلے بیٹھے تھے۔
> ان کی بن آئی۔ خوب جلے پھپھولے پھوڑے
> مخالفت میں رسالے چھپوائے۔ طرح طرح
> کے بہتان باندھے۔ کفر کے فتوے لکھے اور
> بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ طرح طرح
> سے عوام کو بھڑکایا۔ یہاں تک کہ بعض نوجوان
> کے لاگو ہو گئے اور مرنے مارنے پر مستعد ہو
> بیٹھے۔ یہ غدر دلی سے اٹھا اور دوسرے
> مقامات تک پہنچا لیکن سب سے حیرت
> انگیز اور عبرتناک واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب
> کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلماء کا جو اجلاس
> دلی میں ہوا اس میں علمائے کرام جو موجود تھے
> انھوں نے باہمی مشورہ کر کے امہات الامہ
> کی تمام جلدیں جو ابتدائی طوفان کے بعد بعض
> معززین نے مولانا کی منت سماجت کر کے
> ایک صاحب کے پاس رکھوا دی تھیں۔ اور

رالی کی صورت میں بڑا ... مولوی اور اپنے
سامنے ان کتابوں کا ڈھیر لگا لیا۔ اور ان
میں سے ایک مولوی نے زیادہ ثواب کمانے
کے لئے آگے بڑھ کر مٹی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ
کر کے آگ لگا دی اس کے شعلوں کی روشنی
مولویوں کے مقدس چہروں پر پڑ رہی تھی اور
ان کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت
سے اس خوفناک دلی مسرت اور باطنی اطمینان
کا اظہار ہو رہا تھا۔ جو ایک خونخوار درندے یا
سنگدل انسان کی صورت سے انتقام لیتے وقت
ظاہر ہوتا ہے۔ اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو،
مولانائے مرحوم بھی اس آگ میں جھونک دیئے
جاتے۔"

لطف کی بات یہ ہے کہ امہات الامہ کی نسبت جو فتوی جاری
کیا گیا تھا۔ اس میں ایک عالم نے یہ بھی لکھا کہ،

"میں اگرچہ اس جلسہ میں موجود نہ تھا مگر کتابِ
مذکور کے واجب التلف اور مصنف کے
واجب المتارکت ہونے میں شک نہیں۔"

اسی سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ شمس العلما علامہ
شبلی فرماتے تھے کہ

"امہات الامہ کی تصنیف کے بعد جب
ندوہ کا جلسہ دلی میں ہونے والا تھا تو میں نے
جلسہ کا اشتہار دیتے ہوئے ہندوستان کے
نامور علما کی فہرست بھی شرکتِ جلسہ کے
لے چھاپی تھی۔ جس میں مولوی نذیر احمد کا
نام بھی تھا۔ وہ اشتہار کہیں مولوی نذیر احمد
صاحب کے پرانے حریف کی نظر پڑ گیا
تو انھوں نے مجھے بھی صرف اس بنیاد پر کافر
قرار دے کر فتوی چھپا دیا کہ نذیر احمد کے ساتھ

میں نے مولوی کیوں لکھا اور ان کو ندوہ علما
میں کیوں شمار کیا۔"

ظاہر ہے کہ جب نذیر احمد کو ندوہ علما میں شامل کرنے پر شبلی
جیسے عالم دین پر کفر کا فتوی عائد ہو سکتا ہے تو پھر نذیر احمد پر
کفر کا فتوی عائد ہونا ایک معمولی بات ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے
کہ مولوی نذیر احمد نے امہات الامہ بڑی نیک نیتی اور خلوص سے
لکھی تھی۔ لیکن چونکہ اپنے منفرد اسلوب میں لکھی تھی اس وجہ سے
کہیں کہیں ایسا رنگ پیدا ہو گیا جو کسی طرح بھی مناسب قرار
نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن صرف اس بنا پر کسی شخص کو کافر ٹھہرانا کہاں
کا انصاف ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ شورش
فرو ہو جانے کے بعد مولانا راشد الخیری نے امہات الامہ اپنے رسالے
تمدن میں بالاقساط شائع کیا اور کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ مولوی
نذیر احمد کے صاحبزادے مولوی بشیر الدین کا بیان ہے کہ

"میں نے خود جماعتِ مخالفین کے ایک بڑے
رکن سے پوچھا کہ کیوں حضرت یہ کیا معاملہ ہے؟
باہر آں شور اشوری یا بہ ایں بے نمکی۔۔۔
والد مرحوم کے وقت میں آپ نے آگ لگا دی
تھی اور کتاب کو آگ لگا کر ہی چھوڑا اب
آپ کس خوابِ خرگوش میں ہیں تو انھوں نے ہنس کر
جواب دیا اے میاں وہ تو مولوی نذیر احمد سے
مقابلہ تھا۔ خاک از تودۂ کلاں بردار یہ تو
عبد الراشد چھاپ رہے ہیں ان کے منہ کون
لگے۔"

گویا امہات الامہ کی مخالفت مقصود نہ تھی بلکہ مولوی نذیر احمد
کو تنگ کرنا تھا۔ جس مخالفت کا مقصود محض ذاتی مخاصمت
اور دل آزاری ہو اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس
ہنگامے کو فروغ دینے والوں کے بارے میں ایک بڑا اہم بیان
ہمارے سامنے ہے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے بقول۔

"دہلی کے علما نے مولوی نذیر احمد کے خلاف

[illegible] بپا کی مگر معقول اہل
علم اس شورش سے علیحدہ اور بیزار تھے
جو لوگ اس مخالفت کے بانی تھے میں جب
کبھی ان کے ہاں گیا سوائے جوڑ توڑ اور غیبت
و بدگوئی کی باتوں کے کبھی ذکر خدا اور رسول
ان کے ہاں نہ سنا۔ مگر مولوی نذیر احمد سے مرتے
دم تک جب ملنا ہوا ہمیشہ خدا اور خدا والوں
کا چرچا رہتا تھا اور اب آخر وقت میں تو ان کی
خدا ترسی اور رقیق القلبی کا یہ عالم تھا کہ ایک
آیت سناتے اور بے اختیار روتے۔ ایسے سچے خدا
پرست کو کافر کہنے والے میرے عقیدے میں
دوزخ کے کندے ہیں"

شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی مرحوم امہات الامہ
کے موضوع اور دلائل سے اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ انگریزی
میں اس کا ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح امہات الامہ کی اشاعت
کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا اور عیسائی پادریوں کو انہیں کی
زبان میں مسکت جواب مل جاتا لیکن آں قدح بشکست و آں
ساقی نماند شمس العلما کا انتقال ہو گیا۔ اور منصوبہ پروان
نہ چڑھ سکا۔

امہات الامہ کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی یہ سارے
واقعات طبع اول سے متعلق تھے طبع ثانی کی نوبت آئی تو پھر ہنگامہ
برپا ہوا۔ اس ہنگامے کی تفصیل شاہد احمد دہلوی مرحوم نے
گنجینۂ گوہر میں یوں بیان کی ہے۔

"اب سے کوئی پچاس سال پہلے مولوی نذیر احمد
صاحب نے ایک کتاب امہات الامہ لکھی تھی۔ یہ کتاب
ایک بیہودہ ذہن پادری کی کتاب کے جواب میں
لکھی گئی تھی۔ اس نے آنحضرت صلعم پر بعض
بے ہودہ اعتراضات کئے تھے جن میں خاص

باتیں بھی تھیں۔ اس کتاب کا ایک جواب سر
سید احمد خان نے لکھا تھا۔ اور ایک مولوی نذیر
احمد نے یوں تو یہ کتاب شروع سے آخر تک
ایک علمی اور تاریخی کتاب ہے اور اپنے مواد کے
لحاظ سے نہایت قابل قدر بھی۔۔
لیکن مولوی صاحب نے احترام کے الفاظ کسی
نام کے ساتھ نہیں لگائے اور بعض جگہ فقرے
بھی ایسے لکھ گئے ہیں۔ جو زبان کے اعتبار سے
چاہے کتنے ہی ٹکسالی کیوں نہ ہوں لیکن رسول
مقبول و اہل بیت کے ادب و احترام کے
لحاظ سے قابل اعتراض سمجھے گئے مولوی
صاحب اس پیرایۂ بیان کا جواز یوں پیش کرتے
تھے کہ چونکہ ایک عیسائی پادری اس کتاب کا
مخاطب ہے! اس لئے ان کی ضرورت نہیں
سمجھی گئی۔ یہ توضیح صحیح ہو یا غلط یہاں اس
سے بحث نہیں۔ ہوا یہ کہ ہمارے علما نے اس
کتاب کو سوختنی اور مولوی صاحب کو کافر
قرار دیا۔ مسلمانوں کے ایک بڑے لیڈر نے اس
کتاب کے سارے نسخے مولوی صاحب سے اپنی
تحویل میں لے لئے اور مولوی صاحب کی بغیر اجازت
انہیں علما کے جلسے میں لے جا کر جلوا دیا۔ قصہ
مختصر اس ناگوار واقعے کے بعد مولوی صاحب تین
چار سال زندہ رہے مگر انھوں نے ایک لفظ بھی
نہیں لکھا۔ شامتِ اعمال سے اس کتاب کا نسخہ
کہیں سے میرے ہاتھ لگ گیا۔ اور میں نے یہ سوچ
کر کہ ایک اچھی کتاب سے مسلمان کیوں محروم رہیں
اسے جوں کا توں چھاپ دیا۔ اس کا چھپنا تھا کہ پھر
ہمارے علما نے اس کے خلاف تحریک شروع کی

حکومت سے [illegible] کہ کتاب ضبط کر لی جائے حکومت
کو بھلا کیا غرض پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اس جھگڑے
میں پڑے جب ادھر سے کامیابی نہ ہوئی تو مجھ
پر بزرگوں سے دباؤ ڈلوایا گیا۔ یہ بھی ناکام رہا تو
قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ اور ہر شہر میں اور دلی
میں اس کے خلاف جلسے ہونے لگے چغتائی صاحب
(مرزا عظیم بیگ چغتائی) نے مجھے جودھ پور سے لکھا
کہ ساری کتب مجھے بھیج دو اور اعلان کر دو کہ کتب
میرے پاس ہے جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے
میں نے انھیں دو سو جلدیں بھیج دیں کہ محفوظ ہو جائیں
اور کتاب کی اشاعت بند کر دینے کا اعلان کیا۔ مسلمانوں
نے نہ صرف مجھے معاف کر دیا۔ بلکہ خوش بھی ہوئے کہ
چلو غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ یہ کیا کم ہے
کہ کتب کی اشاعت بند کر کے اس نے اپنا مالی
نقصان کر لیا۔ ادھر مرزا صاحب کی ضدی طبیعت
نے زور مارا۔ اور انھوں نے ایک مراسلہ "انقلاب"
لاہور میں چھپوا دیا۔ کہ "امہات الامہ" شاہد احمد
کے پاس نہیں ہے میرے پاس ہے جس میں ہمت
ہو تو مجھ سے لے لے۔ بلکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ
مجھے کاٹ کر میرا پلاؤ پکائیں اور مسلمانوں کو
کھلا دیں۔ اس کے چھپتے ہی بس آگ ہی لگ
گئی۔ چند دن بعد مرزا صاحب کے خط سے
معلوم ہوا کہ جودھ پور کے مسلمانوں نے ان کے گھر
کو گھیر لیا اور زبردستی ان سے ساری کتابیں لے
گئے۔ اس کے بعد وہ ایک دن کچہری جا رہے
تھے۔ تو چار بدمعاشوں نے ان پر حملہ کیا۔
ان کے ایک ہاتھ میں سخت ضرب آئی۔
مرزا صاحب نے لاکھ یقین دلایا کہ کتاب میں نے
[illegible] نہیں لکھی ہے مگر لوگ

۔ یہی کہتے رہے کہ نہیں تم نے لکھی ہے اور اس میں
تم نے گالیاں لکھی ہیں۔ نذیر احمد کو چھوڑ کر کفر
کے فتوی اب مرزا صاحب کو دیے جانے لگے
تھے۔ مگر انھیں رنج اس بات کا تھا کہ وہ کتاب
کو نہ بچا سکے۔ اور مولویوں نے جلسہ کر کے وہ ساری
جلدیں جو وہ مرزا صاحب سے چھین لائے تھے۔
جلا دیں اور یہ ثابت کر دیا کہ پچیس تیس سال میں
مسلمانوں نے کوئی ذہنی ترقی نہیں کی۔"

شاہد صاحب ایک مرتبہ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ جو مولوی صاحب
مخالفت میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے شاہد صاحب سے فرمائش
کی تھی کہ ذرا وہ کتاب پڑھنے کے لیے تو دے دیجیے تو دیکھ لیں کہ اس
میں لکھا کیا ہے۔ بہرحال مولوی نذیر احمد کو اس واقعہ کا اتنا رنج ہوا
کہ پھر انھوں نے لکھنا بالکل ترک کر دیا۔ عجیب بات ہے کہ جو کام
عشق رسول میں کیا گیا تھا زبان و بیان کی ذرا سی بے پروائی کی وجہ
سے مولوی صاحب کے لیے وبالِ جان بن گیا۔

بعض لوگوں نے عذر لنگ پیش کیا کہ "امہات الامہ" کی تصنیف
سے مولوی صاحب کا مقصد مسلمانوں کا دل دکھانا اور [illegible]
تھا۔ مسلمانوں کو اس سے دکھ پہنچا یا نہیں یہ بحث الگ ہے
سوائے دلی کے چند مسلمانوں کے جو اس شورش کے بانی تھے کوئی
کوشاں نہ پایا گیا۔ نفسِ کتاب میں سوائے اس کے کہ بعض جگہ
شوخیٔ طبع سے کوئی فقرہ روانی میں نکل گیا۔ اور کوئی ایسی بات نہیں جس
سے مسلمانوں کی توہین یا مسلمانوں کی دل آزاری مقصود ہو۔ مولوی صاحب جیسے
شخص سے اس کی توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہ بڑے متقی مسلمان
تھے۔ نماز کے سختی سے پابند تھے۔ نہایت خشوع و خضوع سے نماز
پنجگانہ ادا کرتے تھے۔ حافظِ کلام الٰہی تھے۔ کلام مجید پابندی سے
پڑھتے تھے مدتوں ان پر حالت وجد طاری رہتی۔ ہر وقت کلام مجید
کی آیتیں پڑھتے اور زار و قطار روتے۔ خوف الٰہی ان کے دل میں
ایسا تھا کہ شاید ہی کسی کے دل میں ہو۔ ہمدردی، خلیق، پابندی
غربا سے حسن سلوک پوشیدہ امداد خیرات [illegible]

میں یہ جرأت نہیں تھی کہ پیدا سچا مسلمان کیوں کر اسلام کا دشمن ہو سکتا ہے
یہ پوری داستان بڑی عبرت انگیز اور سبق آموز ہے۔
[illegible] احمد کے خلوص اور عقیدت میں کوئی شبہ نہیں آج ان کا شمار
[illegible] ادب کے محسنوں میں ہوتا ہے۔ اور برصغیر کے مسلمانوں کی
نشاۃ الثانیہ میں ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن
یہاں ان کی بدقسمتی تھی کہ مخالفوں نے محض ذاتی دشمنی کی بناء پر انھیں
غیر معمولی صدمہ پہنچایا اور ان کی ایک اعلیٰ پایہ کی تصنیف کو معدوم
محض بنا دیا۔ مولوی نذیر احمد کو اس واقعہ سے اتنا صدمہ ہوا کہ

انھوں نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ ہی ترک کر دیا۔ اور اردو
ایک بڑے انشا پرداز کے شہکار [illegible] ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی
اس ساری داستان کا خلاصہ [illegible] اور
معترضین زبان و بیان کی لغزشوں اور خامیوں کو لے دوڑتے
ہیں۔ جذبے کو کوئی نہیں دیکھتا اقبال نے صحیح کہا ہے ؎

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
لیکن گوہر کو دیکھنے والے ہوتے ہی کتنے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی اور ان کے نقاد ——— صفحہ ۵۷ کا بقیہ

صفحہ ۵۷ کا بقیہ

اپنے ہمعصروں سے بھی زیادہ غلو سے کام لیا ہے۔ جن نظموں کی زبان
عموماً عام فہم اور آسان ہے ان میں بھی انھوں نے بلا تکلف عربی
و فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو عوام الناس کی فہم سے بالاتر
ہیں اور کبھی کبھی تو ان کو اچھے پڑھے لکھے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔
اصناف سخن اور اوزان و بحور کے استعمال میں بھی انھوں نے مروجہ
روش ہی اپنائی ہے۔ غزلیں انھوں نے کثرت سے کہی ہیں اور مثنوی
مخمس مسدس، ترکیب بند اور ترجیع بند وغیرہ سے الگ ہٹ کر
ان کے یہاں نظم کا کوئی تصور نہیں ہے۔
ماضی میں اگر نظیر کو اردو شاعری کی روایت سے خارج

کرنے کی کوشش صحیح نہیں تو دور جدید میں ان کو اس سے چھیننے
کی کوشش بھی غلط ہے۔ ان کے کلام میں اردو شاعری کی روایت
کے اچھے اور برے پہلو بھی ہیں اور اس سے انحراف کی دستگیر
بھی روایت سے ان کا انحراف بڑا اہم ہے لیکن ان کے شاعرانہ
رتبے کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ان کی شخصیت کی صحیح تعبیر اور روایت
انحراف کے باہمی رشتوں کے ادراک کے بغیر نہیں لگایا جا سکتا
اور اس لحاظ سے ان کی شاعری پر محققانہ اور متوازن تنقید کی
ضرورت آج بھی باقی ہے۔

پردے: بیوی نے شوہر سے نئے پڑوسی کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔
"سامنے کے مکان میں جو نیا کرایہ دار آیا ہے وہ کچھ اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا۔"
"کیوں؟" شوہر نے پوچھا۔
اس لئے کہ وہ ہر وقت دروازہ پر کھڑا رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح میری ایک جھلک دیکھ لے۔ آپ مجھے فوراً کھڑکیوں کے لئے پردوں کا کپڑا لا دیں۔
شوہر نے یہ سن کر آہستہ سے کہا۔
بیگم! تم ایک بار اسے پوری طرح اپنے کو دیکھ لینے دو پھر وہ خود اپنی کھڑکیوں پر پردے ڈال لے گا۔

★

رشید

اشتیاق طالب

نئی اور پرانی آوازیں

میر سے غالب و مومن کے دور تک کی تمام تر توانائیاں اور وسعتیں آج کی شاعری میں نظر آتی ہیں

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کے مختلف ممالک کی طرح ہندوستانی سیاست اور سیاسی ڈھانچوں میں تبدیلیاں ہوئیں لیکن ادیبوں اور شاعروں نے اس تغیر و تبدل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا کیونکہ یہ جاگیردارانہ نظام کی پیداوار تھے اور اسی نظام کو اعلیٰ و ارفع سمجھ کر اس سے لپٹے رہنا ضروری سمجھتے تھے جس کی بنیادیں بڑی حد تک کھوکھلی ہو چکی تھیں اور کسی وقت بھی یہ تباہی و بربادی کا باعث بن سکتی تھی۔ آخر کھوکھلی بنیادوں پر کھڑی ہوئی عمارت انقلاب کی تند و تیز رو کی تاب نہ لا کر ڈھیر ہو گئی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اس نظام کی بہت سی قدریں اور روایتیں بھی اسی کے ساتھ دفن ہو گئیں۔ جو لوگ اس تبدیلی کے خواہاں تھے وہ دراصل ایسے سماج کا ڈھانچہ تیار کرنا چاہتے تھے جس میں خود غرضی، لوٹ کھسوٹ، منافقت اور بے تعلقی نہ ہو اور انسانی رشتوں اور قدروں کا تحفظ بھی ہو سکے یعنی یہ لوگ اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کو خطرات کی دلدل اور فرسودہ روایات کی بھول بھلیوں سے نکال کر نئی زندگی سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے

سرسید اور ان کے رفقا کار نے جہاں دوسرے اصلاحی کام کئے وہاں ادب پر بھی احسان عظیم کیا جنھوں نے ادب کو نہ صرف الفاظ کی بازیگری کہنہ روایات کے پیچ و خم سے نکال کر صحیح راہوں پر گامزن کیا بلکہ حقیقت سے ہمکنار کیا اور نئے موضوعات اور نت نئے مسائل کو بھی سمونے کی کوشش کی۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ نثر کی طرف بھی توجہ کی۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہی کی کوششوں سے صنفِ غزل کی نئے سرے سے تشکیل کی گئی اور نظم کی طرح ڈالی گئی۔ غزل جو ہمارا محترم تہذیبی اور ثقافتی لیکن جامد اور غیر متحرک ورثہ بنی ہوئی تھی اور کسی حد تک آج بھی ہے شاعروں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ لیکن حالات اور مسائل کی وجہ سے وہ موضوعات جو اختصار اور ایمائیت کے بجائے پھیلاؤ اور وسعت، وضاحت اور رنگا رنگی کے حامل تھے غزل میں نہیں سمیٹے جا سکتے تھے اسی وجہ سے ایک ایسی صنفِ شاعری کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے ذریعہ ان کا اظہار کیا جا سکے وہ صرف نظم تھی۔ یہ کام ان کے رفیقوں نے بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس کوشش سے نہ صرف نظم کی اہمیت کا اندازہ ہوا بلکہ غزل کا دامن بھی وسیع تر ہوتا گیا

سرسید اور حالی صرف مصلح اور کسی حد تک تغیر پسند تھے ان کو انقلابی کہنا زیادتی ہے اور نہ وہ زمانہ ان سے کسی انقلاب کا متقاضی تھا۔ زمانے کی طلب، اصلاح اور تغیر تھی۔ سو وہ انجام دے رہے تھے پہلی جنگ عظیم کے بعد اگر دوسری جنگ عظیم کے خطرات اور اندیشے نہ رہتے تو شاید یہ کیفیت کچھ اور عرصہ قائم رہتی کیونکہ اس سے جو معاشی بحران اور شکست و ریخت ہوئی تھی اس کے پیش نظر اس تغیر و تبدل کی رفتار کو حیرت انگیز طور پر اس ذہنی انقلاب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی شکل میں رونما ہوا تھا اس تحریک کی وجہ سے ہمارا ادب ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر حال اور مستقبل سے رشتہ جوڑ لیتا ہے۔ زندگی کی طرح ادب بھی

بہنے کا نام ہے۔ ادب کیونکہ زندگی کا آئینہ دار ہے تفسیر اور تنقید بھی ہے اسی لئے فعال اور متحرک ہوتا ہے۔ ہر دور کا ادب حقیقی معنوں میں اسی وقت ادب کہلاتا ہے جس میں زندگی کی ترجمانی کرنے اور آگے بڑھنے کی سکت ہوتی ہے نئے رجحانات کو سمیٹنے کی قوت ہوتی ہے۔ جس میں نزور حیات موجود ہوتا ہے۔

حالی۔ آزاد اور شبلی کے بعد اردو شاعری میں حسرت، فانی اصغر اور جگر کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں غیر معمولی خوبیوں، لطافتوں اور رنگینیوں کے باوجود زندگی کی بھرپور عکاسی اور نہ مستقبل کی نشاندہی ملتی ہے

یگانہ اور فراق اپنے مزاج اور فکر کے اعتبار سے ان شعراء سے مختلف ہیں۔ ان کے یہاں بڑی حد تک زندگی کی نئی تفسیر ملتی ہے اور نئے رجحانات، خیالات کی تازگی اور لہجے کا بانکپن ملتا ہے ان دونوں کے یہاں نہ صرف زندگی کے جلال اور جمال کا امتزاج ملتا ہے بلکہ نئی روایات و اقدار کی تعمیر بھی۔ یہیں سے ہماری شاعری حقیقتوں سے ہم کنار ہوتی ہے۔ زندگی کے نئے معیاروں کے ساتھ ادب میں بھی نئے معیار قائم ہوئے۔ اسی وجہ سے آج ہمارا ادب موضوع، اسلوب اور فکر کے اعتبار سے بہت آگے بڑھ چکا ہے

جہاں تک جدید اردو شاعری کا تعلق ہے تو آزاد اور حالی کے بعد نظر اقبال پر جاکر ٹھہرتی ہے جس نے ہماری شاعری میں آفاقی اور اجتماعی زندگی کا شعور پیدا کر کے نئی وسعتیں اور نئے امکانات پیدا کئے۔ اقبال کے یہاں زمین کے ہنگاموں اور اندیشہائے افلاکی انسان دوستی اور حیات انسانی کی قدر و عظمت کا احساس ملتا ہے "مسجد قرطبہ" میں وقت، انسان اور آفاقی رشتوں کی اہمیت کو تسلیم کرایا ہے۔ شیطان کا کردار حوصلہ، ذہانت اور جرات کی علامت بن کر اقبال کے یہاں ابھرتا ہے۔ اقبال نے شیطان کا کردار پیش کر کے اس راز کو بھی افشا کر دیا ہے کہ انسانیت کے خمیر میں الوہیت اور ابلیسیت دونوں لازمی اور بیرا یک کے اجزا ہیں۔ انسان کی آزادی کا تصور غلامی کی تحریک سے ہٹ کر جبر و قدر کے مسئلے میں اقبال کے یہاں ایک نئی کروٹ لیتا ہے اور انسان ایک نئی آن بان، آب و تاب اور نئی زندگی کے ساتھ ابھرتا ہے

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

اقبال کا یہ انسان نیا ہے جس میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ہے، یہ انسان با اختیار اور اپنی زندگی کا مختار ہے۔ انسانی عظمت اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر مشیت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے خودی کا یہ تصور پہلی بار اقبال کے یہاں ملتا ہے۔ اقبال کے بعد جوش۔ اختر شیرانی۔ حسرت۔ یگانہ۔ فراق۔ مجاز۔ سردار جعفری۔ اختر الایمان، مخدوم۔ ساحر۔ جذبی۔ جاں نثار اختر اور مجروح سلطان پوری کا دور شروع ہوتا ہے

کہنے کو تو اقبال نے بھی غزلیں کہی ہیں لیکن یہ غزل کی صحت مند روایت کو آگے نہ بڑھا سکیں۔ غزل کے افق پر صرف یگانہ ایک تابندہ ستارہ کی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ میں نے "صرف" اس لئے کہا ہے کہ یگانہ نے غزل کو معنی کے اعتبار سے نئی سمت دی ہے۔

اٹھا کے خالی پیالہ لگا لیا منہ سے   کہ یاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

یگانہ کی دہریت غالب سے علیحدہ ہے۔ غالب کی دہریت فکری ہے اور یگانہ کی دہریت انسان کی آزادی کی علامت ہے ؎

سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبط مذہب کیا

یہ انداز عام غزل گو شعراء سے مختلف ہے لیکن اس عہد کے موضوع کی تفسیر ہے اور کو ہکنی کی جرات بھی ہے۔

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے   اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

اسی وجہ سے یگانہ کی شاعری میں ذہنی بانکپن اور جرات رندانہ کی سرمستیاں ملتی ہیں۔ جبر اور فرد کے تصادم کی جو کیفیت یگانہ کے یہاں ملتی ہے وہ اس سے پہلے نہ صرف اردو بلکہ دنیا کی کسی شاعری میں نہیں ملتی۔ ہر نارسائی فرد کے حوصلے کے لئے تازیانہ بن جاتی ہے۔ جبر جتنا شدید ہے اس سے کہیں زیادہ حوصلہ فرد میں موجود ہے۔

اقبال اور یگانہ دونوں ایک ایسے عہد کے لئے راستہ ہموار کر دیتے ہیں جہاں جدید عہد کے مختلف رنگ شاعری میں یکجا ہونے لگتے ہیں۔ اختر شیرانی کی رومانیت میں محبت کا ارضی اظہار پہلی بار ملتا ہے جسے غزل کی ایمائیت سے نکال کر محبوب کے خد و خال، خواہش وقت اور

اظہار محبت سے سجایا گیا ہے۔ اختر شیرانی کی یہ محبوبہ خیالی عورت ہونے کے باوجود اس اعتبار سے حقیقی ہے کہ ہمارے سماج کی جیتی جاگتی عورت ہے جو اپنی تمام تر رعنائیوں، نزاکتوں اور کمزوریوں کے ساتھ نظر آتی ہے جو خود بھی تڑپتی ہے، بے قرار رہتی ہے اور اپنی آگ میں جلتی ہے اور دوسروں کو بھی اپنی آگ میں لپیٹ لیتی ہے۔ جہاں جسم و جان الگ الگ ہیں۔ محبت صرف روح کا رشتہ ہے لیکن یہ محبت معاشرہ میں موجود ہے اور حقیقی بھی ہے۔ اختر شیرانی کی رومانی شاعری میں نئے عہد کا مزاج ملتا ہے۔ حسرت موہانی کی غزل میں محبوب گھریلو عورت ہے جس میں شوخی بھی ہے اور چلبلا پن بھی ہے۔ یعنی حسرت کی شاعری عام انسان کے جذباتی اظہار کا نام ہے۔ حسرت کا عشق شگفتہ مزاج، معصوم اور صحت مند انسان کا عشق ہے ؎

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

یہ جذبات کی شاعری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ حسرت کے یہاں سیاسی موضوعات بڑے اہم ہیں۔ تحریک آزادی کے سلسلہ میں حسرت کی خدمات اور قربانیوں کا اثر اور جوش و ولولہ ان کی شاعری کی آبرو اور جان بن گیا ہے۔ جوش اس عہد کے شعراء میں سب سے زیادہ بالغ نظر شاعر نظر آتے ہیں۔ خصوصاً ان کی جنسی شاعری سچائی کا بے باک اظہار ہے جنسی شاعری ہمارے کلاسیکی ادب کا جزو ہے لیکن مقصدی ادب کے رواج پا جانے کے بعد جوش کا جنس کو شعوری طور پر برتنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسے بھی زندگی کی ایک اہم بنیاد مانتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہیں کہیں اور کبھی کبھی جمالیات اور جنس کے تجربات کو الگ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ان کا اسلوب بیان کے اعتبار سے قدیم سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جوش کی شاعری میں شباب اور سیاست دونوں کے رنگ گہرے ہیں وہ جذبہ کی سرکشی کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی اور سماجی زنجیریں ٹوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس بغاوت کی مثالیں "بنت رانی" کو مہتاب دکن کی عورت" اور اس قسم کی دوسری نظموں میں بکثرت ملتی ہیں

جوش کی شاعری میں انقلاب کے بھاری قدموں کی چاپ، توڑ پھوڑ تند و تیزی کے ساتھ حسن کی پھیلی ہوئی چاندنی۔ آنکھوں سے چھلکتی ہوئی شراب۔ فطرت کی رنگینیاں، یادوں کے پیکر اور گیسوؤں کے گھر سے سائے ملتے ہیں۔ جوش نے جتنی نئی تشبیہات اور استعارات استعمال کئے ہیں۔ اردو کے کسی جدید شاعر نے استعمال نہیں کئے۔ رباعیات میں خاص طور سے ان کی فکر ابھر آتی ہے۔ یہی فکر ان کی بے شمار نظموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ احساس کی IMAGES اتنی تند و تیز ہیں کہ اکثر لوگ ان کی فکر تک نہیں پہنچ پاتے۔ جوش ایک ایسے معاشرہ کا شاعر ہے جہاں آدمی سیاسی، تہذیبی، سماجی اور جنسی طور پر آزاد ہے مگر انتہا پسند نہیں۔ جوش کے یہاں محبت کی بنیاد ہمیشہ جنس پر رکھی گئی ہے اس لئے ان کا نظریہ محبت اختر شیرانی سے زیادہ ارضی ہے

جوش کے بعد جدید شعراء کا عہد آتا ہے۔ جنھوں نے جاگیردارانہ نظام کی بھول بھلیوں سے نکل کر صنعتی عہد میں داخل ہونے والے معاشرہ کے خال و خط کو لفظ عطا کئے اور ان سے تشبیہات و استعارات وضع کئے۔ اسی عہد میں دنیا کی مشترک تہذیبیں بننا شروع ہوئیں۔ جن کو اپنا کر سماجی شاعری کی ایک آفاقی سطح دریافت کی گئی۔ مثلاً غلامی کا مسئلہ معاشی آزادی کا مسئلہ بن گیا۔ ثقافت موازنہ کا ذریعہ بن کر انسانوں کی مشترک قدروں کی دریافت میں مدد دینے لگی۔ دل کی دھڑکنیں فکر و عمل سے ہم آہنگ ہوئیں

غالب نے جس آنے والے عہد کا شاعر اپنے آپ کو کہا تھا "میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں" وہی عہد ہے۔ اس عہد کے شاعر جاں نثار، سردار جعفری، فیض اور مخدوم ہیں۔ جس میں اختر الایمان اور عزیز حامد مدنی بھی شامل ہو گئے۔ راشد اور میراجی دونوں ہیئت کے شاعر ہیں۔ راشد عہد جدید کے ناسخ ہیں۔ میراجی ہندی اور سادہ الفاظ برتنے کی طرف مائل ہو گئے۔ فرائڈ کے نظریہ جنس کے اثرات میراجی پر زیادہ اور راشد پر کم مرتب ہوئے جس نے انھیں شاعر کے بجائے ایک کجروی کی زندگی عطا کی۔ میراجی راشد کے مقابلہ میں ایک تربیت یافتہ ذہن رکھتے تھے اس لئے وہ فرائڈ کے نظریات کی بنیادوں پر شعر نہیں کہہ سکے لیکن جنسی کجروی کے باوجود ایک صداقت ضرور ملتی ہے

اس عہد کا سب سے اچھا شاعر مجاز ہے جس کے نغموں کی بھرپور غنائیت بجائے خود اردو میں ایک جدید رنگ ہے۔ مجاز کی شاعری تانہ دم شگفتہ مزاج حسن پرست کی شاعری ہے اس کے یہاں جھنجھلاہٹ کم اور زندگی سے پیار زیادہ ملتا ہے اور پیار کرنے کا حوصلہ بھی۔ اسی وجہ سے اس کی نظمیں اس کی طاقت بن جاتی ہیں۔ موضوع سیاسی ہو یا محبت کا دونوں میں ایک ایسا غنائی لہجہ موجود ہے جس میں نشاط و سرمستی کے علاوہ بانک سچائی، خلوص، محبت اور ذہانت بھی شامل ہے۔ اس عہد کا سب سے بڑا المیہ بھی مجاز ہی کے یہاں ملتا ہے۔ مجاز تنہا ایسا شاعر ہے جس کا سر کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکا۔ حسن۔ انقلاب اور نئی زندگی کے گیت جس طرح مجاز نے لکھے ہیں اردو شاعری میں شاید ہی کبھی لکھے جاسکیں جس کے لئے خود مجاز کو اپنی زندگی کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ یہی نہیں کہ خود اپنے مذاق طرب آگیں کا شکار۔ یہ المیہ غالب اور یگانہ کے بعد تیسری مرتبہ اردو شاعری میں مجاز کے یہاں ابھرتا ہے۔ مجاز کی زندگی میں قدروں کے برتنے کا جو سلیقہ تھا اسی نے اسے ہر جگہ ناکام رکھا لیکن وہ ابر کی طرح برستا آیا تھا اور زندگی بھر گہر ریز رہا۔

فیض احمد فیض کی رومانی اور سیاسی شاعری نئے موسم کی شاعری ہے۔ سیاسی شاعری کی اس لئے زیادہ اہمیت ہے کہ اس میں اپنے عہد کی کش مکش سچ اور جھوٹ کی کش مکش بن کر نمودار ہوتی ہے لیکن غم کی بڑی شاعری فیض کے یہاں بہت کم ہے۔ فیض نے بحیثیت شاعر کے اپنے عہد کی سیاسی زندگی پر اثر ڈالا۔ وہ فکر اور جذبے کی کیفیت پر زور دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے سماجی شعور میں داخلی آہنگ ملتا ہے۔ فیض نے مغربی ادبیات کے مطالعہ کے بعد مغربی ذہن کو ہمارے کلاسیکی مذاق سے پیوند کیا۔ پاکستان میں خاص طور پر نئی نسل کو پروان چڑھانے اور اس کی ذہنی قیادت کرنے کا سہرا فیض کے سر رہا۔ لیکن آج خود فیض اپنے آپ کہیں کھو چکے ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال ہندوستان میں سردار جعفری اور ساحر کا ہوا۔ سردار جعفری کا شعری لہجہ کمزور ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کا مطالعہ شاعر کے بجائے سیاسی آدمی کی حیثیت سے کیا۔ اس لئے ان کی شاعری صحافتی زبان کے استعمال کی وجہ سے بے جان ہوگئی۔ لیکن ان کی بعض نظمیں جس میں "نئی دنیا کو سلام" بھی شامل ہے اس انداز سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی وجہ سے وہ دل کش بھی ہیں۔ ساحر کے یہاں احساس کی شدت اور پر اعتماد لہجے کے ساتھ موسیقیت اور ترنم بھی ملتا ہے۔ ساحر کی ابتدائی شاعری میں دوسرے شعراء کی طرح انقلابی نعروں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے نغموں میں غنائیت اور سنجیدگی آتی چلی گئی۔ ساحر اپنی رومانی نظموں خاص کر "تاج محل" اور "پرچھائیاں" کی وجہ سے کافی مقبول ہوئے۔ لیکن ان نظموں میں سیاسی و انقلابی جذبہ کی خام کاری زیادہ ہے۔ اپنی رومانی نظموں کے ذریعہ وہ نوجوان دلوں کو ضرور گرماتے رہے۔ لیکن جلد ہی وہ اس وقتی جذبہ کی گرفت سے نکل کر بڑھتی ہوئی زندگی کی طاقتوں سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ مخدوم محی الدین ایک ایسا شاعر ہے جو سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی منفرد نظر آتا ہے۔ اس کی آواز دور ہی سے پہچان لی جاتی ہے۔ مخدوم کی شاعری عشق کی بنیادوں پر رکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا عشق روائتی نہیں سچا اور حقیقی ہے۔ جس میں خودداری اور انا بھی ہے اور حضور حسن میں بھی سر تسلیم خم نہیں کرتا بلکہ خود حسن اس کا شیدائی ہے یہی خودداری اسے انقلاب کی طرف لے جاتی ہے۔ انقلاب کی رو اول اول مدھم رہی لیکن جلد ہی ماحول کی بیزاری۔ معاشی بحران۔ سیاسی توڑ جوڑ اور ناانصافیوں کی وجہ سے طوفان بن جاتی ہے۔ لیکن اس کے انقلاب میں تخریب کے بجائے تعمیر کے پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کے گیتوں کی نغمگی میں نشاط و سرمستی کے بجائے مزدوروں کی بے بسی، محرومی اور غریبوں کی بے کسی اور سسکتی ہوئی زندگی ملتی ہے۔ جس میں تڑپ بھی ہے اور کسک بھی۔ اس کے نغمے آزادی کے جوشیلے نغمے ہیں جو انسان کو نیا حوصلہ اور نئی توانائی عطا کرتے ہیں۔ جذبی کی ایک دو نظموں کو اگر ان کی شاعری سے علیحدہ کردیا جائے تو وہ غزل کے شاعر رہ جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں میر اور فانی کی سی یاسیت ملتی ہے۔ میر کی یاسیت زندگی کے تاریک پہلوؤں سے نمایاں ہوتی ہے اور جلد ہی متحرک اور روشن پہلوؤں میں ڈوب کر ابھرتی ہے فانی کی یاسیت چیخ بن جاتی ہے۔ جذبی کی یاسیت میر اور فانی کی ملی جلی یاسیت کا خوبصورت امتزاج ہے جس طرح ان کی نظموں میں غزل کی رمزیت اور ایمائیت پائی جاتی ہے اسی طرح ان کی نظموں میں ہلکا ہلکا انقلابی رنگ بھی ملتا ہے لیکن چونکا دینے والی کوئی بات

نہیں ملتی۔ جاں نثار اختر کے یہاں سیاسی اور سماجی انقلاب کے اور اک کی کمی ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں انقلاب نعروں کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اختر الایمان کی شاعری میں مانوس فضا کا احساس ملتا ہے۔ انتہا پسندی کے بجائے اعتدال پایا جاتا ہے۔ احساس کی شدت اور جذبات کا نکیلا پن فکر و شعور کے کانٹے پر تل کر سبک اور نرم ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے اختر الایمان کی شاعری توازن اور اعتدال کی اعلیٰ مثال ہے

عزیز حامد مدنی کی شاعری صنعتی زندگی کی ترجمان ہے۔ صنعتی زندگی میں تہہ در تہہ اتر کر نئے استعاروں اور علامتوں کی تلاش نے مدنی کو اس عہد کا بڑا شاعر بنا دیا ہے۔ اسی وجہ سے مدنی نئے شاعر ہیں۔ آج سمندر میں تارپیڈو ہے۔ صحراؤں اور شہروں میں تابکاری کے اثرات ہیں۔ محنت اور سرمائے کی جنگ، اجالے اور اندھیرے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ جنگلوں کی ہولناکیاں ہیں۔ ہزارہا خطرات میں گھرا ہوا انسان کہیں بے بسی اور کہیں بے کسی کا شکار ہے کہیں اپنے عہد کی استحصالی قوتوں سے نبرد آزما ہے۔ لیکن ان سب کے پیچھے ایک خوبصورت خواب چھپا ہوا ہے جو آنے والے مستقبل کی نوید ہے۔ کلاسیکی شاعری سے اتنا گہرا استفادہ مدنی کے یہاں ملتا ہے کہ بہت کم لوگ رمز و ایمائیت کی اس فضا تک پہونچنے میں کامیاب ہو سکے ہیں غزلوں سے زیادہ یہ فضا نظموں میں زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ وہ یونانی علم الاصنام، انگریزی۔ فارسی اور فرانسیسی شاعری کی صلاحیتیں، صنعتی عہد کے عذاب و ثواب کو آدمی کے جذبے اور احساس کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور جہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے مدنی ان کو نئے معنی دیتے ہیں، مجروح سلطان پوری ترقی پسند شاعروں میں وہ پہلے غزل گو ہیں جنھوں نے شعوری طور پر غزل کو نیا سیاسی لہجہ دیا اور بے باکی عطا کی۔ ان کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ موضوعات چاہے سیاسی ہوں، انقلابی ہوں، واردات ہوں یا ہنگامی کسی بھی نوعیت کے حامل ہوں ان میں جمالیاتی کیف رچاؤ۔ اور ادبی انداز نظر ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مجروح غزل کی روایت سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ان کا مزاج غزل کا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی غزلیں رسیلی اور تابناک ہیں جن میں نغمگی مستی اور سرشاری پائی جاتی ہے۔ فراق بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں انھوں نے نئے سرے سے نہ صرف غزل کی تشکیل میں حصہ لیا بلکہ شادگی رعنائی اور تابناکی بھی عطا کی۔ فراق کی غزلوں میں دست صبا کی نرمی پھولوں کا نکھار اور کلیوں کی مسکراہٹ پائی جاتی ہے۔ فراق نے پہلی مرتبہ پاک و ہند کی سرزمین سے غزل کا تعلق پیدا کیا۔ اسی تعلق کی وجہ سے ان کی غزلوں میں رچاؤ اور گھلاوٹ ملتی ہے انھوں نے ایک طرف اپنی شاعری کی بنیاد ماضی کی صحت مند روایات پر رکھی اور دوسری طرف عصر حاضر کی روح کی موسیقی کو اس میں شامل کر کے ماضی اور حال کا آئینہ دار بنا دیا ہے فراق نے غزل کو نیا اسلوب اور نیا مزاج عطا کر کے نئی زندگی سے ہمکنار کیا۔ علی جواد زیدی۔ ندیم قاسمی مجید امجد۔ یوسف ظفر۔ سلام مچھلی شہری نے بھی انسانوں کی بے بسی مجبوری اور محرومیوں کا سلیقے سے برملا اظہار کیا ہے ان کے یہاں افادیت کا نیا ادبی تصور، احساس کی شدت۔ چھوٹے بڑے مشاہدات کے ساتھ زندگی کے اہم تجربات بھی ملتے ہیں ان کے یہاں انقلابی نعروں کی گونج کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی شعور بھی ملتا ہے۔ انہی کے ساتھ آنند نرائن ملا۔ غلام ربانی تاباں۔ شمس زبیری۔ ذوالفقار علی بخاری۔ روش صدیقی اور دوسرے شاعر بھی ہیں۔ جن کے یہاں غزل کی روایت کا احترام ملتا ہے اور نئی روایتوں کو اپنانے کا جذبہ بھی۔

ان شاعروں کے بعد ابھرنے والوں شاعروں میں ناصر کاظمی جمیل الدین عالی۔ سلیم احمد۔ فضا ابن فیضی۔ شاذ تمکنت۔ وحید اختر وزیر آغا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ سجاد باقر رضوی۔ افتخار جالب درد سعیدی۔ ادا جعفری۔ رسا چغتائی۔ سرشار صدیقی۔ انجم اعظمی قابل اجمیری۔ شاہد عشقی۔ فرید جاوید احمد ہمدانی اور دوسرے شعرا شامل ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز کم و بیش [illegible] سے ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ گو آج کل وہ نظم کی طرف مائل ہیں۔ لیکن انھیں جو شہرت اور مقبولیت غزلوں کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی نظموں نے انھیں اسی قدر گوشہ گمنامی میں دھکیل دیا ہے۔ ناصر کاظمی کی غزل میں نئے پن۔ سادگی اور غنائیت کے ساتھ داخلی آہنگ زیادہ گہرا تھا اسی لئے ان کی آواز مانوس تھی۔ یہی مانوس لہجہ ان کی شہرت کا باعث بنا۔ جمیل الدین عالی نے ابتدا میں

بڑی کامیاب غزلیں کہیں لیکن جلد ہی وہ غزل سے دوسروں کی طرف آ گئے۔ دوسروں میں جو مقبولیت اور شہرت جمیل الدین عالی کو نصیب ہوئی اب تک وہ کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ سلیم احمد کا لہجہ نیا اور جاندار ہے۔ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے اعتبار سے سلیم اپنے ہم عصروں میں زیادہ منفرد نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کی شاعری کا ڈھانچہ زیادہ فکری اور شعوری ہے۔ رسا چغتائی حقیقی معنی میں ایک سچا غزل گو شاعر ہے جس کے یہاں جذبے کی صداقت، جذباتی کرب اور احساس کی شدت کے ساتھ درد خود آگہی کا احساس بھی ملتا ہے۔ آج کے عہد میں غزل کا مزاج نہ جانے اگر کہیں ملتا ہے تو صرف رسا کی غزل میں۔

میں آج سر آتش نمرود کھڑا ہوں

اب دیکھئے یہ خلق خدا کیا مجھے سمجھے

سرشار صدیقی اپنے مزاج، فکر اور لہجے کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ روایتی زندگی اور روایتی عشق کے بجائے متحرک زندگی اور صحت مند عشق کے قائل ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں، عشوہ طرازیوں اور ہیبت ناکیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے لہجے میں کہیں تلخی، کہیں للکار، کہیں پیار اور کہیں چیلنج کے ساتھ کاٹ نظر آتی ہے۔ انجم اعظمی کے یہاں صنعتی عہد کی علامتوں کو برتنے کی شعوری کوشش ملتی ہے اسی وجہ سے ان کی شاعری میں اس برق رفتار زندگی سے پیدا ہونے والے مسائل اور عام زندگی کی پیچیدگیوں کا بے باکانہ اظہار پایا جاتا ہے۔ شاہد عشقی کی شاعری جذبہ اور احساس کی شاعری ہے انکی شاعری میں احساس جمال، نرمی اور جو موسیقی ملتی ہے وہ غزل کی روایت کے اعتبار سے نہیں بلکہ عصر حاضر کی روح کی موسیقی اور اس کا جمال ہے اور اس احساس نے ان کے لہجے میں نرمی اور شگفتگی پیدا کر دی ہے۔

ــــہ ہم سے نفرت کرو کہ پیار کرو ✦ کوئی رشتہ تو استوار کرو

قابل اجمیری کا زندگی کے بارے میں جو رویہ رہا وہ اس شعر سے نہ صرف واضح ہو جاتا ہے بلکہ قابل کے لہجے کا بانکپن، تیور اور زندگی سے جس قدر پیار تھا اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے

ــــہ جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ ✦ زندگی کو مری ضرورت ہے

فرید جاوید کی تمام تر شاعری غزل کی شاعری ہے۔ اس کی غزل میں سپاٹ پن یا نام نہاد قسم کی جدیدیت نہیں ملتی۔ بلکہ معنوی اعتبار سے اس کی غزل شاعرانہ روایات کا سہارا لے کر زندگی کی نئی روایات کی تعمیر میں برابر کی شریک ہو جاتی ہے۔ شکیب جلالی اپنی فکر، افتادِ طبع لہجے اور صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک منفرد شاعر تھا۔ اس کی آواز جدید شاعری میں ایک نئی اور ابھرتی ہوئی آواز تھی۔ لیکن حالات کی بے رحمی نے اس کی آواز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دبا دیا۔ اور اردو شاعری ایک اچھے شاعر سے محروم ہو گئی اس کی پوری شاعری کا انداز اس شعر سے عبارت ہے

آکر گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر

تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

جدید تر نسل نے اپنی زندگی کی نئے سرے سے تفسیر شروع کی ہے اپنے معاشرہ کی تصویر میں اس نے جو رنگ بھرنے شروع کئے ہیں وہ اس کے اپنے ہیں جس میں اس کے مزاج، ذہنی رویوں، احساس جمال اور فکر کو بڑا دخل ہے کیونکہ اس نسل کا تمام تر مزاج جدید ہے اس لئے جدید میلانات و رجحانات کو سمیٹ کر جس طرح زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے اسی سے اس کے جدید ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔ مسائل زندگی ہوں یا معاملات عشق کی ترجمانی دونوں میں ایک نیا پن اور اظہار کے نئے پہلو نمایاں ہیں اسی لئے اردو شاعری میں جدید تر نسل کی ذہنی کیفیات اور طرز احساس کے ساتھ نئے امکانات، نئی فضا اور نئی روایات و اقدار کی تعمیر کا احساس ملتا ہے ساتھ ہی عصر حاضر میں ورثہ کے طور پر ملی ہوئی بے چینی، اضطراب، جذباتیت، جنسی اور ذہنی ناآسودگی، بے زاری اور درد و کرب کا اظہار بھی اپنے فطری انداز میں ملتا ہے ہر دور کے شاعر و ادیب کے لئے نامساعد حالات ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں بعض اس چیلنج کو قبول کر لیتے ہیں اور بعض سپر ڈال دیتے ہیں، اور مقابلے میں کہیں یاسیت اور کہیں رجائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نسل نے جس طرح اپنے عہد کے نامساعد حالات کے چیلنج کو قبول کیا ہے اور جس طرح حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کر رہی ہے اس سے اس کے کس بل، زندگی سے پیار

اور آگے بڑھنے کے حوصلہ کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے میرکی صحت مند یا سیت تک کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے اس نسل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے اس دور کے انسان کو اس کی تمام تر خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حقائق کا بے باکانہ اور حقیقت پسندانہ اظہار ہی اس کی سب سے بڑی صفت ہے۔ حالات کی عکاسی اور ذہنی کیفیات کے لئے اپنی جیتی جاگتی زندگی اور ماحول سے علامتیں وضع کرتی ہے اس عمل میں اس کے مشاہدات۔ بصیرت۔ فکر و شعور کو بڑا دخل ہے۔ جسم کی آگ اور شعلوں کی لپٹوں کے ساتھ فکر کی تازگی اور خیالات کا نکیلا پن ملتا ہے۔ مثلاً

ساقی فاروقی کی شاعری اپنے موضوعات۔ لہجے کے بانکپن اور فکر کے اعتبار سے جدید ہے وہ بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہے اور اس کا محبوب موضوع جنس ہے لیکن اس جذبے کے اظہار میں اس کے بیان میں ایک صداقت پائی جاتی ہے۔ جون ایلیا نے بڑی کامیاب نظمیں کہی ہیں لیکن ان کا مزاج غزل کا ہے۔ جون ایلیا کی غزل نئے خیالات نازک اور خوبصورت تراکیب۔ نئے استعارات نئی علامتوں فکر اور اسلوب کے اعتبار سے نئی ہے۔ شاذ تمکنت کے یہاں مینا کاری اور شہریار کے یہاں کچا پن ہے۔ سحر انصاری کی نظموں اور غزلوں میں ذہنی پختگی اور زندگی کا گہرا شعور ملتا ہے۔ نئے شاعروں میں عبید اللہ علیم۔ بشیش سلیمی۔ سلیمان اریب بلراج کومل۔ احمد مشتاق۔ ناصر زیدی۔ کرشن موہن۔ حرمت الاکرام کمار پاشی۔ پرکاش فکری۔ عمیق حنفی۔ حفیظ آذر اور رشی فاروقی کے نام شامل ہیں۔ خواتین میں عرفانہ عزیز، طلعت اشارت اور فہمیدہ ریاض کے نام قابل ذکر ہیں۔ میری رائے میں فہمیدہ ریاض عورتوں میں فیض کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔

آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ میر غالب اور مومن کے دور میں جتنی اعلیٰ شاعری ہوئی اور جو جو اضافے اس دور میں ہوئے اس کے بعد اگر کوئی اس معیار تک پہونچنے میں کسی قدر کامیاب ہوا ہے تو وہی جدید تر نسل ہے

خارجی اثرات ہوں یا داخلی آہنگ دونوں اعتبار سے میر غالب و مومن کے دور تک کی تمام تر توانائیاں اور وسعتیں ہمیں آج [illegible] کی شاعری میں نظر آتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ میر۔ غالب اور مومن کے دور میں جو بے اطمینانی انتشار کرب دبے چینی تھی وہی آج کے دور میں ذرا مختلف انداز میں پائی جاتی ہے اس لئے قدرتی طور پر آج کی شاعری کسی نہ کسی طرح میر غالب اور مومن کے دور اور اس کے بعد کے دور کی شاعری سے قریب تر ہو جاتی ہے کیونکہ آج کی شاعری میں میر کی دردمندی۔ غالب کی خوش فکری۔ مومن کی نازک خیالی۔ حالی کی سادگی حسرت کا بھولا پن۔ فانی کی غم پرستی جگر کی سرمستی۔ یگانہ کے تیور۔ مجاز کی معصومیت بڑے واضح طور پر نظر آتی ہے یہی اس کی کامیابی اور بڑائی کی دلیل ہے۔

ادب

ادیب کی اعلیٰ شعوری قوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسے اس کے معمولی تجربات اور ہیجانات کا نتیجہ قرار دے کر نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہو سکتا اچھا ادب وقت کی چیز ہونے ہوتے بھی ہر وقت کی چیز ہوتا ہے۔ اسلئے اس میں انسانی شخصیت کی جو بالیدگیاں اور امکانات چھپے ہوتے ہیں انھیں بھی دیکھنا چاہیئے۔ زندگی اور انسانی فطرت کو اس کی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ سمجھنا چاہئے۔ روایت اور تغیر کا احساس رکھنا چاہیئے اور رائے دینا چاہیئے کہ کسی ادیب نے کہاں تک زندگی کو حقیقی مسرتوں سے معمور کیا ہے۔

(پروفیسر احتشام حسین)

ادب کو اظہار ذات کہا گیا ہے اس سے خطرناک جھوٹ شاید ہی ممکن ہو کیونکہ ہماری ذات کا اظہار تو ہمارے ہونٹوں سے نکلنے والے ہر جملے، ہمارے قلم سے نکلنے والے ہر لفظ، ہمارے لباس کی ہر شکن اور ہمارے رہن سہن کی ہر ادا سے ہوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی صرف اظہار ذات کی بنا پر ادب نہیں بن جاتی۔ ادب کو عصری زندگی کا آئینہ کہا گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تاریخ یا روزنامچے ادب کی سب سے بڑی صنف قرار پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب نہ محض اظہار ذات ہے نہ محض عصری عکاسی بلکہ ذات اور خارج کے درمیان نقطۂ ربط کی تلاش ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فن دراصل توسیع ذات کا عمل ہے۔

(ڈاکٹر محمد حسن)

ڈاکٹر اسلم قریشی

حالیؔ کی شخصیت

شمس العلماء الطاف حسین حالی کا شمار اردو ادب کی فرشتہ منش شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ حالی کا نام آتے ہی ذہن میں خاکساری۔ دردمندی۔ دلسوزی۔ شرافت اور قناعت پسندی کے تصورات ابھرتے ہیں۔ شاعر ہو سوانح نگار ہو۔ ادبی تنقید ہو۔ عام زندگی ہو۔ عادت مزاج اور روزمرہ کا معمول ہو کسی پہلو کو دیکھئے کسی گوشے پر نگاہ ڈالیے یہ عناصر ہر جگہ نمایاں ہیں۔ مولانا حالی کی پوری زندگی میں انہیں کی کارفرمائی ملتی ہے۔ حالی کی تصانیف میں جو عظمت بلندی اور گہرائی نظر آتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی عناصر ہیں۔

حالی نے اپنی مختصر سوانح میں لکھا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد میں ان کے والد کے علاوہ کسی اور نے کوئی ملازمت نہیں کی اور محض اس مدد معاش پر قانع رہے۔ جو پرانے زمانے میں مختلف سلاطین کی طرف سے عطا ہوتی رہی تھی۔ گویا قناعت پسندی حالی کی خاندانی میراث تھی حالی نے اس خاندانی ورثے کو زیادہ پرعظمت بنا دیا ان کی زندگی کا بڑا حصہ ملازمت میں گذرا لیکن جب سرسید کی تحریک پر ان کے لیے حیدرآباد سے وظیفہ مقرر ہو گیا تو انہوں نے فوری طور پر ملازمت کو خیرباد کہا۔ اور پوری تندہی اور انہماک کے ساتھ علمی اور ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے اس قسم کی قناعت پسندی کی مثالیں ذرا کم ہی ملتی ہیں۔ بے نفسی اور بے نیازی کی اس شان کا مظاہرہ آسان بھی تو نہیں۔

حالی کو علم سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ ان کی پرورش ان کے بھائی بہنوں نے کی تھی خود ان کا بیان ہے کہ مجھے باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقعہ نہیں ملا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اوائل عمری میں وہ پانی پت کے مشہور اساتذہ سے فیض حاصل کر رہے ہیں کبھی سید جعفر علی سے فارسی کا درس لے رہے ہیں اور کبھی حاجی ابراہیم حسین سے صرف و نحو پڑھنے میں مشغول ہیں یہی نہیں تحصیل علم کے سلسلے میں حالی نے جس ایثار اور ضبط نفس سے کام لیا ہے اس کی مثال تو شاید ہی کہیں مل سکے۔ سترہ برس کی عمر میں حالی کو بھائی بہن کے حکم پر شادی کرنا پڑی بھائی بہن نے حالی کی پرورش کی تھی۔ ان کے بڑے حقوق تھے۔ حالی کے نزدیک ان کی ہر خواہش حکم کا مرتبہ رکھتی اس لئے علمی تکمیل کے بغیر انہیں شادی پر مجبور ہونا پڑا ظاہر ہے کہ اب تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے بند تھے۔ حالات کا تقاضا یہ تھا کہ حالی ملازمت تلاش کرتے اور مادی آسائش کی جستجو میں مبتلا ہو جاتے۔ لیکن علمی ذوق کا تقاضا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ حالی کے دل میں ایک لگن تھی ایک ہی شوق تھا۔ تحصیل و تکمیل علم جس کی بظاہر کوئی امید نہ تھی۔ نوجوان حالی نے حالات کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ بیوی کا میکہ خوشحال ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں بیوی کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اور پھر انہوں نے ایک

فیصلہ کر لیا زندگی کا انتہائی اہم اور علمی ذوق و شوق کے اعتبار سے عدیم النظیر فیصلہ۔ وہ گھر والوں سے روپوش ہو کر خاموشی سے دلی چلے گئے اور پوری تندہی سے تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے۔ حالی کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا معنی خیز اور اہم ہے اس سے ان کی شخصیت کو سمجھنے اور تجزیہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

دلی میں حالی کی ملاقات مرزا اسد اللہ خاں غالب سے ہوئی، یہ دور دلی میں ادب و شعر کا زریں دور تھا۔ بادشاہ سے لے کر عام آدمی تک شاعری کے نشے میں سرشار تھا دلی کے در و دیوار سے نغمے پھوٹ رہے تھے اور اردو شاعری میں فکر و فن کی عظمت نمایاں ہو رہی تھی۔ غالب نے حالی کے ادبی ذوق کی تربیت کی انہوں نے اپنے فارسی کے چند قصیدے حالی کو پڑھائے۔ اور پھر فن شعر میں ان کی رہنمائی کی۔ مرزا کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر سے منع کرتے تھے۔ مگر حالی نے جو ایک آدھ غزل اردو اور فارسی کی انہیں دکھائی تو غالب بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا۔ لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے۔ غالب کے اس مشورے سے حالی کی شاعرانہ شخصیت نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے کوئی اور ہوتا تو غالب کی یہ رائے سن کر اپنے آپے میں نہ رہتا لیکن حالی ہمیشہ بہتر سے بہتر کی جستجو میں رہے اور انہوں نے کوشش پیہم کو اپنا مطمع نظر بنایا۔

حالی نے یادگار میں لکھا ہے کہ غالب اعتراف کمال میں وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے۔ لیکن جب تک وہ پوری طرح متاثر نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت تک خاموش نہیں رہتے تھے۔ حالی کے بارے میں انہوں نے جو کچھ کہا بہت سوچ سمجھ کر اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہا۔ اس سے حالی کی فنی عظمت اور شاعرانہ بلندی کے ساتھ ساتھ غالب کی جوہر شناسی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

غالب نے حالی کی شخصیت میں شعر کا احساس پیدا کیا تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اس احساس کو بیدار بنا دیا۔ حالی نے خود کہا ہے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

شیفتہ مبالغہ کرنا ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادھی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ حالی کی طبیعت میں بھی یہ جوہر پہلے سے موجود تھا۔ شیفتہ کی صحبت سے اس کی تکمیل ہو گئی۔ صحیح بات یہ ہے کہ حالی کی ادبی شخصیت کو جو فائدہ شیفتہ سے پہنچا ہے وہ کسی اور سے نہیں پہنچا۔

شیفتہ کی وفات کے بعد حالی لاہور گئے۔ انہیں انگریزی کتابوں کے اردو ترجموں کی عبارت درست کرنے کی خدمت سپرد کی گئی اس طرح انہیں انگریزی ادب کی خصوصیات سمجھنے کا موقعہ ملا حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو حسن بیان سے دلفریب بنانا حالی کی فطرت بن چکا تھا۔ یہاں اس فطرت کو چمکنے کا موقعہ ملا اور نظم اردو کے مشاعروں نے انکی ادبی شخصیت کے اس رُخ کی تکمیل کردی۔ سرسید احمد خاں نے حالی کی ادبی شخصیت کو نیا رُخ عطا کیا اور وہ فروتنی۔ انکساری۔ دردمندی اور خلوص جو ابھی تک حالی کی ذات میں محدود تھے۔ پوری قوم کا سرمایۂ افتخار بن گئے۔ حالی نے ان شخصی عناصر سے فائدہ اٹھا کر ادب کو قومی تطہیر کا موثر ذریعہ بنا دیا۔ یہ ان کی شخصیت کا اہم ترین اور عہد آفریں کارنامہ ہے۔

حالی نے اپنی تمام ادبی تحقیقات میں غیر معمولی [illegible] کا ثبوت دیا ہے۔ سوانح عمریوں میں اس بات کی پوری [illegible]

ہوتا ہے کہ سوانح نگار ممدوح کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت بھی اُبھار کرتا چلا جائے۔ اور اپنی انا کو ہر موقع پر نمایاں اور غالب ثابت کر دکھائے۔ یہ طریقۂ کار بڑائی حاصل کرنے اور تسکین نخوت کے لئے بڑا موثر ہے لیکن حالی نے اس قسم کے طریقۂ کار کو کبھی روا نہیں رکھا۔ یادگار غالب میں انہوں نے ایک جگہ ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ جس میں ان کے اور مرزا غالب کے مابین ایک نوع کی بیت بازی ہوئی تھی۔ یہاں حالی چاہتے تو اپنی شخصیت کو نمایاں کر لیتے لیکن انہوں نے حد درجہ انکسار سے کام لیتے ہوئے یہ لکھا ہے "مجھ کو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی مرتبہ کلام کے سامنے اپنا معمولی اور بے وقعت کلام پیش کروں"۔ یہ انکسار حالی کی شخصیت کا وہ مؤثر اظہار ہے جسے سمجھے بغیر ان کی شخصیت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ شاعری میں بھی انہوں نے اسی انکسار سے کام لیا ہے۔

دردمندی۔ دلسوزی اور خلوص حالی کی شخصیت کے دوسرے نمایاں اوصاف ہیں۔ اسی دردمندی اور خلوص نے ان سے مسدس مد و جزر اسلام جیسی مؤثر اور عہد آفرین نظم لکھوائی اسی دردمندی اور خلوص نے حالی کو ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لینے کا پابند رکھا۔ اودھ پنچ میں حالی پر کیا کیا اعتراضات نہ ہوئے، کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ سرسید کی تحریک کے نقیب تھے۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ انہوں نے اردو ادب کو طرح نو سے آشنا کیا اور قدامت پسندی اور روایت پرستی کے سارے بت توڑ دیئے لیکن شریف النفس حالی نے کسی اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کسی اعتراض سے بد دل نہ ہوئے اور آخر میں ہوا یہ کہ اودھ پنچ کا استہزا، تمسخر اور اعتراضات تو ہوا ہو گئے لیکن حالی کی شرافت اور نیک نفسی کا افسانہ باقی رہ گیا۔ شاید یہ افسانہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ چپ کی داد اور مناجات بیوہ بھی حالی کی اسی دردمندی کا موثر اظہار ہیں۔ اور انہیں پر کیا منحصر کوئی تصنیف اٹھا کر دیکھ لیجئے نظم ہو یا نثر۔ حالی کی شخصیت کا یہ پہلو ہر جگہ نمایاں ہے۔

حالی نیک نفس۔ پاک نہاد اور خلوص کے پیکر تھے بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ ان کا معمول تھا۔ وہ قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ مولوی عبدالحق نے حالی کے بارے میں لکھا ہے۔ "اب بھی بہت سے صاحب علم و فضل۔ باکمال۔ ذی وجاہت اور نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں" یہ حالی کی شخصیت پر بہترین تبصرہ ہے اور اسی تبصرے سے حالی کی شخصیت کا صحیح اندازہ ممکن ہے۔

انیسویں صدی

کے وسط میں انگلینڈ کی ایک شاعرہ نے مشہور ناشر "لانگ مین" سے اپنی نظموں کا مجموعہ شائع کرنے کی درخواست کی تھی جس کے جواب میں ناشر نے شاعرہ کو لکھا کہ "محترمہ! ان دنوں نظموں کا مجموعہ شائع کرنے کی درخواست نہ کیجئے آج کل کوئی نظمیں نہیں پڑھتا اس کے بجائے علم مبطخ (کوکری) سے متعلق کوئی کتاب لکھ سکتی ہوں تو لکھیئے" اس خط کے ذریعہ ناشر نے شاعری کا مجموعہ شائع نہ کرنے پر معذرت کے علاوہ طنز بھی کیا تھا حقیقت میں اس نے کھانا پکانے کی کتاب لکھنے کی فرمائش نہیں کی تھی لیکن اتنے بڑے ناشر کی طرف سے شاعرہ کو اتنی بڑی پیشکش ہوئی تو اس نے چند دنوں کے لئے شاعری ترک کر دی اور کتاب لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد شاعرہ اس کتاب کا مسودہ لیکر ناشر کے پاس گئی۔ لانگ مین یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوا لیکن جب شاعرہ اس کا خط دکھا کر کہا کہ اس نے یہ کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی تو وہ مجبور ہو گیا۔ ۱۸۴۵ء میں اس نے (ELIZA ACTION) کی یہ کتاب "ماڈرن کُکری" کے نام سے شائع کی اور اس کا پہلا ایڈیشن خلاف توقع چند دن میں فروخت ہو گیا۔ لیکن لانگ مین نے اس کتاب کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد جب اس شاعرہ کی نظموں کا مجموعہ شائع کیا تو اس کی ایک جلد بھی فروخت نہیں ہوئی چنانچہ لانگ مین نے شاعرہ کو بلا کر کہا۔

"دیکھا آپ نے۔ میں نہ کہتا تھا کہ عوام کا مذاق کتنا بدل چکا ہے"

شمیم احمد

کلچر — ایک سوال

جو قوم زندہ آثار و اعیان سے تعلق نہیں رکھتی اسکا مقام ممی خانے میں تو ہو سکتا ہے مگر وہ زندہ وجود نہیں بن سکتی

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی
کہئے کیا بات دھیان میں آئی؟

پاکستان میں پچھلے بیس۲ سال سے لوگ کلچر کے نام پر کنارہ چلانے کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ یعنی اس میں پاکستان عوام اور کلچر زیادہ اہم ہو کر ابھرتا ہے۔ دراصل کلچر کے وسیع سے وسیع مفہوم کو بھی اگر پیش نظر رکھا جائے تو بھی ہمارے یہاں اس کا ایک باقاعدہ اور سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے طور پر نافذ کرنا محال ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں مذاہب کلچر کے وسیع سے وسیع تر مفہوم پر حاوی اور زیادہ کامیابی سے نافذ رہے ہیں۔ جہاں فرد سے لے کر معاشرے تک ایک ہی نظامِ خیال اور ایک رنگ میں ڈھل جانے اور ایک مکمل اکائی میں جانے کی خواہش اور آئیڈیل پہلے ہی سے رکھتے ہوں وہاں کلچر کی گنجائش اور ضرورت ذرا کم ہی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کلچر کا سوال اٹھانے والے عموماً وہ حضرات ہیں جو ایک پورے اور مکمل نظامِ خیال، نظریہ حیات اور معاشرتی ہم آہنگی کو مذہب کی مقصدیت اور ادعیت سے بچانا چاہتے ہیں۔ اس لئے مجھے اس مضمون میں کلچر کی تعریف، ضرورت، یا اہمیت کا بالکل ذکر نہیں کرنا ہے بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ اب تک کلچر کے حامیوں نے پاکستان کے مستقبل اس کے آئندہ طرزِ احساس اور اس کی ذہنی اور فکری راہیں کیا کیا متعین کی ہیں۔ آفت یہ ہے کہ کلچر کوئی ڈھور کا ڈبہ نہیں ہے جس کو برآمد کر کے پاکستان کی قدر کو بدلا جا سکتا ہے۔ کلچر کے داعی خواہ اس کے حق میں کتنے ہی شجاع دلائل لائیں اور اس کو پاکستان کی اجتماعی زندگی کے لئے سواد کتنا ہی ضروری کیوں نہ قرار دیں مگر اس کا تعلق اس کا ربط ہمارے وجدان، ہمارے شعور سے بلاواسطہ یا بالواسطہ اگر نہیں ہے تو پھر اس کا ہونا نہ ہونا ہمارے لئے برابر ہو گا۔ اگر مغرب نے اپنے مذہب کی جگہ بعض خواہشات اور مصلحتوں کا ایک ایسا کلچر تیار کر لیا ہے جو اس کی روح کو بھی تسکین دیتا ہے اور اس کی استعماریت کو بھی تو کوئی ضروری نہیں کہ پاکستان میں بھی اس کا تجربہ ضرور کیا جائے۔ اور یہ ممکن بھی نہیں کیونکہ ہمارے معاشرہ کی باطنی ترتیب ممکن ہے کہ وہ نہ رہی ہو جو مغربی معاشروں کی رہی ہے۔

اجتماعی خواہشات ہر فرد کی طرح معاشرہ کی بنیادی حیثیت پر قائم رہتی ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ بسماندہ اقوام اور معاشروں نے طاقتور اور غالب معاشروں اور قوموں کو اپنے لئے ہر سطح پر آئیڈیل اور نمونہ بنا لیا ہو لیکن کسی زندہ معاشرہ نے کسی طاقت ور معاشرہ کی تمام تر نقالی میں کبھی بھی کامیابی حاصل نہیں کی اور اگر کبھی کی بھی ہے تو وہ بہت جلد ایک مردہ معاشرہ بن گیا ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ بہ یک وقت طرزِ معاشرت اور طرزِ احساس من و عن غیر میں رائج ہو جائے یا اپنی طرزِ احساس کی جگہ مکمل طور پر باہر کی طرزِ احساس سے لے لے۔ ایک معاشرہ دوسرے معاشرے کا تتبع ضرور کرتا ہے اور یہ تاثر پذیری بھی صرف اسی وقت عمل میں آتی ہے جب ایک

معاشرہ اتنا اقتدار یا طاقت حاصل کرلے جس سے ذہنی طور پر پس ماندہ معاشرہ یا قوم تاب مقابلہ نہ لاسکے یہی وہ بنیادی فرق ہے کہ انسانی خواہشات کے تمام تر اشتراک اور یکسانی کے باوجود دنیا کا ہر خطہ دوسرے خطے سے مختلف طرزِ احساس اور مختلف طرزِ معاشرت کا حامل نظر آتا ہے۔ حد یہ ہے کہ مغرب کا یہ خود بھی امریکہ جا کر رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ہم مغرب کی بے پناہ طاقت اور مادی ترقی کے آئیڈیل کے ساتھ اس کی معاشرت بھی اختیار کر سکتے ہیں اور وہ معاشرت جو آج کے فرانس، کل کے برطانیہ اور آج کے امریکہ میں نظر آرہی ہے جہاں کا ہر صاحبِ فکر اس بات کا ماتم کر رہا ہے اور اس کا سدِّ باب تلاش کرنا چاہتا ہے کہ مغربی معاشرہ زوال پذیر ہے اگل سڑ رہا ہے۔ اس ظاہری شان و شوکت کے تمام طمطراق کے باوجود اس کا باطن اس کے ظاہر کے سامنے دم توڑ رہا ہے۔ اب ہمارے لئے سیدھا سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایٹمی ترقی کے ساتھ نائٹ کلبوں کی ننگی خواہشات بھی ساتھ لانا چاہ رہے ہیں؟ ہمارے بعض بہی خواہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کی معاشرت نہیں تو کیا آپ طیارہ حاصل کرلیں گے اور ایئر ہوسٹس کو وہیں چھوڑ آئیں گے۔ مگر جناب والا

کہاں کو ہاں کا ڈر ہے کہاں کو ہاں تو ہو گا

دوسرے حضرات وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ قوت اور اقتدار تعالی سے حاصل ہو جاتا ہے لیکن وہ ہمیں یہ بالکل نہیں بتاتے کہ کوئی معاشرہ اپنی پوری شخصیت اور امکانات کے ساتھ جس عمل سے گزرتا ہے وہ کیا ہوتا ہے وجہ اس کی صاف ہے کہ یہ عمل کسی کلیئے یا خواہش کا رہینِ منت نہیں ہوتا۔ قومیں اور معاشرہ کیسے بنتے اور ترقی کرتے ہیں اور کیسے بگڑتے اور زوال پذیر ہوتے ہیں اور یہ عمل ان میں کب کب ہوتا ہے؟ اس کا پتہ چلانا آسان کام نہیں ترقی کرنے والا معاشرہ کس لمحے اس عمل کے دائرے میں داخل ہوتا ہے جس سے اس کا مستقبل تابناک اور موثر بن جاتا ہے اس کی دریافت کا کوئی پیمانہ آج تک انسانی فکر کی تاریخ نہیں بنا سکی۔ مثلاً ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ باوجود اتنی قوت طاقت اور فکر کی اتنی وسعت کے مغربی معاشرت کیوں کر زوال پذیر ہو رہی ہے اور یہ بھی کہ کم و بیش پچاس سال سے الوکے بہترین دماغ اس کا تجزیہ کرنے اور اس کا حل پیش کرنے میں لگے ہوئے ہیں مگر اس تمام تر شعوری کاوش کے نتیجے میں ان کی حالت بد سے بدتر کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ اور اسباب و علل اور وسائل کے اس پورے شعور کے بعد بھی یہ عمل کیوں نہیں رُک پاتا ہے؟ اس کا جواب دیئے بغیر ہم پاکستانی اپنے مستقبل کا کوئی راستہ متعین نہیں کر سکتے۔ یہ یاد رکھیے کہ اگر ہمارے معاشرہ کی باطنی قوت زندہ نہیں ہے تو ہم بھوت تو بن سکتے ہیں مگر ایک جیتا جاگتا وجود نہیں یہ باطنی قوت کیسے حاصل ہوتی ہے اگر اس کا جواز الامانت اللہ کئی سو دانشور دے سکیں تو پھر شاید آپ کی اور میری دونوں کی مشکلات حل ہو جائیں، مجھے افسوس ہے کہ باطنی قوت! منفرد طرزِ احساس کی پیدائش کسی قوم کی تہذیب کو بنانے میں سب سے اہم کام انجام دیتی ہے جس کو پیدا کرنا اور جس کو جاری و ساری کر دینا آپ کے ہاتھ میں ہے اور نہ ہاتھ میں۔

کلچر ہماری ضرورت ہے یا نہیں یہ تو دانشور جانیں مگر اپنے اخباروں سے اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اس دور میں مختلف ملکوں کے درمیان ایک اہم رابطہ ضرور قرار پاتا جا رہا ہے میرے ایک دوست تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ انڈونیشیا کی تمام فلسفہ اور ادب پر لکھی ہوئی کتابوں سے انڈونیشیا کی جو روح اور روشنی ہم تک نہیں پہونچ سکی تھی وہ روشنی ان کی رقاصاؤں کی پنڈلیوں اور کولہوں نے ہمارے دلوں کی گہرائیوں تک پہونچا دی ہے۔ میں بھی ایسی باتوں پر جان دیتا ہوں لیکن غالباً کلچر کے بعض مخلص حامیوں کا نقطہ نظر اس کے علاوہ اور بھی ہے اس لئے مجھے سب سے پہلے ان حضرات کے خیالات اور سوالات آپ کے سامنے پیش کر دینے ہیں جو انھوں نے بڑے کرب اور درد کے ساتھ اٹھائے ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز بٹالوی نے اس سلسلے میں بنیادی سوال یہ کیا تھا کہ ہمارا تہذیب سے ہمارا تعلق جب تک متعین نہیں ہوگا اس وقت تک کلچر کے بارے میں ہمارا طرز احساس متعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں انھوں نے گندھارا تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے اسے پاکستان کے ماضی کا ایک اہم ورق قرار دیا ہے۔ اعجاز بٹالوی صاحب کے اس خیال سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی قوم کا تعلق جبتک اسکے ماضی کے اس تمام ورثہ سے قائم نہیں ہوگا جو پوری انسانیت کا بہت اہم اور قابل قدر ورثہ رہا ہے اس وقت تک ہم اپنے آپ کو دریافت نہیں کرسکتے۔ اس سوال کی معنویت کو پانے کے لیے مجھے اپنے آپ سے چند سوال کرنے پڑے

کیا دنیا کی تمام قومیں کسی نہ کسی خطۂ زمین پر آباد نہیں ہیں؟

کیا مختلف خطوں میں مختلف اقوام اور معاشرے فنا نہیں ہوتے رہے ہیں؟

کیا بعض اقوام میں دوسری حملہ آور اقوام کا خون شامل نہیں ہوتا رہا ہے، اور کیا ان تمام اقوام کی سینکڑوں سالہ تاریخ بعض بنیادی تبدیلیوں سے آشنا ہونے کے بعد فنا ہو کر دوسری اقوام کے لیے جگہ خالی نہیں کرتی رہی ہے؟

ان تقریباً تمام یکساں سوالات سے میں جس نتیجہ پر پہونچنا چاہتا ہوں وہ یقیناً آپ نے بھانپ لیا ہوگا۔ ہر قوم اپنے آثار اور علامات میں اس وقت تک دلچسپی لیتی ہے اور اس تک ماضی کا تمام اور طرز احساس اسی وقت تک پہونچتا رہتا ہے۔ جب تک اس کے رشتے ماضی سے زندہ علامات تصورات اشیا اور طرز احساس کی صورت میں قائم ہوں۔ مردہ اشیا اور مردہ طرز احساس سے کوئی قوم زندہ رشتے اسوقت تک استوار نہیں کرسکتی جب تک وہ کسی قوم کے شعوری اور غیر شعوری عمل اور حرکت میں موجود نہیں ہوتے۔ جو چیز مجھے خواب میں بھی دکھائی نہیں دیتی وہ نہ میرے زندہ شعور کا جزو ہے نہ اجتماعی لاشعور کا حصہ بنتا ہے۔ پہلے بھی مغربی پاکستان میں کچھ اقوام آباد تھیں شاید گندھارا تہذیب سے پہلے ہزاروں سال پہلے بھی موجود رہی تھیں۔ ہوں جس کے آثار اگر اب بھی نہیں تو کل دریافت ہو جائیں۔ سوال یہ ہے کہ ان سب سے ہمارا باطنی رابطہ کس طرح قائم ہے انسان کا وجود کیسے ہمارے لیے کوئی معنی رکھتا ہے؟ اگر یہ ربط موجود ہے تو وہ پاکستان کے ہر فرد کی شخصی تعمیر اور نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کی نفسی قوت میں بھی ایک عنصر کی حیثیت میں کام کر رہا ہوگا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو خواہ ہمارا تمام بعد اور گندھارا تہذیب ہماری تاریخی عظمت کو چار چاند لگا دے مگر وہ پاکستان کی زندہ تاریخ اور تہذیبی شخصیت کا حصہ بن ہی نہیں سکتے کیونکہ ہم اس سے زندہ اور متحرک رشتہ نہیں رکھتے ——— کلچر کے ہر مفہوم کے اعتبار سے جب تک ہمارا ماضی زندہ رشتوں کی صورت میں قوم کی اجتماعی خواہشات میں شامل نہیں ہوگا اس وقت تک اس سے ہماری قومی شخصیت اور تاریخ کا ہر رشتہ ایک ناجائز رشتہ ہوگا، جو قوم زندہ آثار و اعیان سے تعلق نہیں رکھتی اس کا قیام محض خانے میں تو ہوسکتا ہے مگر وہ زندہ وجود نہیں بن سکتی۔ کیونکہ ایسی قوم کا کوئی عنصر بھی نہ اختیاری ہوسکتا ہے اور نہ حرکی ——— "قوم" اور "فرد" ماضی کے ضمن میں ہم معنی الفاظ ہیں۔ میرا وجود خود ایک تاریخی، معاشرتی، سماجی، فکری اور زندہ حقیقت ہے اور میرا ہر فعل ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک زندہ رشتہ رکھتا ہے۔ اقوام بھی اسی وقت تک صفحۂ عالم پر جانی پہچانی جاتی رہیں گی۔ جب تک ان کا عمل، ارادہ، فکر اور شعور بیک وقت ان دو زندہ رشتوں کو جنم دے رہا ہوگا۔ اگر ایک فرد یا قوم دونوں زوال پذیر یا فنا ہوچکی ہوں تو وہ اقوام عالم کا مردہ عنصر ہیں۔ جس سے ان کی قومی خصوصیات، طرز زندگی، رسوم و رواج، رہن سہن اور ان کے فطری اور قدرتی جوہر اور خصوصیت کا اندازہ تو کیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ تاریخ اور اقوام کے زندہ دھارے میں کسی اضافے کے باعث نہیں ہوتیں۔ بلکہ اضافی ہو جاتی ہیں۔ قصہ مختصر کیا گندھارا تہذیب سے ہمارا کوئی زندہ رشتہ موجود ہے؟ اگر نہیں تو وہ پاکستانی قوم کے میلان فکر کو بیدار کیسے

بن سکتی ہے؟ ہاں ہمیں اس کا احترام اس لئے کرنا چاہیئے کہ وہ
کسی ہمارے خطے سے لازمی اور زندہ رشتوں کی صورت میں پیوند
ہیں جس طرح ہم اس زمین سے پیوست ہیں (اور ہو سکتا ہے کہ چند
ہزار سال بعد ہم نہ ہوں اور کوئی اور ہو) مگر یہ طے ہے کہ گندھارا
تہذیب پاکستانی قوم کی تہذیبی شخصیت اور قومی شعور کے لئے
ایک مردہ اور بے معنی سرمایہ ہے۔ اگر اعجاز بٹالوی کو اس سے رشتے
جوڑنے کی اس لئے خواہش ہے کہ مغربی اقوام نے اسے ایک
فیشن بنا رکھا ہے تو مجھے اس پر کسی اعتراض کا حق نہیں پہنچتا۔
مگر اس صورت میں ایک گندھارا کیا۔ کپل وستو اور گیا کا چپہ چپہ
ہمارے لئے قابلِ احترام ہے۔

تقریباً یہی معاملہ اُن دانشوروں کے ساتھ ہے۔ جو
کلچر اور پاکستانی تہذیب کا سراغ لگاتے ہوئے اپنا رشتہ "موہن
جوداڑو" اور "ہڑپہ" سے جوڑتے ہیں فیشن سے قطع نظر کیا یہ
دانشور واقعی اپنی روح کی گہرائیوں میں اس رشتہ کو صداقت کے
ساتھ محسوس کر رہے ہیں؟ کیا واقعی "موہن جوداڑو" اور "ہڑپہ"
کے آثار سے ہمارا کوئی ایسا تعلق موجود ہے جو ہمارے انفرادی اور اجتماعی
وجود کا ایک حصہ محسوس ہو رہا ہے؟ ان دانشوروں کی دانش میں
اتنی موٹی سی بات نہیں آتی کہ "موہن جوداڑو" اور "ہڑپہ" کے آثار
کی عظمت اس میں نہیں ہے کہ ہم اپنا رشتہ کسی نہ کسی طرح
اُن سے ٹانک دیں بلکہ وہ ساری انسانیت اور انسانی تاریخ
کی راہ کا وہ سنگِ نشان ہیں جنہیں انسان اور انسان کی تہذیب
نے اپنے سفر کی ہزاروں سالہ جدوجہد میں جگہ جگہ چھوڑا ہے وہ
ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لئے اتنا ہی
محترم اور قیمتی سرمایہ ہے جس طرح بابل و نینوا کی تہذیب کے آثار
پاکستانیوں کے لئے محترم ہیں۔ بابل و نینوا۔ موہن جوداڑو اور ہڑپہ
کیا اور سب قدیم ترین تہذیب کے آثار انسانی ارتقاء کے
سراغ اور اس کے سفر کے سنگِ میل ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ ہمارے
لئے تو قومی الجنتہ میں مستحوں پائے جانے والے ڈھانچے بھی
اتنے ہی باعظمت اور قابلِ احترام ہیں۔ جتنے یہ آثار۔
اشہاد

لیکن اس بات کا کیا تعلق پاکستانی عوام کی شخصیت، اس کے مزاج
اس کی ثقافت، اور تہذیب سے ہے۔ یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔
میں اس سوال کے بارے میں اس لئے پوچھتا ہوں کہ ہر قوم اپنی
زندہ تاریخ، خصوصیات اور شخصیت کے بغیر اپنی انفرادیت
برقرار ہی نہیں رکھ سکتی۔ ہر معاشرہ کا ایک اصل، ایک بیج،
ایک تقاضہ اور مزاج ہوتا ہے جو اس قوم کے جغرافیائی حدود اور
حالات اس کی تاریخی نوعیت، زمینی طرزِ احساس عقائد مذہبی اور
فطری کوائف، موسم اور زمین کی خاصیت اور اس کے مخصوص
طرزِ فکر سے وجود میں آتا ہے۔ ہر قوم اور اس کی ذہنی اور جذباتی
شخصیت اسی طرح زمین سے اُگتی ہے جس طرح ایک مخصوص بیج
سے مخصوص پودا، پھول اور پھل اُگتے ہیں۔ اگر آپ کسی قوم
کی انفرادیت کو نظر انداز کر دیں گے تو اس کو ملکوں اور قوموں
کی برادری میں پہچان بھی نہ پائیں گے۔

اس کے علاوہ ان مختلف اقوام، ملتوں اور ملکوں
نے اپنی زندگی اور طرزِ حیات کے لئے کوئی نہ کوئی مخصوص اسم
یا معنویت ضرور تلاش کی ہے۔ جو ہر قوم میں ایک زندہ حرکی رَو
کی طرح جاری اور ساری رہتی ہے۔ کیا سامی اور آریائی مزاج آپ
کو ایک ہی نظر آتا ہے؟ کیا ہندو تہذیب اور یہودی تہذیب ایک
ہی حقیقت کا نام ہے؟ کیا چینی اور یوروپی تہذیب میں کوئی
فرق نہیں ہے؟ کیا ایرانی اور یونانی اقوام باوجود ایک رشتے
کے ایک ہی انداز ہے؟ یہ بالکل سیدھی اور صاف حقیقت ہے
کہ ان اختلافات میں ہر قوم کی فطری خصوصیات کام کر رہی
ہیں۔ ایک قوم کا بیج دوسری قوم کے بیج سے جدا ہے ایک قوم کا
اسم دوسری قوم کے اسم میں شامل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے
ہر قوم اپنا مزاج، اپنا طرزِ احساس، اپنی روح، اپنی شخصیت
اور اپنی طرزِ فکر الگ اور علیحدہ رکھتی ہے۔ اگر آپ نے اس بنیادی حقیقت
کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی تو پھر آپ اپنے وجود سے
انکار کر دیں گے۔

اب تک میں نے جن سوالات اور رویوں کا ذکر کیا ہے

وہ دراصل بعض بنیادی اصولوں اور گہری معنویت سے تعلق رکھتے تھے اور کلچر کے سلسلے میں خلوص و یقین پیدا کرتے تھے ۔ لیکن ہمارے یہاں کثیر تعداد میں ایسے دانشور موجود ہیں جو اس موضوع پر فکر اور خلوص سے تہی ہو کر بہت سطحی اور مبتذل سوالات اٹھاتے ہیں ۔ ان میں سے ایک گروہ کا سوال ہے کہ ہمارا ہیرو داہر تھا یا محمد بن قاسم ؟ داہر جو پاکستانی علاقے سے تعلق رکھتا تھا اور محمد بن قاسم جو بیرونی حملہ آور تھا ؟ ۔ ہم دونوں میں سے کس کو ہیرو مانیں ؟ ۔

یہ سوال کرنے والا ذہن یقیناً علاقائی اور محدود جغرافیائی حدود سے اوپر اٹھنے کے قابل نہیں کیونکہ وہ یہ سوال کرتے ہوئے صرف علاقائی احساس کے ایک مغالطہ کا شکار ہے اور اسے اپنی غرض اور حماقت سے فکری اور شعوری عمل سمجھ رہا ہے ۔ کیونکہ یہ بنیادی طور پر کلچر کا یا تہذیبی مسئلہ کا سوال ہی نہیں ہے ؟ اس کا فیصلہ ہر فرد کے اپنے ہاتھ میں ہے اور وہ بہت آسانی سے محمد بن قاسم یا داہر میں سے کسی ایک کو قبول یا رد کر سکتا ہے ۔ اگر آپ کے باطن میں راجہ داہر کا خون زندہ ہے اور چہکتا اور بولتا ہے تو محمد بن قاسم کی تلوار آپ اپنے ہاتھ سے خود پھینک دیں گے ۔ ہر چیز اپنی اصلیت کی طرف لوٹ کر رہتی ہے ۔ اگرچہ راجہ داہر پاکستان کے لاشعور میں زندہ ہے تو پھر انند پال بھی ہوگا ، پرتھوی راج بھی ہوگا جے چند بھی ہوگا ۔ اور محمود غزنوی ، شہاب الدین غوری ، اور احمد شاہ ابدالی مردہ اور بے معنی ہو چکے ہوں گے ۔ اتنی سچائی مجھے بہت بھاتی ہے ۔ "ہمیوں بقال کا لونڈا ہمیوں بقال کا لونڈا ہی رہنا چاہیئے بیرم خان کا نہیں ـــــ جو اپنا باپ بدلتا ہے وہ یقیناً ہم میں سے نہیں ۔" باپ سے مراد وہ صداقت ہے جسے آپ زندہ محسوس کر رہے ہوں تو مسلم اقوام نے جس صداقت کو قبول کیا تھا وہی ان کی اصل ہیں لیکن ان نو مسلموں سے جنھوں نے اس صداقت کو جھٹلا دیا ہے مردہ کر دیا ہے اور قبول نہیں کیا ہے اب ان

سے صرف اتنا پوچھنا باقی رہ گیا ہے کہ علاقائی تہذیب سے الگ ہٹ کر سچائی کے ساتھ راجہ داہر کا تعلق ان کی ذات یا اجتماعی معنویت کے ساتھ کتنا ہے ؟ دراصل تہذیب اور کلچر جس جگہ سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں یہی مقام ہے کیونکہ آگے چل کر راجہ داہر اور محمد بن قاسم کے نام داہر اور محمد نہیں رہ جاتے بلکہ اللہ اور مہادیو میں تبدیل ہو جاتے ہیں ۔ ان دونوں اسموں میں سے ایک آپ کو انتخاب کرنا ہے جو یقیناً آپ کے ہاتھ میں ہے ۔ اسی سے ملتا جلتا اور علاقائی مغالطہ کا شکار وہ گروہ بھی ہے جس کا کہنا ہے کہ فنونِ لطیفہ ہمیشہ انسانی زندگی کی تسکین اور ترسیل اور حصولِ لذات کا ذریعہ رہے ہیں ۔ اس لئے پاکستان کے مختلف علاقوں کی علاقائی ثقافت عوامی رقص و موسیقی وغیرہ ہی پاکستان کا کلچر ہیں ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان حضرات کے ذہن میں کلچر کا مفہوم واضح نہیں ہے ۔ وہ اس کو محض فنونِ لطیفہ تک محدود کر دینا چاہتے ہیں ۔ یہ سوال اٹھانے والے عموماً وہ لوگ ہیں جن کے لئے کلچر کا مفہوم رجعت پسندی اور بوڑھا ذہنیت کا حامل ہے ۔ غالباً وضاحت کی ضرورت نہیں کیونکہ کمیونسٹ نظریہ کے یہ حامی حضرات انفرادی طرزِ احساس اور قومی شخصیت کے اصولی طور پر منکر ہیں ۔ اس لئے تو دراصل کلچر کی بحث میں ان حضرات کا ایک سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں آنا چاہیئے تھا مگر اس محدود نقطۂ نظر کا ذکر بھی اس لئے ضروری تھا کہ وہ علاقائی ثقافت کو پاکستانی کلچر کے نام پر بہت زور شور سے پیش کرتے رہتے ہیں ۔ اس سے قطع نظر کہ ان کا اصل مقصد کیا ہے ؟ ایک بات صاف اور واضح نظر آتی ہے کہ وہ مرکزیت کے خلاف سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے ۔ وہ دراصل پاکستان کو علاقائی ثقافتوں کے نام پر شدید قسم کے تعصب میں مبتلا کر کے مرکزیت کو کمزور کر دینا چاہتے ہیں ۔ اس لئے کلچر کا مسئلہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ جاتا ہے ۔ کیونکہ یہ حضرات یہ نہیں بتاتے کہ پاکستان

یا صرف سندھ کا مظہر کونسی علاقائی ثقافت ہوگی۔ مشرقی پاکستانی یا مغربی پاکستانی۔ اسے مغربی پاکستان میں بھی۔ سندھی لوک ناچ [illegible] پاکستانی۔ انفرادی طرز احساس کی نمائندگی کریں گے یا بلوچستان سرحد کی علاقائی ثقافت پاکستانی کلچر کہلائے گی یا پنجاب کی یا یہ سب پاکستانی کہلائیں گے۔ اور اگر ایسا ہوگا تو اس میں پنجاب۔ سندھ۔ بلوچستان۔ سرحد اور بنگال پاکستانی کیسے نظر آئیں گے اور کیسے جانیں گے۔ اس گروہ کی سب سے بڑی مگر سب سے اچھی دلیل یہی ہے کہ یہ کلچر کے نام پر تمام دنیا کے انسانوں کی مشترک خواہشات و فنون کو پیش کرتے ہیں اور یہ نہیں بتا سکتے کہ اس میں انفرادیت اور شخصیت کیسے پیدا ہوگی۔ ناچ اور گانے پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر خطے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں مگر ہم مصر کے بلی ڈانس کو مصر کے کلچر کا مترادف کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ یا بھنگڑا ناچ پاکستانی کلچر کے پورے مفہوم کو کیسے پیش کر سکے گا۔ اسی طرح کا ایک اور گروہ ابھی پیدا ہوا ہے — جس نے اس مضحکہ خیز منطق کو اور بھی حد کمال تک پہنچا دیا ہے۔ وہ موہن جو ڈارو کے آثار میں سے بیل گاڑی اور بھینس کو اس کے کلچر کی علامت بتلاتے ہیں اور اس طرح موہن جو داڑو کی ثقافت کا باقاعدہ سلسلہ پاکستان کی موجودہ بیل گاڑی اور بھینس سے جوڑ دیتے ہیں گویا یہ دونوں ان مشترک علامت کی بنا پر ایک ہی کلچر کہلائے جاتے ہیں۔ دیکھا آپ نے یہاں بھینس بھی کلچر کے مترادف ہو گئی

ارے بھائی کون سی بھینس؟ کیا پاکستانی بھینس کے آٹھ سینگ ہوتے ہیں۔ یا وہ بچے کے بجائے انڈا دیتی ہے؟ اور ہل تو انسانی تمدن کے ایک خاص عہد کے سماجی آلے کی حیثیت میں متعارف ہوئے تھے۔ اس وقت ساری دنیا میں بیل گاڑی نہیں تو گھوڑا گاڑی یا ہل نہیں تو کھرپے ہی استعمال ہوتے تھے مگر بیل گاڑی یا ہل یا بھینس کو پاکستان کی پانچ ہزار سال قبل کی تہذیب کی علامت سمجھ کر اسے پاکستانی کلچر کیسے قرار دیا جا رہا ہے۔

ایں چہ بوالعجبی است

دراصل آخرالذکر تینوں گروہ وہ ہیں جنھوں نے پاکستان کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا ہے۔ ان کی منطق کی رو سے پاکستان کا قیام ہی بالکل غلط قرار پاتا ہے ان میں بھی تیسرا گروہ پاکستان کی تاریخ کو کچھ مصلحتوں کی بنا پر پچھلے ساڑھے چار سو سال کی ہند مسلم تاریخ سے جدا کرنا چاہتا ہے اور اپنا رشتہ قدیم ہندوستان سے قائم کرتا ہے انھیں مغلوں سے یا مسلمانوں سے ہی نفرت کیوں ہے۔ اس کی بنیاد بھی علاقائی عصبیت ہے۔

آپ حضرات کو ان تمام گروہوں کی سرگذشت سے یقیناً اتنا پتہ چل گیا ہوگا کہ پاکستانی کلچر کا کیسا آملیٹ بنایا جا رہا ہے پھر آخر کلچر کیا ہے؟

اگر پاکستانی قوم ایک زندہ قوم ہے۔ اگر اس کی تاریخ ایک زندہ تاریخ ہے۔ اگر اس کے رشتے زندہ ماضی سے زندہ رشتوں کی صورت میں موجود ہیں تو پھر اس کا ہر فعل اس کا کلچر ہے۔ اس کی اپنی انفرادیت ہے جس کو باہر سے لا کر یا فرض کر کے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہر وہ چیز جو اس کے نفسی عمل میں شامل نہیں ہے وہ اس کے لئے مردہ ہے۔ اگر اس کا باطنی تعلق گندھارا تہذیب سے جو کبھی اس خطہ پاک کا جز تھی آج نہیں ہے اور ایک ایسی تہذیب سے جو پاکستان سے سینکڑوں میل دور مکہ مدینہ میں پیدا ہوئی تھی اور سینکڑوں سال پہلے پیدا ہوئی تھی آج بھی زندہ رشتوں اور شعوری صورت میں موجود ہے تو گندھارا تہذیب میرے لئے مردہ ہوگی اور مکہ مدینہ کی تہذیب ایک زندہ اور شعوری عمل بن جائے گی۔ یہ کوئی ایسا بھاری نکتہ نہیں جس کو ذہن نشین کرانے کے لئے بار بار توجہ دلائی جائے۔

شہزاد حمید

نقطے اور زاویے

تخلیق کی تکمیل سے ایک خاص آسودگی اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ تخلیق بھی ایک تجربی حقیقت ہے اور روایتی نظریئے کے برعکس، محسوسات کے تابع ہوتی ہے۔ اس وقت جب کہ جدید ادب کی تقریباً تمام اصناف اور خصوصاً صنفِ شعر کے تمام پہلو واضح ہوتے جا رہے ہیں، یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ نظریئے کو توانا، حرکت پذیر اور فعال بنایا جائے۔ ترقی پسند نقادوں نے تنقید کے نام پر اگرچہ بہت کچھ لکھا ہے، لیکن ان کے رشحاتِ قلم سے جو کچھ سامنے آیا ہے وہ تنقید کا ایک جامد نقطۂ نگاہ تھا اور اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اشتمالی خیالات پر چار ہو جائے خواہ اس کے لئے ادیب اور شاعر کو سماج کی قربان

ابہام! شاعری کی جان ہے، اس کا حسن ہے۔
جہاں تک کسی شعری فن پارے کا تعلق ہے ابلاغ کے مقابلہ میں
ابہام زیادہ اہم رہا ہے ___ ورنہ میر، غالب، اقبال
شیکسپیئر، اور گوئٹے کو سمجھنے کے لئے شرحیں شائع
نہ ہوتیں۔

ہمیں جدید شاعری ہی کیا، جدید ادب کی دیگر تمام اصناف کے بارے میں نقد و نظر کے نئے زاویئے تلاش کرنے ہوں گے اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو کوہ کن کی طرح پرانے تنقیدی نظریات کی تنسیخ بھی کرنی ہوگی کیونکہ اب یہ نہیں کہ کسی ادبی تخلیق میں صرف یہ دیکھا جائے کہ ادیب نے اس میں فنی ضروریات کا التزام بھی کیا ہے یا نہیں یا یہ کہ فلاں لفظ صحیح طور پر استعمال ہوا ہے۔ جدید ادب اس بات کا متقاضی ہے کہ تخلیق کو جمالیاتی اقدار کی روشنی میں ماننے سے پہلے تنقیدی اظہار ع

گاہ پر بھینٹ ہی کیوں نہ چڑھانا پڑے۔

اب تک ہمارا تنقیدی نقطۂ نگاہ یہ رہا ہے کہ شعری تخلیق کو الفاظ اور ان کی معنوی تعبیرات کی روشنی میں جانچا جائے اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اظہار کا وسیلہ صرف زبان ہے اور اسی لئے ہم عام طور پر الفاظ کی معنویت پر منحصر رہتے ہیں۔ اس لئے ہمارے تنقیدی نقطۂ نگاہ کی تشکیل میں بھی یہی عوامل کارفرما رہے۔ اس میں شک نہیں کہ شعر و ادب میں لفظی صوت گری کو ایک اہم مقام حاصل ہے

اور ہم اسی کی بدولت شعری تخلیق میں جاری و ساری روح تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن جدید شعری تخلیق میں ان تمام مفروضات کو کالعدم قرار دینا ضروری ہو گیا ہے کیونکہ موجودہ ادبی تخلیق معنویت کا ایک علامتی اظہار ہے اور ان علائم کی تفہیم کے بعد ہی اسے قابلِ ادراک کیا جا سکتا ہے۔ گویا لفظ بذاتِ خود کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ اسے جسم عطا کیا جاتا ہے بہ الفاظ دیگر وہ ایک علامت ہے۔ جدید تنقید کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ لفظوں کے روایتی طور پر متعینہ معنوی خول سے باہر آ کر ایک نیا جہانِ معنی تلاش کیا جائے۔ جدید شاعر کسی لفظ کو صرف اس لئے استعمال نہیں کرتا کہ اس کے کوئی خاص معنی ہیں بلکہ وہ اس کے بظاہر متعینہ معنوں کے علاوہ اسے نئی جہتوں، نئی سمتوں، اور نئی وسعتوں سے روشناس کرتا ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب لفظ کو روایتی لفظ نہ سمجھ کر ایک علامت کے طور پر تسلیم کیا جائے۔

کسی لفظ کو نئی جہتوں، نئی سمتوں اور نئے آفاق سے ہمکنار کرنے کا ایک مقصد شعری تخلیق کو معنویت کے اعتبار سے متنوع بنانا بھی ہوتا ہے۔ جہاں معنویات (SEMANTICS) کا سوال پیدا ہوگا۔ وہاں مفہوم کے ابلاغ، ابہام اور اہمال کا سوال بھی پیدا ہوگا۔ معنویات کا مطلب دراصل کسی علامت کا شئے مدرکہ کے ساتھ رشتہ یا شعری اصطلاح میں تلازمہ REFERENCE ہے۔ شاعر اور قاری کے درمیان ہمیشہ ہی ایک ربطِ باہم رہا ہے۔ اس ربطِ باہم کو ترسیلِ خیال کا رشتہ کہہ لیجئے یا زیادہ بنام اصطلاح میں ابلاغ۔ بات بہرحال ایک ہی ہے۔ کسی افراط و تفریط سے کام لئے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ ابلاغ کا تعلق محسوسات سے ہے نہ کہ صرف ادراک سے۔ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔ یا اس نے کیا کہا ہے۔ اگر اسے محسوس کر لیا گیا یا اس کی بات اپیل کر گئی تو سمجھ لیجئے کہ شاعر نے اپنے خیال کی ترسیل کی ہے۔ تقاضائے سلاست کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابلاغ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو واضح اور غیر مبہم ابلاغ جو عام طور پر اور خصوصاً صحافت کا مابہ الامتیاز صفت ہے۔ اور دوسرا اشاراتی

شعری ابلاغ سے میری مراد شاعر اور قاری کے درمیان اس پیچ در پیچ سلسلے سے ہے جو شعر میں موجود ہوتا ہے۔ شعری ابلاغ، نثری ابلاغ کے مقابلے میں مبہم ہوتا ہے اور ایک گونا گوں تاثر لئے ہوتا ہے۔ ابہام شاعری کی جان ہے۔ اس کا حسن ہے۔ اور معنی آفرینی کی گنجائش پیدا کرتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ عبارت ژولیدہ، گنجلک اور بے ربط الفاظ کا مجموعہ ہو۔ جہاں تک کسی شعری فن پارے کا تعلق ہے۔ ابلاغ کے مقابلہ میں ابہام زیادہ اہم رہا ہے ورنہ میر، غالب، اقبال، شکسپیئر اور گوئٹے کو سمجھنے کے لئے شرحیں شائع نہ ہوتیں۔ امعانِ نظر سے دیکھا جائے تو ابہام کا تعلق ایک بار پھر علامات سے ہے۔ اور علامات بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو ہمہ گیر اور آفاقی ہیں اور جن کے مطالب و مفاہیم ہر کسی کی سمجھ میں آتے ہیں۔ ایسی علامات پرانی داستانوں، حکایتوں، اساطیر، تلمیحات اور معاشرتی و تہذیبی کردار سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسری طرح کی علامات انفرادی نوعیت کی ہوتی ہیں اور جن کے معنی صرف ذہنِ شاعر میں ہی محفوظ ہوتے ہیں۔ غالباً ایسی ہی علامات کے لئے طنزاً کہا گیا ہے کہ "المعنی شعر فی البطنِ شاعر"۔ انفرادی علامات بھی عام فہم ہو سکتی ہیں بشرطیکہ شاعر نے ان کی نشست اور انسلاکات کو کامیابی کے ساتھ برتا ہو۔ ویسے بھی شعر کی فضا چند انسلاکات ہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اگر آپ کسی گھر سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھیں گے تو آپ کے ذہن میں یہ خیال یقیناً پیدا ہوگا کہ وہاں آگ جل رہی ہے یہی وہ انسلاک ہے جو آپ کے ذہن نے دھوئیں اور آگ کے درمیان قائم کیا ہے۔ یا اگر آپ غالب کا یہ شعر پڑھیں کہ

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

تو آپ کا ذہن فوراً ہی زندگی کی بے ثباتی اور شمع اور صبح اور سحر کے درمیان ایک غیر محسوس رشتہ قائم کر لیتا ہے۔

ابلاغ اور ابہام کا مسئلہ دراصل اضافی نوعیت کا ہے کیونکہ یہ قاری کا ذہن ہے کہ عبارات الفاظ میں کس طرح سمجھتا ہے۔ بہرحال

بہم بھی اس انداز میں ہے۔ ایک ہی بات ہم کی سمجھ میں آسکتی ہے
اور الف کی سمجھ میں نہیں۔ یہ سارا تنازعہ دراصل اس وجہ سے
پیدا ہوتا ہے کہ شعری تخلیق ایک ادعائی بیان PSEUDOSTATEMENT
ہے نہ کہ ایک خالص بیان۔ CATEGORICAL
STATEMENT جو سائنسی
علوم کی خاصیت رہا ہے۔ ابہام اسی وقت قابلِ قدر ہوتا
ہے جب معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ خیال کی نزاکت اور ندرت
کا اظہار بھی ہوتا ہو۔ لیکن اگر مفہوم خواہ مخواہ الجھ کر رہ جائے
اور ژولیدگی پیدا ہو تو اسے ابہام نہیں بلکہ اہمال سے موسوم
کیا جا سکتا ہے۔ ابہام اور اہمال میں یہ فرق ہے کہ اہمال میں
کسی استعاراتی پیکر کے کئی مطالب ہو سکتے ہیں جن میں سے کسی
مفہوم کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں مفہوم
ہی درست ہے حالانکہ اصابتِ رائے کا تقاضہ ہے کہ کسی شعری پیکر
کا وہی مفہوم متعین ہو جس کا اظہار شاعر کرنا چاہتا ہے۔ اس
مرحلے میں عجیب و غریب صورتِ حال پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ کہ
ہم کس مفہوم کو درست اور صحیح مفہوم قرار دیں۔ اس طرح کی
صورت حال کا تدارک صرف اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ شعر کے وہی
معنے لئے جائیں جن سے شعری پیکر کی جامعیت کا اظہار ہوتا ہو اور
اس جامعیت کا اظہار شعر یا نظم کی مجموعی فضا اور اس کے مجموعی
تاثر پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ مجموعی فضا اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب
شعری تخلیق کی ہیئت (حتیٰ کہ عنوان بھی) الفاظ کی نشست، الفاظ
کے درمیان ربط و تسلسل، تراکیب و تشبیہات کا ربطِ باہم اور
پورے ڈھانچے کو مدِ نظر رکھا جائے۔ شعری تخلیق کی علامات
تلازمات اور استعارات منفصل بالذات نہیں ہوتے بلکہ ایک
دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں گویا شعر یا نظم ایک نامیاتی
نظام ہے۔ استعارے کا مقصد دو مختلف اشیا کے درمیان صرف
مماثلت اور مشابہت ہی پیدا کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ دو مختلف
مطالب اور علائق CONTEXTS کو بھی ایک
دوسرے کے قریب لا کر ... ایک دوسرے
[illegible]

جیسے کہ اجنبی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ مصرعہ لیجئے

ع "بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا"

غالب کے اس مصرع میں بحر اور بیاباں نہ صرف دو مختلف المعنی
الفاظ ہیں بلکہ دونوں کے تلازمات بھی مختلف ہیں۔ بحر زندگی
اور اس کی ہما ہمی، ہلچل، فعالیت اور ایک نامیاتی حقیقت
کی علامت ہے جبکہ بیاباں، ویرانی، جمود، اور انتہا پسندی
سے کام لیا جائے تو موت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ گویا یہ
دونوں الفاظ یا زیادہ بہتر طور پر یہ دونوں علامات نہ صرف
ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ مختلف الاساس بھی ہیں مگر غالب
نے ان دونوں کے درمیان نہ صرف ایک ارتباط ہی قائم کیا ہے
بلکہ دونوں ایسے نظر آ رہے ہیں جیسے کہ لازم و ملزوم کی حیثیت
رکھتے ہوں۔

اس طرح ہم مفہوم کے تلازماتی نظریے کو ان الفاظ میں
پیش کر سکتے ہیں:-

۱۔ الفاظ ایک دوسرے کو زندگی عطا کرتے ہیں یعنی ان کا
مفہوم اسی وقت واضح ہو سکتا ہے جب تمام علائق کو مدِ نظر رکھا
جائے جن میں وہ واقع ہوتے ہیں۔

۲۔ شعری بیان کا تعلق پوری شعری تخلیق سے ہوتا ہے
اور اس کے مفہوم کو صرف ایک یا چند الفاظ یا علامات کے سہارے
متعین نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ استعارے کا کام صرف مماثلت پیدا کرنا ہی نہیں ہے
بلکہ وہ معنی آفرینی کی گنجائش بھی پیدا کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ
مختلف علائق کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔

۴۔ کسی خیال کا پوری طرح ادراک کرنے کے لئے ضروری
ہے کہ استنباطی طریق کار کو مدِ نظر رکھا جائے۔

اس بحث و تمحیص سے ایک اور دلچسپ بات جو سامنے
آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر جدید شعری تخلیق مزاجاً استعاراتی اور
علامتی ہے تو کیا ہم اسے کسی غیر شعوری یا لاشعوری عمل کے تابع قرار
دے سکتے ہیں۔ یہ سوال جدید شعری یا غیر شعری تخلیق پر بحث

کرنے وقت [illegible] لگتا ہے کہ اس سے پہلو تہی ناممکن
ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ تخلیق۔ فیضان سماوی کے باعث
[illegible] پذیر ہوتی ہے اور اس لئے ایک اضطراری فعل اور جذبہ
[illegible] ہے۔ شعری تخلیق کو فیضانِ الٰہی کے تابع کر دینے کا
[illegible] مشرق اور مغرب۔ دونوں ہی میں قبول عام حاصل کر چکا ہے
ہومر بھی جب اپنی نظمیں شروع کرتا ہے تو وہ بھی طبع خداداد
MUSE کی تعریف میں رطب اللسان نظر ہوتا ہے۔ ہومر
افلاطون۔ ہی لیود۔ سیمونی ڈیز۔ پینڈارا اور دیگر یونانی ادیبوں
شاعروں۔ فلسفیوں مفکروں اور خطیبوں کے درمیان۔ جو
سیکڑوں برس گزرے ہیں۔ ان کے دوران بھی کم و بیش انہی خیالات
کا اظہار کیا گیا ہے۔ مشرقی شعرا بھی کسی استثنیٰ یا تخصیص کے بغیر
اسی خیال کے مؤید رہے ہیں۔ یعنی این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔ خود غالب نے بھی بڑے دھڑلے سے کہا
ہے کہ "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں = غالب صریرِ خامہ
نوائے سروش ہے۔"

سوال یہ ہے کہ کیا تخلیق واقعی ایک غیر شعوری یا لاشعوری
فعل ہے۔ امعانِ نظر سے دیکھا جائے تو جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔
کیونکہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو ضمنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر
شعری صداقت کے اظہار کے لئے جس اسلوب کا سہارا لیتا ہے، جو الفاظ
تلازمات۔ علامات تراکیب اور زبان و بیان استعمال کرتا ہے۔
کیا وہ سب لاشعور کی دین ہیں۔ یقیناً نہیں کیونکہ کسی شعری
صداقت کو نطق و لب سے آشنا کرنے کے لئے جس اسلوب، الفاظ
اور اسی طرح کے دیگر شعری لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ
سب ایک شعوری عمل کے تابع ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں کسی حد
تک رعایت دی جا سکتی ہے کہ جذبہ یا موضوعِ خیال کی اچانک
آمد کا تعلق لاشعور سے ہے مگر یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے
کہ کیا جذبہ یا موضوع کوئی تجریدی حقیقت ہے۔ یعنی کیا وہ ایسی
شے ہے جس کا پہلے سے کوئی وجود نہیں تھا۔ یا جس کا تصور ناممکن
تھا۔ یقیناً یہ جذبہ یا خیال کسی تجربی یا حسی حقیقت کا انعکاس
انطباع

ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں [illegible] یا ایک
نہاں خانوں میں کسی خیال کا نزول یقیناً کسی STIMULUS
کا مرہونِ منت ہے جو خارجی بھی ہو سکتا ہے اور
باطنی بھی۔ ذہنِ شاعر میں ایک مصرع آتا ہے اور یہ مصرع یقیناً
ماورائے محسوسات نہیں ہوتا، اور وہ اس مصرع کا ہم پلہ مصرع
تلاش کرنے لگتا ہے۔ پہلے مصرع کی آمد اور دوسرے مصرع کی تلاش
دراصل شعوری فعل کی ابتدا ہے۔ اگر یہ مصرع فنکار کی نظر میں
سابقہ مصرع کی جامعیت کو واضح نہیں کرتا یا اس کی معنویت کے
ساتھ انصاف کرنے کے ناقابل ہے تو اس صورت میں حک و اضافہ
اندک و بسیار۔ اور تنقید و تنقیص کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ شاعر
کو خوب سے خوب تر کی تلاش ہوتی ہے۔ دراصل تخلیق کا طرب اسی
لمحہ سے شروع ہوتا ہے۔ گویا ہر تخلیقی فن پارہ بتدریج ظہور پذیر
ہوتا ہے۔ کیتھرائن پیٹرک کا دعویٰ ہے کہ ہر تخلیقی فکر میں تدوین
INCUB ترتیب PREPARTION
ILLUMINATION اشراق ATION
اور تصدیق VERIFICATION کے چاروں مدارج
لازمی ہیں۔ تدوین کے لئے ضروری چیز مواد ہے۔ فنکار کے لئے یہ
درجہ تلاش و تجسس کا درجہ ہے۔ اس دور میں وہ اپنے ماحول
کا مطالعہ کرتا ہے۔ اپنا خیال آرائی سے کام لیتا ہے اور اگر ضرورت
محسوس ہو تو دوسروں کے اشعار کا مطالعہ بھی کرتا ہے جہاں
تک ماحول کے مطالعے کا سوال ہے۔ گسٹالٹ مکتبۂ فکر کا کہنا ہے
کہ ماحول اور فرد ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور
قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ فلاں خیال۔ فلاں شے کے
ادراک کا نتیجہ ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ خیال کا نزول فرد کے مدِ عمل
کی صورت میں ظاہر ہوا ہو۔ تخلیق کا دوسرا مرحلہ ترتیب کا ہے
یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جب کوئی خیال شعری قالب میں ظاہر ہوتا
ہے۔ لیکن شعری قالب میں ڈھل جانے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے
کہ موضوعِ خیال مکمل ہے بلکہ وہ خیال۔ محض خام کی صورت میں
موضوعِ شعر کی حیثیت سے فکر کے تجربے [illegible] یعنی اشراق میں
[illegible]

داخل ہوتا ہے۔ ابتدائی درجے میں شاعر اپنے مسودے میں حذف و اضافے کے بعد یہ دیکھتا ہے کہ آیا اس نے موضوعِ خیال کے ساتھ واقعی انصاف کیا ہے۔ اگر اسے اطمینان نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ وہ اس میں مزید حک و اضافہ کرے۔ دراصل یہ مرحلہ موضوع کی لفظی صورت گری اور اس کی آرائش ORNAMENT ATION سے تعلق رکھتا ہے۔ صورت گری اور آرائش کا یہ عمل یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ چوتھے درجے یعنی تصدیق کے مرحلے میں بھی جاری رہتا ہے۔ اس درجے میں موضوعِ خیال اور طریقۂ اظہار کے درمیان ربطِ باہم تلاش کرنے کے فعل کو اولیت دی جاتی ہے۔ اس چوتھے درجے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی جذبہ۔ کیفیت یا خیال بھرپور طریقے سے رونما ہوا ہے یہی وہ مرحلہ ہے جب سامع یا قاری سے شاعر خراجِ تحسین حاصل کر سکتا ہے کیونکہ شدتِ تاثر۔ صلابت اور توانائی اسی مرحلے میں بدرجۂ اتم پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح ڈیوی DEWEY کا طریقہ کار صرف سائنسی مسائل ہی پر نہیں بلکہ شاعری۔ ادب۔ موسیقی۔ فن۔ اور ڈرامے پر بھی منطبق ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ شعر کے ان چاروں مدارج کے درمیان کوئی حدِ فاصل یا خطِ امتیازی موجود ہے۔ ان مدارج کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تخلیق کا کرب اگر واقعی کوئی شے ہے تو وہ دراصل یہی ہے اور اسی لئے صرف آغاز کے طور پر میں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ تخلیق کی تکمیل سے ایک خاص حظ۔ آسودگی اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہمیں گستاف فیخنر GUSTAV FECHNER کی طرح جمالیاتی نظریے کی تشکیل کے لئے کوئی تجربی EMPIRICAL طریقہ کار تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ معلوم کرنا ہی فائدہ مند ہو سکتا ہے کہ کتنے فیصد لوگوں کو مربع کی بجائے مستطیل کی شکل بھلی لگتی ہے۔ شعری صداقت اپنے عالمِ جنینی EMBRYONIC STAT سے اپنے عالمِ وجود تک مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ جس طرح انسانی کردار HUMAN BEHAVIOUR کو کسی تجربگاہ کی تکنیک سے تشخیص نہیں بنایا جا سکتا اس لئے کہ وہ ہر لحظہ اور ہر آن تغیر پذیر ہے اسی طرح شعری صداقت کے اظہار کے مختلف مدارج کو کسی بے لچک اور سخت قاعدے کا پابند نہیں کیا جا سکتا تاہم جس طرح انسانی کردار کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی مخصوص صورتِ حال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر یہ صورتِ حال بجنسہ پیش آئے تو کردار بھی وہی ہوگا جو کہ تھا۔ اسی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعری تخلیق بھی مختلف مدارج اور مراحل طے کرتی ہوئی اسی نتیجے پر پہنچتی ہے جو ایک طرح سے پہلے ہی متعین ہوتا ہے۔

بڑا

ادب ہمیشہ نہایت پیچیدہ حقیقتوں کے تصادم کے دور میں پیدا ہوا ہے۔ اچھا ادیب وہ ہے جو اپنی ذات کو بلند انسانی اقدار سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے وسیلۂ اظہار پر پوری طرح قابو حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک اظہار ابلاغ نہیں بنتا۔ ادب وجود میں نہیں آتا۔

(ڈاکٹر خورشید الاسلام)

اچھا

ادب عصری صداقتوں سے عبارت ہوتا ہے اور اعلےٰ ادب محض فرد کی ذات کا آئینہ دار نہیں ہوتا بلکہ ذات کی توسیع کرتا ہے۔ اچھا ادیب وہ ہے جو بچہ کی مسکراہٹ میں مسرت کا راز پا لے اور لطیف احساسات سے زندگی کے حسن تک پہنچ سکے۔

(وشوناتھ ترپاٹھی)

نئی

ترقی پسندی کسی سیاسی فارمولے پر زور نہیں دیتی بلکہ ایک نئے رویے اور نئی آگہی پر اصرار کرتی ہے

(ڈاکٹر سعید)

پروفیسر منظور حسین شور

صُورت پرست

دیکھتی رہتی ہے تیری نگہ ظاہر بیں،
میری اچکن کے بٹن سارے لگے ہیں کہ نہیں

شیروانی کی پھبن، سوٹ کا انداز بھی دیکھ
اور اپنی نگہ و فکر کی پرواز بھی دیکھ

بےکفن میری نگاہوں میں ہے تہذیب کی لاش
اور تجھے ننگے سروں پر ہے کُلاہوں کی تلاش

جبہ و جامہ و دستار تری فکر کے دام
مجھکو خلعت میں بھی عُریاں نظر آتے ہیں غلام

سطوتِ میر و قباپوش و کلہ دار بھی دیکھ
اور انسانیت و عقل کے نادار بھی دیکھ

کتنے جسموں پہ ہے زرتار لباسوں کے کفن
اِن قباؤں میں شرافت کے ہیں کتنے مدفن

کتنے روباہ لباسوں میں نہاں ہوتے ہیں
کتنے سیلاب کناروں پہ یہاں سوتے ہیں

کتنے تاریک ہیں دل، کتنی نگاہیں مفلوج
کتنی کرنوں کا جنازہ ہے اندھیرے کا عروج

ہر روش پر کسے معلوم ہیں کتنے خوش پوش
مفلسِ عقل و یتیمِ خرد و قاتلِ ہوش

کیا خبر کتنے قباپوش ہیں سرگرم خرام
جنکے ماتھوں پہ ہے تحریر غلام ابنِ غلام

کتنے بوجہلوں پہ ہوتا ہے رسولوں کا قیاس
کتنے تاریک ضمیروں کو چھپاتے ہیں لباس

اپنے ملبوس کی تزئین پہ مرنے والے
کہیں صابون سے دھلتے بھی ہیں چہرے کالے

قیدِ ملبوس سے جکڑی ہوئی نظروں کو نکال
پردہ تہذیب کے ناسور پہ ریشم کا نہ ڈال

ایک انسان کی جویا ہے تمدن کی نظر
ایک خورشید کے ماتم میں ہے دنیا کی سحر

اِس سے آگے نگہ و فکر کی توہین نہ کر
اے غریقِ لبِ ساحل کسی طوفاں میں اُبھر!

ہو جہاں روح لباسوں کے خم و خم کی اسیر
بجھ کے رہ جاتے ہیں تہذیب کی چھینٹوں سے ضمیر!

شاذ تمکنت

چاند پھر نکلے گا

چاند پھر نکلے گا، پھر تیرے خد و خال کا رنگ
یاد آئے گا، مجھے نیند نہیں آئے گی

دل بہت روئے گا، آنسو نہیں پونچھے گا کوئی
جاں پہ بن جائے گی، دیوار و در و بام مجھے
بھینچ لیں گے مری تنہائی نہ دیکھے گا کوئی
آنکھیں، (موہوم اجالے کے پراسرار کھنڈر)
راہ تکتی چلی جائیں گی نہ لوٹے گا کوئی

رات بھر پھر مرے ارماں کا سیہ تاب چراغ
جھلملائے گا مجھے نیند نہیں آئے گی

ہر مہینہ یونہی یہ درد کی فصل آئے گی
چاند آ آ کے کرے گا مرے زخموں کا حساب
مطمئن ہو کے شب ماہ پلٹ جائے گی
کہ ابھی تک مری آنکھوں سے لہو بہتا ہے
کہ ابھی اور تمنا مجھے تڑپائے گی

چاند پھر دائرہ سے زاویہ ناخن تک
گھٹتا جائے گا مجھے نیند نہیں آئے گی

بلراج کومل

ننھے کے لئے

لوگ بچوں سے باتیں کرتے ہیں
آنے والے دنوں کے خوابوں کی
ایک ایسے جہاں کی جس میں
وادیوں اور سبزہ زاروں کا
ایک رنگین سلسلہ ہوگا
جھومتے گنگناتے پیڑوں کے
درمیاں اک حسین کھلونا سا
گاؤں ہوگا کوئی جہاں پریاں
چاندنی کے جمیل آنچل میں
رقص کرنے کو آئیں گی ہر شب
آنے والے دنوں کے خوابوں میں
ماہ پاروں کے شوخ جھرمٹ میں
اک پری میرے ننھے منے کی
ننھی دلھن کا روپ ہوتی ہے
ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دونوں
وادیوں اور سبزہ زاروں سے
مثل بادِ صبا گذرتے ہیں
اک افق کو پھلانگ جاتے ہیں
آرزو دوسرے کی کرتے ہیں

خواب آغاز، منزلیں انجام
درمیاں روز و شب کا ایک نظام
درمیاں سختیاں مسافت کی
درمیاں دھوپ ابر، تاریکی
خواب پیکر ہے، خوف سایہ ہے
کیسا آغاز، کون سا انجام؟
میرے ننھے مزے سے سو جاؤ
کوئی ننھی پری بلاتے ہی
نیند کے ساتھ خواب آئیں گے
خواب کچھ اور خواب لائیں گے

سرشار صدیقی:

شرقِ اوسط

تیل جب تک دفینوں کی صورت رہا
موجۂ نیل ہو
یا فرات اور دجلہ کی لہریں
دف و چنگ پر رقص کرتی رہیں
نہر سوئز کی تخلیق سے
نہر سوئز کی تطہیر تک
امن ہی امن تھا
شیخ محلوں کی عیاشیوں میں مگن
عنبر و عود و زیتون میں گم رہے۔
قوم روتی رہی،
اور تاریخ تلوار سرہانے رکھے ہوئے
چین کی نیند سوتی رہی

چشمہ اُبلنے لگا تیل کا
اور اس طور آغاز ہونے لگا
اِک نئے دور کا
اِک نئے کھیل کا
کشت و خوں
قتل و غارتگری
جبرِ ظلم و ستم جسکا انجام تھا۔

وادیٔ نیل سے
اُردن و شام و بغداد کے سبزہ زاروں تلک
کوہساروں تلک
ریگزاروں تلک

بوترابوں کے بیٹوں کی مٹی کی بو
ابن مریم کے بچوں کی حرص و ہوس کا نشانہ بنی
آسمانی خداوند کے حکم سے
بوترابوں کے بیٹوں کی مٹی
جہاں ابن مریم کے بچوں کے ہاتھ آ گئی
ان کی مٹی سے

صرف بربادیاں
صرف محرومیاں
صرف ویرانیاں
اس خموشی کے سنسان جنگل سے بھی
ایک آواز آتی رہی ہے۔
اُمِ کلثوم گاتی رہی ہے۔

تھکن

شہر کا اونچا منارہ
آخری کرنوں سے ہم آغوش تھا
دھوپ
رخصت ہو چکی تھی کوچہ و بازار سے
میں تھکا ہارا مسافر
بوجھ اٹھائے سارے دن کی محنتوں کا
سیلِ آدم میں بہا جاتا تھا تنکے کی طرح
اور رقصاں تھا افق پر ڈوبتے سورج کے پاس
ڈوبتے دل کا خیال
جاگتا ہو شہر جب آٹھوں پہر
دن کو ہنگامے سہی لیکن سکوں
آغوش شب میں بھی محال

رات آئی خواب کا در کھل گیا
سو گیا صحرا نوردی کا جنوں
میں تھکا ہارا تھا، میرے پاؤں بے آرام تھے
گھر میں تھی معصوم چہروں کی نوید
نیند کی پریوں نے آکر خواب کے خیمے تلے
میری محرومی کے قصوں کو سُلایا دمبدم
بھوک لیکن کارخانوں میں کہیں بے خواب تھی
جنس کا آسیب سارے شہر میں آوارہ تھا

سلیمان اریب :

یہ ہاتھ

یہ ہاتھ کتنے حسیں، کتنے خوبصورت ہیں
یہ ہاتھ جن پہ ہے اک جال سا لکیروں کا
لکیریں، جن میں ہیں صدیوں کے ارتقا کے نشاں
نشاں، عمل کے، عزائم کے، علم و حکمت کے
صعوبتوں کے، صلابت کے اور مشقت کے
وفا کے، قرب و رفاقت کے، مہر و الفت کے
صفا و صدق کے، انسانیت کی خدمت کے
کرم کے، جود و سخا کے، عطا کے، بخشش کے
کمال و کشف کے، کاوش کے اور کوشش کے
یہ ہاتھ کتنے حسیں، کتنے خوبصورت ہیں۔
مگر ہمیشہ مجھے اِن سے خوف آیا ہے۔
یہ ہاتھ سانپ کا پھن ہیں
یہ ہاتھ ہاتھ نہیں
مجھے نہ دیکھو مرے ہاتھ پہ نظر رکھو

دنیا

ساتھ چلا ہوں میں دنیا کے
اور دنیا کو چھوڑا بھی ہے
ٹکرایا ہوں ہر پتھر سے
پتھر سے سر پھوڑا بھی ہے۔
چبھتی ہے ہر شیشے کی نے
ہر شیشے کو توڑا بھی ہے۔
دنیا کے ٹوٹے تاروں کو
دل کی لے سے جوڑا بھی ہے
لیکن قاتل پھر قاتل ہے
اُس کو دیکھو اس کو نہ چھوڑو

بشیر نواز:

سچ کی عمر ہے اک لمحہ

فلک کے دامن میں پھول سا اک لٹک رہا ہے۔
نہ جانے کل اسکو وقت کس غار میں گرا دے
گزرتے لمحوں کی گرد ممکن ہے اسکو انجان وسعتوں میں کہیں چھپا دے
دمکتی بے چین لو بجھا دے

یہ آج اس لمحہ اک صداقت ہے
جیسے میں اور تم ہیں زندہ
نہ جانے کل کیا ہو
یہ بھی ممکن ہے اس صداقت پہ خود مجھے، خود تمہیں بھی اک خواب کا گماں ہو
یقین اپنا دھواں دھواں ہو

یہ اپنی اس لمحے کی صداقت
نہ جانے کس کس کے واسطے اب بھی جھوٹ ہو صرف داستاں ہو
کوئی بتائے
وہ کون قدریں ہیں جن کے آنچل
ازل کے دامن کا سلسلہ ہیں

کہاں ہے وہ سچ؟
وجود کے دن سے آج تک جو اٹل ہے بے میل ہے امٹ ہے۔
ہزار ہا برف کی چٹانوں کے نیچے مچھلی کی لاش کی طرح بے تغیر ہے بے نمو ہے
میں اس حقیقت کو جانتا ہوں
کہ وقت کا چاک سچ کو ہر لمحہ نت نئے روپ دے رہا ہے۔
میں لمحہ لمحہ بدلتے رنگوں میں سچ کے چہرے کو ڈھونڈتا ہوں۔

قبر

ہُو کا عالم ہے نہ اپنا نہ پرایا کوئی
نہ کوئی شاخ جو تعظیم سے سایہ کو جُھکے
نہ کوئی دوست کہ جو اشک بہانے کو رُکے
نہ کوئی ہاتھ جو رکھ دے مرے سینے پہ گلاب
سب ستم خوردہ و مجبور سب ہی پا بہ رکاب
سب کے سینوں پہ ہے خود اپنی ہی قبروں کا عذاب
خیریت پوچھنے والے یہ بھلا کیا جانیں
اپنی ہی مرگِ جواں سال کا نوحہ ہوں میں
اپنی ہی قبر کا ٹوٹا ہوا کتبہ ہوں میں
یہ بھی اک رسم ہے کہتے ہیں کہ زندہ ہوں میں

زبیر رضوی:

دادخواہ

نیم کی اک شاخ
پہلی بار
تاریکی میں تنہائی کی نوحہ گر ہوئی ہے۔
رات آنکھوں میں شکستہ خواب لیکر جاگ اٹھی ہے
درد میں ڈوبی ہوئی آواز کی سامع بنی ہے
ہر طرف ماحول خاموشی کے پہلو میں سمٹ کر سو رہا ہے
میرا کمرہ جاگتا ہے
آخری صفحات اپنی ڈائری کے
لکھتے لکھتے رو دیا ہوں
موم بتی کی پلک سے ٹوٹ کر آنسو گرا ہے
سوچتا ہوں درد کی اس قتل گہہ میں
کون کس سے داد کا طالب ہوا ہے !!!

حمید الماس:

"میں"

زمانہ کے صحرا میں
پتھر کے مانند استادہ
خاموش حیراں کھڑا ہوں
مرے لب پہ مہریں
مری آنکھیں ویراں
مرے پاؤں مٹی کے سینہ میں
دھنستے چلے ہیں

میں لمحوں کے رستے کا راہی
کبھی اپنی منزل کی جانب چلا تھا
شب و روز کی گردشیں
چاند سورج کی کرنیں
مجھے جانتی تھیں
میں انھیں جانتا تھا
معاً راہ کی بھیڑ میں
تم نظر آئیں
میں رک گیا
میں نے مڑ کر جو دیکھا
تو پتھر کا بت بن گیا

خدا جانے کوئی طلسمات کی وادیوں سے
کب آئے
مجھ پہ پانی چھڑک کر جگا دے
تو میں بول اٹھوں
میں خدا ہوں

حُرمت الاکرام

ایندھن

گپھاؤں سے نکلو
تو پوچھوں یہ تم سے کہ انسان کیا ہے؟
مگر تم تو شاید
کسی چوٹ کھائے ہوئے بھیڑیے کیطرح
تلملا کر، غضب ناک ہو کر کہو گے،
یہ معلوم کس کو نہیں ہے
کہ انسان مٹی کا پتلا ہے، بس اور کیا ہے؟

میں پھر کیا کہوں گا، یہی سوچتا ہوں
یہی سوچ کے چپ ہوں لیکن
یہ چپ اپنا ایندھن ابھی سے طلب کر رہی ہے
تو کیا اسکو اندر ہی اندر سُلگنے دوں؟
بن جانے دوں اک جوالا مکھی؟
میں یہ بھی سوچتا ہوں

اسی واسطے پوچھتا ہوں یہ تم سے کہ انسان کیا ہے؟

آہٹ

آہٹ ابھری
پگڈنڈی الفاظ کی گونجی
کہر میں ڈوبے چہرے بولے
صبح ہوئی
ہم کو پہچانو

○

آخری دن
صُور کی آواز گونجی
ہڈیاں اگلیں گی قبریں
کوہسار اڑتے پھریں گے
(روئی کے گالوں کی طرح)
چادریں تانو
سوا نیزے پہ سورج آگیا ہے

○

کہہ دو

بجھ گئی مہر کی آگ
ہو گئی کرنوں کی مشعل ٹھنڈی
رات مہتاب کی قندیل لئے آئی ہے
رات سے کہہ دو
یہ قندیل نہیں راحتِ جاں
کیا خبر
کب اٹھے اک پارۂ ابر
اور اندھیرا چھا جائے

○

جشنِ حیات

نہ سہی ذوقِ محفل آرائی
نہ سہی اہتمامِ جشنِ بہار
زندگی اتنی کم عیار نہیں
آدمی کب ہے اس قدر مجبور

کیوں شبِ ماہ رائگاں جائے
کریں اک آہ، گیت اک گائیں۔

سحر انصاری

ہجر کی مثال

وہی مکان ہے
وہی یقین ہے، وہی گمان ہے۔
مگر وہ دل کہاں کہ جس کی دھڑکنیں
میرے دل کے پاس آکے پوچھتی تھیں کیوں
اتنی دیر تک کہاں تھے تم ؟
گھڑی کی سوئیوں نے نصف شب کے سارے زخم گن لیے
تھکے تھکے کہاں سے آرہے ہو تم
اور اب جو آئے ہو تو چپ، اداس ہو، ملول ہو
اور آکے میز پر
سفید پیڈ اور پین لئے
لکیریں دائرے بنا رہے ہو کیوں ؟
ہمیں ستا رہے ہو کیوں ؟

وہ جسم اس کا مکان میں کیوں نہیں
جو مجھ سے نیم شب میں پوچھتا تھا سو رہے ہو کیا ؟
وہ جاگتا حصار
جس کے بازوؤں میں میری جیت تھی
وہ اب میری شکست کا بہانہ کیسے بن گیا
وہ ایک لمحہ ہجر کا زمانہ کیسے بن گیا
وہ لمسِ شاخِ گل بھی تازیانہ کیسے بن گیا

یہ خامشی
ہے کس صدا کی منتظر
یہ تیرگی
ہے کس چراغِ آرزو کی رہگزر
مکان کیوں اداس ہے۔
زمیں کیوں اداس، آسمان کیوں اداس ہے
جہان کیوں اداس ہے۔
میں تیرے ہجر کی مثال بن کے جی رہا ہوں کیوں
میں اپنی ذات کا سوال بن کے جی رہا ہوں کیوں

مرے سوال کا جواب
ہوائے نیم شب کی دستک خموش تو نہیں
جنوں کے درد کا علاج زہر ہوش تو نہیں

فضا ابن فیضی:

متاعِ رُسوائی

میں نے چاہا تھا کہ بازار میں رسوائی کے
آج پاکیزگیٔ لوح و قلم تو نہ بکے

چاک در چاک نہ ہو میرے رسولوں کی قبا
کوچہ در کوچہ یہ ناموس امم تو نہ بکے

کچھ بڑی شے نہیں ہونٹوں کا تبسم لیکن
آبروئے جو محبت کی وہ غم تو نہ بکے

ہے اسی موج سے شاداب مری کشتِ خیال
جل بجھے جسم مگر آنکھ کا نم تو نہ بکے

مفت رسوا تو نہ ہو جیب و گریباں کا وقار
عقل کے ہاتھ جنوں کا چم و خم تو نہ بکے

ذہن میں جال تو بُنتا رہے گیتوں کا طلسم
فن تو زندہ رہے شاعر کا قلم تو نہ بکے

سرِ بازار نہ ہو قلب و نظر کا نیلام
اس طرح ہوش و بصیرت کا بھرم تو نہ بکے

میری آنکھوں نے اسی بزم میں دیکھا لیکن
کتنے خوابوں کو حقیقت کی تجارت کرتے

میں نے پھولوں کو اسی باغ میں اکثر دیکھا
اپنی ہی نزہت و نکہت کی تجارت کرتے

ہر جگہ مجھکو ملے ہیں یہی اربابِ خرد
ننگ و ناموس بصیرت کی تجارت کرتے

گذرے بازار سے صاحب نظرانِ محفل
فکر و تخیل کی عظمت کی تجارت کرتے

انتہا یہ ہے کہ آئینوں کو میں نے پایا
اپنے جوہر کی لطافت کی تجارت کرتے

کون سی چیز رہی دستِ ہوس سے محفوظ
چشم و ابرو بکے، خال و لب و رخسار بکے

دامِ عشووں کے لگے، مول اداؤں کا ہوا
لائۂ عارض و سروِ قد دلدار بکے

اسی ماحول میں اربابِ وفا کے ہاتھوں
عشق کی آن بکی، حسن کے پندار بکے

ایک اک شہر "زلیخا کدۂ مصر" بنا
اس طرح یوسفِ کنعاں سرِ بازار بکے

اپنی ہی مشک کی خوشبو نے دیئے انکو فریب
آج بے دامِ غزالانِ طرح دار بکے

کچھ نہ باقی رہا تہذیبِ جنوں کی خاطر
جیب و دامن بکے، پیراہن و دستار بکے

آدمیت ہے کہ جنسِ سرِ بازار کوئی
لوگ سو بار خریدے گئے، سو بار بکے

پاؤں میں عیشِ غلامی کی چمکتی زنجیر
یوں بھی آزاد تمدن کے پرستار بکے

ہوئی چورا ہوں پہ تقدیسِ محبت نیلام
آج نفرت کے اندھیروں میں حسیں پیار بکے

ہے تصور ہی غلط پھول کا خوشبو کے بغیر
زیست خود بک گئی جب زیست کے اقدار بکے

کیا قیامت ہے کہ مل جائیں خریدار اگر
دھڑکنیں دل کی بکیں، نبض کی رفتار بکے

پھر بھی خالی ہی رہا ذہن و نظر کا کشکول
فن کے آثار بکے، فکر کے شہ کار بکے

برسرِ بزم ہوا غالب و اقبال کا مول
اپنے ہی فن کی دکانوں میں یہ فنکار بکے

کیا کہوں میں ادب و فن کی گذرگاہوں میں
کتنے پاکیزہ خیالات کا نیلام ہوا

یوں چکائی گئی مطرب کے نفس کی قیمت
ساز کے ساتھ ہی نغمات کا نیلام ہوا

وقت نے چھین لی احساس کے ماتھے کی شکن
گرمیٔ شعلۂ جذبات کا نیلام ہوا

پی گئی سختیٔ حالات قلم کی شبنم
ساقی و جام و خرابات کا نیلام ہوا

ابدیت نہ رہی فن کی حسیں قدروں کی
عشق و مستی کی روایات کا نیلام ہوا

میں نے چاہا تھا کہ بازار میں رسوائی کے
آج پاکیزگیٔ لوح و قلم تو نہ بکے

مخمور سعیدی

"تھکن"

یاد آ رہی ہے آج وہ ساعت کہ میں نے جب
پہلا قدم رکھا تھا سرِ رہ گذارِ شوق

رکتی نہ تھی نگاہ کسی اک مقام پر
پیدا نہ تھی کہیں بھی کوئی صورتِ قیام
نادیدہ منزلوں کے تجسس میں روز و شب
دل کو سکون تو نیند ان آنکھوں کو تھی حرام

دنیا مرے خیال کی کتنی وسیع تھی
کیا کچھ مری نظر سے گذرتا چلا گیا
جن مرحلوں میں توڑ دے دم ذوقِ رہروی
طے ایسے مرحلے بھی میں کرتا چلا گیا

اتنا بڑھا جنونِ سفر اس قدر بڑھا
رسم و رہِ سفر سے میں بیگانہ ہو گیا
مجھ کو سنا سنا کے، مری ہرزہ گردیاں
کہنے لگیں: یہ شخص تو دیوانہ ہو گیا

لیکن اب ایک عمر کی آوارگی کے بعد
ہوش آ رہا ہے کچھ دلِ خانہ خراب کو
محرومیوں کی گرد میں لپٹا ہوا شعور
مجھ سے چھپا رہا ہے مرے اضطراب کو

وہ تجربے ہوئے کہ خود اپنی نگاہ میں
باقی نہیں رہا ہے اب اپنا کوئی بھرم
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور آتا نہیں نظر
راہیں پکارتی ہیں اور اٹھتے نہیں قدم

شل ہو گئے قدم تو سفر ختم ہو گیا
واماندگی سے روح سکوں پا ہی جائیگی
اب دھوپ ہو کہ چھاؤں کہیں بیٹھ جاؤں میں
اب اتنا تھک گیا ہوں کہ نیند آ ہی جائیگی

ڈاکٹر عزیز تمنائی

ہالے اور روپ

مجھے سوچنے دو
کہ میں کر رہا ہوں گذرتے ہوئے ثانیوں کا شمار
انہیں ثانیوں کی خراماں قطار
اسی سمت روندے چلی جارہی ہے ہر اک رہگذار
جہاں اولیں بار آہٹ سے چونکے تھے گرد و غبار

مجھے سوچنے دو
گذرتے ہوئے ثانیوں کی جہانگشت آنکھوں میں
وہ ان گنت روپ ہیں
مری آپ بیتی کے پائندہ پیکر
جو اب بھی ہیں ہر موڑ پر ایستادہ
مری سوچ کے جال بنتے ہوئے

مجھے سوچنے دو
کہ ان ثانیوں کی جب ان پیکروں سے ملاقات ہوتی ہے۔
ہر فاصلہ دُھند میں ڈوب جاتا ہے
ہر سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے
اور مجھ کو محسوس ہوتا ہے جیسے
گذشتہ و آئندہ ہر ثانیہ ایک ہالہ ہے اور درمیاں میرا روپ
مرا ہر لمحہ دگر رنگ روپ۔

شمیم نوید

"مساوات"

شاید وہ سب جھوٹے تھے
جن لوگوں نے
عشق کیا تھا
ایک ہی صورت کو چاہا تھا
اُس خوشبو کا ایک رنگ ہی دیکھا تھا
وہ خوشبو
جو بٹی ہوئی ہے کتنے جسموں کتنے چہروں میں
یا پھر
میں جھوٹا ہوں
جس کو
ہر چہرہ اچھا لگتا ہے۔

شبی فاروقی

تو پھر کس لئے ؟

میں ۔ رفاقت کی پژمردہ ٹہنی پہ کمہلایا اِک پھُول
وہ ۔ رُخ بدلتی ہواؤں کی لہروں پہ اُڑتی ہوئی ایک تتلی
زمانہ ۔ بدلتے ہوئے موسموں کی صداقت کا نوحہ
تو پھر کس لئے
چاند سورج کی چاہت میں، پیاسی زمیں نے
پرستش کے دریا بہائے
پہاڑوں نے شفاف جھرنوں کے نغمے سُنائے ۔
اور اُڑتے ہوئے ابر پاروں نے شبنم کے موتی لٹائے
مگر ۔ کون ہے جو بتائے
کہ اس چھایا ناٹک کی شوبھا
اجالوں کے بے رنگ پردوں پہ اپنے ہی میلے
بدن کی سیاہی کا پرچار ہے
جو کنول نین جوتی کی شیتل مدھر چاندنی کی سبھا میں
کسی کامنی نرتکی کے سجل پاؤں کے گھنگرؤں کی چھنک
تو کبھی گیت سنگیت کے نت نئے روپ مالا کی سندر لیک
سے برہ کی اگن مانگ کر بیل بوٹے کھلائے
تو پھر کوئی تتلی
کسی پھول سے ریت کیسے نبھائے ۔

میں ۔ رفاقت کی پژمردہ ٹہنی پہ کمہلایا ہوا اک پھول
وہ ۔ رُخ بدلتی ہواؤں کی لہروں پہ اڑتی ہوئی ایک تتلی
زمانہ ۔ بدلتے ہوئے موسموں کی صداقت کا نوحہ !

بیتے لمحوں کا قرض

نہ تجھ کو پانے کی کوئی حسرت
نہ تجھ کو کھونے کا کوئی غم ہے
کہ آج اک عمر کی مسافت کے بعد
خود آگہی نے مجھ کو
وہ غم دیا ہے
جو تیرے غم سے بھی کچھ سوا ہے
وہ غم بڑا ہے
کہ جس نے بخشا ہے زندگی کا شعور مجھ کو
کہ مرے پاس اب
سوائے اس اک شعور کے اور کیا ہے باقی
لٹا چکا ہوں میں حال اپنا
گنوا چکا ہوں میں اپنا ماضی
ہیں اس طرح دونوں ہات خالی
کہ اب نئے آنے والے لمحوں کو سوچتا ہوں
جو مجھ پہ واجب ہے بیتے لمحوں کا قرض
کیسے ادا کروں گا ؟

نریش کمار شاد

"سراب"

جب کبھی مجھکو تیرا خیال آگیا
میرے چہرے کی ساری تھکن ڈھل گئی
میرے دل میں خوشی کے کنول کھل گئے
میرے احساس میں چاندنی گھل گئی

اور پھر اک مچلتے ہوئے جوش سے
چل پڑا میں تری جستجو کے لئے
اپنی وا ماندہ آنکھوں کی محراب میں
کتنی گلرنگ شمعیں فروزاں کئے

جانے کب تک ترے رنگِ رخسار کو
آرزؤں کے خاکوں میں بھرتا رہا
لے کے تخیل کے بازؤں میں تجھے
گیت گاتا رہا، رقص کرتا رہا

یونہی گاتے ہوئے رقص کرتے ہوئے
میں بھٹکتا رہا کتنے صحراؤں میں
رُوح میں تو امنگیں مہکتی رہیں
اور کانٹے کھٹکتے رہے پاؤں میں

مُدتوں تک تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے
آ ہی پہنچا بالآخر میں تیرے قریں
آنکھ اٹھا کر جو دیکھا تری شکل کو
مجھکو ڈسنے لگا میرا خوابِ حسیں

کیا یہی وہ بھیانک خد و خال تھے
جو مرے عزم کو گدگداتے رہے
جن کی خاطر مرے نوجواں ولولے
زندگی بھر مصائب اٹھاتے رہے

مصحف اقبال توصیفی

سفر

خاموش ہے رات تیرگی بھی
سنسان اداس راستوں کی
باہنوں میں سمٹ کے سوگئی ہے
اک یاد بدل بدل کے پہلو
پھر مجھ سے لپٹ کے سوگئی ہے
ٹوٹا ہے فلک سے کوئی تارہ
رہ جائے گا پھر خلا میں کھوکر
میں نے اسی گھومتی زمیں سے
اے جاں تری چاہ کے سفر میں
ڈھونڈا ہے تجھے خلاؤں میں بھی
کچھ رات تو کٹ گئی ہے یوں بھی
گو دور ہی ہے وفا کی منزل
یہ فاصلہ کچھ تو کم ہوا ہے
پلکوں سے ڈھلک کے ایک آنسو
رخسار پہ میرے تھم گیا ہے

علی عباس امید

آبلہ پائی

وہی موسم خزاں کا اور وہی بے رنگ منظر ہے
وہی جھلسا ہوا سبزہ، وہی تپتی چٹانیں ہیں
تمناؤں کے صحرا میں حوادث کے بگولے ہیں
تصور کے بیاباں میں حسیں یادیں بھٹکتی ہیں
سر مقتل چراغاں ہے، صلیبوں کی قطاریں ہیں

میں آشفتہ پریشاں، تشنہ لب، بے کار و بے مایہ
سکوں ناآشنا، طوفاں گزیدہ راہ رو بھٹکا
نہ جانے کتنی مدت سے اسی کھنڈر میں پھرتا ہوں

مجھے اس آبلہ پائی کا کوئی غم نہیں پھر بھی
یہ اکثر سوچتا ہوں جانے اس کی انتہا کیا ہو

دیار ہو میں بکھرے میرے تابندہ نقوش پا
کسی گم کردۂ منزل کے رہبر ہو بھی سکتے ہیں
مری مدت کی یہ محنت کبھی راس آ بھی سکتی ہے
تخیل کی حسیں دنیا کبھی پاس آ بھی سکتی ہے

محمود خاور:-

اندیشے

ہر طرف اک سکوت.... خاموشی
در و دیوار پر دھندلکا سا
رات آدھی گذر گئی..... لیکن
نیند آنکھوں سے دور ہے اب بھی

ڈر رہا ہوں کہ پھر کوئی سایہ
میری جانب بہت دبے پاؤں
تیرگی سے نکل کے آئے گا
پھر کسی دستِ ناز کی نرمی
مری رگ رگ میں دوڑتی ہوگی
پھر کوئی مرمریں حسیں پیکر
میری نظروں کے سامنے ہوگا

یونہی ہر ایک رات میرے لئے
جھومتے خواب لے کے آتی ہے
شمع جلتی ہے. پھول کھلتے ہیں
اور پھر خواب ٹوٹ جاتے ہیں
تیرگی پر سمیٹ لیتی ہے
دن کے مقتل میں نشتر کا سورج
ہاتھ میں تیغِ انتقام لئے
ہر نفس کا حساب مانگتا ہے

خواب تعبیر بن نہیں سکتے
گھاؤ صدیوں کے جاگ اٹھتے ہیں
خواہشوں کا یہی مقدر ہے
زندگی کی اداس راہوں میں
ساتھ چلتا ہے کربِ تنہائی

اپنے خوابوں سے آج ڈرتا ہوں
یہ مرے خواب میرے دشمن ہیں
دو گھڑی روک کر اجالوں میں
تیرگی اور بھی بڑھائیں گے

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

ایک مصیبت

> تم جو خواہش رکھتے ہو وہ پوری نہیں ہوسکتیں تمہاری محبت کا راستہ بند ہے اسلئے تم گھٹ رہے ہو۔ تمہاری محبت ایک لاحاصل کشمکش ہے اسلئے تم لاشعوری طور پر اسے مصیبت سمجھتے ہو۔

میں نے اسے ریل سے اتروا کر اپنے موٹر میں بٹھا کر خود اسٹیرنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا، "تم میرے لئے ایک مصیبت ہو۔"

"ہاں میں آپ کو بہت تکلیف دیتی ہوں" اس کی نہایت دلکش سریلی آواز میرے کان میں آئی اور انجن کی جس کو میں نے اسٹارٹ کردیا تھا آواز میں غائب ہوگئی۔

موٹر کو بڑھاتے ہوئے میں نے کہا، "تم سمجھیں نہیں میرا مطلب کیا ہے۔ تمہاری خدمت کرنے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ بڑا مزا آتا ہے۔ میں اس فکر ہی میں رہتا ہوں کہ تمہارا کوئی کام ہو اور میں انجام دوں۔ تمہارے بابت سوچتے رہنے کی۔ تمہارے کام میں لگ جانے کی عادت پڑگئی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ جب تمہارا کوئی کام نہیں ہوتا تو بیقرار رہتا ہوں۔ تم سامنے نہیں ہوتیں تو تمہارا تصور آنکھوں کے سامنے کھیلتا رہتا ہے۔ تم یہاں ہوتی ہو تو دوڑ کر تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔ تم باہر ہوتی ہو تو جی چاہتا ہے کہ اسٹیشن پہنچ کر ٹکٹ لوں اور تمہارے یہاں پہنچ جاؤں۔ اکثر خیال ہوتا ہے موٹر میں پیٹرول بھروا کر تان دوں اور تمہارے ہاں جا پہنچوں مگر جب تم سامنے آجاتی ہو تو عجیب عالم ہوتا ہے تم بہت دور معلوم ہوتی ہو۔ میرے تمہارے درمیان ایک دیوار حائل نظر آتی ہے جس کو میں پار نہیں کرسکتا۔"

یہ کہتے کہتے میں رک گیا کیونکہ موٹر شہر کے گنجان حصے میں سے گزر رہا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ موٹر کے بیک ویو مرر میں دکھائی دے رہا تھا۔ میری ایک نگاہ اس پر بھی پڑ ہی جاتی۔ وہ ہمیشہ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ مگر اس وقت چہرہ پر ایک خاصی سرخی نمایاں ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سرور تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل کوئی لذت محسوس کر رہا ہے جو چہرہ پر چھلک گئی ہے اور مجھے حصہ دار بننے کی دعوت دے رہی ہے۔ میرا دل بھی اس کیف سے بھرتا رہا اور میں آبادی سے نکل کر سول لائن کی سڑک پر آیا۔

"ہاں تو تم سمجھیں کہ تم مجھ پر ایک مصیبت کی طرح آئیں اور ایک مصیبت ہوگئیں۔" میں نے کار کو ٹاپ اسپیڈ پر کرکے تیز کرتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرہ کا رنگ اور بھی سرخ ہوا۔ آنکھوں میں اور بھی زیادہ مستی آئی اور ہونٹ یوں کھل گئے جیسے کہ بوسہ لینے کی اجازت دے رہے تھے۔ سڑک سناٹے کی تھی اور بے اختیار میرا جی چاہا کہ موٹر روک کر اس کا منہ چوم لوں مگر میں نے آئینے سے نظر ہٹا کر اس کو دیکھا تو ایک پراسرار دیوار میرے سامنے حائل ہوگئی۔

میں نے سڑک پر نگاہ کرتے ہوئے کہا، "میرے دل میں ایک سوال ہے جو میں تم سے آج پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہی میری ساری

مُصیبت کی جڑ ہے"

"کیا سوال ہے؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

میرے منہ تک سوال آیا مگر پھر کہتے کہتے سالگا میں نے کہا،

"اچھا پہلے ایک اور سوال کا جواب دیدو"

"ایک اور؟ آخر پہلا ہی سوال کیوں نہیں پوچھتے"

"وہ بعد میں آجائے گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہ جانتی ہو کہ میں تم کو چاہتا ہوں"

اس نے ٹھٹھا مارا اور بولی "کیا آپ نے مجھے بالکل احمق سمجھ رکھا ہے۔ کیا میری آنکھیں پھوٹی ہیں۔ کیا آپ کی ہر ہر حرکت میں میری حد سے زیادہ دلجوئی نہیں ہوتی"

"یہ سب تو دوستی اور مروت میں بھی ہو سکتا ہے"

"مگر آپ میں بات ہی اور ہے ایک عجیب شوق۔ ایک عجیب خلوص۔ ایک عجیب جذبہ کہ آنکھوں صاف صاف عشق نمایاں ہوتا ہے مجھ ہی نہیں دکھائی دیتا بلکہ میری امی نے ایک دن کہا" اس پر ہنسی اور پھر ہنسی اور پھر شرما گئی۔

"ہاں تو تمہاری امی نے کیا کہا؟"

اس کے چہرہ پر ایک متفکرانہ سنجیدگی آئی اور غیر جذباتی سے لہجہ میں اس نے کہا "یہی کہا کہ یہ تم پر بری طرح عاشق معلوم ہوتا ہے، یعنی تمہارے میاں سے کسی دن جھگڑا نہ ہو جائے"

"اور تمہارے میاں کو بھی کبھی کسی دن کوئی شبہ ہوا"

"کچھ ہے تو۔ مگر انہوں نے خود ہی تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا اور پھر برابر ہر کام میں مجھے آپ کے پاس بھیج دیتے ہیں یا آپ کو بلوا لیتے ہیں۔ میں برابر آپ کے ساتھ اکیلی ہی ہوتی ہوں کوئی ساتھ کبھی نہیں ہوا"

"ممکن ہے کہ انہوں نے کبھی میری بابت تم سے کچھ پوچھا ہو؟"

"آپ کے بابت جب بھی کوئی بات چھیڑتے ہیں تو میں ٹال دیتی ہوں کسی کام کا ذکر کرنے لگتی ہوں۔"

"تو میں یہ سمجھوں کہ آپ میرے حال کو ان سے چھپانا چاہتی ہیں۔ جو محسوس کرتی ہیں وہ صاف نہیں کہہ دینا چاہتیں"

"اگر میں کہہ دوں تو وہ ضرور بگڑ جائیں گے آپ سے"

"اور تم نہیں چاہتیں کہ وہ مجھ سے بگاڑ کریں یعنی ہم دونوں کے ملنے میں حائل ہوں"

اس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ہنس دی اور پھر اس کے چہرہ پر وہ لجاہٹ اور اس کی آنکھوں میں وہ مستی جو مجھے بیقرار کر رہی تھی کمال کو پہنچ گئی۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں مجھے بڑے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت سامنے سے آتی ہوئی ایک بس کا ہارن بجا اور میں اپنی موٹر کو سنبھالنے لگا۔

تھوڑی دیر خاموشی سے سڑک پر نگاہ کئے ہوئے چلنے کے بعد میں نے مہرہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرہ پر سنجیدگی بلکہ افسردگی نظر آئی۔ میں نے کہا "اب میں وہ سوال پوچھ سکتا ہوں اس بات کا ذکر کر سکتا ہوں جس کی وجہ سے تم میرے لئے ایک مُصیبت ہو گئی ہو"

وہ کچھ نہیں بولی مگر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

"آئیں تم رنجیدہ معلوم ہو رہی ہو؟ کیا بات ہے؟"

میرے یہ کہنے پر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے دکھائی دیئے۔

میں نے کہا "تم روؤ نہیں میرے سوال کا جواب مل گیا"

میں نے اب محسوس کیا کہ جیسے مجھے اس کا چہرہ بیک وقت مرر میں دکھائی دے رہا تھا ویسے ہی میرا چہرہ بھی دکھائی دے رہا تھا آئینہ میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے کہ ہم اپنے کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ مگر ایک کو دوسرے کا چہرہ ضرور نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ روتے روتے ایک دم سے ہنسنے لگی اور ہنستے ہوئے اس نے اپنا سر اپنے گھٹنے پر ٹکایا اور پھر اٹھا کر اور ہنسی۔

میں نے پھر بات شروع کی۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سے پہلے پہلے محبت نہیں ہوئی۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ تم مجھ سے محبت کر رہی ہو کچھ عرصے تک میں نے الگ ہونا چاہا۔ ہزاروں قسم کے

چاہتی

خیالات آتے تم مجھے کسی طرح اچھی نہیں لگی تھیں. مگر تم مجھ سے اور بھی زیادہ کھل کھل کر بیباک ہو ہو کر ملنے لگیں. مجھے محسوس ہوا کہ مجھے تم سے محبت کرنا چاہیئے۔ میں نے کبھی فارسی کا ایک شعر پڑھا تھا۔

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود
شمع دل سوز یدگئی پروانہ شیدا می شود

میں اس شعر پر یہ سوچا کرتا تھا کہ یہ بات محض وہم ہے ایک صاحب نے اس کے یوں معنے بھی سمجھائے کہ فقرہ عشق اول ہے یعنی اول درجہ کا عشق لیکن اگر یہ معنی لئے جائیں کہ اول درجہ کا عشق معشوق کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے تو پھر دوسرے مصرعے کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے ہیں یہی سوچتا رہا ہوں کہ تم مجھ پر ایک مصیبت نازل ہوئیں اور میں اس میں زیادہ سے زیادہ شوق سے پھنستا گیا یہاں تک کہ میں اب تمہارے لئے بے قرار رہتا ہوں "

" تو تمہیں یقین ہے کہ اس مصیبت کو میں نے شروع کیا "

" ہاں کچھ ایسا ہی ہے. تمہارا کیا خیال ہے "

پھر وہ ہنس کر دوہری ہوئی اور بولی ۔خیر مصیبت کا لفظ تو میں استعمال نہیں کروں گی مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تھی. تم میرے شوہر سے اس قدر مختلف تھے ۔ وہ مجھ پر بہت سخت ہیں، بات بات پر غصہ کرتے رہتے ہیں۔ تم نے کبھی غصہ تو کیا بے اعتنائی کے تیور بھی اختیار نہیں کئے ۔ میں تم سے زیادہ سے زیادہ خوش ہو ہو کر ملتی رہی ۔ محبت عشق و شق کا تم لوگوں کو خیال ہوتا ہوگا مجھے تو اپنی خوشی کا خیال تھا اور مجھے یہ مصرع یاد آتا ع ہموارہ مرا عید ز دیدار تو ہموار ۔ اس میں حرج کیا تھا مصیبت کیا تھی ۔ تم اسے نہ معلوم کیا سمجھے اور اب ایک مصیبت خیال کرتے ہو "

" مصیبت مصیبت ۔ الحمد میں یہ کیا لفظ استعمال کر گیا جس سے تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے "

وہ ہنسی اور کہنے لگی " مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے خیر میں سمجھتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے تھے اس لئے میں تم سے محبت کرنے لگی ۔ تم سمجھے کہ میں محبت کرتی ہوں اس لئے تمہیں محبت کرنا چاہیئے ورنہ ظاہری حسن کا سوال تو تمہارا چہرہ میرے میاں کے چہرہ سے کسی طرح اچھا نہیں ہے اور تمہیں بھی میری صورت کوئی خاص حسین نہیں معلوم ہوتی ہم لوگوں کی محبت کو حسن سے کوئی خاص تعلق نہیں ۔ اب یہ سوال کہ پہل کس نے کی تو میں سمجھتی ہوں تم نے ۔ تم سمجھتے ہو میں نے ۔ عشق اول در دل معشوق پیدا می شود الا شعر جو تم نے سنایا اس کے کہنے والے شاعر نے بھی تمہاری طرح محسوس کیا ہوگا کہ محبوبہ نے پہل کی ۔

" تو پہل کسی کی طرف سے نہیں ہوئی "

" میرا تجربہ تو محدود ہے کہہ نہیں سکتی کہ صحیح کہہ رہی ہوں یا غلط مگر میں سمجھتی ہوں دونوں دلوں میں ایک ساتھ ہی محبت جاگ جاتی ہے اور لاشعور میں رہتی ہے شعوری احساس بعد میں ہوتا ہے کسی کا شعور پہلے اپنی طرف جاتا ہے اور کہتا ہے پہل اس نے کی اور پھر معشوق کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ بھی مان گئی یا راضی ہو گئی کسی کو معشوق کے عشق کا شعور پہلے ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ میں بھی راضی ہو جاؤں ۔ اصل میں محبت ہوتی ہی نہیں اگر دونوں طرف نہ ہو "

" یہ بھی تو ہوتا ہے کہ ایک محبت کرے اور دوسرا یا دوسری نفرت کرے "

ایسے واقعات ہماری اس وقت کی بحث سے خارج ہیں ان کی پیچیدگیاں اور ہیں گی ۔ مجھے ان کا کوئی تجربہ نہیں اور نہ مجھے ان کی بابت کوئی کلیہ پیش کرنا چاہیئے "

" اچھا میں جو سوال کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھا کیا تم کو مجھ سے پہلے محبت ہوئی جس کے جواب میں مجھے محبت کرنا پڑی اور مجھے اس کا جواب مل گیا ۔ محبت میرے دل میں بھی اسی وقت سے تھی جب میں نے تمہیں دیکھا اور تمہارے دل میں بھی مگر مجھے پہلے تمہاری محبت کا شعور ہوا "

" اور اس شعور نے ہی تو اسے مصیبت قرار دیا "

" مصیبت ؛ مصیبت کوئی نہیں یہ لفظ تو اک دم سے میرے منہ سے نکل گیا "

" اک دم سے نکل جانے ہی کی وجہ سے یہ تمہارے دل کے حال کا زیادہ بہتر ترجمان ہے "

"مصیبت بڑی دلکش ہے۔ تم کچھ اور نہ سمجھو"
"نہیں یہ مصیبت حقیقی ہے۔ میں اسے پورے طور سے سمجھتی ہوں۔ تمہاری محبت کا راستہ بند ہے تم جو جو خواہشیں مجھ سے رکھتے ہو وہ پوری نہیں ہو سکتیں اور اگر پوری کرنے کی کوشش کروگے تو بڑے جھگڑوں میں پڑوگے۔ اگر میں اور تمہارے قریب ہو جاؤں تو یہ راز ایک دن کھل رہے گا اور تمہارے اور تمہارے دوست کے جھگڑے ہوں گے۔ اگر طلاق لے کر میں تم سے شادی کر لوں تو آخر میرے بچے بھی ہیں جو لازمی طور پر میرے میاں سے تعلق رکھیں گے اور ان کے مارے میں اپنے میاں کو ہرگز نہ چھوڑ دوں گی چاہے مجھے کتنی ہی تکلیف ہو۔ تمہارے لئے میری محبت کا کوئی خاتمہ نہیں نظر آتا۔ اس لئے تم گھٹ رہے ہو اور محبت اپنی جگہ پر ہے ہی وہ برابر تم سے میرے کام کراتی ہے۔ غرض تمہاری مجھ سے محبت ایک لاحاصل کشمکش ہے اس لئے تم لاشعوری طور پر اسے ایک مصیبت سمجھتے ہو"
"اور اگر تم کو محبت ہے تو تم بھی اسے ایک مصیبت سمجھتی ہوگی۔ تمہارے رویے سے میں بھی یہ نتیجہ نکالوں کہ وہ تمہارے لئے بھی ایک مصیبت ہے تو؟"
"نہیں میرے لئے مصیبت نہیں ہے۔ میرے لئے تفریح ریلیف Relief ہے۔ میاں کے ساتھ رہنا ہر وقت کی دانتا کل کل ایک مصیبت ہے۔ اس کے لئے بھی اور میرے لئے بھی۔ انہوں نے مجھ کو تمہارے حوالے کر کے اپنی بہت کچھ مصیبتوں سے نجات حاصل کر لی جو کام میں ان سے لیتی وہ تم کر دیتے ہو۔ وہ مجھے لینے نہیں آتے ان کے پاس سواری نہیں ہے۔ کام سے چھٹی بھی نہیں ملتی تم سے کہا بھیا ذرا میری بیوی کو فلاں گاڑی سے اتروا کے لے آنا"
"انہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ کسی دن میں ان کا رقیب بن جاؤں"
"اس کا سوال اب تک نہیں آیا اور نہ آئیگا کیونکہ جب بھی وہ تمہارے بابت بات چھیڑتے ہیں میں کاٹ دیتی ہوں۔ ان کو خیال بھی نہ ہوگا کہ تم میری طرف توجہ ان کی دوستی کے علاوہ بھی کسی وجہ سے کرتے ہو۔"
خیر جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ تم کو کیا ریلیف محسوس ہوتی ہے؟
"کتنی خوشی مجھے ہوئی تھی جب تم سے ملنے کے بعد احساس ہوا کہ ایک ایسا مرد بھی ہے جو ہمیشہ پیار سے بات کرتا ہے۔ جان چھڑکتا ہے اور آج چار برس ہو گئے۔ اس کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میری زندگی ایک مصیبت ہے تمہارے ساتھ جو وقت گزرتا ہے اس میں اس سے نجات مل جاتی ہے"
تو تم مرنے میں ہو میرے لئے ایک مصیبت ہے،
خیر مصیبت و مصیبت کچھ نہیں۔ مجھے ایک لذت درد ہے کبھی کبھی درد کا بھی خیال آجاتا ہے۔ مگر اب میں درد کو بھولنے کی کوشش کروں گا۔"
"تم نہیں بھول سکتے۔ یہ ناممکن ہے۔"
اب اس کے گھر والا محلہ آگیا تھا۔ میں نے کہا: "چھوڑو یہ باتیں آج ایسی باتوں پر نکل گئے اب کبھی ایسی باتیں نہ کریں گے۔"
"نہیں نہیں۔ اچھا ہوا جو ایسی باتیں ہو گئیں۔ مجھے تمہیں بتانے کا موقعہ مل گیا کہ جو یہ محبت مصیبت نہ معلوم ہو بلکہ ایک ریلیف ہو جائے"
"کوئی ایسی صورت ....؟ لو تمہارا گھر آگیا.... اگر ہو تو بتانا کبھی۔"
"کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تم ایک مصیبت اور مول لے لو۔ یہ مصیبت ریلیف ہو جائے گی۔"
"ایک اور مصیبت وہ کیا؟" میں نے کار کو اس کے گھر کے پورٹیکو میں داخل کرتے ہوئے کہا۔
اس کا میاں اور بچے نکل کر باہر آ ملے ہیں آئے۔ وہ موٹر سے اتر کر اپنے میاں سے بولی " میں ان کی جلد سے جلد شادی کرا دینا چاہتی ہوں تاکہ انہیں ایک مصیبت سے نجات ملے۔

کوثر چاند پوری

جنون کی موت

> وہ آن کی آن میں اس کونے سے اُس کونے تک خبریں پھیلا دیتے۔ شہری زندگی پر منافع کر پڑتا۔ لوگ ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے اور پھر وہی بڑا سا فساد ہو جاتا!

رات تاریک اور سنسان تھی اور بجلی کے کھمبوں پر قمقمے چمک رہے تھے۔ ان کی روشنی شاید اندھیرے سے مغلوب نہ ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ تاریکی اور روشنی میں دیر سے فیصلہ کُن جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ کمرہ کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور میں پلنگ پر پڑا شہر کی مشینی زندگی سکوت پر غور کر رہا تھا۔ کائنات اونگھتی محسوس ہو رہی تھی، اسی وقت سڑک کے دونوں طرف کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی اور کھڑکی کے سامنے آ کر گفتگو میں تبدیل ہو گئی۔

کیا خبر ہے؟ ایک آواز آئی۔

"وہ مر گیا پاگل خانے میں۔"

"مر گیا دیوانہ"

"ہاں! دیکھنا ہے ویرانے پر کیا گزرتی ہے۔"

کچھ بھی گزرے مرنے والے کو اس سے کیا؟ شہر کی ہنگامہ خیزی میں کسی کے مرنے جینے کی تو کوئی اہمیت نہیں، لوگ مرتے ہی رہتے ہیں، سڑک پر موٹر سے کچل کر آدمی مرتا ہے اور آپس کے جھگڑوں میں زخمی ہو کر جنرل وارڈ میں بھی دم توڑ دیتا ہے۔ یہ سب روزمرہ کی باتیں ہیں، لیکن پاگل خانے میں کسی کے مرنے کی خبر میرے لئے بالکل نئی تھی، عجیب اور حیرت انگیز بھی۔ وہ دونوں دیوار کے قریب کھڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے خبر سنانے اور سننے والے کو اس واقعے سے گہری دلچسپی ہو۔

"کیا ہو گیا تھا؟"

ہوتا کیا، جانتے ہو غلام نبی اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا، وہ سڑکوں پر شور مچاتا پھر رہا تھا آخر پاگل خانے بھیجد یا گیا اور آج وہیں وہ چل بسا۔"

"بہت بُری خبر لائے ہو رام اوتار سمجھ لو اس کے ساتھ ہم دونوں بھی زندہ دفن ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ وہ شہر بھر کے لئے ایک مصیبت تھا۔ کسی کی عزت اور دولت اس کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھی دنگا کرا دینا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ کسی کا دوست نہیں تھا۔"

"میرا اور تمہارا بھی نہیں؟"

"کسی کا نہیں۔"

اب میری سمجھ میں آیا کہ یہاں شخص کا ذکر ہے جس کو رام اوتار بھی کہا جاتا تھا۔ اور غلام نبی بھی یوں اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ عام طور پر اسے فساد اور بدامنی کا سمبل سمجھا جاتا تھا۔ وہ مرتے دم تک اپنے کردار پر قائم رہا۔ اونچے قد کا لمبا تڑنگا آدمی تھا چہرے میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ آنکھوں میں شرارت کی جھلک ضرور تھی۔ اس کا لہجہ بہت دھیما تھا۔ دن کنبر وہ ہوٹلوں، کیفوں اور چائے خانوں کی

رونق بڑھتا تاہ رات کو کسی پارک میں بیٹھا یا چوراہے پر کھڑا نظر
آتا۔ افواہیں پھیلانا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان
کرنا اس کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس کی پھیلائی ہوئی افواہیں پلٹ کر
اُڑ کر آتیں تو کوئی پوچھتا۔

"کیا ہو رہا ہے شہر میں؟"

وہ یقین دلانے کے انداز میں کہتا۔

"ہر شخص اپنے بچاؤ کی فکر کر رہا ہے۔ سوڈے کی بوتلیں جمع
کی جا رہی ہیں۔ اس بار ہولی خیریت سے گذرتی دکھائی نہیں دیتی
بڑے زور شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔"

"کس بات کی؟"

"مقابلے کی۔"

سینکڑوں رام اوتار اور غلام نبی اس کی جماعت میں
شامل تھے۔ وہ آن کی آن میں اس کونے سے اس کونے تک خبریں
پھیلا دیتے۔ شہری زندگی پر فالج گر پڑتا، لوگ ایک دوسرے کو
شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے اور پھر کوئی بڑا سا فساد ہو جاتا۔
امن و امان ہو جانے پر بھی وہ لوگوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیتا۔ برابر
یہی کہتا پھرتا۔

"آگ ابھی بجھی نہیں، اندر ہی اندر سلگ رہی ہے دو مگر
ٹکر ضرور ہوگی۔ دکانیں لوٹنے اور گھروں میں آگ لگانے کے پلان
بنائے جا رہے ہیں۔"

اب تک اس نے نہ جانے کتنے ہنگامے کرا دیئے تھے۔ اس کی
تاریخ انھیں ہنگاموں سے بھری ہوئی تھی۔ پولنگ اسٹیشن سے پبلک
جلسوں تک اس نے جال بچھا رکھا تھا۔ کہیں نہ ہونے پر بھی وہ ہر
جگہ موجود رہتا تھا۔ تہواروں پر نہایت سختی سے بندوبست کیا
جاتا۔ خراب شہرت کے لوگوں کو پکڑ کر بند کر دیا جاتا لیکن وہ
کسی کے ہاتھ نہ آتا۔ بڑے بڑے دنگے ہوئے، آگ لگائی گئی، قتل
بھی ہوئے مگر اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آئی۔ ایک دن وہ ہوٹل میں
بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ آس پاس بہت سے آدمی چائے کافی یا
اور رنگ پینے میں مشغول تھے۔ بڑے اطمینان سے باتیں ہو رہی تھیں

گفتگو نئے چیئرمین کے متعلق تھی جس کو آج اسی ہوٹل میں شہریوں کی
طرف سے پارٹی دی جا رہی تھی۔

"شری مادھو رام آ رہے ہیں اس وقت۔"

"بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"اب کوئی دنگا نہیں ہوگا۔"

"کبھی نہیں، مادھو بابو غنڈوں کا دشمن ہے۔"

وہ غور سے باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی اپنی غفلت پر
افسوس کر رہا تھا وہ سوچ رہا تھا رام اوتار اور غلام نبی بڑے کام
چور ہیں، انھوں نے مجھے وقت پر اطلاع کیوں نہ دی، دونوں کا کورٹ
مارشل کر دوں گا۔ پارٹی ساڑھے پانچ بجے دی جا رہی تھی اور اس
وقت پانچ بج رہے تھے۔ اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی
اور کاجو کا ایک دانہ منہ میں ڈال کر آہستہ آہستہ چبانے لگا۔
جس رفتار سے منہ چل رہا تھا۔ اس سے دوگنی تیزی کے ساتھ
دماغ میں خیالات کا چکر چل رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا اور اسے
کیا کرنا ہے، اس موقعہ پر جب کبھی کوئی بڑی تبدیلی ہوا کرتی تھی
وہ اس کا خیر مقدم ضرور کرتا تھا۔ مادھو رام جی کا چیئرمین بن جانا
اور پھر اس پارٹی میں شریک ہونا بھی کوئی معمولی بات نہ تھی۔

رام اوتار

غلام نبی

تم کہاں مر گئے۔

اس نے کاجو چباتے ہوئے اتنے زور سے کہا کہ لوگ اس کی
طرف متوجہ ہو گئے۔

پہلی پیالی پی چکنے کے بعد عادت کے خلاف اس نے ایک
اور چائے لانے کو کہا۔ اس کے خالی ہونے تک سوا پانچ ہو گئے۔
مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ چیئرمین صاحب بھی ٹھیک وقت
پر آ گئے، وہ پتلے دبلے گندمی رنگ کے آدمی تھے اور اس کے لئے
نئے نہیں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ مادھو رام امن کے پجاری ہیں، ہر
فرقہ کے لوگ ان پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ انتظامات نہایت شاندار
تھے۔ میزیں پھلوں اور مٹھائیوں سے بھری ہوئی تھیں مادھو (سلسلہ)

چیرز کی گونج میں اسپیچ دیتے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا۔

"باہمی میل جول سے زندگی پر نکھار آتا ہے اور اس کی پوری ذمہ داری ہم ناگرکوں پر آتی ہے میں چاہتا ہوں کہ ہر معاملہ کو بات چیت سے سُلجھایا جائے۔"

اس نے بظاہر پارٹی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ چیرمین صاحب کی تقریر سُن کر اسے یوں لگا جیسے وہ اس کے وجود کو جھٹلا رہے ہوں' وہ جانتے ہی نہ ہوں کہ ایک طاقت اور بھی ہے جس سے سمجھوتہ کئے بغیر کوئی اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسے بہت غصہ آیا وہ ہنسا اور آہستہ سے بولا۔

"تم میل جول قائم نہیں رکھ سکو گے مادھورام تم اسپیچ دے سکتے ہو کام نہیں کر سکتے۔"

اسی وقت مادھورام چیرمین نے زور سے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ معلوم ہوا ان کے ہاتھ پر کسی نے پتھر مار دیا ہے۔

پارٹی ختم ہوگئی' مہمان رخصت ہونے لگے، وہ بھی ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

رات کو بجلی کی سی تیزی سے ہر گلی کوچے میں یہ خبر پھیل گئی کہ نئے چیرمین نے ایک تاریخی یادگار کو گرا کر اس کے اوپر سے سڑک نکال دی' اگلے دن اسی ہوٹل کے سامنے بہت بڑا ہنگامہ ہوگیا۔ فساد زیادہ پھیلنے نہیں پایا' پھر بھی کافی نقصان ہوگیا۔ بہت سے راہگیر گھائل ہو کر ہسپتال چلے گئے۔ ایک لڑکی وہیں ختم ہوگئی وہ دودھ کی خالی بوتل ہاتھ میں لئے گھر سے نکلی۔ سامنے سے جلوس نعرے لگاتا آگیا۔ لڑکی کے سر پر کسی نے پتھر مار دیا، وہ چکرا کر گر پڑی، اسی وقت لاؤڈ اسپیکر پر چیرمین صاحب کی آواز گونجی۔

"پاگل نہ بنو — ہوش میں آؤ!"

پھر وہ زور سے چیخے

"کسی بے خطا پر ہاتھ مت اٹھاؤ نقصان اٹھانا ہے۔ تو مجھ پر اٹھا لو۔"

چیرمین صاحب کھلی جیپ میں سوار تھے۔ ان کی گاڑی میں بندوق یا مشین گن نہیں تھی۔ وہ موٹر میں کھڑے بول رہے تھے اور جب انہوں نے کہا سب اپنے اپنے گھر چلے جائیں تو مجمع کا جوش ذرا ٹھنڈا پڑا۔ چیرمین صاحب کی آواز میں بڑی مٹھاس تھی۔ وہ ایک پتلی سی گلی میں کھڑا تھا۔ دوڑ کر لڑکی کے پاس آیا جو نیم بے ہوشی کے عالم میں دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔

"منا بھوکا ہے — جلدی دودھ دو"

بوتل کے ٹکڑے زمین پر بکھرے ہوئے تھے وہ انہیں اکٹھا کرنے لگا جیسے بوتل کے ذرے نہ ہوں۔ اس کے اپنے دل کے ٹکڑے ہوں۔ جب تک کانچ کے چمکتے ہوئے ریزے جمع ہوئے لڑکی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھی وہ دیر تک ٹکڑے جوڑ کر بوتل بنانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ تھک کر لڑکی سے بولا۔

"تمہیں مرنے نہیں دیا جائے گا ——— تم زندہ رہوگی"

لڑکی کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہوئی۔ اس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں اس نے بگڑ کر کہا۔

شیشی ٹوٹ گئی۔

ریزے بکھر گئے۔

لڑکی مرگئی

ذرے جُڑ نہیں سکے۔

لڑکی زندہ نہیں ہو سکتی۔

شیشی میں نے توڑی۔

لڑکی کو میں نے مارا ہے۔

مادھو صاحب آپ سچ کے اچھے آدمی ہیں اور میں —

میں .... اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ تیزی سے چیرمین صاحب کی آواز کی طرف دوڑنے لگا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ان کے سامنے پہنچ کر اپنے جرم کا اقرار کرلے۔ چلتے چلتے اس کے کان گونجنے لگے طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں۔

تم مجرم ہو — فساد تم نے کرایا ہے۔

اور پھر جیسے بہت بڑا طوفان آگیا ہو۔ بادل گرجا بجلی

(باقی صفحہ ۳۴۳ پر)

اشتہار

دیوندر اسر

کینوس کا صحرا

تم نے دیکھا وہ کلس، ہیروشیما کی چٹان پر
آدمی جھلس کر اس پر منعکس ہو گیا ہے
آگ اگلتی گرمی میں انسان کی کیا
صورت ہوتی ہے ہیروشیما پر گویا ہم سب سے بڑا فنکار ہے

میں کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں بڑا حبس تھا۔ گرم اندھیرا تھا۔ کمرے کی کائنات میں باسی بو بسی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا دریچہ تھا جس سے روشنی کی کچھ امید ہو سکتی تھی۔ اُسے بھی گہرے نیلے پردے سے بند کر دیا گیا تھا۔ اور چیزیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو کر مات کھا کر مدہوش پڑی تھیں۔

باہر لُو چل رہی تھی اور تیز چمک دار دھوپ شیشہ سے چھلک کر آنکھوں میں گڑ رہی تھی۔ بن پکاسو ٹوٹے ہوئے صوفے کے اسپرنگوں پر بیٹھا کورے کینوس پر نیم غنودگی کی حالت میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

"جناب بن پکاسو۔ جلدی پانی لاؤ۔ پیاس سے بے حال ہو رہا ہوں۔ یہ گرمی تو مار ڈالے گی" میں نے کہا۔

"پانی۔ پانی تو نہیں ہے" بن پکاسو نے کہا۔

"تھوڑا پانی۔ ایک گھونٹ پانی۔ صرف چند بوندیں"

"پسینہ پی لو۔ ذرا کھاری ہوتا ہے اور کوئی بات نہیں۔ جلدی ورنہ وہ بھی سوکھ جائے گا" بن پکاسو بولا۔

"یو سوائین"

"سنو ڈیر۔ برف اور دھوپ میں کیا فرق ہے" اس نے اچانک پوچھا۔

"برف سرد ہوتی ہے اور دھوپ گرم" میں نے کہا۔

"برف بھی سفید ہے اور دھوپ بھی" اس نے کہا۔

"تم ہمیشہ رنگوں میں ہر چیز کو کیوں دیکھتے ہو؟"

"اس لئے کہ رنگ ہی دائمی حقیقت ہے اور رنگ بھی تو سرد اور گرم ہوتے ہیں" وہ بولا۔

"لیکن دھوپ اور برف کی مناسبت سے نہیں" میں نے کہا

"میں ہر چیز کا رنگ دیکھتا ہوں۔ برف اور دھوپ دونوں کی چمک بڑی پیاری ہوتی ہے" اس نے کہا "برف منجمد پانی نہیں، منجمد دھوپ ہے۔ دھوپ کی سلیب (SLAB) شیشہ گری کی صفت ہے"

"تم مجھے پاگل بنا رہے ہو" میں نے کہا۔

"پاگل! تم باہر تیز دھوپ میں گھوم کر آئے ہو۔ اس لئے ذرا سر گھوم گیا ہے۔ کیا لائے ہو؟ صفر محض! اور کمرے میں دھوپ میں جلی ہوئی چیزیں ہیں۔ اور صفر محض —" بن پکاسو کہہ رہا تھا۔

"مجھے پانی چاہئے۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔ تم کتنے بے رحم ہو"

"اسی طرح دنیا مر جائے گی۔ اپنی ہی پیدا کی ہوئی گرمی سے۔ جب درجۂ حرارت — کیوں ڈیر کتنے فارن ہیٹ پر پہنچ جائے گا" وہ بولا۔

"معلوم نہیں"

"اور لوگ جھلس کر مر جائیں گے۔ ہیٹ ڈیتھ۔ HEAT DEATH" اس نے کہا۔

"لیکن اس سے پہلے تو دنیا ڈائنوسار جیسی بہت سی وحشت جھیل چکی ہوگی" میں نے کہا۔

مارلن منرو کی تصویر سے اڑ کر چڑیا ایزل پر بیٹھ گئی اور پھر اپنی چونچ کھولے بن پکاسو کے سر پہ۔ اور پھر جیسے ایک دم تڑپ کر اٹھی اور بدھ کے مجسمے پر جا بیٹھی۔ وہاں سے اڑی تو سیدھے باتھ روم کے روشن دان سے اندر چلی گئی۔ چڑیا کے پنکھ جل رہے تھے۔ میں پانی کی تلاش میں باتھ روم کی طرف لپکا۔ باتھ روم کا دروازہ جھٹکے سے کھلا۔ سامنے دیوار پہ لگے شیشے میں میرا جھلسا ہوا چہرہ تھا۔ بکھرے ہوئے بال، دھول سے اٹا چہرہ۔ قیامت سے پہلے دنیا کا آخری آدمی — اور — اور — اس چہرے پر ایک اور چہرہ منعکس تھا۔ سنک (SINK) سے ٹانگیں باہر لٹکائے وہ بیٹھی تھی۔ پتلی سنگی مرجھائی ہوئی بے جان ٹانگیں — موت میرے سامنے سنک میں دھنسی ہوئی تھی۔

"بن پکاسو" میں چلایا۔

"ڈرو مت۔ لڑکی نہیں۔ ماڈل ہے" وہ بولا

"لیکن یہ تو مرچکی ہے" میں نے کہا

"مری نہیں۔ مرنے سے پہلے کا چہرہ ہے۔ ابھی سورج سوا نیزے پر نہیں آیا۔"

"لیکن" میں خوف سے تھرا اٹھا۔

بن پکاسو باتھ روم میں داخل ہوا۔

"تم اتنا گھبرا کیوں جاتے ہو۔ لڑکی سے، ماڈل سے، موت سے، چڑیا سے، گرمی سے، جیسے دنیا تمہارے سامنے فنا ہو رہی ہے اور تم اس مسمار شدہ دنیا کے آدمی ہو — بے سہارا، تنہا، بے یار و مددگار"

"اگر دنیا فنا ہو جائے گی تو میں کب زندہ رہوں گا"

"اسے یہی تو تمہاری وحشت کا باعث ہے۔ کہ اگر سب مر گئے اور صرف تم زندہ رہ گئے تو کیا ہوگا" اس نے کہا۔

"خیر یہ بتاؤ تمہیں اس لڑکی کے چہرے میں کیا نظر آتا ہے"

اس نے اچانک پوچھا۔

گرمی میں جھلسا ہوا چہرہ۔ پیاس سے بے حال"

"اور ؟"

"تنہا، بے یار و مددگار، خوف زدہ، شکستہ"

"ہوں۔ تو یہ چہرہ کس کا ہے"

"میرا" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"میں دراصل تمہاری تصویر بنا رہا ہوں۔ یہ میرا ماڈل ہے۔ اسے پانی نہیں ملے گا۔ اور یہ پیاس سے تڑپے گی (یعنی تڑپتی رہی)۔ اور کمرے کے حبس یعنی حبس بے جا میں ہیٹ ایکسا ہشن (HEAT EXHAUSHION) کا شکار ہو جائے گی (یعنی ہو گئی) اس کے چہرے پر موت کی دہشت ہے۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے اس کی آواز نہیں سنی۔ بس چونچ کھولے عالم بے قراری میں بھٹکتی رہی، اور باتھ روم کی طرف بھاگی۔ پانی بند ہو چکا تھا۔ ایک قطرہ نل کے منہ پر لرز رہا تھا۔ گرے یا سوکھ جائے۔ اس نے ہونٹ کھولے۔ چڑیا آئی اور پھر سے پانی کا قطرہ لے گئی اور دوسرا قطرہ — آخری — اس کے گالوں پر ٹوٹ گیا اور —"

"تم آرٹسٹ ہو کہ سائنسدان یا —"

"یا اذیت پرست" بن پکاسو زور سے چیخا۔

"YOU ON A ROQUE" میں چلایا۔

"اس لق و دق صحرا میں جہاں دور دور تک پانی نہیں۔ وہ سنک میں بیٹھ گئی اور اس کی ٹانگیں سنک کے باہر لٹک گئیں۔ پورے جسم سے ٹانگوں کا رشتہ ٹوٹ گیا اور معلوم ہے اس کے آخری الفاظ کیا تھے"

"کیا ؟"

"میں ڈوب رہی ہوں۔ بچاؤ، مجھے بچاؤ" اب بتاؤ، برف اور دھوپ میں کیا فرق ہے۔ بن پکاسو زور سے ہنسا۔

"میں اسے مرنے نہیں دوں گا" میں چلایا۔

"اسے مار کون رہا ہے ؟"

"تم نے اسے مار ڈالا ہے۔ لاؤ پہلے برف لاؤں"

میں نے کہا۔

"پیسے"۔ وہ پھر ہنسا۔ "مائی ڈیر۔ یا تم اپنا اچھا سا کوئی نام
لے لو — یہ بار بار مائی ڈیر کہنے میں بڑی کوفت ہوتی ہے۔ تو ڈیر۔
میں نے ان مادام کو زحمت دی تھی ہے کہ وہ ماڈل بنے اور میں تصویر
بناؤں اور کچھ پیسے آئیں۔"

"لیکن تمہاری تصویر خریدے گا کون؟"

"اسے بیچنے کے لئے کون بنا رہا ہے ظالم؟" وہ تو اس کمرے
کی دیوار پر آویزاں رہے گی۔ یہ لڑکی مر بھی جائے تو بھی تصویر زندہ
رہے گی۔ اس لئے کہ آرٹ ابدی ہے۔ اس لئے کہ دیوار مستقل حقیقت
ہے۔ یہ انسان کی دیوار ہے۔ میرا مطلب ہے تصویر ہے۔ ازل سے
ابد تک۔ تم اور تمہارے دوست صدیوں سے یہ دیوار بنا رہے
ہیں۔ ایک انسان سے دوسرے انسان تک۔ لیکن سب کا حشر ایک
ہے۔ ہیٹ ڈیتھ (HEAT DEATH) تم نے دیکھا وہ کلس ہیروشیما
کی چٹان پر۔ آدمی جھلس کر اس پر منعکس ہو گیا ہے۔ آگ اگلتی گرمی
میں انسان کی کیا صورت ہوتی ہے۔ ہیروشیما پر گرا بم ہم سب سے بڑا
فن کار ہے۔"

"بن پکاسو! اس گرم اندھیرے کے پاتال سے باہر نکل آؤ۔
ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔" میں نے کہا اور باہر کی طرف دوڑا۔

پانی! لیکن پانی کہاں ہے؟

سامنے ریستوران سے تھوڑی سی برف لے آؤں۔ اور
پانی کا ایک گلاس۔ لیکن کیا وہ پانی دے گا۔ ابھی تو اس کا
پچھلے دو ماہ کا بل بھی نہیں چکایا۔

پڑوس میں مسز — کیا نام ہے ان کا؟ — بہرحال ہیں۔
ان سے پانی مل سکتا ہے۔ لیکن؟

ہمارے کمرے کی پیلی روشنی رات رات بھر جلتی رہتی ہے
اور ہم بہت اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اور ہمارے
کپڑے باہر تار پر سوکھتے رہتے ہیں اور ہوا سے اڑ کر ان کے آنگن میں
ان کے کپڑوں سے جا ملتے ہیں۔ ایک بار انھوں نے بن پکاسو سے
شکایت کی تھی کہ کپڑوں کو کلپ لگا دیا کرو۔

بن پکاسو نے کہا۔ "ہمارے پاس کلپ نہیں ہیں مادام۔ ورنہ
ہم اپنا ہاتھ، منہ اور دماغ بند کر لیتے۔" مادام نے ہونٹ چبا کر بن پکاسو کو
باسٹرڈ — بن پکاسو نے بدصورت بنا کر کہا۔

"میں کپڑوں کو پھانسی پر لٹکانا اچھا معلوم نہیں دیتا۔ اگر آپ
چاہیں تو ہم کپڑے پہننا چھوڑ سکتے ہیں۔"

اس پر مادام بڑی ناراض ہوئیں۔ اور انھوں نے پولیس میں
شکایت کی دھمکی بھی دی کہ پڑوس میں یہ لوگ ننگا ادھم مچاتے ہیں۔
ادھم کے بجائے انھوں نے ایک دوسرے لفظ کا استعمال کیا تھا۔ جو
ہماری پارلیمنٹ کے خلاف تھا۔

بن پکاسو نے وہیں کھڑے کھڑے ڈائننگ ٹیبل کے کپڑے
پر کوئلے سے ان کی تصویر بنا دی تھی۔ مادام شاید آرٹ کی قدردان
تھیں یا اپنے حسن پر فدا نرگسیت کی ماری۔ انھوں نے تصویر رکھ لی اور کپڑے
واپس کر دیئے۔ سنا ہے کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں کو بتاتی ہیں کہ
جب وہ پیرس گئی تھیں تو وہاں کے مشہور فن کار — جس کا نام وہ اکثر
بدل دیتی تھیں۔ عورتوں کے رسالے پڑھنے کے بعد — نے ان
کی تصویر بنائی ہے۔ دریائے سین کے کنارے جب وہ سن باتھ لے
رہی تھیں۔

یہ بن پکاسو لباس کے اندر بھی کیسے جھانک لیتا ہے؟

"میرا نام — خیر نام چھوڑیئے — میں بن پکاسو کا دوست
ہوں۔ بن پکاسو جس نے آپ کی یہ تصویر بنائی ہے۔ وہ سامنے دیوار
پر کپڑے کے اوپر —" میں نے کہا۔

"یہ تصویر بن پکاسو نے نہیں پکاسو نے بنائی ہے۔" مادام
نے کہا۔

"جی ہاں۔ وہی پکاسو۔ میں اس کا دوست ہوں۔ وہ
اس وقت پیاس سے تڑپ رہا ہے۔ پیاس مجھے بھی بڑی سخت لگی
ہے۔ اور اس کا ماڈل تو قریب قریب مر چکا ہے۔ HEAT
EXHAUSTION اور شک میں اس کی ناڑیں تک رک رہی ہیں۔ لوگ
بند ہو چکے ہیں۔"

مادام نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور پھر اندر چلی گئیں
اور ریفریجریٹر سے ایک بوتل نکالی۔ پہلے تو دیکھ کر میری زبان

اقبال متین

سڑک

جب ہم کسی چہرے کو ایک بار صرف ایک
بار دیکھ کر زندگی بھر دیکھتے رہتے ہیں تو اس ایک
کو کبھی نہیں دیکھ سکتے جسے دیکھنا نہیں ہوتا ہے
میں اپنے ذہن سے اسے کس طرح نکال پھینکوں جو
میرے دماغ میں یہ کہہ کر ٹھوک لگاتا ہے کہ جسے
نہیں دیکھو! میں بھی اس دنیا میں زندہ ہوں۔

کالونی سے پل تک ساڑھے تین ہزار قدم کا فاصلہ ہے میں یہ فاصلہ آتے جاتے دو بار روز ہی طے کرتا ہوں۔ مسافت کا یہ پیمانہ کسی بے کار ذہن کی نشان دہی کرتا ہے۔ ذہن سوچ سے عاری ہو اور کسی بے سبب اُداسی کا شکار ہو تو شاید آدمی سڑکیں ناپ کر جی بہلاتا ہے۔ سڑکیں میں نے بھی بہت سی ناپی ہیں، لیکن یوں بھی نہیں کہ قدم بھی گنتا رہوں۔ سڑکیں تو بس کھلی رہتی ہیں۔ سب کے لئے یکساں — دوڑتی ہوئی موٹروں کے لئے بھی — رکشاؤں اور سائیکلوں کے لئے بھی — کھلنڈرے بچوں کے لئے بھی — تھکے تھکے قدموں کے لئے بھی۔ فرق کچھ نہیں پڑتا۔ ہم اپنی اپنی زندگی آپ اٹھائے پھرتے ہیں — پھولوں کی طرح سبک بھی پتھروں کی طرح وزنی بھی۔ اب یہ اور بات ہے کہ میں زندگی اس طرح ڈھوتا ہوں جیسے پتھر ڈھو رہا ہوں — لیکن خود میں بھی تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ہمیشہ ہی اس سڑک پر پتھر ڈھوئے ہیں — کبھی کبھی تو یوں گزرا ہوں کہ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میں کالونی سے کب نکلا ہوں اور کب پل تک پہنچ گیا ہوں۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ وہ چاروں آدمی مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں — کبھی میں نے کسی ایک پر بس یوں ہی نظر ڈال لی ہے

کبھی یوں بھی ہوا کہ ان میں سے کسی نے مجھے بغور دیکھا تو میں نے نظریں چرالیں — کسی کو کیا پڑی ہے کہ ایک دوسرے کی طرف توجہ دے لیکن اس سڑک سے ان چاروں آدمیوں کا تصور وابستہ کئے بغیر اس سڑک کی اپنی مخصوص تصویر ذہن میں نہیں بن سکتی ہاں اس کی جغرافیائی اہمیت کی وضاحت کے لئے اس کے حسن کا تذکرہ بھی کچھ ضروری ہے۔

سفید ساریوں میں ملبوس نرسوں کی ٹکڑیاں جو اپنے ہوسٹل سے ہاسپٹل تک جاتی ہیں اور پھر ہاسپٹل سے ہوسٹل تک لوٹ آتی ہیں اس کا مستقل حسن ہیں کیونکہ ہوسٹل اسی سڑک پر ہے۔ رنگ و بو کا یہ کارواں راہگیروں کی نظروں کے لئے کچھ نہ کچھ تو فراہم کر ہی دیتا ہے — مجھے کسی بھی حسن کے اجتماعی مظاہرے میں کبھی دلکشی نظر نہ آئی — مجھے تو کسی بھی کارواں نے آج تک اپنی جانب متوجہ ہی نہیں کیا۔ چاہے یہ کارواں سیاست کا ہو، ادب کا ہو یا زندگی کا — میں اس مسافر کو ٹھٹک کر ضرور دیکھ لیتا ہوں جو کارواں سے کٹ جاتا ہے۔ مجھے آسمان کی وسعتوں میں پرندوں کی ڈاریں متوجہ نہیں کرتیں کہیں کوئی ساڈولتا ہوا یکا و تنہا پرندہ میری نگاہوں کا مرکز ضرور بنتا ہے — مجھے

باغ میں پھولوں کے گچھے ہنسنے نہیں لگتے مگر ویرانے میں سر اٹھائے ہوئے تنہا پھول جانے مجھے کیوں عظیم لگتا ہے ـــــ نرسوں کی ان لڑکیوں کا میرے روز مرہ سے بس اتنا ہی علاقہ ہے کہ وہ گزرتی ہیں ـــــ میں گزر جاتا ہوں ـــــ ہاں معمولی شکل و صورت والی وہ لمبوترے چہرے کی لڑکی بہتی ہوئی اس سڑک پر میرے ساتھ دوڑتے ہوئے وقت میں ایک لمحہ کی حصہ دار ضرور ہے، جب وہ مجھے آتا ہوا دیکھ لیتی ہے تو دور ہی سے نظریں جھکا لیتی ہے جیسے میں اس کے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں ہوں لیکن قریب پہنچتی ہے تو مجھے دیکھے بغیر جیسے گزر ہی نہیں سکتی۔ وہ دراصل کسی ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتی ہے ـــــ وہ جب بھی میرے پاس سے گزری ہے کچھ اس طرح گزری ہے جیسے چلنا بھول گئی ہو ـــــ میں کبھی کبھی رحم کھا کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر جاتا ہوں۔ یہ سب کچھ دراصل ایک بہت ہی معمولی حادثے کا ردعمل ہے ـــــ ہوا یوں تھا کہ جب پہلی بار میں نے اس کو دیکھا تھا تو وہ میری نظروں کی زد میں آ کر کچھ عجیب حرکتیں کر بیٹھی تھی۔ اپنے لمبوترے چہرے کو ہونٹ بھینچ کر مضحکہ خیز انداز میں سکیڑ لیا تھا۔ پھر ہاتھ پاؤں سیدھے کئے یوں چلنے لگی تھی جیسے پریڈ کر رہی ہو ـــــ میں بمشکل اپنی مسکراہٹ پر قابو پا سکتا تھا ـــــ اور جب اس کے برابر سے گزر گیا تھا تو پانچ دس قدم چل کر اس کو پلٹ کے دیکھا تھا ـــــ وہ میری طرف گھوم کر کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی ـــــ میں نے فوری نظریں پھیر لیں۔ اس کے بعد میں نے پلٹ کر اسے کبھی نہیں دیکھا ـــــ لیکن اس سڑک پر پہنچ کر وہ نظر بھی نہیں آئی ہے تو میں اسے ضرور دیکھ لیتا ہوں ـــــ کیونکہ اس سڑک پر وہ میرے ذہن کا ایک لمحہ ہے۔

اور پھر وہ آدمی ـــــ جس کو میں نے دوسری بار دیکھنے کی جسارت نہیں کی۔ اپنی جگہ کتنا مطمئن ہے۔ اس کو پرواہ نہیں ہے کہ ـــــ راہ گیروں کی نظریں جب اس پر پڑتی ہیں تو کس طرح مجروح ہو جاتی ہیں ـــــ اس کی ایک آنکھ بالکل پھوٹ کر حلقے سے باہر نکل آئی ہے۔ اس کا چہرہ اتنا کریہہ ہے کہ نظریں پناہ مانگتی ہیں۔ میں نے دور سے اس کو محسوس کیا ہے تو اس کے گزر جانے تک نظریں سڑک پر جمائی ہیں وہ مگر مجھ سے انتقام لینے کا در پے ہے ـــــ میں اس کو اپنے مقابل پاتا ہوں اپنا راستہ رکا ہوا محسوس کرتا ہوں ـــــ اور وہ آنکھ ـــــ میں آنکھیں بند کر لوں تب بھی نظر آتی ہے۔

جب ہم کسی چہرے کو ایک بار صرف ایک بار دیکھ کر زندگی بھر دیکھتے رہتے ہیں تو اس آنکھ کو کیوں نہیں دیکھ سکتے جسے دیکھنا نہیں چاہتے ـــــ میں اپنے ذہن سے اسے کس طرح نکال پھینکوں جو میرے دماغ میں یہ کہہ کر کچوکے لگاتا ہے کہ مجھے بھی دیکھو میں بھی اس دنیا میں زندہ ہوں۔

اور پھر وہ دراز قد بوڑھا ـــــ وہ مجھے صبح نہیں ملتا، شام کو ملتا ہے اور ضرور ملتا ہے ـــــ میں اسے ضرور دیکھتا ہوں اور وہ مجھے ضرور دیکھتا ہے۔ لیکن ہم دونوں ایک دوسرے سے نظریں ملا کر ایک دوسرے کو غور سے نہیں دیکھتے ـــــ چوری چھپے کن انکھیوں سے دیکھتے ہیں ـــــ وہ چھڑی ٹیکتا ہوا بڑی عزت سے چلتا ہے ـــــ میں اپنا سیف SAFE اٹھائے بڑی تمکنت سے گزرتا ہوں ـــــ وہ روزانہ شام کو واک کے لئے نکلتا ہے۔ میں تھکا ہارا آفس سے لوٹتا ہوں۔ سنتا ہوں وہ دولتمند ہے۔ اس کو اپنی دولت کا زعم ہے۔ میں اپنے ذہن و دل کی دولت پر نازاں ہوں۔ اپنی ادبی اہمیت کا مجھے احساس ہے۔ ہم دونوں اپنی اپنی انانیت کی لاش اٹھائے گزر جاتے ہیں۔ ہمارا نہاں ایک دوسرے کے قریب آنے نہیں دے گا ـــــ ٹھیک ہے اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ وہ آدمی مجھے پسند کرتا ہے اور میں بھی اسے پسند کرتا ہوں ـــــ وہ چاہتا ہے میں پہل کروں۔ میں چاہتا ہوں وہ پہل کرے ـــــ دیکھنا ہے یہ دولتمند کس سانچے میں ڈھلتے ہیں۔

سب سے نرالی شخصیت تو یہ ہے ـــــ یہ جو آدمی ہے۔ اس کو دیکھتا ہوں تو دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹتی ہیں ـــــ عجیب بے نیاز آدمی ہے۔ اس کی کوئی شکل سیدھی نہیں ہے۔ ایک

پاؤں پھینک کر، جسم کو خم دے کر، دونوں ہاتھ ڈولتی ہوئی گٹھری کے جھولنے کی طرح ہلاتا ہوا اس طرح چلتا ہے کہ بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ راستے چلنے والے حیرت بھری کا سے ضرور دیکھتے ہیں۔ مرلی سی بہت معمولی چہرے کی یہ شخصیت جس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہیں اپنے اندر شاید کوئی اور ہی دنیا بسائے ہوئے ہے۔ اس کو ایک پل کے لئے بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ دیکھے جانے کے لائق ہے اور کتنے ہی راہ چلتے مڑ کر اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ بس اپنی ہی دنیا میں مگن ہے میں جب بھی اسکے برابر سے گزرا ہوں۔ اس کو چلتا ہوا دیکھتا رہا ہوں اور اطمینان سے مسکراتا رہا ہوں۔ اور اب یہ تمنا حسرت بن گئی ہے کہ وہ بھی کبھی ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر ڈالے ۔۔۔ اس نے کبھی کسی کو دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اپنا جسم کنی کھائے ہوئے پتنگ کی طرح ٹیڑھا میڑھا اس طرح گھسیٹتا ہے جیسے تھاپ کھا کر ابھی زمین پر بیٹھا ہو اور کوئی بچہ اسکی ڈور تھامے بھاگ رہا ہو۔

آج آٹھواں دن ہے۔ یہ تھاپ کھایا ہوا پتنگ نما آدمی نہ مجھے صبح نظر آیا نہ شام۔ میری دو وقت کی مسکراہٹ اس نے چھین لی ہے۔ کسی سڑک پر آتے جاتے دو وقت کی مسکراہٹ کا روزانہ معمول بن جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے اور اس شخص نے بے مانگے کتنے ہی راہ چلتوں کو یہ سب کچھ دے دیا ہے۔

سرتی نے مجھے لکھا تھا ۔۔۔۔ "ایم اے کے فارم کے لئے تصویر اتروانے گئی تو ایک دو پوز اور کھنچوا آئی۔"

اس جملے کے بعد سرتی نے میری کہانیوں اور اس کی اپنی کہانیوں کے کرداروں کی بات شروع کر دی ۔۔۔ اور وہ یہ بھول گئی کہ اس نے مجھے بہت دن ہوئے لکھا تھا۔ "جلد ہی ایک تصویر بھیجوں گی لیکن وہ کسی ادبی پرچے کے لئے نہیں آپ کے لئے ہوگی۔"

اس سرتی کو جس نے آج تک تصویر نہیں بھیجی ہے اس سڑک سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں تو یہ بھی نہیں جانتا ہوں کہ کوئی ایسی سرتی ہے بھی یا نہیں ہے ۔۔۔ میں نے اسے اپنے اندر جنم دیا ہے۔ ذہن میں لا لا کر اسے سجایا ہے سنوارا ہے۔ وہ خاموش رہی ہے تو اس کو گویائی بھی عطا کی ہے اور اس سے بات بھی کی ہے اور جب زیادہ میری طرف بڑھا ہے میں نے چپکے سے سرتی سے کہا ہے جاؤ

میرے سوچتے ذہن سے چھپ جاؤ۔ فضا میں اس شرافت سے ٹیٹ لی۔

اور گیا ۔۔۔ یہ سرتی میری کسی کہانی کا کوئی کردار تو نہیں؟

شام بھیگ رہی ہے۔ یہ بے وقت سے پہلے واپس ہو رہے ہیں، موسم میرے جی کی طرح اداس ہے ۔۔۔ مجھے ایک وہ چہرہ آدمی نظر آتا ہے۔ تھاپ کھایا ہوا پتنگ۔ زمین پر لٹکا ہوا جیسے ڈور کوئی نادان کھینچ رہا ہے۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔

"کہاں تھے اتنے دنوں سے؟"

وہ بمشکل اپنی دنیا سے باہر آتا ہے۔

مجھے دیکھتا ہے۔ میں مسکراتا ہوں۔ وہ بھی مسکراتا ہے میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتا ہوں ۔۔۔ وہ مجھے بغور دیکھتا ہے ۔۔۔ پوچھتا ہے۔ "آپ کون ہیں ۔۔۔؟"

میں بھی سوچ میں پڑ جاتا ہوں ۔۔۔ واقعی میں کون ہوں؟

میرے سارے کردار اگر میری کتابوں سے نکل کر مجھ سے یہ سوال کر بیٹھیں کہ تم کون ہو؟ تو میں انہیں کیا جواب دوں گا ۔۔۔ میں انہیں کہوں گا کہ میں نے تمہیں اپنے ذہن میں رکھ کر سجایا ہے۔ کچھ تم سے لیا ہے تو کچھ تمہیں دیا بھی ہے۔ کبھی کبھی تو میں نے تمہیں راتوں کی نیند دی ہے، دن کے ہنگامے دے دیئے ہیں۔

لیکن میں اس سے کچھ بھی تو نہیں کہہ پاتا ہوں۔

سرتی اگر مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ تم کون ہو؟ تو میں اسے کیا جواب دوں گا ۔۔۔ زندگی ڈھونے والے یہ کہاں سوچتے ہیں کہ وہ کون ہیں کیوں ہیں اور اگر وہ یہ سوچنے لگیں تو پھر جئیں کیونکر۔

شاید تخلیق کار تنہا پیدا ہوتا ہے، تنہا جیتا ہے اور تنہا مرتا ہے۔ بالکل خدا کی طرح۔ اس کی دنیا سب کی ہوتے ہوئے بھی کچھ اس کی اپنی ہی ہوتی ہے

اور میں سڑک پر چلتے چلتے قدم اٹھاتا جا رہا ہوں ۔۔۔ میرے ساتھ صرف سرتی ہے، وہ سرتی جس کا اس سڑک سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔۔۔ اور جو یہ نہیں جانتی کہ میں کب سے پکار رہا ہوں گا ۔۔۔ جاؤ میرے سوچتے ذہن سے چھپ جاؤ ۔۔۔ میں زیادہ زندگی سے ...

انور عنایت اللہ

یادوں کے چراغ

بیبی! دوستی کے بندھن بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ اس کا ذات پات، رنگ، نسل یا جنس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اسے تو آندھیاں اور طوفان بھی نہیں توڑ سکتے

وہ ہوائی جہاز میں داخل ہونے سے پیشتر حسب معمول رک کر مڑتی ہے اور میری طرف دیکھتی ہے۔ پھر ہاتھ اٹھا کر ہلاتی ہے اور اندر چلی جاتی ہے۔ آج بھی یوں لگتا ہے جیسے کہنا چاہتی ہو تم مجھے یہیں روک کیوں نہیں لیتے؟ اتنی مختصر سی ملاقاتیں کیا ایسے جذبات پیدا کر سکتی ہیں؟ اپنائیت کا اظہار کیا صرف زبان ہی سے ہو سکتا ہے؟ — ان سوالوں کا مجھے کبھی جواب نہیں ملا۔

میرے سامنے جہاز کھڑا ہے۔ اب اس کی سیڑھیاں ہٹالی جاتی ہیں۔ دروازہ اندر سے بند ہو جاتا ہے اور جہاز تاریک رن وے پر آہستہ آہستہ رینگنے لگتا ہے۔ میں جنگلے کے سہارے کھڑا چندھیائی آنکھوں سے ان ٹمٹماتے روشن قمقموں کو دیکھنے لگتا ہوں جو رن وے کے دونوں طرف لگے ہوئے ہیں اور دور افق میں کہیں کھو جاتے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد جہاز کی آواز تیز ہو جاتی ہے اور وہ رن وے پر دوڑنے لگتا ہے، اور پھر یکایک فضا میں بلند ہوتا ہے اور فاصلے یک بارگی تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں۔ یکلخت جیٹ ہوائی جہاز پلک جھپکتے کہیں دور پہنچ جاتا ہے اور پھر سینکڑوں گز کی بلندی پر آسمان میں پہنچ جاتا ہے۔ آج تو مطلع ابر آلود ہے

اس لئے ہوائی جہاز فوراً نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ صرف آواز سنائی دیتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد یہ آواز بھی فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے اور ان لمحوں کی یاد باقی رہ جاتی ہے جو میں نے لاؤنج میں اس کے ساتھ گزارے تھے۔

جمعہ کی رات کراچی کے ہوائی اڈے کی مصروف ترین رات ہوتی ہے۔ رات بھر مشرق اور مغرب سے ہوائی جہاز آتے ہیں اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ یہاں سستا کر اپنی منزل کی طرف اڑ جاتے ہیں۔ اس کا جہاز بھی عموماً جمعہ ہی کی رات کو کراچی سے گزرتا ہے۔ جب میرے آس پاس کے لوگ واپس لوٹ جاتے ہیں تو میں بھی ٹھنڈی سانس لے کر مڑتا ہوں اور نیچے کار تک جاتا ہوں۔ میرا منتظر رہنے والا شوفر اپنی سیٹ پر ٹوپی رکھے سو رہا ہوتا ہے۔ میں اسے جگاتا ہوں تو وہ مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے میرا یہاں آنا اس کے لئے بھی ایک معمہ ہے۔

میں گھر پہنچتا ہوں تو ایک عجیب خاموشی میرا استقبال کرتی ہے۔ دونوں بچے غالباً سو چکے ہیں۔ عادل شاید جہانگیر سے ابھی واپس نہیں آیا۔ صرف شاہدہ جاگ رہی ہے۔ میں داخل ہوتا ہوں تو وہ میرے ہاتھ سے چھڑی لے لیتی ہے۔ میں صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں تو وہ پوچھتی ہے۔ "اولیجی

سے آؤں؟"

"نہیں" میں جواب دیتا ہوں۔

"پی لیجئے۔ آپ نے تو آج کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"مجھے بھوک نہیں۔" میں جواب دیتا ہوں۔

"آپ شاید مجھ سے بھی خفا ہیں۔" وہ نظریں جھکا کر آہستہ سے کہتی ہے۔

"نہیں بیٹی ــــ میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔ آج عادل نے میرے ساتھ زیادتی کی۔ میں اس سے بھی خفا نہیں ہوں۔" میں جواب دیتا ہوں۔

"انہیں معاف کر دیجئے ابو ــــ پچھلی جنگ میں انہیں اتنے زخم لگے کہ وہ آپ کی باتیں سمجھ ہی نہیں سکتے۔"

"اور تم بیٹی؟" میں آہستہ سے پوچھتا ہوں۔

"یہ دیکھتے ہوئے بھی میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر آپ اس لڑکی سے ملنے ایئرپورٹ جاتے ہیں تو میں سمجھتی ہوں اس میں بھی ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ میری شادی کو آٹھ سال ہو گئے میں نے کبھی آپ کو کوئی غلط بات کرتے یا غلط قدم اٹھاتے نہیں دیکھا۔ پھر یہ میں کیسے مان لوں کہ آپ اس سے مل کر غلطی کر رہے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے وہ چلی جاتی ہے اور چند لمحوں کے بعد میرے چپل، میرا ڈریسنگ گاؤن اور سلیپنگ سوٹ لے آتی ہے اور کہتی ہے۔ "ابو ــــ میری ایک بات مانئے گا؟ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیجئے۔ میں اولٹین لے آتی ہوں۔"

میں انکار کرنے ہی والا ہوتا ہوں کہ وہ مجھے روکتی ہے اور کہتی ہے: "ابو ــــ اگر آپ نے انکار کیا تو میں یہی سمجھوں گی کہ میں آپ کی بیٹی نہیں، بہو ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ مجھے اتنی محبت سے دیکھتی ہے کہ میری عینک کے شیشوں پر دھند سی چھا جاتی ہے اور اس کا چہرہ مجھے صاف دکھائی نہیں دیتا۔ آج کنول ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لئے مجھ سے جدا ہوئی تو اس وقت بھی میری یہی کیفیت ہوئی تھی۔ کیا عمر کا تقاضا یہی ہے کہ بڑھاپے میں دل اس قدر کمزور ہو جاتا ہے؟ شاید کنول کو میری آنکھوں کے آنسو نظر آ گئے تھے۔ اس لئے اس نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا اور کہا تھا ــــ "ارے آپ اتنے گرانڈیل پاکستانی اور اس طرح آنسو بہا رہے ہیں؟ آنسو مجھے بہانا چاہئے کیونکہ جب بھی میں آپ سے مل کر جاتی ہوں مجھے اپنی ماں یاد آ جاتی ہے جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اپنے تمام رشتے دار یاد آ جاتے ہیں جن سے نہ میں کبھی ملی اور نہ ملوں گی۔ اور ہر بار یہی لگتا ہے جیسے ہماری یہ آخری ملاقات ہے۔ اس لئے نہیں کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ بھگوان آپ کا سایہ مجھ پر ہمیشہ قائم رکھے ــــ نہیں نہیں اس لئے نہیں بلکہ یوں لگتا ہے کہ جیسے میں کراچی سے نہ گزر سکوں ــــ اچھا ــــ اب آنسو پونچھ لیجئے اور مجھے پیار سے آشیرواد دیجئے!"

شاہدہ بھی مجھے اتنی ہی محبت سے دیکھ رہی ہے شاید اسی لئے آنسو دوبارہ بہہ نکلتے ہیں۔ پھر میں اسے اپنے پاس بٹھا لیتا ہوں اور کہتا ہوں۔ "بیٹی دوستی کے بندھن بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ ان کا ذات پات، رنگ و نسل، قومیت یا جنس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انہیں زمانے بھر کی آندھیاں اور طوفان بھی کبھی نہیں توڑ سکتے ــــ میں اس وقت کی باتیں سنانے لگا ہوں جب عادل، تمہارا شوہر تین سال کا تھا۔ میرے بچپن کے کئی دوست تھے جن کے ساتھ میں پلا بڑھا۔ ان میں جوالا پرشاد بھی تھا جن کا خاندان ہمارے پڑوس میں آباد تھا۔ وہ، میں اور اس کی بہن شیاما ــــ ہم سب ساتھ ہی کھیلے کودے اور پلے بڑھے تھے۔ جس دن شہر میں فسادات کی آگ بھڑکی، عادل اپنی امی کے ساتھ صبح ہی سے اپنے نانا کے یہاں سول لائنز چلا گیا تھا جو انگریزوں کا محلہ تھا۔ میں گھر میں تنہا تھا اور جوالا پرشاد کا پڑوسی ہونے کی وجہ سے بڑے اطمینان سے بیٹھک روم میں روشنی کئے کوئی تازہ رسالہ پڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف شہر میں آگ لگی ہوئی تھی لیکن میرے یہاں امن تھا۔ احتیاطاً میں نے تمام دروازے پھاٹک

اور کھڑکی [illegible] کسی نے آہستہ
سے میرے بیڈ روم کی کھڑکی کھٹکھٹائی۔ میں چونک کر اٹھا
جب چند لمحوں کے بعد دوبارہ کسی نے کھٹکھٹائی تو میں اٹھا
اور میں نے آہستہ سے پوچھا "کون ہے؟"

اس پر مجھے دھیمی سے شیاما کی آواز سنائی دی۔

"بھیا۔ کمرہ کی روشنی گل کر دیجئے اور کھڑکی کھولئے۔ میں اندر
آنا چاہتی ہوں۔"

میں نے فوراً یہی کیا اور جوں ہی کھڑکی کھولی وہ جلدی
سے اندر آگئی۔ ہم نے کھڑکی بند کر دی اور پھر میں نے روشنی
کردی۔ وہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک
بڑی سی تھیلی تھی۔

"بات کیا ہے شیاما؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔
یہ سننا تھا کہ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگی ———

"وادل کہاں ہے؟" اس نے روتے ہوئے پوچھا۔
"اپنے نانا کے یہاں ہے" میں نے جواب دیا۔
"بھگوان تیرا لاکھ لاکھ شکر ——— جلدی کیجئے
بھیا۔ یہ کپڑے بدل لیجئے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے تھیلی
میں سے ایک دھوتی، کرتا اور گاندھی ٹوپی نکالی اور میرے
حوالے کر دی۔ "زیادہ وقت نہیں ہے بھیا۔ آج رات آپ
کے گھر پر حملہ ہونے والا ہے!"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں ہاں بھیا ——— بڑے بھیا اپنے غنڈے دوستوں
کے ساتھ پہلا منڈی کے علاقے میں لوٹ مار چلا رہے ہیں۔ وہاں
سے وہ کسی بھی وقت واپس آ سکتے ہیں۔ آج محلے میں بہت
کم لوگ ہیں۔ سب لوگ قتل و غارت گری میں لگے ہوئے
ہیں۔ واپس آ کر آپ کے گھر کا صفایا کریں گے!"

آنسو تھے کہ ان کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے
دور سے چیخ و پکار کی [illegible] آ رہی تھیں۔ مشرقی افق
[illegible]

سے قریب آسمان کی سرخی میں اضافہ [illegible]
لگ گئی تھی۔ میں نے جلدی سے کپڑے بدلے اور پھر ہم
کھڑکی ہی کے ذریعے باہر نکل آئے۔ اس نے کپڑے پہننے سے [illegible]
گھر کی تمام روشنیاں جلا دیں۔ جب ہم [illegible]
اس نے آہستہ سے کہا۔

"بھیا ——— آپ رام کشن ہیں اور میں آپ کی
بیوی شیاما۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔
"گھبرائیے نہیں بھیا۔ میں آپ کو سول لائنز پہنچا دوں گی۔
اول تو یہیں کوئی نہیں پہچانے گا۔ یہاں کسی کو ہوش نہیں
ہے۔ اگر کسی نے پہچان بھی لیا تو میرے ہوتے وہ آپ پر
حملہ نہیں کرے گا۔"

جانے وہ کیا کچھ کہتی۔ مجھ پر تو گویا سکتہ طاری تھا۔
وہ میرا ہاتھ تھامے یوں چل رہی تھی اور یوں ہنس ہنس کر
باتیں کر رہی تھی۔ جیسے ہم واقعی میاں بیوی ہوں۔ ہم تاریک
اور نیم تاریک گلیوں میں سے ہوتے ہوئے خیریت سے سول
لائنز پہنچ گئے اور پھر وہ مجھ سے جدا ہو گئی ——— آخری
بار جدا ہو گئی ———!"

میں رک کر اپنی عینک کے شیشے صاف کرتا ہوں۔
شاہدہ بڑے انہماک سے میری کہانی سن رہی ہے۔

"جانتی ہو بیٹی اس رات میں جان بچانے کی اسے
کتنی کڑی سزا ملی! ——— جب آدھی رات کو غنڈوں
نے میرے گھر پر حملہ کیا اور انہیں میں گھر پر نہیں ملا تو میرے
عزیز دوست جوالا پرشاد کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے وہاں کپڑے
کا وہ تھیلا مل گیا جس پر ان کے دوکان کی مہر لگی ہوئی تھی
وہ غصہ میں اپنی بہن کے پاس گیا تو شیاما نے [illegible]
نے مجھے حفاظت سے سول لائنز پہنچا دیا تھا۔ یہ سننا تھا
کہ وہ آگ بگولا ہو گیا اور اس نے ان کی [illegible]
اس کی بہن ایک [illegible] کی ماں بننے والی تھی [illegible]
بیٹا۔ [illegible] رام کشن [illegible]

بقیہ صفحہ [illegible]

جوگندر پال

پانی بلو رہا ہوں

تنہائی پسند افراد کی تنہائیاں دنیا کے بڑے بڑے شہروں سے بھی زیادہ گنجان آباد ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی تنہائی میں کل کائنات کی رفاقت میسر آجاتی ہے۔ اسلئے اگر آپ تنہائی کے ڈر سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو تنہا ہیئے

میں آپ سے بات کر رہا ہوں یا اپنے آپ سے؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی سے بات کرتے ہوئے مجھے یہی لگتا ہے کہ میں دراصل اپنے آپ سے ہمکلام ہوں، اور ایسا بھی، کہ اپنے آپ سے کچھ کہہ رہا ہوتا ہوں مگر دراصل کسی اور سے مخاطب ہوتا ہوں۔

نہ جانے میں آپ سے کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ ابلاغ کا مسئلہ واقعی بڑا ٹیڑھا ہے۔ آپ کو تو شاید یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ اپنی بات اوروں کو کیونکر سمجھائیں مگر میرا مسئلہ یہ ہے کہ جو کچھ مجھے آپ کو سمجھانا ہے وہ میں اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھا پا رہا۔ میں شاید اس لئے بول رہا ہوں کہ کسی معصوم بچے کے مانند بول بول کر ہی سوچ سکتا ہوں ——

میں سوچتا ہوں کہ اگر ہم بولنا بند کر دیں تو کیا ہم سوچ سکتے ہیں؟ — آپ شاید حیران ہوں مگر میں سچ کہتا ہوں کہ میری سوچ کا تصور بے صدا نہیں۔ آپ بھی ذرا سوچئے۔ کیا جب آپ کا منہ بند ہوتا ہے تو آپ کے ذہن میں بھانت بھانت کی سوچیں بچوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر شور نہیں مچا رہی ہوتی ہیں؟ سوچیں بڑی باتونی ہوتی ہیں، اتنی باتونی جتنا کوئی سوچنے والا کم گو۔

میں بہت سوچا کرتا ہوں اور میری سوچیں میرے ذہن میں اپنی آواز سے گونجتی رہتی ہیں اور ان سوچوں کا شور سن سن کر مجھے بے اختیار ان لغوی اساتذہ کا خیال آنے لگتا ہے جو ہر وقت بولتے رہتے ہیں مگر کہتے کچھ بھی نہیں۔

مجھے آپ سے کیا کہنا ہے؟ کیا مجھے واقعی آپ سے کچھ کہنا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کہنے کے لئے کسی کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا اور سب محض اپنی اپنی آواز کو ہی ڈھوتے رہتے ہیں۔ مثلاً اس وقت میں صرف اپنی آواز کو ڈھو رہا ہوں اور یہ محسوس کر کر کے بڑا خوش ہو رہا ہوں کہ میرا مطلب اتنا باریک ہے کہ آپ کو نظر نہیں آرہا۔ مائیکروسکوپک میننگ! ہم اپنے مطلب کو چھیل چھیل کر باریک کرتے رہتے ہیں، ہاؤ ونڈر فل! ہاؤ فائن! اتنا فائن کہ مائیکروسکوپ کے بغیر کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لائیے مائیکروسکوپ۔ ادھر لائیے —— اب بھی کچھ نظر نہیں آرہا! —— کوئی اور مائیکروسکوپ لائیے۔ یہ گھٹیا ہے۔ یہ بھی نہیں —— خیر اس وقت تک انتظار کیجئے جب تک آپ کوئی کوالٹی مائیکروسکوپ نہیں بنا سکتے ——

یا یہ تو نہیں کہ آپ نے سچائی کو اپنی لفاظی سے اتنا چھیل دیا ہے کہ وہ اپنے وجود سے ہی چھل گئی ہے۔ مگر ہماری سچائی ہی سچائی ہی نہیں رہی تو آخر ہم پیش کیا کرنا چاہتے ہیں؟ دراصل ہمیں کوئی پرابلم درپیش نہیں لیکن ہماری خواہش ہے کہ کوئی پرابلم پیدا

آپ کا ریسرچ پرابلم کیا ہے ؟

صرف روٹی !

صرف روٹی کمانے کے لئے ہم نے یہ کیوں ضروری ٹھہرا لیا ہے کہ پہلے سائنس، فلسفہ اور ادب پر ریسرچ کی جائے ؟ براہ راست روٹی کمائیے ۔

واقعی میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ مجھے آپ سے کچھ کہنا کیا ہے ۔ شاید ہم سب لوگ صرف باتیں کرنے کے لئے ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہیں ۔ پہلے پہل جب ابھی زبانیں دریافت نہیں ہوئی تھیں تو انسان کس طرح آپس میں باتیں کرتے ہونگے ؟ ——— غاں غوں ——— غ ——— آخ ——— کھو ——— آ ——— یہ ہا ——— اد ——— وہ ——— وں ! ——— اور وہ بڑے خوش تھے ۔ اپنی زبان سے کوئی زبان بولنے کی بجائے کھاتے پیتے ۔ کیڑے مکوڑے گھاس گھری سب کچھ کھا کر انہیں بڑا مزا آتا تھا کیونکہ ذائقہ اشیاء کی بجائے ان کی زبان میں ہوتا ۔ مگر جب سے انہوں نے زبان سے زبان کا کام لینا شروع کیا وہ اپنی خوراک کے لئے خاص خاص اشیاء کے محتاج ہو کر رہ گئے ۔ اُن کی زبان نے اپنا طبعی ذائقہ کھو دیا اور ہوتے ہوتے آج یہاں تک نوبت آپہنچی ہے کہ ہمیں سب اشیائے خوردنی سے صرف باتوں کا ہی ذائقہ آتا ہے ۔

یہ پنیر کتنا لذیذ ہے !

گویا اگر ہم یہ نہ کہیں تو ہمیں پنیر کا ذائقہ سرے سے محسوس ہی نہ ہوا !

مجھے افسوس ہے کہ بات خواہ مخواہ لمبی ہوتی جارہی ہے ۔ آپ بھی کچھ کہئے ! مگر آپ کیونکر کہیں گے اور کہیں گے تو میں کیونکر آپ کو سنوں گا ؟ آپ تو مجھے پڑھ پڑھ کر سن رہے ہیں ۔ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ میں نے لکھا ہے اور آپ پڑھ رہے ہیں ، ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ نے لکھا ہوتا اور میں پڑھتا رہیں بہت کم پڑھتا ہوں ، بہرحال یہ اچھا ہے کہ بذریعہ تحریر آپ تک پہنچا ہوں نہیں تو بات چیت میں یہ کوفت رہتی ہے کہ فریقین بیک وقت بولنا چاہتے ہیں اور جب گفتگو میں نہ بولنا اور صرف سننے پر مجبور ہوتے ہیں اس وقت سننے کی بجائے اصل میں اپنی بولنے کی باری کا انتظار کرتے ہوئے بغور سن رہے ہوتے ہیں ——— خیر ، آپ مجھے یہ بتائیے کہیں آپ مجھے اس لئے تو اتنے دھیان سے نہیں سن رہے ہیں کہ میں کوئی بڑا باریک نکتہ پیش کروں گا ۔ ذرا غور کیجئے ، اگر میں آپ کے اتنے بڑے وجود کو اکیلا چھوڑ کے کسی باریک سے نکتے کی تلاش میں نکل پڑوں تو میری واپسی تک آپ یہاں سے جا چکے ہوں گے پھر باریک نکتے میرے کس کام کے ؟ ——— اور باریک نکتے آپ کے بھی کس کام آئیں گے ؟ حال ہی میں ایک نامور سوشیالوجسٹ نے بڑی کاوش سے ریسرچ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ کے متعلقین کو آپ کی گفتگو میں باریک نکتوں کی موجودگی کا احساس ہونے لگے تو وہ آپ سے غیر متعلق ہونا شروع ہو جاتے ہیں ۔

آپ پہلے ہی اس بھری پُری دنیا میں تنہائی کے کرب کا شکار ہیں ، جب سچ مچ تنہا رہ گئے تو آپ کا کیا حال ہوگا ؟ ——— بس موٹی موٹی باتیں کیجئے اور موٹے موٹے قہقہے لگائیے تاکہ آپ کے آس پاس متعلقین کا جمگھٹا لگا رہے اور آپ ان سے لگے رہنے کے طور پر اپنی ذہنی تنہائی کا ذکر کر کر کے خوش رہیں کہ دنیا کا بازار کتنا بارونق ہے !

تنہائی کا قصہ چل نکلا ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ تنہا پسند افراد کی تنہائیاں دنیا کے بڑے بڑے شہروں سے کہیں زیادہ گنجان آباد ہوتی ہیں ۔ ان لوگوں کو اس تنہائی میں کل کائنات کی رفاقت میسر آجاتی ہے ، اس لئے اگر آپ تنہائی کے کرب سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو تنہا رہئے ۔ تنہائی کا درد انہیں لاحق ہوتا ہے جو اجنبی لوگوں سے بڑے تپاک سے گلنے ملنے کیلئے چوبیس گھنٹے گھر سے باہر رہتے ہیں ——— کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ میں آپ کو سدا گھر میں پڑا رہنے کی تلقین کر رہا ہوں ؟ اگر یہ ہے تو آپ بڑے خوش ہوں گے ۔ یہی تو آپ کا ایمان ہے کہ گھر چوکھٹے سے باہر قدم مت رکھو ۔ خدا آپ کی حالت پر رحم کرے ذرا باہر آئیے ، آپ تو ہر روز سات میل اور اپنے اندر

ہیں۔ اگر قدرت کی یہی رضا ہوتی کہ آپ سدا اپنے اندر ہی توجہ آپ کی ناک کی گھوڑی کے دونوں بالائی اطراف میں آنکھوں کا جوڑا کیوں موجود ہوتا ؟ آپ کی تو دونوں آنکھیں قائم ہیں، اندھوں کو بھی یہ توفیق بخشی گئی ہے کہ وہ اپنے کانوں سے سن سن کر دیکھ لیں، ہمارے بابا آدم کو خدا نے یہ خاص پیغام بھیجا تھا کہ تم کائنات کے جس جس حصے کو دیکھ لوگے، وہ تمہارا ہو جائے گا۔ جو کچھ ہم باہر دیکھتے ہیں وہی کچھ ہمارے اندر بہتا چلا جاتا ہے باہر کی کھیتیاں ہماری جانب سلسلہ وار پھیل پھیل کر ہمارے اندر ہی اندر اُگتی چلی جاتی ہیں۔ انہی نظاروں سے ہمارا ربطِ زندگی قائم ہے۔ آیئے گھر سے باہر نکلئے۔ گھر کا تصور اس لئے جاذب نہیں کہ ہم یہیں پڑے رہیں بلکہ اس لئے کہ گھر واپس آ سکیں۔

کیا آپ کو ڈر ہے کہ گھر لوٹنے سے پہلے کوئی آپ کی اس شخصیت کو قتل کر دے گا جسے لے کے آپ گھر سے نکلیں گے ؟ بچے ہیں آپ ! ـــــ اس لئے بچے ہیں کہ آپ نے ابھی تک اپنی بچپن کی شخصیت کو قتل ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں آپ اس لئے سانس لے رہے ہیں کہ آپ کے وجود میں ہر دم ملکُو جراثیم شخصیتوں کا قتلِ عام ہوتا رہتا ہے۔ آپ اپنے بچپن کی اس ننھی سی شخصیت کو موت کے گھاٹ اتر جانے دیجئے تاکہ آپ کی نئی نئی شخصیتوں کا امکان ہموار ہے، اور پھر وہ بھی موت کے گھاٹ اتر جائیں تو اور نئی شخصیتوں کا۔ موت کے اسی عمل سے آدمی کا عملِ حیات قابلِ یقین ہے۔ جب تک آپ ہنستے ہنستے اپنے کسی دور کی مرحوم شخصیت کو دفناتے رہیں گے اس وقت تک آپ کی بہتر اور برتر شخصیت کی تخلیق و پرداخت ممکن ہے۔ اپنی جس شخصیت کو آپ آخری یاد کر لیں وہی آپ کی ذہنی موت کے آغاز کا سبب ہو جاتی ہے ـــــ آیئے۔ گھر سے باہر قدم رکھئے۔ مر مر کر جیتا نہ ہو تو جینا مرنے سے کم نہ ہو۔ آیئے، ڈریئے نہیں ! اگر آپ ڈر رہے ہیں تو اپنے آپ کو سختی سے جھڑکئے کہ ڈرتے کیوں ہو۔

مگر کیا فائدہ ؟ مجھے معلوم ہے کہ آپ صرف اوروں کو جھڑک کر ہی خوش ہوتے ہیں، یا شاید آپ اوروں کو بھی نہیں جھڑکتے، شاید آپ صرف خوش ہو کر ہی خوش ہوتے ہیں آپ بے وقوف ہیں۔ خوشی خوش رہنے کے منطقی نتیجے سے حاصل نہیں ہوتی۔ خوشی اسی طرح حاصل ہوتی ہے کہ خوشی کچھ بھی کر لیا جائے۔ مثلاً بخوشی آپ غمگین بھی رہیں تو اس سے آپ کو خوشی ہوگی۔

اچھا آپ یہ بتایئے ـــــ میرا مطلب ہے بتایئے نہیں بس سُنئے ـــــ آپ کی اس خود اطمینانی کا باعث کیا ہے ؟ آپ اس لئے خوش ہیں کہ جو ہے وہ ٹھیک ہے، یا اس لئے کہ جو ہے وہ اتنا غلط ہے کہ آپ تنہا اسے ٹھیک کرنے سے قاصر ہیں! بتلایئے ! یا بتانا نہیں چاہتے تو مجھ سے چلا کر کہیئے کہ بکواس بند کرو مجھے معلوم ہے کہ میں بکواس کر رہا ہوں۔ بکواس کرنا مجھے آجکل بہت اچھا لگتا ہے، غالباً اس لئے کہ جو لوگ بکواس نہیں کرتے انہیں سُن سُن کر مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ نِری بُری بکواس سُن رہا ہوں۔ کیا آپ کو بھی بکواس کرنا یا بکواس سُننا پسند ہے ؟ـــ میں جانتا ہوں کہ آپ اس لئے پڑھتے ہیں کہ موڈ ذرا غیر سنجیدہ ہو جائے، اور بس۔ اگر واقعی یہ بات ہے تو بڑی سنجیدگی سے میری بکواس سنتے جایئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی کام کی بات کہہ کے آپ کے دماغ پر زور نہیں ڈالوں گا۔ آپ تو کبھی کبھار ذہن پر زور ڈال کے کچھ نہ کچھ سوچ لیتے ہیں مگر مجھے اپنی سوچ پہ بالکل بھروسہ نہیں رہا۔ میں اپنی دانست میں کوئی سنجیدہ بات کرتا ہوں تو لوگ ہنسنے لگتے ہیں اور کوئی ہنسی کی بات کرتا ہوں تو وہ نہایت سنجیدگی سے اس پر غور کرنے لگتے ہیں۔

دیکھئے، اتنی دیر سے آپ سے مخاطب ہوں مگر مجھے یہ معلوم نہیں کہ آپ کون ہیں، کوئی پروفیسر، فلم ایکٹر یا لٹریری کریٹک؟ ـــــ نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے ؟ یہ لوگ اردو ادب نہیں پڑھتے، کسی انگریزی روزنامے کے سنڈے ایڈیشن میں اپنے پسندیدہ کامک کا تصویری سلسلہ دیکھتے ہیں، آپ ضرور کوئی بس کنڈکٹر، پرائمری اسکول ٹیچر یا ہاؤس وائف ہیں۔ آپ کام والے لوگ ہیں مجھے افسوس ہے کہ میں نے خواہ مخواہ اپنی بیہودہ گوئی سے آپ کا

وقت ضائع کیا۔ خیر، میں آپ کو ادب وجب کی باتیں کرکے بور نہیں کروں گا۔ حالانکہ میرا یقین ہے کہ ادب کے کسی پروفیسر کی بہ نسبت آپ کو ادب میں زیادہ دلچسپی ہے۔ ادب آپ کے لئے کوئی مسئلہ نہیں بلکہ آپ کے مسائل کا حل ہے۔ مثلاً آپ کی جیب میں جانے کے لئے دو چار آنے ہوں تو چائے کی بجائے آپ کوئی ناول یا رسالہ کرائے پر لے کر اپنی ساری بھوک مٹا لیں گے۔ آپ پڑھ رہے ہوتے ہیں تو آپ کا انگ انگ پڑھ رہا ہوتا ہے۔ کبھی آپ بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں، کبھی آپ کی آنکھیں بھر آتی ہیں، کبھی بیڑی سلگا کر ایک ہی لمبے کش میں اسے ختم کرکے آپ پھر کتاب پر سر جھکا لیتے ہیں۔ میں اپنے پروفیسر دوستوں سے اکثر یہی کہتا ہوں کہ آپ کے یا اپنے طلباء کے مانند ادب کا مطالعہ پیٹ بھر کر کیا کریں مگر کیا کیا جائے، انہیں بھوک ہی نہیں لگتی۔ بس کھائے بغیر منہ بنا کے فوراً الٹے سیدھے نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ میرے بونا فائیڈ ریڈرز آپ ہیں۔ آپ مجھ سے اتنی توقعات وابستہ کرکے مجھے پڑھتے ہیں کہ میں بلا جھجک تخلیق کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہوں۔ چند روز کی بات ہے میرے ایک فاضل دوست نے میری کوئی کہانی پڑھ کر رائے دی کہ آپ کے فن سے صرف ہم انٹلیکچوئلز ہی استفادہ کر سکتے ہیں شاید انہیں میرے فن سے اتنی غرض نہ تھی جتنی ہم جیسے انٹلیکچوئلز سے۔ یا اگر انہیں میری تعریف کرنا بھی درکار تھا تو انسان کی فکر فنی سطح پر مفید ہونے کی بجائے صرف کارگر ہوتی ہے لہٰذا ہر حیوان جسے انسانی چہرہ پہنایا گیا ہے فنونِ لطیفہ سے متاثر ہونے کا اہل ہے۔ فن اور علم میں یہی ایک اہم فرق ہے کہ علم اپنی معراج کی جانب نارسا ہوتا جاتا ہے لیکن فنی تخلیق کی تکمیل رسائی کے کسی نہ کسی پہلو سے جڑی ہوتی ہے ——— ارے! میں یہ کس چکر میں پڑ گیا۔ میں واقعی آپ کو بور کرنے لگا ہوں۔ کہنا مجھے صرف یہ تھا کہ آپ محض اپنی خوشی کی خاطر پڑھتے ہیں، نہ کہ اس لئے کہ باقاعدہ ادبی مطالعہ کے توسط سے آپ کو معاشیات پر مقالہ لکھنا ہے، یا آپ کو پڑھ کے پڑھانا ہے۔ شیکسپیئر نے اپنی دانست میں ٹیکسٹ بکس لکھی تھیں یا اسٹیج پلیز؟)

ایک اور باعث یہ ہے لٹریچر کا ایکسپرٹ ہر نئے خیال یا ہیئت کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور جب تک وہ خیال صدی نصف صدی بوڑھا نہیں ہو جاتا، وہ اُسے خطرہ سمجھ کے اس سے دور دور رہتا ہے مگر جب اُس کے چہرے پر خوب جھریاں آ جاتی ہیں تو ایکسپرٹ اسے بے بس پاکر دبوچ لیتا ہے اور کلاسیکی کتابوں میں محبوس کرکے اس پر نجات کی راہیں بند کر دیتا ہے ——— مگر عام پڑھنے والے نئے اور باغی ادب کی گورنمنٹ کو تسلیم کرنے میں پیش پیش کرتے ہیں۔ اگر سبھی خواص ہوتے تو ہمارا ادب ابھی تک الٹرا فیوڈلزم کا شکار ہوتا۔

اچھا، چھوڑیئے یہ ادب وِدب کا حساب کتاب۔ یہ بتایئے آپ لوگوں کے چہروں سے یہ کیوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی بڑی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ اتنا کام کرتے ہیں آپ۔ کیا آپ کے پاس سوچنے کا ٹائم ہے؟ جب ذرا فرصت ملے تو ہنسئے کھیلئے ——— اصل میں مَیں نے اپنی ایک کہانی میں یہی چاہا تھا کہ میرا ایک کردار ——— وہ آپ جیسا ہی تھا ——— اٹھ کر کھُل کے دو چار قہقہے لگائے جن سے گرد و پیش کی زندگی مسرت سے گونجنے لگے مگر وہ بھلا آدمی فلسفی نظر آنے پر مصر تھا اور مجھے اس پر ترس آ رہا تھا کہ ناحق اپنے دفتر میں میزان کرتے ہوئے غلطیوں کا مرتکب ہوگا اور مصیبت مول لے لے گا ——— ارے بھئی، کون سا اتنا بڑا مسئلہ ہے؟ ——— اس نے اپنی گہری سوچ کو ترک کرتے کے انداز میں بغیر کسی تمہید کے جواب دیا، میں سوچ رہا ہوں کہ گیہوں دو روپے کیلو ہے، دودھ پونے دو روپے لیٹر، گھر کا کرایہ اسی روپے، بچوں کی اسکول کی فیس اور ———

ارے! میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم ہمارے تہذیبی اور روحانی ورثے پر غور و فکر کر رہے ہو۔ میرے بھائی، ہماری یہ عظیم تہذیب بڑی آسانی سے تمہیں اور تمہارے سارے کنبے کو مہیا ہو سکتی ہے۔ لوگے؟ ——— کتنے روپے کیلو کے حساب سے؟ نہ بھئی، ابھی میں اپنا بجٹ بڑھانے کے موقف میں نہیں ہوں ۵۲ سے سو دو سو برس پہلے میں چوری کرکے اپنے ضرورتیں پوری

اشتہار

کرلیتا تھا مگر آج ان مصنوعات کے سارے رس پبلک کا مالک میں ہی ہوں
چوری کروں تو کس کی ؟ یہ سبزیاں، گوشت، انڈے، دودھ
—— یہ سب کچھ میرا ہے مگر چونکہ میرے پاس خریدنے کو دام نہیں
اس لئے یہ سب کچھ میرا نہیں۔ میں مالک ہوں۔ میں مالک نہیں ہوں !
ہہ ہہ ہا —— ہہ —— ا —— خیر، چھوڑیئے اس پگلے کو را کو!
ہوسکتا ہے میری نظر کو دھوکا ہوا ہو اور آپ کسی فکر میں غلطاں نہ
ہوں۔ اس دن بھی میرے ساتھ یونہی ہوا۔ وہ آدمی مجھ سے ذرا دور
بیٹھا تھا۔ پہلے تو میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کے اس کے پاس
چلا آیا۔ ارے بھائی میرے، معاف کرنا ! میں وہاں کئی منٹ سے
آپ کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ آپ رو رہے ہیں۔
نہیں ! میں تو ہنس رہا تھا ! —— تو کیا جب آپ روتے ہیں
تو ہنستے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ؟ شاید اسی لئے ہمارے رہنماؤں کا خیال
ہے کہ ہماری ساری قوم بڑی خوش باش اور مطمئن ہے !
در اصل عصری حالات اتنے ایب نارمل ہو چکے ہیں کہ ہمارے
چہرے کے خطوط بھی کھنچ کھنچ کر نارمل نہیں رہے اور ہم اپنے مانند
نظر نہیں آتے !

ہیلو پروفیسر ! ہاؤ آر یو ؟ —— اچھا دوست
اب آپ معاف کیجئے، میرا پروفیسر بار آگیا ہے، اب لکھنے نہیں
دے گا —— آؤ پروفیسر، بیٹھو۔
نہیں، بیٹھیں گے نہیں۔ آؤ کسی کیفے میں چلتے ہیں ——
او —— و ! کچھ لکھ رہے ہو ؟ آج کل یہ کیا الم غلم لکھتے رہتے ہو؟
تمہاری وہ کہانی پڑھی تھی۔ کیا نام تھا اس کا ؟ خیر نام کو چھوڑو !
کیا موضوع تھا ؟ خیر چھوڑو ! کوئی سر پیر نہ تھا۔ کہاں سے
شروع ہوئی، کہاں ختم ہوئی ؟ کیا ہوا ؟ کچھ پتہ نہ چلا ! کیا تم اسے
کہانی کہتے ہو ؟ کہانی تو یہ ہوتی ہے کہ پہلے یہ ہوا، پھر یہ، پھر یہ۔
نہ کہ یہ کہ بس جو ہوا یہی ہوا —— کوئی خاک سمجھے !
میرے باعلم دوست، گذشتہ دس برس میں تمہیں کوئی
واقعہ پیش آیا ہے ؟ آج ہمیں واقعات پیش نہیں آتے خیال
ہی خیال ہی پیش آتے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کرتا، کوئی واقعہ کہیں
شروع نہیں ہوتا کہیں ختم ہوتا ہے۔
نان سنس !
کامن سنس، پروفیسر، نو نان سنس ! میری کہانیوں
کو سمجھنا اتنا مشکل ہے کہ انہیں صرف عام لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔
آؤ کیفے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔

یادوں کے چراغ —— صفحہ ۱۲۱ کا بقیہ

دن کی روشنی میں محلے کی کئی عورتوں اور بچوں نے گواہی
دی کہ وہ کل رات ایک غیر کا ہاتھ تھامے بڑی سڑک پر نظر
آئی تھی۔ اس دن پنچایت بیٹھی۔ خود جیالا پرشاد نے
فیصلہ صادر کیا۔ کہ ایسی ذلیل بہن کا اس سے کوئی تعلق نہیں
رام کشن نے فیصلہ سنایا کہ نہ وہ اس کی بیوی ہے اور نہ اس
کے بچے کی ماں، بچہ نہ جانے کس کا ہے۔ شیاما کو گھر سے نکال
دیا گیا۔ محلہ بدر کر دیا گیا۔ اسے ایک آشرم میں پناہ ملی۔
جہاں اس جیسی بہت سی بدنصیب عورتیں رہتی تھیں۔ وہیں
کنول پیدا ہوئی۔ بچی کی پیدائش کے فوراً بعد اس نے دم توڑ دیا
بچی کو آشرم والوں نے پالا۔ جب وہ بڑی ہوئی تو اسے اسکی
ماں کا ایک خط دیا گیا جس میں شیاما نے اپنی داستان غم
سنائی تھی اور میرے بارے میں سب کچھ بتایا تھا۔ اس کے
بعد کنول نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور اب جب بھی وہ ہوائی جہاز
میں کراچی سے گزرتی ہے، میں اس سے ملنے ایئر پورٹ ضرور
جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے ایک غیر مسلم، خوبصورت، نوجوان
ایئر ہوسٹس سے بلا ناغہ ملنا یہاں والوں کو بالکل نہیں بھاتا
خود میرا بیٹا نہ جانے کیا سوچتا ہے —— لیکن بیٹی ——
تم ہی بتاؤ —— کیا میں بھی اس بدقسمت لڑکی کا ساتھ اسی طرح
چھوڑ دوں، جس طرح اس کے باپ، ماموں اور دوسرے رشتہ
داروں نے چھوڑا تھا ؟ —— کیا واقعی بعض بندھن اتنے
مضبوط نہیں ہوتے جنہیں زمانے بھر کی آندھیاں اور طوفان
بھی کبھی نہیں توڑ سکتے ؟ ——————

عفت موہانی

کفّارہ

باہر کے کھنکتے قہقہے اس کی روح میں زہر
گھول رہے تھے ۔ اچانک اُسے سیما
دکھائی دی ۔ سُرخ لباس میں لپٹی سہاگ کی خوشبو
میں بسی ، چہرے پر افشاں کے ستارے مسکرا رہے تھے ۔

محلے ٹولے کی بات ہوتی تو یقین آتا مگر سگی بہن کا کام تھا اور
ی یوں منہ چھپاتی پھر رہی تھی جیسے کسی کو نظر آگئی تو سب سے بڑا گناہ ہوگا
ن میں خالہ بی محلے بھر کی لڑکیوں کو سمیٹے ڈھولک پر گا رہی تھیں ۔ ہونٹوں
کراہٹ کی چاندنی بکھری ہوئی تھی مگر آنکھوں میں جدائی کی کربناک گھڑیوں
ھیرا رچا ہوا تھا ۔ اور اماوس کی سیاہی سیما کی آنکھوں میں بھی اُتر آئی
۔ اس کے بعد کیا ہوگا ۔ اماں مفلوج ہیں ۔ خالہ بی تنک مزاج ۔ اگر کسی
ت پر ناراض ہوئیں تو بیٹے کے گھر چلی جائیں گی ۔ سلمیٰ کا وجود عدم وجود برابر
۔ وہ تو تتیا مرچ تھی ۔ طبیعت کی کڑوی کبھی کسی کو سراہا نہیں ۔ بات کرنے
ت سننے کی روادار نہیں ۔ پتہ نہیں وہ ایسی کیوں ہوگئی تھی ۔ کہنے کو ایک
ں کی بیٹیاں تھیں ۔ ایک گھر ایک ماحول میں آنکھ کھولی ۔ مگر دونوں میں
ین آسمان کا فرق تھا ۔ سلمیٰ سراپا جلال تو سیما سراپا جمال اس کے پاس دو
ڑی بیٹھ جاؤ ۔ تو یوں لگے جیسے بے آب و گیاہ صحرا میں چلتے چلتے اچانک
ک سایہ دار نخلستان میں آنکلے ہوں ۔ میٹھی بولی پیاری شکل تبھی تو ایک
کی دیکھی ہوئی منصور کی ماں بہنیں یوں فدا ہوئیں کہ بغیر تاریخ مقرر کئے
گوٹھی پہنا گئیں ۔ اماں بی کی چھاتی پر دھرا پہاڑ سرکا ۔ وہ تو بڑے بھیا کے
نے اور چھوٹے کے پاکستان چلے جانے سے ایسی بدحواس تھیں کہ اگلا پچھا
سوجھتا تھا ۔ لے دے کے سیما اور سلمیٰ رہ گئیں ۔ شوہر تو عرصہ ہوا ختم ہو چکے
تھے اثاثہ رہا سہا بے سروسامانی کی حالت میں ختم ہو چکا تھا ۔ ایسے

کڑے وقت میں نجانے کب کی مروت خالہ بی نے دکھائی ۔ بیٹے سے سدا
کی شاکی تھیں بہو الگ چڑیا نوچن مچائے رکھتی تھیں ۔ ٹین کا صندوق
اور پھٹی دری میں تکیہ لپیٹ لپاٹ آدھمکیں ۔ ایک رات چپکے سے
انھوں نے اماں کو بڑے نوٹوں کی تھئی دکھائی ! ۔ اور فخریہ مسکرائیں ۔
" اصغر جانے ہے کہ میں بالکل ننگی بوچی ہوں ۔ تبھی تو تیز مرچیں
کا بگھار مجھے دیئے رہے ۔ اے بیوی ۔ یہ میرے مرے میاں کی جمع جتھا
ہے ۔ مکان بیچ کر پوری گڈی میرے ہاتھ پر رکھدی تھی ۔ اصغری ناشاد
کو ہوا بھی نہیں لگی ۔ ایک دفعہ پوچھا تھا کہدیا میں نے کہ تیری شادی
پر سب لگا دیا ۔ ! "

اماں کمزور سی ہنسی ہنس دیں ۔

" پورے پانچ ہزار ہیں ۔ ہمیشہ سینے سے لگائے رہی کہ
اللہ جانے کون سا کٹھن وقت ایسا آن پڑے کہ نمک دلیہ کو ترسوں
موت مٹی چندے سے ہو ۔ سو بہن تقدیر کے پھیر کی طرح یہ پانچ ہزار سینے
پر لادے لادے پھری ۔ اب یہ تم رکھ لیئو ۔ "

" نا بہن ۔ میں کمزور اپاہج آدمی ۔ ایک جگہ بیٹھی رہتی ہوں ۔ محلے
بھر کی بیٹیاں بہوئیں ملنے آتی ہیں ۔ مالک جانے کب کس کی نیت بدل
جائے ۔ یہ تو تم ہی رکھو جیسے اب تک رکھے رہی ہو ! " اماں نے یوں
لرزتے ہاتھ اٹھایا جیسے وہ کالے بچھو ہوں ۔ ابھی ڈنک مار دیں گے ۔

مگر زہر بھی کبھی تریاق ہوتا ہے۔ سیما کی زہر سے تریاق کا کام لیا گیا۔ سیما کی نسبت پکی ہوئی اور اماں کو خفقان کے دورے پڑنے لگے۔ ایسے جانگداز کہ بس صبح ہیں تو شام کا بھروسہ نہیں اور شام ہیں تو صبح کرنا جوئے شیر کا لانا برابر۔ خالہ بی برابر سرہانے ڈٹی رہیں۔ دوا علاج میں کمی نہ دکھائی۔ لڑکیاں آس پاس بیٹھی آنسوؤں سے منہ دھوتی رہیں اور اماں دھونکنی بنے سینے سے مرنے والوں اور جیتے جی بچھڑ جانے والوں کو یاد کر کے موت کو آوازیں دیتی رہیں۔

خالہ بی حیران تھیں۔ اماں تو ہمیشہ دامن پھیلا کر لڑکی کے ٹھکانے لگ جانے کی دعائیں مانگا کرتی تھیں اب ایسا اچھا گھرانا ایسا شریف لڑکا مل گیا ہے تو کاہے کی پریشانی ہے! انھیں کیا خبر تھی کہ جہاں ایک دفعہ کھانے کے بعد دوسرے وقت کا بھروسہ نہ ہو وہاں بیٹی بیاہنا آسان نہیں ہے۔ وہ اتنا بھی اماں کو خالی ہاتھ نہیں سمجھتی تھیں۔ اماں کا عروج انھوں نے دیکھا تھا۔ مگر اب اماں کو عین بیاہ کے دنوں میں سیما کی موت کی دعائیں مانگتے دیکھ کر خالہ بی کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ دن کتنے رہ گئے تھے جس شام سیما کو خالہ بی نے بڑے ارمانوں سے مائیوں بٹھایا۔ اسی رات اماں کی گود میں خالہ بی نے اپنا اثاثہ ڈال دیا۔

"قسم پروردگار کی آپا۔ اگر غیریت برتو تو میرا مرا منہ دیکھو جیسی تمہاری لڑکی ویسے میری۔ حد ہے پرائے پن کی تم آپی آپ گھلتی رہیں اور منہ سے نہ نکالی یہ بات کہ بیاہ کے لئے پریشان ہو۔ اللہ پاک کی کریمی کے قربان۔ کیا پتہ۔ اسی وقت کے لئے میں نے یہ دھر اٹھایا تھا کہ ایک حج اکبر کا ثواب مجھے مل جائے۔۔۔!" یہ کہہ کر وہ خاموش سسکیوں سے رو پڑیں۔ اماں پر کون سا جذبہ طاری تھا۔ وہ خود نہ سمجھ سکیں جھینپ جھلاہٹ غصہ یا شرمندگی! ایک دم وہ آسمان سے زمین پر گر پڑیں۔ کیا سمجھیں گی خالہ دل میں؟ اگر کبھی پلٹ کر طعنہ دے دیا تو نظریں چار کرنے کی سکت نہ رہے گی۔ یہ رقم احسان کی چکی بن جائے گی جس میں اماں کی روح سدا پستی رہے گی! جب اماں کو کچھ نہ سوجھا تو وہ بھی ان کے آنسوؤں میں شامل ہوگئیں۔

خالہ بی نے نہ جانے کب کے ارمان نکالے تھے۔ شادی کا سامان کر رہی تھیں۔ روز ہی کچھ نہ کچھ خریداری ہوتی۔ کپڑے زیور سب تیار ہو گیا۔ سیما حیران تھی۔ اماں کے پاس کون سا خزانہ ایسا نکل آیا تھا؟! سلمیٰ جانتی تھی!۔ اماں بہت کچھ چھپائے ہوئے تھیں۔ شاید سیما کے لئے اور یہ سوچ کر اس کی نفرت کچھ اور گہری ہو گئی۔ سیما سے یوں بھی جلتی تھی۔ اب تو منہ دیکھنا گوارا نہ تھا۔

سیما مانجھے کے زرد زرد کپڑوں میں ملبوس سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں خوشگوار مستقبل کے اچھوتے خواب بھی سو رہے تھے اور دردناک ماضی کی جگر خراش یادیں بھی انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ وہ ہنس بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ اماں کو چھوڑ کر کیسے جائے گی۔؟! اماں بیمار ہیں۔ سلمیٰ تند مزاج۔ خالہ آج ہیں کل نہیں۔ بھیا الٹ کر پوچھتے نہیں۔ اس گھر کا کیا حشر ہوگا؟!

اور خالہ بی دالان میں لڑکیوں کو سمیٹے بیٹھی ڈھول پیٹ پیٹ کر گا رہی تھیں ؎

> پی کے گھر آج پیاری دلہنیا چلی
> روئے ماتا پتا ان کی دنیا چلی
> پی کے گھر ———

ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوب ڈوب گئی۔ اماں کو بیٹی کی جدائی کا غم تھوڑا تھا۔ خالہ کے ایثار کا احساس زیادہ۔ کوئی سگی بہن بھی نہ تھیں۔ ہمسائی تھیں بہناپا تھا۔ ہمیشہ ہر جگہ اتفاق نے ساتھ ہی ساتھ رکھا تھا۔ اماں کی ممنون و متشکر نظریں بار بار خالہ بی کے جھریوں بھرے چہرے پر پڑتیں۔ اور بار بار ان کا دل بھر آتا! پروردگار کس طرح کام نکالتا ہے۔ اگر آج وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتا۔؟!

اور سلمیٰ تھی۔ پل بھر کے لئے وہ لڑکیوں میں آ کر نہ بیٹھی۔ کسی نے اسے بلایا بھی نہیں؟! — بند دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ غم و غصے کی تصویر بنی۔ سیما کے چہرے پر نگاہ پڑتی اور اسے بھسم کر جاتی۔ اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی پھر سب کیوں اس کے والہ و شیدا تھے۔ محلے بھر کی دیوی تھی۔ گھر کی کرتا دھرتا۔ خالہ کی جان اماں کی ایمان۔ آخر کیوں۔ آخر کیوں۔ وہ کھڑی ہونٹ چباتی رہی۔ باہر کے کھنکتے قہقہے اس کی سماعت میں نشتر

گھول رہے تھے۔ آپا کی سرلی شرمائی شرمائی ہنسی اسے بنا دئی ٹک رہی تھی نفرت اور غصہ۔ وہ کھولتی رہی گھلتی رہی نجانے کیا دیکھا تھا۔ منصور کے گھر والوں نے آپا میں۔ سانولا رنگ ہے۔ جھاڑ جھنکاڑ ایسے بال۔ سیدھا قد اور بالکل گونگی بہری۔ نہ منہ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں۔ کون سا سرخاب کا پر لگا ہے ان میں ؟!۔

شادی کے دن بھی وہ اپنے کمرے میں بند رہی۔ اسے کسی نے پوچھا بھی نہیں اماں چلنے پھرنے سے معذور تھیں۔ خالہ نے اسے اس کے حالوں پر چھوڑ دیا تھا۔ کیچڑ بھری اُتھلی گڑھیا سمجھتی تھیں کہ ٹھیکری پھینکو نا اوپر چھینٹے پڑیں! پورے گھر میں شور تھا!۔ آپا دلھن بنی بیٹھی تھیں بارات آ چکی تھی۔ دروازے پر روشن چوکی بج رہی تھی —! سب مصروف تھے اور وہ اکیلی اپنے کمرے میں بند سوچے جا رہی تھی نجانے کیا کچھ۔ جس کا سر پیر نہیں تھا۔ مگر وہ ایسی یادیں تھیں کہ پل بھر کے لئے سہی اس کی آنکھوں میں آنسو بسا گئیں۔

سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں!! وہ سوچتی رہی کسی نے مجھے مڑ کر نہیں پوچھا کیا میں اسی ماں کی اولاد نہیں جس کی آپا ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہے؟ اماں بیزار۔ خالہ متنفر۔ آپا بے رُخ۔ نہیں اماں۔ مجھے یقین نہیں۔ میں نے آپ کی کوکھ سے جنم لیا ہو؟۔ آپ کو یکساں محبت نہیں۔ آپ آپا کی ہیں۔ میری نہیں! ان کے لئے محبت ہے۔ عزت ہے۔ پیار ہے۔ اور میرے لئے نہیں۔ میرے لئے صرف نفرت تلخیاں اور بے رُخی۔!

اچانک اپنا نام سُنکر وہ چونکی۔

"اے ہے۔ سلمیٰ کہاں رہ گئی۔ وہ آواز میں آواز ملاتی تو سہاگ میں جان پڑ جاتی —!" خالہ کہہ رہی تھیں۔

سلمیٰ کے دشمن بھی نہیں آئیں گے۔ اس لئے دانت پیسے۔ اور گھور کر خالہ کو دیکھا۔

پھر خالہ خود ہی دوڑی آئیں اور سلمیٰ جھٹ پلنگ پر جا لیٹی! وہ بڑی محبت سے اسے جگانے لگیں۔

"اے بیٹی، یہ کیا جوگ لیا ہے تم نے۔ نہ کپڑے بدلے نہ باہر آئیں۔ بہن تمہاری اس گھر سے جا رہی ہے آؤ چلو اس سے ملو۔ پھر وہ نجانے کب آئے۔ سلمیٰ سلمیٰ!...... بیٹی ایسی بھی کیا نیند۔ اٹھو میری بیٹی!—"

"آپا جاتی ہوں تو جائیں۔ میرا کیا لئے جاتی ہیں۔" اس نے پھاڑ ہی کھایا۔

خالہ کو اس جواب کی امید نہ تھی۔ جھجک کر دو قدم پیچھے ہٹیں سلمیٰ انھیں گھور رہی تھی۔

"کچھ پاگل تو نہیں ہوگئیں۔ بہن سے کون سا بیر باندھا ہے؟ آخر کیا بگاڑا ہے اس نے تیرا؟"

"خالہ۔ میں نہیں آؤں گی۔ کہہ دیا ایک بار — اب آپ جائیے!" اور خالہ تھکے تھکے قدموں سے باہر مڑ گئیں۔

پھر اسے کھلے دروازے میں اچانک سیما دکھائی دی سرخ لباس میں لپٹی، ہار پھولوں سے ڈھکی وہ یوں قدم بڑھا رہی تھی جیسے خواب میں چلے پھرے۔ سہاگ کی خوشبو میں بسی ہوئی۔ چہرے پر افشاں کے تارے مسکرا رہے تھے! وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کے دل کی دھڑکن کنپٹی میں گونج رہی تھی۔

"سلمیٰ...... میں کیا خطا کی ہے؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔!

وہ بیٹھی بدستور ہونٹ کاٹتی رہی۔

"سلمیٰ...... میرے پاس چلو۔ اللہ کہیں میرا دم نہ نکل جائے۔ تم میرے قریب نہیں آئیں۔ مجھے کسی پل چین نہ ملا — سلمیٰ...... ایسا نہ کرو — میری بہن۔ پھر میں نہ جانے کب آؤں — تمہاری صورت کو ترسوں گی۔ تمہاری آواز کو تڑپوں گی۔ میری بہن میری ماں جائی —!"

"اُونہہ" — وہ جھلس گئی۔

آپا بک بک کر رو رو کر تھک گئیں تو چپ ہو گئیں۔ اس نے ایک لفظ نہ کہا۔ کہتی بھی کیا۔ آپا کے من میں تو لڈو پھوٹ رہے ہونگے۔ منہ سے جدائی کا رونا رو رہی ہیں! وہ جلبلاتی رہی۔

پھر رخصتی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ جہاں کچھ دیر پہلے قہقہے لگ رہے تھے۔ اب آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی!۔ اماں کے سینے میں

ہوا سلانے لگی تھی۔ خالہ کے دل میں پٹخے چل رہے تھے۔ مگر وہ طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پہ لئے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ حد ہے مکاری کی۔! ازل سے یہی ہوتا آیا ہے ابد تک ہوتا رہے گا۔ پھر آخر اس ڈھونگ کی ضرورت کیا ہے۔؟!

سیما کا دل اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اب تک وہ یہی سمجھتی رہی تھی کہ یہ سب اس کا بچپن ہے۔ یہ تو اب احساس ہوا۔ نفرت کا انداز جانور بھی پہچان لیتے ہیں۔! وہ تو انسان تھی؛ ماں کی محبت کے ساتھ ساتھ وہ نفرت کی سوغات بہن کی طرف سے لے چلی۔؛ گھر سے جانے کا صدمہ ایسا نہیں تھا جتنا سلمیٰ کی تحقیر کا صدمہ۔ جب سلمیٰ چھوٹی سی تھی۔ تب سیما اسے کھلاتی تھی۔ سلمیٰ نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے تھپڑ مارے تھے بال کھینچے تھے۔ اس کی پیٹھ پر سوار ہوتی تھی اس کے پاس گھس کر سوتی تھی

اس کی خاطر اس نے اپنی جوانی تج دی تھی۔ ایک ماں کی طرح۔

لیکن اس کا صلہ !؟! وہ دل ہی دل میں رو پڑی۔

مگر سلمیٰ پر اثر نہ تھا وہ خوش تھی۔ جس قدر دل دکھا سکتی تھی۔ دکھا دیا۔ اب نفرت کی خلیج دونوں کے بیچ تھی۔! ایسی گہری خلیج کو پاٹنا دونوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ سیما چاہتی تھی کہ اپنے سلوک سے سلمیٰ کو جیت لے۔ مگر وہ ناقابل تسخیر تھی۔

"خالہ بی؛ . . . میں نے آخر ایسا کیا کیا ہے۔؟!" وہ خالہ بی کے سینے سے لگ کر بولی۔ "خالہ بی۔ میرا قصور یہی ہے کہ آپ سب مجھے چاہتے ہیں۔؟"

"نہیں بیٹی۔ ایسا نہیں ہے؛" خالہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "ابھی وہ بچہ ہے دل برا نہ کرو۔" اماں تو منٹ بھر کے لئے سیما کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ سمجھ گئیں کہ پھر سلمیٰ نے کچھ کیا ہے۔ مگر وہ کچھ کہہ کر اور اس کا دل برا نہ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ کلیجہ مسوس کر رہ گئیں۔!

کتنی بار سوچا تھا اس نے۔ وہ کیوں خواہ مخواہ دیوانی ہو رہی ہے۔ اب تو وہ جا رہی ہے۔ پھر کہاں وہ اور کہاں سلمیٰ۔ مگر سلمیٰ خوش تھی۔ اب گھر سے نکلیں تو اچھا ہے۔ سب کچھ اس کا ہے۔ دیکھے گی اماں اور خالہ کا حال۔ کٹے ہوئے کنکوے کی طرح ڈولتی پھریں گی — وہ،

بے آواز ہنسی۔

"یہ حقیقی بہن نہیں۔ دشمن ہے تیری—" خالہ بی نے کہا۔

"نہیں— خالہ" وہ کانپ گئی۔! مگر ایک تازہ زخم دل پہ لگا

باہر سے ایک بار اور رخصتی کا بلاوا ہوا۔ پل بھر کی رکی دبی ہچکیاں پھر تیز ہو گئیں؛ آخری بار اماں نے کہا کوئی تو اس کمبخت کو بلائے خالہ مرتی کھپتی پھر آئیں۔ سلمیٰ سنگھار میز کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی انھیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

"بیٹی۔ آخر یہ کیا دانت کاٹے کی دشمنی ہے۔ گھر میں بارات آئی ہے۔ بہن وداع ہو رہی ہے اور تمہارا خون یوں سفید ہو رہا ہے کہ دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔ ملنا تو بڑی چیز ہے۔ آخر کا ہے کا عناد ہے یہ۔ اگر اس نے کچھ کیا ہو تو معاف کر دو اسے۔"

"بس کرو۔ خالہ" وہ چہکی؛ "تم کون ہو دخل دینے والی؛! —"

"ہوش کی دوا کرو بیٹی۔ میں بھی تمہاری ماں کے برابر ہوں۔!"

خالہ نے آنکھیں نکالیں۔ "خدا کی شان ہے کہ آج تمہیں یہ دن لگے۔ ماں برابر خالہ سے آدھا تہائی کرنے لگیں۔

نہ جانے کیسے سلمیٰ کا ہاتھ اٹھ گیا، خالہ کو جیسے چکر آ گیا۔ چند منٹ بعد شکست خوردہ سی خالہ سلمیٰ کے تھپڑ کا اثر دل پہ لئے واپس نکلیں تو قدم اٹھنے محال تھے۔ گرتی پڑتی محفل میں آئیں! اور بھیگی دیوار کی طرح ڈھ گئیں!

خالہ کو بے حال دیکھ کر اماں ہول گئیں۔

"خالہ۔ آپ کے ساتھ سلمیٰ نہیں آئی۔!"

"نہیں—" وہ بھرے گلے سے بولیں۔

"ہے ہے۔ اختری خانم۔ ہوا کیا۔ کچھ کہو بھی تو—"! اماں بے چین ہو کر پلنگ سے اترنے لگیں تو خالہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ "جسے سینے پر سلا کر بڑا کیا۔ اس کے ہاتھ کا تھپڑ کھانا میرے بھاگوں میں بدا تھا۔!"

"اس نے آپ کو مارا ہے؛" سیما دھک سے رہ گئی

اماں سناٹے میں رہ گئیں۔!

"خالہ۔ خدا کی قسم۔ آج کے دن کی قسم" سیما کا چہرہ لال انگارہ
بن گیا۔ "اب میں اس کے لئے کوئی بھلائی نہیں کروں گی۔ وہ میرے
لئے اور میں اس کے لئے مر گئی:۔"

سیما گھر سے کیا نکلی۔ جیسے زندہ جنازہ اٹھا ہو۔ اماں پلنگ
پر گریں۔ خالہ بی بھی اپنے گھر کو سدھاریں: پھر سیما بھول کر بھی اس
گھر میں نہیں آئی۔ اسے اب سلمٰی سے نفرت تھی۔ وہاں کیا تھا سوائے
بڑھاپے کی اس ہوکے۔ اور یہاں۔ جیسے پر کٹے پرندے کو صدہا سال
بعد قفس کی کھڑکی کھلی مل گئی ہو۔ اور اس نے ہرے بھرے گلستان میں
آزادی و اطمینان کی طویل سانس لی ہو۔ سیما سب کچھ بھول گئی: منصور
کی محبت۔ اس کی بہنوں کی شفقت و خلوص میں وہ اپنی پرانی یادیں گم کرنے
میں کامیاب ہوگئی:۔

لیکن اسے یاد تھا سلمٰی کا تھپڑ۔ خالہ کے آنسو اور اماں کی
بے چارگی:۔ مگر وہ اب بھی سمجھ نہ سکی۔ سلمٰی کی بے رخی سنگدلی اور
تیز مزاجی کا سبب کیا تھا؟!

منصور جب اس کے اپنے گھر کا چکر لگا آتے تو وہ بڑے
اشتیاق و اضطراب سے اماں کا حال پوچھتی۔ خالہ کی کیفیت سلمٰی کی خیریت
جانتی۔ مگر منصور کے اصرار پر بھی وہ کبھی میکے نہیں گئی۔

منصور کو گمان گزرتا: سیما یوں گرمجوشی سے سلمٰی کے متعلق
نہیں پوچھتی؟ کیا دونوں سگی بہنیں نہیں ہیں؟! ایک دن اس نے یونہی
پوچھ لیا تو سیما ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی:۔

"حیرت ہے۔ ایک ماں کی بیٹیاں۔ اور ایسا تفاوت؟!۔
ایک بے علم مگر تربیت کی اعلیٰ مثال۔ دوسری گریجویٹ مگر تربیت اور
تعلیم کی بدترین مثال۔" وہ متحیر بھی تھا اور متاسف بھی۔ بری راہ اُس
سے کچھ دُور نہیں۔

میں نے قسم کھائی ہے۔ اب اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گی:
"تم نہیں جانتیں۔ سلمٰی نے اپنی تعلیم سے بھی ناجائز فائدہ اٹھایا
ہے۔ وہ جب باہر نکلتی ہے تو ایک لڑکا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اس
کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ تمہاری ماں کو ان حالات کی خبر نہیں؟!
تم نے بھی اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں:۔ اب اگر کچھ اونچ نیچ
ہوگئی تو ذمہ دار کون ہوگا؟!"۔

"میں کیا جانوں، میں تو اس کی دشمن ہوں!۔" سیما روہانسی
ہوگئی: پھر اسے خیال آیا۔ ٹھیک ہے۔ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی بھرتا
ہے۔ خدا کے یہاں دیر ہے پر اندھیر نہیں۔ اس نے میرا جینا حرام کر رکھا
تھا۔ اب خود بھی سزا بھگتے گی۔!!

اس نے خوش رہنے کی کوشش کی۔ مگر دل میں کانٹے سے
ٹوٹ رہے تھے: نجانے کیوں۔ جی گھبرا رہا تھا:۔ وہ مسرور نہ ہوسکی۔
پریشان ہوگئی:۔ اس نے اتنی بڑی قسم کیوں کھائی تھی۔؟!۔

پھر وہ بے چین بے چین سی میکے بھاگی۔ اماں بیمار تھیں، خالہ
بی نے چپکے چپکے سب کچھ سنا دیا۔ سلمٰی نے نوید سے پینگ بڑھا رکھے
ہیں۔ وہ گھر پر آتا ہے۔ سلمٰی اس کے ساتھ جاتی ہے!!

ابھی سیما کو میکے آئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ باہر سے مسکراتی
ہنستی سلمٰی آئی! مگر بہن کو دیکھ کر اس کے چہرے پر تلخی کے سائے پھیل
گئے!۔

"خیریت تو ہے سلمٰی!۔" اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔
"کیوں نہ ہوتی؟!" سلمٰی نے کہا۔
"میں تمہارے لئے کچھ نہیں کروں گی۔" سیما کا دل چلانے لگا۔
"کبھی تو شریفوں کی طرح گفتگو کیا کرو۔" اماں بولیں۔
"شریف ہوں بھی تو۔"

افسوس ۔۔۔ سیما نے زیرلب کہا اور سر موڑ کر آنگن کے
مرجھائے پھولوں کو تکنے لگی۔!

اماں کی بیماری سردیوں کی شدت کے ساتھ بڑھتی گئی۔!
پہروں خاموش پڑی رہتیں اور جب ان سے زندگی کا بوجھ سہارا نہ
گیا تو انھوں نے یہ ناقابل برداشت بوجھ اتار پھینکا!۔

چھائیں چھائیں کرتی تاریکی بڑھی!۔ موت کے سائے در و
دیوار پر پھیل گئے:۔ خالہ بی پچھاڑیں کھا کھا کر سنبھلیں سیما رو رو کر تھک
چکی تو دیکھا کہ گھر تباہ ہو چکا تھا۔

منصور سے دیکھا نہ گیا۔ وہ اماں کی موت کے تیسرے ہی دن
سب کو اپنے گھر لے کر چلا آیا۔ سیما سے وہ خفا تھا۔ آخر وہ [illegible]

کی دلجوئی کیوں نہیں کرتی۔ بھوکی پیاسی ماں کی موت کا داغ دل پر لئے
وہ اکیلی پڑی سسک رہی ہوگی۔ کون سا احساس ہے جو سلمیٰ کے پیروں
میں بیڑیاں بن گیا ہے ؟!

سلمیٰ کی کراہیں کمرے میں گونج رہی تھیں : آج اس کا اپنا کوئی
نہیں ؟! سیما کے لبوں پر ایک پراسرار سا تبسم کھیلنے لگا : اماں کا غم
پس منظر میں جا سویا۔

قدرت نے بالآخر انتقام لے ہی لیا۔ میرے سینے میں بھی
دل تھا۔ آج اسے پتہ چلا آنسو کیسے نکلتے ہیں ؟! ـــ اس حادثہ
کے بعد سے سلمیٰ بہت گم صم رہنے لگی تھی۔ اب بھی وہ سیما سے بات
چیت نہ کرتی ! ـــ خالہ ممتا سے مجبور ہوکر اپنے گھر نہیں گئی تھیں۔ یہیں
چلی آئی تھیں اور ماں کو کھوئے ہوئے منصور نے ماں کی طرح خالہ
کا بھی استقبال کیا تھا۔

"آخر یہ بھولی بھٹکی زندگی کب تک ؟ ! ـــ" منصور کو قلق
ہوتا ۔!

"میں ملازمت کروں گی ! ـــ" سلمیٰ نے کہا۔

سیما کی نظروں میں نوید پھر گیا۔ تو ملازمت تقریب کا بہانہ
بنے گی۔؟! ـــ

"یہاں کچھ کمی تو نہیں ہے۔؟" ـــ اس نے کہا۔

آپا۔ اتنی سی خوشی بھی تمہیں سزاوار نہیں ؟ ـــ" سلمیٰ کا لہجہ
تلخ تھا ؟!

"بیٹی ـــ ماں جائی ـــ !" خالہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"ماں جائی ؟ ـــ" نجانے کب کا رکا ہوا لاوا سلمیٰ کے دل میں
پھوٹ پڑا۔ "میں نہیں جانتی کون کس کی بہن ہے۔ محبت کی بھوکی پیار
کی متلاشی مجبور لڑکی جسے کسی نے خلوص نہیں دیا۔ اور نہ خلوص کا ڈھونگ
رچایا۔ باپ کے مرنے کے بعد اماں نے دور کر دیا۔ منصور بھائی ! بڑے
بھیا کی موت کی نحوست مجھ سے منسوب کی گئی۔ آپا نے کبھی پیار نہیں
کیا۔ میں اگر سرکش رہی تھی۔ بد مزاج تھی تو مجھے سنبھالا جاتا۔ سدھارا
جاتا۔ دور کیوں کیا تھا ؟۔ میں آج سب سے دور ہوں۔ اس بھری
دنیا میں کوئی دل نہیں جس میں میری جگہ ہو۔ کوئی آنکھ نہیں۔ جو میرے
لئے بھیگ سکے۔ ! کوئی ہاتھ نہیں جو مجھے گرتے سے اٹھا سکے۔"

"میں بھی نہیں ! ؟ " سیما کی کھوکھلی آواز میں سارے جہاں
کا کرب سمٹ آیا۔

آپا۔ تمہیں اماں کی محبت ملی تھی۔ تم سرشار تھیں " سلمیٰ نے
کہا۔ "مگر میں محرومیوں کا سرمایہ لئے تم سب سے دور ہوگئی۔ محبت
کی کمی نے مجھ میں نفرت بھر دی۔ جب کوئی میرا نہیں تھا تو میں بھی کسی
کی نہ ہو سکی۔"

"تم سب کی ہو سلمیٰ۔ سب تمہارے ہیں " ! منصور اس کے
لڑکپن پر ہنسنے لگا۔ " محبت کو پہچاننا سیکھو ! "

" اماں کے ساتھ میں نہ مرگئی ؟ " بہت دنوں بعد وہ جی بھر
کے روئی

" میری شادی پر تم نہ آئیں۔ رخصتی ہوئی تم باہر نہ نکلیں۔ اور
خالہ کو تم نے تھپڑ تک مار دیا تھا !ـ" سیما بولی۔

"نہیں ـــ !" منصور نے حیرت سے کہا۔

" اے بیٹی ـــ کہاں کا قصہ نکال بیٹھیں !" خالہ شرمندہ ہو
گئیں ـــ ! اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کے تھپڑ بہت کھا چکی ہوں
کیا میں بدلہ لینے بیٹھوں گی۔ میں بھی ماں ہوں۔ تو بھی ماں ہے ۔
اب سب کچھ بھول جا۔"

" خالہ بی ـــ !" یکایک سلمیٰ ان کے شانے سے لگ گئی " بھول
جائیے سچ مچ بھول جائیے !ـ"

" پگلی۔ کہیں کی !ـ" خالہ بی ہنس پڑیں۔

" آپا . . . . پتہ نہیں کب اماں کی طرح میں بھی ختم ہو جاؤں
آپ مجھے معاف کر دیجئے !" اس نے کہا۔

" معاف کرنے سے زخم تو نہ بھر جائیں گے ـــ !" سیما بڑی
دل آزاری سے ہنسی۔

منصور سخت ناراض تھا۔ اب تو اسے ساری خطا سیما کی
ہی لگ رہی تھی ! اب ایسا بھی کیا عناد ؟ وہ چپکے چپکے نوید سے
نسبت پکی کر رہا تھا۔ وہ بہت شریف آدمی ثابت ہوا تھا۔ لیکن سیما
نے ہوں ہاں کچھ نہ کہا ؟ ایک بھیانک خاموشی کر رہ گئی تھی۔

"اب تو کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ ۔" منصور کہتا ۔

"اچھا ! ۔۔" جیسے غار کے دہانے سے آواز نکلتی

اُف ۔۔ آپا کا دل ۔ ۔ پتھر ہے پتھر" سلمیٰ سوچتی اور الجھتی اسے اپنا وجود کھلنے لگتا ! ۔۔ یہ کیا ہے زندگی ؛ دوسروں کے رحم و کرم پر ۔ محتاج ۔ مجبور ۔۔ بے بس . . . .

خالہ بی نے بہت سمجھایا ۔ تھک ہار کر خود ہی جہیز سینے بیٹھ گئیں ۔

"دل میں بات رکھنا بہت بُرا ہے" وہ بڑبڑاتی رہ گئیں "پتھر بن کر رہ گئی ہے ۔ جانتی ہے کہ ماں کے بعد بے بس ہو کر تیرے گھر میں آ کر پڑی ہے ۔ جیسے تو نے بیاہ کے بعد میکے میں جھانکنے کی قسم کھا رکھی ہے ۔ دیکھو بھیّو کہ وہ بھی اپنے گھر سے تیرے اچھے بُرے میں نہ آوے گی"

"خالہ بی . . . . خالہ بی . . میں بھی تو مجبور رہوں ! ۔۔"

سیا نے کہا ۔

"اچھی مجبوری ہے ۔۔ میاں لاکھوں کا کاروبار کرتا ہے ۔ کوٹھی ہے ۔ موٹر ہے ۔ درجنوں نوکر ہیں ۔ کنکر پتھر کی طرح روپئے پھینکتی ہے ۔ یہی مجبوری ہے کہ چھوٹی بہن کے بیاہ پر دل میں کھوٹ آوے ہے ۔ اور کیا ۔ اگر آج کے دن وہ جنتی بیوی زندہ ہوتیں تو یہ رنگ ڈھنگ دیکھ دیکھ کر کلیجہ پھٹ جاتا ان کا ۔ اچھا ہوا ۔ پاک بے نیاز نے یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی پردہ ڈھک دیا ۔۔"

"بس خالہ بی ۔۔ ان سے کچھ نہ کہئے ۔ میں کر تو رہا ہوں !"

منصور کو غصہ آ گیا ۔

سیا کی شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی ! ۔۔۔۔

اسے خیال آیا ۔۔ کیا کچھ لے کر وہ سسرال آئی تھی ۔ کیا سلمیٰ ایک لاوارث لڑکی کی طرح سسرال جائے گی ۔ ؟ ! وہ میری بہن ہے ۔ چاہے زبان سے شکوہ نہ کرے ۔ مگر دل میں کیا سوچے گی ۔ ؟ ! ۔"

چپ چاپ اس نے تجوری کھولی ۔ اور بڑے نوٹوں کی گڈیاں اوپر تلے بھری دیکھ کر اس کی سانسیں پھولنے لگیں ۔۔ ! اس کی نظریں کمرے میں اور کمرے سے باہر دالانوں میں گھومیں ۔ قیمتی صوفہ سیٹ ، اسپرنگ کے آرام دہ پلنگ اور فولڈنگ کرسیاں جگہ جگہ بکھری تھیں ۔ اس کے ہاتھ جھکے ہوئے شیشوں سے مزین الماریوں پر ٹکے اور ایک جھٹکے سے اس نے پٹ کھولے ۔ مرصع ملبوسات کی قطاریں سجی ہوئی تھیں ۔۔ ؟ !"

یتیم و بیسر سلمیٰ . . . . . اس کے دل میں ہوا سنسنے لگی

نہیں نہیں . . . . میں اب سب کچھ اُسے دوں گی ۔۔ اپنے ہاتھ سے ۔۔۔ وہ میری طرح زندہ جنازہ بن کر نہیں اُٹھے گی ۔ دلہن بن کر سسرال سدھارے گی ۔ ؟"

اس کی ماں میں ہوں ۔۔

اور سیا کے لبوں پر تلخ تبسم مامتا بھری مسکراہٹ میں بدل گیا ۔

خالہ بی دالان میں بیٹھی سُرخ دوشالہ پہ کرن ٹانک رہی تھیں ۔ اور آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھیں ؂

پی کے گھر آج پیاری دلہنیا چلی

سیا کو دیکھ کر وہ مسکرائیں اور ہاتھ روک لئے ۔ !

"خالہ بی ۔۔ میں ٹانک دوں . . . . . ! آپ تھک گئی ہیں"

سیا بھی ساتھ میں مُسکرائی ۔

"سچ مچ بیٹی ؟" ۔ وہ پھول کی طرح کھل اُٹھیں

"ہاں خالہ بی . . . . مگر مجھے اتنا بتا دیجئے قسم توڑنے کا کفارہ کیا ہوتا ہے ۔ ؟ !"

خالہ بی سوچ میں پڑ گئیں ۔ اتنے میں سلمیٰ کسی کام سے کمرے میں آئی ! ۔ اور اپنا جواب سُننے سے پہلے ہی سیا نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی آغوش میں گرا لیا ۔

"کفارہ شاید یہی ہے : ۔۔

خالہ بی پوپلے منہ سے ہنس پڑیں ! ! "

☆

پانی کا کاروبار

زکی انور

> اِس وقت رپورٹ کا بھوت تھکا تھکا سا تھا اور ذہن میں پریوں کا رقص ہو رہا تھا سیٹھ کی لڑکی کا دیدار پہلے دن ہو چکا تھا۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ اسے پڑھانے کا تصور یقیناً بے ہوش کر دینے والا تھا۔ لیکن۔

صرف سیٹھ یا صرف کھونٹی والا کہہ کر بھی کسی کو پکارا جا سکتا ہے یعنی سیٹھ یا کھونٹی والا بھی نام ہو سکتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے چاول گیہوں۔ گڑ۔ بناسپتی۔ سیاہ مرچ۔ دوائیں اور سائیکل کی ٹیوب وغیرہ کی ذخیرہ اندوزی کے علاوہ اس نے انسانی ناموں کا بھی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ اور اس کا پورا نام تھا سیٹھ بھگت رام بھگوان داس کھونٹی والا

وہ اب کھونٹی والا تو سرے سے نہیں تھا اس کے دادا

پردادا کھونٹی بیچتے ہوں تو یہ الگ بات ہے

بھگت رام اور بھگوان داس میں سے وہ بھگت رام تھا

یا بھگوان داس اس کا سراغ لگانا کچھ آسان کام نہیں۔

ہاں وہ سیٹھ بہر حال تھا۔ لہٰذا پورے نام کی الجھن سے بچنے کے لئے لوگ اسے سیٹھ جی یا سیٹھ صاحب۔ یا پھر بڑے پیار سے سیٹھو صرف سیٹھ کہا کرتے تھے۔ یا پھر اسکے بعض خوشامدی ملازم اسے نگر سیٹھ کہہ کر پھسلا دیا کرتے تھے

ملازموں میں سے کچھ باس، کچھ مالک اور کچھ سرکار کہتے تھے۔

میں اس کے ہاں کی ملازمت بڑی مشکل اور دوڑ دھوپ کے بعد کمرشیل ٹیکسز کے ایک افسر کو پچاسی روپے رشوت دے کر حاصل کی تھی۔ ریٹ تو اس افسر کا پورے سو تھا اور اسی اعتبار سے بھائی جان نے مجھے سو روپے عنایت بھی کئے تھے۔ لیکن میں نے اپنی چرب زبانی سے ایک دوسرے کمرشیل ٹیکسز کے افسر کی بہت زیادہ شکایت کر کے اسے لوٹ لیا تھا۔ اور پچاس روپے سے چل کر پچاسی میں بات پکی کر لی تھی۔ اور پندرہ روپے میں نے بچا لئے تھے۔ لیکن اب ان پندرہ کے اخراجات کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں محسوس نہیں کرتا۔ کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ سیٹھ بھگت رام بھگوان داس کھونٹی والا کی فرم میں میری ملازمت بہت قیمتی اور اہم تھی۔ چاول کی قیمت کچھ اس انداز سے بڑھتی جا رہی تھی کہ ہم مذاق میں سوچتے تھے کہ وہ دن دور نہیں جب چاول کے دانے درجن کے بھاؤ سے بکنے لگیں گے۔ ایک آخری سہارا تھا اس امید کا کہ انتخاب میں اگر کانگریسیوں کا پتہ کٹ گیا تو یقیناً گرانی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ کانگریس کے علاوہ باقی تمام جماعت والے ذخیرہ اندوزوں کے گھر میں گھس گھس کر چاول اور گیہوں اور دوسری چیزیں باہر نکال لائیں گے۔ اور بے شک ساری جماعت والوں نے اپنی انتخابی تقریروں میں یہ وعدہ بھی کیا تھا پھر کیا ہوا ؟ اس کا مجھے علم نہیں۔ کیونکہ سیاست سے میری دلچسپی صرف اتنی ہے کہ اب میں تقریباً ساری جماعتوں کے پرچم پہچاننے لگا ہوں۔ یا پھر اتنی دلچسپی کہ میں ووٹ دے آیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ کانگریسیوں کا پتہ سچ مچ کٹ گیا۔ اور غیر کانگریسی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن چاول اور گیہوں وغیرہ کا بھاؤ اور بھی بڑھنے لگا ..... اور بھی بڑھتا گیا ... ... اور بھی ..... اور جس دن سے بھائی جان نے مجھے اپنے ایک دوست سے قرض لے کر کمرشیل ٹیکسز کے افسر کو دینے کے لئے سو روپے

دیئے تھے اس دن وہ بھابی جان سے خانہ داری کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اپنی آنکھیں پونچھنے لگے تھے اور پھر بھابی جان کے پاس سے اٹھ گئے تھے اور کافی دیر تک اپنی میز پر کی ہچکولتی میز پر ماہانہ خرچ کا بجٹ بناتے رہے تھے

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دوسری ملازمتوں کی طرح سیٹھ بھگت رام بھگوان داس کھونٹی والا کے فرم کی ملازمت ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے سیٹھ اپنے گھر بھاڑ و لگانے کا ہی حکم کیوں نہ دے۔ کتنی خراب بات تھی کہ اکیلے بھائی جان کمانے والے تھے اور ہم سب دس آدمی کھانے والے کم سے کم مجھے تو ان کا ہاتھ بٹانا ہی چاہیئے تھا میں ہٹا کٹا تھا۔ تندرست تھا اور بی اے کا امتحان دے چکا تھا۔

ایسی کہانیاں آپ نے بھی سنی ہوں گی۔ میں نے بھی اسی قسم کی کہانی مختلف پلاٹوں کے ساتھ سنی ہیں۔ کہ ایک آدمی صرف چھ پیسے لیکر گھر سے نکلا تھا کلکتہ۔ بمبئی۔ بنارس یا دلّی یا پھر ٹرین میں اس کی ملاقات کسی لاولد سیٹھ سے ہو جاتی ہے۔ وہ اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیتا ہے اور پھر اس کی ایمانداری سے خوش ہو کر اسے کبھی نصف اور کبھی ساری جائداد کا مالک بنا دیتا ہے۔ کبھی یہی پلاٹ کچھ یوں ہوتا ہے کہ سیٹھ اولاد نرینہ سے محروم ہوتا ہے اور اس کی ایک نہایت ہی حسین وجمیل بیٹی ہوتی ہے اور مرتے وقت سیٹھ اپنی بیٹی کو پاس بلا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلاتے رہنے کے بعد جلدی سے اپنے چہیتے ملازم کے ہاتھ میں ڈال دیتا ہے اور مر جاتا ہے

سیٹھ بھگت رام بھگوانداس لاولد تھے اور نہ اولاد نرینہ سے محروم۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ اور چار بیٹیاں تھیں لہٰذا نصف یا ساری دولت حاصل کر لینے کا تو خیال ہی فضول تھا۔ البتہ ملازمت میں استحکام کے لئے میں اپنے آپ کو اس کے گڈ بک میں داخل کرنے کی ہر وقت فکر کرتا رہتا تھا۔

چنانچہ ملازمت کے تیسرے ہی دن میں نے اسے "یور ایکسی لینسی" کہہ کر مخاطب کیا۔ اسے انگریزی کی بھی شُد بُد تھی۔ لہٰذا بہت خوش ہوا اور بولا۔

"جوان لڑکے ہو تم۔ میرے ہاں کے کام میں تو دن رات برابر ہے فرصت فُرصت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن میں تمہیں شام

اشتہار

کے چھ بجے چھٹی دے دیا کروں گا۔ لیکن ایک شرط پر"

"حکم ہو بندہ پرور" میں نے طبرکا کے کالج میں چند ہی روز پہلے کھیلے گئے ایک ڈرامے کے مکالموں کا سہارا لیا۔" اگر عالم پناہ کا حکم ہو کہ میں آسمان کے ستارے زمین میں بچھا دوں تو بندۂ ناچیز اپنی دھن میں ضرور لگ جائے گا۔ رہی فتح یا شکست تو یہ تو ـــ یور ایکسی لینسی! دراصل نصیبوں کی بات ہے۔ یہ ارمان اپنے دل میں ہرگز نہ رہنے دو گا کہ دل ناتواں نے مقابلہ ہی نہیں کیا۔۔۔۔۔ کون سی شرط ہے جہاں پناہ ارشاد ہو!"

"شرط یہ ہے کہ چھ بجے سے نو بجے تک تم میری لڑکی کو انگریزی پڑھا دیا کرو!"

"چشم ما روشن دلِ ما شاد" میں جھک کر کورنش بجا لایا۔" میں ابھی درِ دولت کو روانہ ۔۔۔۔۔۔۔"

"نہیں"۔ اس نے میری بات کاٹ کر کہا "ابھی تو وہ اسکول میں ہوگی۔ چھ بجے سے نو بجے تک"

"بہت خوب بندہ پرور" میں نے جواب دیا۔ اور ایک بار پھر کورنش بجا کر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ جہاں میں انکم ٹیکس کو بھیجا جانے والا گوشوارہ پر کرنے کے سلسلے میں یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کو جعل سازی کیا جائے اور کیسے۔ اس قسم کے کاموں کے لئے جو منشی تھا وہ اپنے کام میں بڑا ہوشیار تھا۔ مگر وہ چھٹی پر تھا۔ دوسرے کلرک اور اکاؤنٹنٹ وغیرہ دقت دینے پر رضامند نہیں تھے۔ اور جہاں تک خود اپنی عقل سے بنانے کی بات تھی عقل بالکل کام ہی نہیں کر رہی تھی۔ اور اپنی تمام تر چرب زبانی خوشامد چاپلوسی اور ٹیبر تک کے باوجود وہ رپورٹ اس قدر ہولناک تھی کہ ہر وقت مجھے اپنی برطرفی کا پروانہ نظر آتی تھی۔

لیکن اس وقت رپورٹ کا بھوت تھکا تھکا سا تھا اور ذہن میں پریوں کا رقص ہو رہا تھا سیٹھ کی اس لڑکی کا دیدار پہلے ہی دن ہو چکا تھا جو تیم ملنے کے زنانہ اسکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی بلا کی حسین تھی وہ اور اسے پڑھانے کا تصور یقیناً بے ہوش کر دینے والا تھا۔ لیکن فلک کج رفتار نے مجھے کچھ زیادہ دیر تک بے ہوش و مدہوش نہیں رہنے دیا۔ یہ فلک کج رفتار دراصل فرم کا وہ بوڑھا ایپل ادریان

تھا جو کمرے کبڑا تھا۔ لنگڑا تھا۔ اور جس کا وزن گرام میں کہنا زیادہ مناسب تھا۔ لیکن ہم اسے بہادر کہنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ وہ نیپالی تھا۔

البتہ میں نے اس کی جھکی ہوئی کمر اور لنگڑی چال کی مناسبت سے اس کا نام فلک کج رفتار رکھ دیا تھا اور اس کا یہ نام اردو داں کارندوں کے علاوہ بڑے منشی اور مطلب سمجھ لینے کے بعد نوجوان حلیم حکم چند کو بھی پسند آیا تھا۔ اور انھوں نے بتایا تھا کہ بے شک یہی کم بخت کسی کی تنخواہ کٹ جانے، کسی کی چھٹی نامنظور ہونے اور کسی کی برطرفی کا پروانہ لیکر آیا کرتا ہے۔

ہز ایکسلینسی نے پھر بلایا تھا۔ میں فلک کج رفتار کے پیچھے پیچھے چل پڑا

سیٹھ نے پوچھا

" انکم ٹیکس والی رپورٹ بن گئی ؟"

یک لخت میرے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ لیکن جب میں اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ نہایت تیزی سے کہنے لگا

جی ہاں بندہ پرور۔ اس وقت یور ایکسلینسی نے بلوا لیا تھا نہیں تو کام کافی آگے بڑھ گیا ہوتا۔ جہاں پناہ بات کچھ ایسی ہے کہ .... دیکھئے نا......"

"میں جانتا ہوں" وہ بولا "اس کام میں تمہیں دقت ہوگی مارو گولی مکرجی چھٹی سے واپس آکر بنائے گا۔

" لیکن جہاں پناہ" میں نے نرم اور سیٹھ سے انتہائی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اس رپورٹ کے لئے بہت کم وقت رہ گیا ہے غالباً پندرہ کو سب مٹ کرنا ہے اور آج گیارہ ہو گئی۔ مکرجی بابو غالباً سولہ تک چھٹی پہ ہیں.... لیٹ ہو جائے گی۔ تو بڑا غضب ہوگا۔ یہ انکم ٹیکس والے......"

رفتہ رفتہ تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ وہ زور سے ہنس پڑا

"تم نے وقت خریدتے اور بیچتے سنا ہے؟ بیچنے والے وقت بھی بیچتے ہیں اور ہم وقت خریدتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو!"

تو میرا کام ؟" میں نے کچھ اس انداز سے پوچھا جیسے میں بڑا مستعد ہوں، اور بے کار رہنا نہیں چاہتا۔ " میں کیا کروں گا!"

"تمہیں میں بڑے آرام کا کام دے رہا ہوں۔ اس نے کہا۔

" بہت اچھا کام "۔

" شاید راج کماری جی کو پڑھانا" میں نے ہنس کر پوچھا اور ذہن کی وہ پریاں جو اپنی پائل کھول رہی تھیں پھر ناچنے لگیں

" راج کماری کون ؟" اس نے پوچھا۔

" میں نوکر ہوں" میں کہنے لگا۔ اور یور ایکسلینسی آقا ٹھہرے میں اپنے آقا کی بیٹی کا نام کیسے لے سکتا ہوں!"

" اوہو ہو ہو" وہ ہنس پڑا پھر بولا۔ "نہیں جی پڑھائی لکھائی کو بھی گولی مارو!"

اور میں چونک اٹھا۔ اور ذہن کی ساری پریاں انتہائی بیدردی سے اپنی پائل کھولنے لگیں اور جب وہ رخصت ہو گئیں تو میرے منہ سے بمشکل صرف ایک لفظ کیوں نکل سکا جس کے جواب میں ہز ایکسلینسی کافی دیر تک تعلیم نسواں کی خرابیوں کے بارے میں تقریر کرتے رہے اور جب وہ خاموش ہوئے تو میری باری آئی اور میں تعلیم نسواں کی خوبیوں پر روشنی ڈالتا رہا۔ لیکن اس کم بخت کو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اور فیصلہ کن انداز میں اس نے کہا۔

"بکواس "

میں نے بکواس بند کر دی۔

مجھے جو دوسرا کام سونپا گیا۔ وہ سچ مچ آرام دہ تھا۔

شہر کے کچھ علاقوں میں واٹر سپلائی کا انتظام نہیں تھا جب کہ وہاں کے کنوئیں اپریل سے خشک ہونا شروع ہو جاتے تھے اور اپریل کے وسط تک چند ہی کنوئیں اس قابل رہتے تھے جو مہینہ میں ایک بار نہانے والوں کے نہانے کے لئے مئی تک کام آسکتے تھے۔ مئی کے بعد سارے کے سارے کنوئیں سوکھ جاتے تھے۔ صرف اللہ کا نام باقی رہ جاتا تھا۔ لوگ پانچ میل سے پانی لاتے تھے یا کافی مزدوری دے کر منگواتے تھے۔

سیٹھ بھگت رام بھگوانداس نے شہر کے اکثر علاقوں میں درجنوں چھوٹے چھوٹے فلیٹ بنا رکھے تھے۔ ان فلیٹوں سے کرایہ کی آمدنی تو تھی ہی اب کے جنوری میں سیٹھ نے کیا یہ کہ شہر کے خشک علاقوں

کے ہر ایک فلیٹ میں کافی گہرائی تک بورنگ کروا کر ہاتھ سے چلائے جانے والے ٹیوب ویل لگوا دیئے اور یک لخت سیٹھ نے اپنے فلیٹوں کے کرائے میں کہیں پچیس اور کہیں تیس روپے کا اضافہ کر دیا اور کرایہ داروں نے پانی کی تکلیف سے بچنے کے لئے یہ اضافہ خوشی خوشی قبول کر لیا

لیکن ٹیوب ویل بنوانے کا جو اصل راز تھا اس سے صرف مجھے آگاہ کیا گیا۔ کیونکہ محض دو تین دنوں میں ہی میں یقیناً اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ اگر سیٹھ لاولد ہوتا تو مجھے اپنی ساری دولت کا مالک بنا دیتا۔ اور اگر اس کے صرف ایک بیٹی ہوتی تو جن سنگھ کے انتخابی فنڈ میں تین ہزار ایک روپیہ چندہ دینے کے باوجود اس سے میری شادی کر دیتا

"غلام آباد مسلمانوں کا علاقہ ہے۔" وہ مجھے میرا کام سمجھانے لگا "پانی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور غلام آباد کے لوگ پانی پانی ہو رہے ہیں۔"

موقع بہت اچھا تھا اور میں نے اتنی زور سے سبحان اللہ کہا جیسے میں نے نعرہ لگایا ہو۔ اور پھر اس کی انشا پردازی اور زبان دانی کی مدح سرائی میں میں نے جو زبان درازی شروع کی تو مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں نے کون کون سے نام مشاہیر انشا پرداز کے طور پر لے ڈالے تھے۔ غرض کوئی ایسا نام میرے ذہن میں نہیں بچا جسے میں نے اپنے وقت کا بہترین ادیب۔ شاعر یا انشا پرداز اور زباں داں نہ کہا ہو اور جسے میں نے سیٹھ بھگت رام بھگوانداس کے نزدیک طفل مکتب نہ ثابت کیا ہو۔

لیکن کم بخت نے داس کو ڈی گاماکا نام یقیناً سن رکھا تھا۔ چنانچہ جب میں داس کو ڈی گاماکا ادبیت میں ڈوبا ہوا ایک بہت ہی مشکل شعر پڑھ رہا تھا اور ابھی میں دوسرے مصرعے کے ہزاروں سچ .... بھی کہہ سکا تھا کہ وہ جلدی سے بولا۔

"یہ داس کو ڈی گاما تو اپنا ہندوستانی کوی نہیں تھا جی!"

اور تب میں نے اسے بتایا کہ ایک داس کو ڈی گاما ہندوستان میں بھی تھا جو مشہور پہلوان گاماکا دادا اور اپنے وقت کا بہت بڑا ساہتیکار اور کوی تھا۔ اپنی بات کو اور بھی زیادہ سچ ثابت کرنے کے لئے اور اپنی علمی معلومات کی دھونس جمانے کے لئے میں نے اس سے کہا۔

"مثلاً نیوٹن — یہ ایک مشہور ولایتی سائنس داں لیکن ہمارے ہاں بھی ایک نیوٹن تھا جو اورنگ زیب کے دربار میں درباری تھا اور اپنے زمانے کا استاد شاعر تھا.... چانکیہ نے اپنی کتاب میں ہندوستانی نیوٹن کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کا نام نوتن لکھا ہے چنانچہ قلم سشاد نوتن نے چانکیہ خاندان کے آخری تاجدار ابن بطوطہ پر بمبئی ہائیکورٹ میں دعویٰ بھی دائر کیا تھا۔ پتہ نہیں پھر کیا ہوا... غرض یہ پوائنٹ لینی کہ اگر آپ اپنا بزنس تج دیں اور کتابیں لکھنے لگیں تو ہزاروں روپے سالانہ آپ کو رائیلٹی ملے... سبحان اللہ سبحان اللہ.... کیا زبان دانی ہے.... کیا بندش ہے.... پانی کے بغیر پانی پانی.... بہ خدا ہزاروں روپے کی رائیلٹی...."

"بچے ہو تم۔" وہ ہنس پڑا۔ "نوجوان! ہزار ہزار کا بزنس بھی کوئی بزنس ہوتا ہے؟ خیر چھوڑو ان باتوں کو.... دیکھو غلام آباد میں پانچویں سڑک پر ساتواں فلیٹ اپنا ہے وہ خالی ہے۔ تم اپنا ڈیرہ ڈنڈا وہیں جما لو جب کرایہ دار آئے گا۔ دیکھا جائے گا"

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"وہاں۔" وہ سمجھا کر کہنے لگا۔ تم ایک کام کرنا... تم مسلمان ہو اور وہ علاقہ مسلمانوں کا ہے۔ لوگوں سے ملو۔ سارے لوگ پانی کے بغیر پریشان ہیں۔ ان سے پانی کی قیمت کا معاملہ کر لو۔ میرا خیال ہے دس پیسے فی بالٹی لوگ آسانی سے دے دیں گے.... یا پھر جیسا مناسب دیکھنا تم تو کافی ذہین اور سمجھدار ہو۔ جو آدمی ہمارے جس فلیٹ سے پانی لینا چاہے اس فلیٹ کے کرایہ دار سے اسے ملا دو اور ہر شام کو کرایہ دار سے پیسے وصول کر لو۔ ہاں کرائے داروں کو اتنی سہولت دے دو کہ وہ اگر چاہیں تو ایک بالٹی کے بارہ پیسے بھی وصول کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں ورنہ گاہک بھڑک جائیں گے تمہارا اصل کام یہ چیک کرنا ہوگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ فلیٹ کا کوئی کرایہ دار چپ چاپ بالٹی پانی بیچے اور تمہیں قیمت کم دے..... خلاصہ یہ کہ میرے اندازے کے مطابق سات ہزار کی آبادی کے اس علاقے میں کم از کم دو سو روپے کا روزانہ پانی بک سکتا ہے..... جاؤ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی سیٹھ سے واسطہ پڑا تھا۔ جاؤ نوجوان میں

تم سے بے حد خوش ہوں اور تمہیں پونے دو سو روپے روزانہ پر ٹھیکہ
دیئے دیتا ہوں۔ یعنی جتنی بھی آمدنی ہو۔ تم صرف پونے دو سو مجھے دو گے
باقی تمہارا۔۔۔۔ اور ہاں تمہاری تنخواہ اپنی جگہ پہ ——
وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن میں اس وقت
صرف یہ سوچ رہا تھا کہ ایک اکیلے بھائی جان اور ہم دس کھانے والے
اور اس سوچ کے بعد جو دوسرا خیال میرے ذہن میں آیا وہ پچیس
روپے کا ملال تھا جو میں نے کمرشیل ٹیکسیز کے ایک افسر کو دیئے تھے
اور میرا تیسرا خیال ادھورا سا تھا۔
"اگر پانی کا ہی دھندہ قسمت میں لکھا ہے تو
.... اگر پانی کا ہی دھندہ قسمت میں لکھا ہے
.... اگر پانی کا ہی دھندہ ......"
اس سے آگے سوچ کا دروازہ بند تھا اور وہ دروازہ
میری بی اے کی اُس ڈگری سے بند تھا جو ابھی مجھے ملی نہیں تھی۔

بے شک وہ دروازہ بے حد مضبوط تھا جسے توڑنے میں
مجھے دو راتیں لگ گئیں۔ لیکن میں بہر حال دروازہ توڑ دینے میں
کامیاب ہو گیا۔
دروازے کے اس پار اصلی دنیا تھی جس میں کسی قسم کی ملاوٹ
نہیں تھی۔ اس لئے کہ وہ دنیا محنت کشوں کی دنیا تھی۔ کوئی لوہا پگھلا رہا
تھا کوئی لوہا کاٹ رہا تھا۔ کوئی رکشہ چلا رہا تھا۔ کوئی بچوں کو پڑھا
رہا تھا۔ کوئی کہانیاں لکھ رہا تھا۔ سب اپنی اپنی محنت میں مگن تھے۔
یہاں تک کہ کچھ لوگ پانی ڈھو رہے تھے۔
اور میں بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ان
میں سے کوئی بھی کسی کا نوکر نہیں تھا

اور یہ میری گیارھویں کیپ ہے
میرے پاس سائیکل کے ٹائر کی ایک گاڑی ہے جس پہ پانی
کے چھ کنستر آتے ہیں اور پوری ایک گاڑی پانی پہنچانے کی مزدوری
تیس پیسے ہے اور اس وقت میری جیب میں تین روپے آ چکے ہیں لیکن
آج میں کم سے کم بیس پھیرے کر دوں گا۔ کیونکہ مجھے بھابی اور بچوں کے
لئے مٹھائی بھی تو لے جانی ہے!
ہم سب کے لئے آج بڑی خوشی کا دن ہے۔
میں نے بی اے پاس کر لیا ہے۔

ادب

کا کام یوں بھی بڑی جانفشانی کا کام ہے۔ یہ انسانوں
کی ایسی بولتی ہوتی تاریخ ہے جس کی لپیٹ میں وقت، کلچر،
ذہن اور مذاق سب کی رنگ آمیزیاں آجاتی ہیں۔ جیسے مغربی
مبصرین نے قوموں کی روح کی خود نوشت سوانح عمری سے
تعبیر کیا ہے۔ جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ تاریخ کچھ بھی ہو لیکن اگر
اس نے انسانوں کی جذباتی اور عقلی دلچسپیوں پر روشنی نہیں ڈالی۔ اگر
اس نے حفظِ نفس اور قومی تعبیر کے ان آلات کا اظہار نہیں کیا جو قوموں
کے ارتقا اور تنزل میں لائحہ عمل بنتے رہے ہیں تو اس نے اپنا کام پورا
نہیں کیا۔ اور ان سب کی تعزیر اور محاسبہ کے لئے بغیر فن کی روشنی کے
کوئی اور راستہ نہیں۔ تنقید کی منزل اس کے بعد ہی آتی ہے۔ جب ہم واقعات
کی اصلیت اور حقیقت کو پرکھ کر اس کا جائزہ لیں گے۔ پھر محقق ایسا نہیں
کا ملا نہیں جس کی قیادت پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کیا جا سکے اور نہ اپنے شبہات
کو اتنی وسعت دی جا سکتی ہے کہ ہر قدم اور ہر منزل مشکوک نظر آنے لگے۔ اور
ہرسات کی چھان بین کے لئے عمرِ خضر بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ تحقیق کے مفہوم کو اتنا
تنگ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہر لفظ، ہر شعر اور ہر مصرعہ کے لئے محقق وقت
برباد کرتا رہے۔ اگر کسی انفرادی رجحان کے باعث کسی محقق کو اس میں
دلچسپی ہے تو وہ اسے اپنے لئے مخصوص کر سکتا ہے لیکن یہ بات
تحقیق کا مفہوم نہیں بن سکتی۔

(اسلوب احمد انصاری)

حسن اجمل مسرت

> **کمرہ ایک نسوانی جسم کی خوشبو سے لبسا ہوا تھا لیکن یہ خوشبو اس نوعیت کی تھی جس سے کمال کو ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ اچانک کمرہ کا پردہ اٹھا اور ایک سانولی سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔**

اس دن بارش کے ساتھ ساتھ طوفان بھی آیا تھا۔

اور یہ پہلا اتفاق تھا کہ کمال نے اپنے گھر جاتے ہوئے ہلکا سا خوف محسوس کیا۔ نہ معلوم اس کا بوسیدہ مکان اس طوفانی موسم کا مقابلہ کر سکے گا یا نہیں۔ بظاہر یہ امید نہیں تھی کیونکہ تناور درخت جڑ سے اکھڑ گئے تھے اور شہر کے مختلف حصوں سے پرانے مکان گرنے کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ لیکن وہ اپنے گھر سے دور رہنے کو تیار نہیں تھا۔ معلوم نہیں اس تکونے کمرے سے اسے کیا انسیت تھی کہ اسے دوسری چھت کے نیچے نیند ہی نہ آتی تھی۔ چاہے وہ کیسی ہی جگہ ہو کیسی ہی محفل ہو اگر اسے بیٹھے بیٹھے اپنے مکان کی یاد آ جاتی تو وہ کہیں نہ رک سکتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوتا۔ ”اب چلوں گا۔“

اور اس کا یہ جملہ اب اتنا زیادہ سمجھا جا چکا تھا کہ جاننے والے اس کے بعد اس سے رکنے کے لئے بالکل اصرار نہ کرتے۔ اپنے مکان سے اس کا یہ جذباتی تعلق مشہور تھا۔ ایک بار کسی دوست نے اس کے مکان پر کچھ نازیبا تبصرہ کر دیا تھا تو کئی دن تک کمال کی اس سے بول چال بند رہی تھی۔ کہنے والے نے صرف اتنا کہا تھا: ”سمجھ میں نہیں آتا یار تمہارا اس گھر میں دل کیسے لگتا ہے۔ مجھے تو تمہارا مکان قرون وسطیٰ کا کوئی قید خانہ معلوم ہوتا ہے۔ یا یوں جیسے تاریخ سے پہلے کا کوئی مہیب الجثہ جانور اپنی کمین گاہ کے باہر سر اٹھائے کھڑا ہو۔“

کہنے والے نے بہت صحیح بات کہی تھی۔ اس کے مکان کی ہیئت واقعی خاصی ہیبت ناک تھی۔ تین منزلوں پر مشتمل وہ عمارت جس کی دوسری منزل کا ایک تکونا سا کمرہ اس کا مکان تھا۔ شاید اب سے سو سال پہلے تعمیر ہوئی تھی۔ اور تعمیر کرنے والوں نے شاید کبھی اس کی مرمت کی طرف توجہ نہیں دی تھی اور اب عالم یہ تھا کہ دیواروں کا پلاسٹر ادھڑ چکا تھا۔ ستون کھوکھلے ہو چکے تھے اور چھجے اپنے مکینوں کا بوجھ سہارتے سہارتے اتنے زیادہ جھک چکے تھے جیسے کسی بھی لمحہ زمین پر آ رہیں گے۔ اس عمارت کی آڑی ترچھی بے رنگ دیواریں ایک دوسرے کے سہارے یوں رکی ہوئی تھیں جیسے ایک دوسری سے لپٹ کر اپنی کسمپرسی کا ماتم کر رہی ہوں۔۔۔ یہ سب درست تھا مگر پھر بھی کمال نے اپنے دوست کی بات کا اتنا برا مانا تھا۔ جیسے اس نے کمال کے مکان پر تبصرہ نہ کیا ہو اس کی ماں بہن پر عیب لگایا ہو۔ اس واقعہ کے بعد اس کے دوست آہستہ آہستہ مکان سے اس کے جذباتی لگاؤ کے احترام کرنے لگے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ آج جب بارش نے طوفانی رنگ اختیار کر لیا تھا اور پرانے مکان دھڑا دھڑ گر رہے تھے تو کسی دوست نے اسے یہ مشورہ دینے کی جسارت نہیں کی کہ وہ یہ طوفانی رات اپنے مکان میں بسر کرنے کا خطرہ مول نہ لے۔

اور آج عجیب اتفاق تھا کہ اسے خود ہی اپنے مکان میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے مکان کے سامنے ایک دکان کے سائے میں کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ اسے اندر جانا چاہئے یا نہیں۔۔۔ بارش مسلسل جاری تھی اور رہ رہ کر بجلی یوں کڑک رہی تھی جیسے قدرت اپنے طیش کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ اور اس پر سے طوفانی ہوا۔۔۔ جیسے پوری کائنات اپنی زندگی

کے لئے ایک کربناک جد وجہد میں مبتلا ہو۔ اور اس طوفانی موسم میں اس کا مکان یوں لرزتا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بے سہارا بچہ کسی خوفناک منظر سے بار بار دہل اٹھتا ہو۔ اور جب کبھی طوفانی ہوا کا جھکڑ آتا تو مکان کے چوبی زینے یوں چرچرانے لگتے جیسے تاریخ سے پہلے کے کسی مہیب الجثہ جانور نے جانکنی کے عالم میں اپنے جبڑے پھیلا دیئے ہوں اور اس پر بجلی کی کڑک ایسی معلوم ہوتی جیسے وہ اس عفریت کی آخری کراہ ہو

کمال کو اس عفریت سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ وہ دنیا میں اکیلا تھا۔ اور اس بھری دنیا میں ایک تکونے کمرے پر مشتمل وہ مکان ہی ایک ایسی چیز تھی جسے وہ اپنا کہہ سکتا تھا۔ اور شاید اس لئے اس کی ساری محبت ساری اپنائیت کا مرکز وہ مکان تھا اور اسی لئے اس مکان کے سلسلے میں اس کے جذبات بالکل وہی تھے جو سفید بالوں اور دھندلی نگاہوں والی ماں کے لئے ایک بچے کے ہو سکتے ہیں۔ اور اس وقت وہ اپنی اس بے زبان ماں کی آغوش میں سما جانے کو بیتاب تھا مگر یہ طوفانی بارش ــــــ

اور پھر اس نے دیکھا نیچے والی منزل کے کئی خاندان ایک ایک کر کے اس طوفانی بارش میں گھر چھوڑ کر کسی دوسری پناہ گاہ کی تلاش میں نکل گئے۔ دور کہیں دھم سے ایک درخت گرا اور اس کی شاخیں دیر تک چرچرا کر ٹوٹتی رہیں اور پھر اتنی زور سے بجلی کڑکی جیسے اپنی اس نئی فتح پر قہقہہ لگا رہی ہو اور اس منظر نے اس کی رہی سہی ہمت بھی چھین لی۔

اب اس کے سامنے رات بسر کرنے کا مسئلہ تھا۔ وہ ایک رات کے لئے عابدہ کے گھر بھی رک سکتا تھا احمد بھی اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ اور پھر سلیم تو بخوشی اس کو روکے گا۔ اور اس طرح ناموں کا ایک سلسلہ اس کے ذہن میں آتا چلا گیا۔ اور یہ نام ان تمام متمول عزیزوں اور دوستوں کے تھے۔ جو اس کی قدر کرتے تھے۔ لیکن جن سے ملتے ہوئے کمال کو ہمیشہ ایک واضح بُعد محسوس ہوا کرتا تھا۔ ایک ایسا فاصلہ جسے دودھ کی نہر بھی پاٹ نہیں سکتی تھی۔ اور وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کس کے گھر کو آزمانا چاہیئے۔

وہ دوکان کے سائے سے کھلی سڑک پر نکل آیا۔ اور اس کا لباس جو بوچھار کی وجہ سے پہلے ہی بھیگ چکا تھا اب بارش سے پل جھپکنے میں اس کے جسم سے چپک گیا۔ بارش بڑی شدت سے ہو رہی تھی۔ اتنی شدت سے کہ بوندوں کے تواتر سے اسے سانس لینے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سنسان سڑک پر بارش میں بھیگتا ہوا ایک سمت میں چلتا رہا یہاں تک کہ ایک موڑ پر اسے احساس ہوا کہ وہ عابدہ کے گھر کے سامنے پہونچ چکا ہے

عابدہ نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا۔

"کمال بھائی آپ؟" اس نے بھرپور حیرت سے کہا۔ پھر فوراً لہجہ بدلتے ہوئے بولی "شاید مجھے بارش کا احسان مند ہونا چاہیئے کہ اس بہانے سہی آپ آئے تو"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے" اس نے کہا "اور لوگ کہاں ہیں۔؟"

"سب اندر ہیں" اس نے کہا "ٹھہریئے۔ میں آپ کے لئے تولیہ لے آؤں۔ آپ کا لباس بالکل تر ہے۔"

اور پھر اس نے موٹے موٹے روئیں والی تولیہ سے جسم خشک کرتے ہوئے عابدہ کی طرف چور نظروں سے دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود اس کے جسم کا کنوارا پن اور اس کے لہجے کی کھنک برقرار تھی اس کا وجود اب بھی اس کنواری مہک سے بسا ہوا ہے جس کا ہلکا سا احساس اس کے ذہن میں اب تک محفوظ تھا

پھر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا۔ اور ماچس کی تلاش میں جیبیں ٹٹولنے لگا۔ عابدہ نے ایک سمت سے لائٹر اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ابھی تک ماچس بھول آنے کی عادت باقی ہے" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

کمال نے جواب نہیں دیا۔ صرف خاموشی سے سگریٹ سلگایا اور لائٹر عابدہ کی طرف بڑھا دیا۔ اور جب عابدہ لائٹر لینے کے لئے اس کی طرف بڑھی تو اس نے پوری شدت سے پھر اس مہک کے جھونکے کو محسوس کیا جس کے خلاف اسکی تنہائیوں میں ابھی تک جنگ جاری تھی۔

عابدہ کے جسم میں ایک ایسی مہک تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ دنیا کی کوئی خوشبو' کوئی عطر اتنا لطیف اتنا دائمی نہیں ہو سکتا جتنی وہ مہک تھی جو قدرت نے اس کے وجود میں بسا دی تھی۔ ایک مخصوص سی نسوانی مہک جیسے پھولوں کا رس' مٹی کا سوندھا پن اور دودھ کا عطر ایک دوسرے میں گھل مل کر خوشبو بن گئے ہوں۔ ایک ایسی خوشبو جس میں ایک آسودگی گھلی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک پیار رچا ہوا ہوتا ہے ایک گھریلو پن بسا ہوا ہوتا ہے ہو سکتا ہے یہ محض اس کا خیال ہو۔ مگر وہ اس مہک کا شدت سے قائل تھا اس کے نزدیک ہر نسوانی جسم کی ایک مخصوص خوشبو تھی۔ بالکل منفرد اور ایک

دوسرے سے بالکل مختلف۔ اور مختلف جسموں کو محض مہک سے اسی طرح پہچان سکتا تھا جس طرح چہرے کی بناوٹ یا آواز کے فرق سے کسی کو پہچانا جاتا ہے۔ اور عابدہ کے وجود کی مہک ہر مہک سے الگ تھی۔ ہر خوشبو سے جدا تھی۔ اور اس نے اس وقت اس مہک کو اس شدت سے محسوس کیا تھا جیسے کوئی بھولی ہوئی سہانی بات یکایک یاد آجاتی ہے۔

پھر گھر کے اور لوگ بھی باہر کمرے میں آگئے۔ خالہ امی۔ اختر۔ عابدہ کے دو ننھے منے آنکھیں ملتے ہوئے بچے۔ اور پھر ان سب کے بعد عابدہ چائے کی ٹرے لئے ہوئے اس انداز سے کمرے میں آئی جیسے چائے اس نے پہلے سے تیار کر رکھی ہو خالہ امی نے اسے بہت اپنائیت سے اس کی بے راہ روی پر ڈانٹا۔ مدتوں شکل نہ دکھلانے کا شکوہ کیا۔ عابدہ نے بچوں سے اسے سلام کروایا اور اختر نے بڑے کاروباری انداز میں اس سے مصافحہ کیا۔ اور یہ بات اس نے فوراً محسوس کرلی کہ اختر اس سے بے رخی سے پیش آیا تھا۔

پھر چائے کا دور چلا تو اس نے یونہی پوچھ لیا۔" اور کیا حال ہیں آپ لوگوں کے ــ عابدہ تم تو اچھی ہو؟"

اور اس جملہ پر عابدہ نے اسے یوں تڑپ کر دیکھا جیسے یہ سوال کرکے اس نے عابدہ کے دل کو ٹھیس پہنچائی ہو ــ ہاں وہ اچھی طرح تھی ــ اس کا شوہر بہت وجیہہ تھا۔ متمول تھا۔ اس کے دو پھول جیسے بچے تھے۔ اپنا گھر تھا۔ اپنی کار تھی۔ ایک چھوٹی سی دنیا تھی جو اس کے قدموں میں تھی لیکن اس دنیا میں ایک ادھورا پن تھا۔ ایک کمی تھی۔ اور کمال کو معلوم تھا کہ اس کی دنیا میں یہ ادھورا پن کس وجہ سے تھا ــــ احمق لڑکی! اس نے سوچا۔ وہ آنا سب کچھ پا جانے کے بعد بھی ایک خیالی ہیولے کے پیچھے بھاگ رہی تھی ــ

پھر مختلف موضوعات پر گفتگو چل نکلی اور کمال جو اس ارادے سے آیا تھا کہ یہ طوفانی رات عابدہ کے گھر گذارے گا اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ کوئی اس سے رک جانے کے لئے اصرار کرے۔ شاید خالہ امی ہی کو احساس ہو جائے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ عابدہ نے اسے دو ایک بار ایسی نظروں سے ضرور دیکھا۔ جیسے وہ اس کے دل کی بات سمجھ گئی ہو۔ لیکن منتظر ہو کہ اختر اس سلسلے میں پہل کرے ــــ آخر وہ اپنے دل کے چور کو کہاں لیجاتی؟

پھر تھوڑی دیر بعد اختر جماہی لے کر اٹھ کھڑا ہوا ــ

"میں معافی چاہوں گا۔" اس نے صرف اتنا کہا اور اندر چلا گیا کمال کو ایسا محسوس ہوا جیسے اسے کسی نے بھرے بازار میں رسوا کردیا ہو۔ فوراً ہی وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

" اب میں بھی چلوں گا۔"

عابدہ نے اسے معذرت خواہ نظروں سے دیکھا۔ خالہ امی نے دبی زبان سے روکا: "اس طوفان میں کہاں جاؤ گے؟" لیکن وہ نہ رک سکا۔

اب وہ پھر سڑک پر تھا اور بارش کی بوندیں اس کے جسم پر چوٹ لگاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

عابدہ کے گھر آکر اسے بے حد ذہنی کوفت ہوئی تھی۔ نہ جانے اختر کو اس سے اتنی نفرت کیوں تھی۔ اگر اسے عابدہ سے ایسی ہی محبت ہوتی جس کے آگے اختر کا کاروباری ذہن سوچ ہی نہیں سکتا تھا تو اسے عابدہ کو اپنا لینے سے کون روک سکتا تھا؟ یا اگر وہ عابدہ کو کسی وجہ سے نہیں اپنا سکا تھا تو یہ اس کا گناہ تو نہیں تھا۔ اگر وہ اتنا ہی برا ہوتا جتنا اختر نے اسے سمجھا تھا تو شاید عابدہ کسی معصوم کلی کی طرح اس کے گھر میں نہ مہک سکی ہوتی ــ وجود کی خوشبو کے پیار اور جسموں کے اتصال والی محبت میں کتنا بڑا فرق ہے یہ اختر کا کاروباری ذہن کیسے سمجھ سکتا تھا۔ اور کمال کو یہ سوچ کر خود پر بہت غصہ آیا کہ اس نے عابدہ کے گھر رات بسر کرنے کا خیال ہی کیوں کیا۔ اگر وہ کہیں ایسا کرتا تو دوسری صبح شاید عابدہ بھی اس کی طرح سڑک پر نظر آتی۔

سوچنے کا یہ انداز اس کی سمجھ میں کبھی نہ آسکا تھا۔ اور اس لئے وہ اپنے تمام عزیزوں اور دوستوں سے الگ اپنی دنیا بسائے ہوئے تھا۔ اس کی ساری محبتوں کا مرکز صرف اس کا اپنا گھر تھا۔ وہ تکونا سا نیم تاریک کمرہ جس کی سیلی سیلی سی فضا اس کے وجود کا ایک حصہ بن چکی تھی۔

مکان کا خیال آتے ہی اسے ایک بار پھر یہ سوچ کر رنجیدہ ہونا پڑا کہ وہ اپنے گھر سے دور رہنے پر مجبور تھا۔ بارش کا زور بڑھتا ہی جا رہا تھا اور رات کی تاریکی کے ساتھ ساتھ طوفان بھی خوفناک ہوتا جا رہا تھا رات گذارنے کا مسئلہ اب اور بھی شدید ہوگیا تھا۔

احمد کے گھر کافی دیر تک کال بیل بجاتے رہنے کے بعد دروازہ کھلا تو احمد سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے اس انداز سے باہر نکلا جیسے اسے زیادہ سے زیادہ یہ امید رہی ہو کہ اس طوفان میں آنے والا کوئی پاگل ہی ہو سکتا ہے

یا پھر کوئی بے خبر قسم کا انسان چھپتا رہ جانے والا۔ لیکن جب اس نے کمال کو سامنے پایا تو بوکھلا گیا

"ارے کمال تم؟ خیریت تو ہے"

"سب خیریت ہے یار۔ اندر تو آنے دو۔" کمال نے کہا اور تیزی سے کھلتے دروازے کے اندر چھلانگ لگا دی اور اس لمحہ میں کمال نے یہ بات محسوس کر لی جیسے احمد نے بے اختیارانہ طور پر اسے روکنے کی کوشش کی ہو لیکن وہ تو اچانک اندر چلا آیا تھا اور اندر آتے ہی اس نے دوسری بات جو محسوس کی وہ یہ کہ احمد کا کمرہ ایک نسوانی جسم کی خوشبو سے بسا ہوا تھا لیکن یہ خوشبو کچھ اس نوعیت کی تھی جس سے کمال کو ہمیشہ نفرت رہی تھی اور ابھی وہ اس پر غور ہی کر رہا تھا برابر ہی کمرے کا پردہ اٹھا اور ایک سانولی سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔

"احمد ڈیئر" وہ بے خیالی میں احمد سے کوئی بات کہنے والی تھی لیکن کمال کو یکلخت سامنے پاکر بوکھلا گئی اور الٹے پاؤں دوسرے کمرے میں چلی گئی

"یہ میرے آفس میں ٹائپسٹ ہیں۔ مس ڈسوزا" احمد بتانے لگا

"بیچاری بارش میں پھنس گئی ہیں۔ ذرا بارش رکے تو انہیں گھر چھوڑ آؤں گا"

اور کمال فوراً سمجھ گیا کہ آفس کی ٹائپسٹ لڑکیاں بلا وجہ احمد کے گھر نہیں آیا کرتیں۔

"اچھا بھئی پھر میں چلتا ہوں۔ کمال جانے کے لئے مڑا

"آخر کیسے آئے تھے۔ خیریت تو ہے؟" احمد نے پوچھا۔

"رات گذارنے آیا تھا تمھارے گھر"

"رات گذارنے۔۔ اوہ!"

"فکر نہ کرو اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے"

"پھر کیا کروگے؟"

"گھر واپس جاؤں گا۔"

"ایسے میں گھر واپس نہ جاؤ۔ میری رائے یہ ہے کہ۔۔" اس نے سوچ کر کہا۔ "کیوں نہ رات کسی ہوٹل میں گذار لو۔"

"ہوٹل میں۔۔! ہاں یہ خیال بھی اچھا تھا۔

پھر احمد نے جلدی جلدی اپنا ایک جوڑا نکال کر اس کے حوالے کیا اور تکیے کے نیچے سے گاڑی کی چابی نکال کر بولا

"چلو میں تمھیں ہوٹل میں چھوڑ آؤں۔"

"کیا کروگے۔ میں خود چلا جاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "یہ وقت تم مس ڈسوزا کے ساتھ بارش رکنے کا انتظار کرنے میں صرف کر سکتے ہو۔"

"گدھے ہو تم۔" احمد نے اس کی پیٹھ پر ٹھوکا دیا اور پھر لڑکی کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں بولا

"ڈارلنگ مائینڈ ڈیر اف آئی۔۔۔۔۔۔۔"

"یس یس۔ آئی کین ویٹ۔" لڑکی نے دوسرے کمرے سے جواب دیا اور احمد اسے اتنی تیز رفتاری سے ہوٹل پہنچا کر بھاگا جیسے اسے یہ ڈر ہو کہ اگر بارش رک گئی تو مس ڈسوزا کو روکنے کے لئے ایک اور طوفان اسے اپنی جیب سے خریدنا پڑے گا۔

کمال کے لئے ہوٹل میں قیام کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اسے جو کمرہ ملا وہ دوسری منزل پر تھا۔

اس نے جلدی جلدی بھیگا ہوا لباس تبدیل کیا اور بستر پر بے سدھ ہو کر گر پڑا۔ پلنگ گدیلا تھا مگر اس کے جسم کو ان گدوں پر عجیب سی بے کلی سی محسوس ہوئی۔ اسے تمام تر ظاہری شان کے باوجود وہ بستر تکلیف دہ محسوس ہونے لگا۔ ماحول کی اجنبیت نے اسے فوراً ہی کمرے سے متنفر کر دیا اور اسے بہت شدت سے اپنا گھر یاد آنے لگا۔

ہوٹل کا یہ کمرہ اس کے اپنے کمرے سے کئی گنا بڑا تھا۔ اس کی مسہری گداز تھی اور اس کی دیواریں بڑے سلیقے سے پینٹ کی گئی تھیں۔ لیکن اسے تو وہ اجنبیت کاٹنے کو دوڑ رہی تھی اور اس پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں وہ سکون کہاں تھا۔ جب وہ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹتا تو اسے اپنے جسم کو اس غیر محسوس سے گڑھے میں جاکر بہت سکون ملتا۔ جو اس کے اپنے جسم کے بوجھ سے بستر میں پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس کی پلاسٹر اکھڑی ہوئی سیلن زدہ دیواریں۔ اسے اپنی محبت سے معمور معلوم ہوتی تھیں۔ اور وہ تکونا کمرہ اسے ایک ایسی آغوش کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ جس میں اس کے لئے محبت ہی محبت اپنائیت ہی اپنائیت تھی اور ہوٹل کے اس گداز بستر میں ہم آغوشی کا وہ انداز کہاں تھا؟ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بازاری عورت سے ہم آغوش ہو رہا ہو۔ ان گدوں میں وہ گرمی بھی نہیں تھی جو اس کے برسوں

پرانے بستر میں اب تک محفوظ تھی۔ یہ اس کے اپنے جسم۔ اس کے اپنے خون کی حرارت تھی جو اس بستر میں اس کے سارے کمرے میں رچی بسی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے اس آراستہ کمرے اور اس کے اپنے کمرے میں وجود کی مہک کا فرق تھا۔ اپنائیت اور حبنبیت کا فرق تھا۔ خون کے رشتے اور روپے سے خریدے ہوئے تعلق کا بنیادی فرق تھا ۔ اور پھر خون کی وہ گرمی جو اس کے بستر میں بسی رہ گئی تھی اسے آواز دینے لگی ۔

اس نے ہوٹل کا بل ادا کیا اور پھر بھیگتا ہوا سڑکوں پر چل پڑا اور اس کا رخ سیدھا اپنے گھر کی طرف تھا۔ بالکل جیل سے بھاگے ہوئے اس قیدی کی طرح جو پناہ کی ہر ممکن کوشش کے بعد ناکام ہو کر قید خانے واپس لوٹ رہا ہو۔ اور اس بار جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو خوف کا معمولی سا احساس بھی اس کے ذہن میں باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے چرچراتی ہوئی تاریک سیڑھیاں بے دھڑک طے کیں۔ اپنے کمرے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ صرف چند لمحوں کے لئے اس کے کمرے میں روشنی نظر آئی اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ شاید وہ اپنے جسم سے بنے ہوئے گڑھے میں پہنچتے ہی بارش اور طوفان سے بے نیاز ہو کر بچوں کی طرح میٹھی نیند سو گیا تھا ۔ !

اگلی صبح طوفان تھمنے کے بعد احمد اس سے رات کے رویہ کی معافی مانگنے کے لئے ہوٹل پہنچا۔ اور اسے وہاں نہ پا کر اس کے گھر آیا لیکن اس وقت تک اس کا گھر ملبہ کا ڈھیر ہو چکا تھا۔ جس کے نیچے سے لاشیں برآمد کی جا رہی تھیں۔ کمال اپنے گھر میں سکون کی نیند سو رہا تھا۔

اصلی یا نقلی

ٹیکسی ڈرائیور نے ادب سے پوچھا" بیگم صاحب آپ کے دانت اصلی ہیں یا نقلی۔ ؟"

بیگم نے غصہ سے سوال کیا" اس قسم کا سوال پوچھنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوتی ؟ "

ٹیکسی ڈرائیور نے ادب سے جواب دیا" گستاخی معاف بیگم صاحب۔ مطلب یہ کہ سڑک آگے بہت خراب ہے آج چوتھی بار اس سڑک پر میری ٹیکسی الٹے گی۔ دانت اگر نقلی ہیں تو نکال لیجئے تاکہ ٹوٹنے نہ پائیں۔"

جنون کی موت ـ صفحہ ۱۱۱ کا بقیہ

کر گئی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی، وہ بھاگتا رہا، تیز بہت تیز، اس کے بعد وہ کسی کیفے یا ہوٹل میں نہیں دیکھا گیا جنگل اور ویرانوں میں گھومتا رہا۔ ہر شخص سے کہتا۔

.چیئرمین نے مجھے شہر سے نکال دیا ۔ میں مجرم تھا۔

وہ پاگل ہو چکا تھا، اس کا جنون شہر کے لئے امن کا باعث بن چکا تھا۔ کوئی دنگا نہ ہوا، کوئی لڑکی نہ مری، دودھ کی شیشی نہ لوٹی، مہینوں وہ جنگلوں میں گھومتا رہا۔ شہر کی سمت اسے ڈر لگتا۔ نہ جانے کس نے اسے پاگل خانے بھیج دیا۔ جس روز وہ مرنے والا تھا اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"منّا بھوکا ہے۔ اسے دودھ ملا ؟"

ڈاکٹروں نے مذاق کے موڈ میں جواب دیا۔

" دودھ تم پی گئے۔ منّا اب بھی بھوکا ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر کہا۔

" دودھ میں نے پی لیا، منّا اب بھی بھوکا ہے ؟"

یہ کہہ کر وہ ایک دم بکھر گیا، اپنے کپڑے پھاڑنے لگا، پھر بے ہوش ہو کر گر پڑا اور کبھی ہوش میں نہ آیا اور اس وقت رام دت اور غلام نبی دونوں باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔

وہ مر گیا پاگل خانے میں۔

میں نے سوچا پاگل خانے میں مر کر اس نے اپنے ادیب ام کے ساتھ بڑا انصاف کیا ہے۔ موت اس کی نہیں ہوئی جنون اور پاگل پن کی ہوئی ہے اور اس کے لئے پاگل خانہ ہی بہترین جگہ تھی۔

ادب

سماج کے ارتقا کا آئینہ بھی ہے اور رہبر بھی ہے۔ ادب زندگی کا ہاتھ پکڑ کر آگے ہی نہیں چلتا رہ نوردوں کو حوصلہ بخشتا ہے سایہ دار درختوں کی اور چشموں کی نشاندہی کرتا ہے اور منزلوں کی بشارت دیتا ہے۔

(ڈاکٹر قاضی عبدالستار)

شہلا نزہتین

وہ چلی آئی مگر زرد چہرہ بار بار اس کی نگاہوں میں ابھرا چلا آتا۔ وہ کیوں چلی گئی تھی ایک اجنبی کے ساتھ۔ وہ تو ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ تم کیوں میرے خیالوں میں آبسے ہو دوست؟ وہ سوچتی رہ گئی۔

چائے کی پیالی پکڑتے میں ندیم صاحب کا ہاتھ زری کی سفید انگلیوں سے مس ہو گیا۔ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نرمی سے بولے۔ زری۔ تمہارا ہاتھ گرم کیوں ہے؟"

"بخار ہو گا" وہ اطمینان سے مسکرائی

"کل بھی تھا نا!"

"ہو گا۔" وہ منی کو فراک پہنانے میں محو تھی۔

الجھ کر بولے" لاپرواہی مت برتو زری۔ تکلیف بڑھ جائے گی"

"بڑھ جانے دیجئے"

"پلنگ پر پڑ جاؤ گی"

"پڑ جانے دیجئے"

چڑ کر بولے" مر جاؤ گی۔"

"مر جانے دیجئے" وہ بے نیازی سے ہنسی۔

"بڑھ جانے دیجئے۔ پڑ جانے دیجئے۔ مر جانے دیجئے۔" زری کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ احمق۔ ضدی۔ جیسے زندگی کی قیمت ہی نہیں جانتی۔

"اچھا سنو زری۔ وہ آج اس سے انتہائی میٹھی اور پیاری بات کہنا چاہتے تھے۔ مگر اس سے قبل کہ وہ آگے کچھ کہتے منی رانی۔ باکل پائل چلتی برآمدے سے نیچے اتر گئی۔

"اللہ میرے۔ کہیں سیڑھیوں سے نیچے نہ گر جائے" زری ان کی سنے بغیر لپک گئی۔

اچھا زری۔ تم سنو یا نہ سنو۔ مگر میں اب بہت جلد تمہیں تمہاری ان وفاؤں کا صلہ دوں گا۔ میں اب تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا بنالوں گا۔ میرے معصوم بچوں کو تم جیسی شفیق ماں اور کہاں مل سکے گی۔؟

زرین احمد علی۔ زرین۔ زری۔ زرو۔ یہ معصوم ناموں والی معصوم سی لڑکی کسقدر پیاری تھی۔ مہربان اور ہمدرد۔ ان کی کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ۔ زرین احمد علی سے ان کی پہلی ملاقات اپنے آفس میں ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں ملازمت کے لئے انتہائی پریشان تھی۔ بوڑھی ماں کے علاج کے لئے پیسہ پیسہ کو ترس رہی تھی۔ بی۔ اے کی ڈگری ہاتھ میں لئے در در کی خاک چھانتی پھر رہی تھی۔ مگر کم عمری اور ناتجربہ کاری اس کی راہ میں حائل تھی۔ اسی الجھن میں وہ ایک دن ان کے سامنے جا بیٹھی۔

معاف فرمایئے۔ دفتر میں فی الحال کوئی ایسی جگہ نہیں ہے"

ندیم صاحب نے اسے رکھائی سے ٹالنا چاہا۔

اپنے حالات کی ماری زرین مضطرب ہو کر بولی" دفتر میں نہ سہی کہیں اور سہی۔ کہیں اور۔"

"میں نے کہہ دیا نا محترمہ کہ کوئی جگہ......"

اشیاء

" نوکری ——— ؟ —— آپ سے کون مانگتا ہے۔ مجھے تو روپے کی ضرورت ہے۔ میری امی شدید بیمار ہیں۔ کیا آپ کو کسی ملازمہ کی بھی ضرورت نہیں۔ کھانا پکانے کے لئے، کپڑے دھونے کے لئے، بچے کھلانے کے لئے۔۔۔ مجھے —— میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے نوکری کی کس درجہ اشد ضرورت ہے ——"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا ستھری ساڑھی میں لپٹی پریشان حال لڑکی رندھے رندھے گلے سے فریاد کر رہی تھی۔ کھانا پکانے کے لئے کپڑے دھونے کے لئے۔ بچے کھلانے کے لئے ——"

" ویری سوری۔۔۔۔ " وہ بات پوری نہ کر پائے۔ اور زرین اٹھ کر باہر نکل گئی ——

" کیسے کیسے لوگ آ جاتے ہیں یہاں ——" وہ ملول ہو گئے نظر اٹھا کر دیکھا سامنے میز پر پانی کے شفاف قطرے چمک رہے تھے۔

آنسو —— آنسو —— ان کا دل لرز گیا۔ فوراً باہر گئے۔ اور زرین کو یہ کہہ کر ایک بار پھر آنسو بہانے پہ مجبور کر دیا " —— اچھا۔ آپ کل سے یہاں آ جائیے "

" میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی ——" وہ ان کے سامنے جی بھر کر روئی۔

ندیم صاحب اس کے کردار کو اچھی طرح سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ وہ دفتر کی کسی اور برانچ میں تبدیل کر دیئے گئے۔ کس قدر اداس ہوئی تھی زرین یہ اطلاع پا کر۔ زرد زرد چہرہ والا اپنا یہ محسن اسے بے تحاشہ عزیز تھا۔ ابھی تو وہ ان کے احسان کا بدلہ بھی نہ اتار سکی تھی۔ کتنی جلدی بچھڑ گئے تھے وہ۔ یہ احساس زرین کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھا۔

پھر ایک دن ندیم صاحب کو کسی نے بتایا کہ ان کی ملازم رکھوائی ہوئی لڑکی کی امی کا انتقال ہو گیا۔ آہ —— بیچاری۔ وہ پہلے ہی کیا کم دکھی تھی جناب یہ غم بھی اس کے دل پر آن پڑا۔ وہ ماں جیسی جس کی خاطر اس نے ملازمت مانگی تھی۔ وہ ماں مر گئی جس کے لئے وہ دن رات جس محنت کر رہی تھی۔ ندیم صاحب اکثر اس کے دفتر کے سامنے سے گزرتے تھے۔ وہ اس سے ہمدردی کرنا بھی چاہتے تھے مگر اس کی امی کا نام زبان پر آتے ہی بہت پیارا آنسو سے لبریز دو آنکھیں تصور میں ابھر آتیں۔ وہ ان آنکھوں کو بار بار آنسوؤں میں ڈوبا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

ندیم صاحب سے دوسری ملاقات بڑے مزیدار انداز میں ہوئی۔ وہ شام کو آفس سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی اور سامنے سے ندیم صاحب اندھا دھند اپنا اسکوٹر اڑائے چلے آ رہے تھے۔ زرین اسکوٹر کے نیچے آتے آتے بچی۔

" مرنا ہے کیا ——" وہ خفا ہو کر چیخے۔

" کون احمق ہے جی یہ ؟ ——" زرین نے جھلا کر سر اٹھایا۔ زرد چہرہ اداس آنکھیں —— " ارے —— آپ ہیں ——" وہ بگڑتے بگڑتے مسکرا پڑی۔

" معاف فرمائیے گا ——" وہ معذرت کرنے لگے۔

فرما دیا —— اس نے شاہانہ انداز میں گردن جھٹکائی۔ جھک کر زمین پر گرے ہوئے ناول اٹھائے اور اسکوٹر میں لگی ہوئی ٹوکری میں اچھال دیئے

" ہیاؤں —— ہیاؤں —— اوں —— اوں ——" ننھے سے بچے کے رونے کی آواز فضا میں بکھر گئی۔ ندیم صاحب تڑپ کر ٹوکری پر جھکے۔

" کیا ہے اس میں ——" وہ حیران انہیں تکنے لگی۔

" میری بچی ہے ——" وہ جلدی جلدی ناول نکال رہے تھے۔

" ٹوکری میں بچی ——" وہ بے تاب ہو کر دیکھنے کو جھکی۔ ننھا منا سا پیکر۔ گلابی ہونٹ۔ ننھی بچی مچل مچل کر روئے جا رہی تھی۔

" چپ چپ۔ روتے نہیں رانی بیٹی۔ شاباش —— بیٹے۔ بہت بہادر ہے ہماری بیٹی تو ——" وہ اپنا دسترخوان جیسا رومال نکال کر اس کے منہ پر پھیرنے لگے۔

" ہشت —— ایسے تھوڑی کیا —— اسے ہنسی آ گئی ——" ہٹئے دیکھئے آپ ——" اس نے ہاتھ بڑھا کر بچی کو نکال کر سینے سے لگا لیا۔

" ہائے۔ کیسی نازک سی بچی ہے۔ انکل —— پھول جیسی پیاری سی بچی زرد زرد —— بالکل باپ پر گئی ہے —— بچی کو تھپکتے ہوئے بولی۔ بہت

سمجھ رہے آپ کی بچی تو ہے۔"

"جی ہاں۔ ان دنوں ہو گئی ہے۔ ورنہ جب ہوئی تھی تب تو پورے سات پونڈ کی تھی جناب۔" وہ خالص ماؤں والے انداز میں بولے۔ وہ بمشکل ہنسی روک سکی۔

"اچھا بھئی۔ یہ لیجئے۔ چپ کرا دیا ہم نے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ ورنہ مجھ سے تو یہ نالائق تمام عمر چپ نہ ہوتی۔"

وہ صرف مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ اگر ذرا سی بے تکلفی اور ہوتی تو کہتی۔ آپ کی بچی اتنی نالائق نہیں ہے جتنے کہ خود آپ۔ اتنی منی سی بچی کو ٹوکری میں ڈالے پھرنا۔ نالائقی ہی تو ہے۔

اس کے بعد بھی زرین نے کئی دفعہ ندیم صاحب کو اسکوٹر پہ آتے جاتے دیکھا۔ کئی بار وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا لئے بھی۔ چپ چپ رہنے والے زردی مائل انسان کی شخصیت زرین کو پہلے ہی دن سے پسند تھی۔ اور اب تو وہ خدا جانے کیوں اکثر ان کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شادی شدہ ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے اسکوٹر میں لگی ٹوکری میں ایک منہ بسورتی بچی ہے

ادھر پچھلے کئی روز سے زرین کو ان کا اسکوٹر نظر نہ آیا تھا خدا کرے وہ بخیریت ہوں۔ اس نے دل ہی دل میں ان کی صحت کے لئے سینکڑوں دعائیں مانگ ڈالیں۔ پھر دوسرے ہی روز ان سے ملاقات ہو گئی۔ پوچھنے پر انتہائی افسردگی سے بولے

"میں تو ٹھیک ہوں مس زرین۔ ہاں بچی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ یہ دوائیں میں اسی کے لئے تو لے جا رہا ہوں۔"

"ارے۔ تو منی رانی بیمار پڑ گئی۔ اتنی ذرا سی تو ہے بیچاری۔"

"جی ہاں۔ اور بدتمیز تو اس قدر ہے کہ کیا عرض کروں۔ کل رات بھر لئے بیٹھا رہا۔ مگر مجال ہے جو چپ ہوتی ہو۔ آیا الگ ہلکان ہو گئی کم بخت۔"

"ارے۔ تو اس کی امی کیوں نہیں سنبھالتیں اسے۔"

اس کے منہ سے یونہی نکل گیا۔

"امی۔ کونسی امی۔" انھوں نے افسردگی سے اس کی طرف دیکھا۔ "اس کی امی نہیں ہیں۔"

وہ ششدر رہ گئی۔ تو۔ تو۔ اس ننھی بچی کی بھی امی نہیں ہیں۔ وہ آنسو بہاتی۔ منہ بسورتی نازک سی بچی بن ماں کی ہے۔ مارے غم کے زرین کا دل پھٹنے لگا۔ ماں کے سوا بچوں کا کون ہوتا ہے بھلا اور تبھی تو یہ خود بھی اتنے اداس اداس رہتے ہیں۔ بیوی کا غم لگ گیا ہے انھیں۔

"اچھا۔ میری طرف سے بہت پیار کیجئے گا اسے۔" وہ نظریں جھکائے آگے بڑھ گئی۔

"ذرا سنئے۔۔۔" انھوں نے پکارا۔ اور وہ رک گئی۔

"مس زرین۔۔۔ آپ۔ آپ۔" وہ ہچکچا سے رہے تھے۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ۔ کیا۔ آپ میرا ایک کام کر سکتی ہیں۔"

"آپ کا کام۔" زرین کے قدم جم گئے۔ آپ کے کام آنے کا ارمان تو پتہ نہیں کس دن سے ہے مجھے۔ فرمائیے نا میں ضرور کروں گی۔

بری طرح ہکلاتے ہوئے بولے۔ "آپ۔ وعدہ کیجئے کہ برا نہیں مانیں گی۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے آپ سے کہنا نہیں چاہئے۔ مگر میں کیا کروں میں سخت مشکل میں ہوں۔ دراصل وہ میرے بس کا کام ہی نہیں ہے ورنہ۔"

"آپ کہئے تو۔ مجھے آپ کا کام کر کے بے حد خوشی ہو گی۔"

بات یہ ہے کہ رانی مجھ سے بالکل نہیں مانتی۔ نہ دوا پیتی ہے۔ کل سے تو اس نے دودھ بھی نہیں پیا۔ بس روئے چلی جاتی ہے آپ ذرا چل کر اسے چپ کرا دیجئے۔ دوا پلا دیجئے۔ ورنہ مر جائے گی بس۔" ان کا گلا رندھ گیا۔

میں آپ کے ساتھ جاؤں۔ جاؤں۔ نہ جاؤں۔ انجان گھر۔ پرائے بچے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ تو تو کہتی تھی کہ تو ان کا احسان زندگی بھر نہیں بھولے گی اور ان کی خوشی کے لئے اپنی جان بھی دیدے گی۔ اور اب۔۔۔ تیرے قدم پیچھے کیوں ہٹ رہے ہیں۔ احسان فراموشی کو تو تو سب سے بڑا جرم سمجھتی تھی نا زرین۔ "آپ نہ چلیں تو وہ مر مرا جائے گی۔"

"نہیں۔ نہیں۔" میں آپ کی منی کو یوں نہیں مرنے

دو ماگی سادہ سبی پھر وہ ان کے ساتھ ان کے گھر پہنچ گئی۔
ان کا گھر۔ جو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ مدت سے کسی عورت نے یہاں قدم نہیں رکھا۔ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی۔ سارا سامان بکھرا ہوا۔

"منی رانی کدھر ہے" وہ اس اجنبی ماحول میں گھبرائی گھبرائی سی کھڑی تھی۔

"ابھی لاتا ہوں ڈھونڈ کر"۔ لفظ "ڈھونڈ کر" پہ اسے مسکرانا پڑا۔ جیسے وہ ان کی بچی نہیں۔ کوئی جوتا یا موزہ تھی کہ جس کی اب تلاش ہو گی۔

"یہ لیجئے۔ اب سنبھالئے اسے آپ" منی کو جانے کس کونے سے نکال کر اس کی گود میں دے دیا۔ پھر وہ میلے کپڑوں کی ایک چھوٹی سی ڈھیری کو چھو چھو کر آوازیں دینے لگے۔

"جاوید۔ جاوید بیٹے۔ دیکھو تو اپنے گھر کون آیا"

"اچھا۔ تو ان کا ایک بیٹا بھی ہے" اس نے جھک کر دیکھا کپڑوں کے ڈھیر میں چار پانچ سال کا معصوم بچہ آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔ زرین کو سامنے پا کر پوری آنکھیں کھول دیں اور اچک کر اس سے لپٹ گیا۔

"امی۔ اچھی امی" زرین نے سٹپٹا کر ندیم صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ سادگی سے بولے "بہت دن ہو گئے ماں سے بچھڑے۔ نیند میں آپ کو شاید یہ سمجھ بیٹھا ہے"

اُدھر منی صاحبہ نے آنکھ کھولتے ہی آسمان سر پہ اٹھا لیا۔

"کس قدر بھوکی ہے غریب۔ روئے نہ تو اور کیا کرے۔ لائیے دودھ کی بوتل کدھر ہے۔"

"ابھی لاتا ہوں" وہ ادھر ادھر جھانکتے پھر رہے تھے۔ جھنجھلا کر بولی۔ "بھئی اُدھر نعمت خانہ وغیرہ میں دیکھئے۔ یہ دراز میں کیا کر رہے ہیں آپ"

"جی نہیں۔ یہ دیکھئے مل گئی یہیں سے" بوتل دودھ سے بھر کر زرین کے ہاتھ میں دے دی۔

"تو پھر نعمت خانہ میں کیا رکھتے ہیں آپ" اس نے پوچھا۔

"اس میں تو منی کے کپڑے ہیں آدھے کل سے وہ بھیگے۔ دودھ کی بوتل دراز میں اور کپڑے نعمت خانہ میں۔" ان کے سلیقے کی بھی دل سے قائل ہو گئی۔

"اچھا۔ اب بوتل کے لئے نپل تو لائیے" وہ کھلی بوتل کو تک رہی تھی۔

مسکرا کر بولے۔ "بس وہی تو نہیں ہے اپنے پاس۔ ویسے ہم دے پلا دیتے ہیں۔"

تبھی تو بھوکی رہتی ہے بیچاری۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ پھر اس نے اپنی ساڑھی کا پلو پھاڑا۔ دھو کر بتی بنائی اور دودھ میں ڈبو ڈبو کر منی کے حلق میں ٹپکانے لگی۔

"منی کا دوسرا فراک لائیے۔ یہ بالکل گیلی ہو رہی ہے"

"ہمیں کہاں ملتی ہیں یہ سب چیزیں" وہ بالکل منی کے انداز میں بسورے۔

اچھا۔ آپ ذرا ان دونوں کو سنبھالئے۔ میں لاتی ہوں۔ وہ انتہائی اپنائیت سے اٹھ کر چل دی۔ نعمت خانہ اور الماریوں کی حالت واقعی ابتر تھی۔ بمشکل تمام اس نے تھوڑا بہت سامان مناسب جگہوں پر رکھا۔ منی اور جاوید کا منہ دھلا کر کپڑے بدلائے۔ منی کو دوا پلائی۔ اور پھر جب وہ واپس جانے لگی تو ندیم صاحب منی اور جاوید سمیت اسے دروازے تک چھوڑنے آئے۔ انتہائی ممنونیت سے بولے "آپ کتنی اچھی ہیں زرین"

زرین نے پلٹ کر خوبصورت آنکھوں اور زرد چہرے والے پرکشش نوجوان کی طرف دیکھا۔

آپ خود بھی تو کچھ کم اچھے نہیں۔" یہ بات وہ صرف سوچ سکتی تھی کہہ نہ سکی۔

وہ چلی تو آئی مگر زرد چہرہ بار بار اس کی نگاہوں میں ابھرا چلا آتا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کیوں چلی گئی تھی ایک اجنبی کے ساتھ۔ وہ تو ابھی ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ تم

[illegible]
ہو رہی تھی۔

پھر ایک طویل عرصے کے بعد اس کی ملاقات ندیم صاحب سے بالآخر ہو ہی گئی۔ وہ انتہائی مضمحل اور پریشان تھے۔ اتنے دنوں میں ان کا چہرہ کچھ اور بھی زرد ہو گیا تھا۔ کوئی غم لگ گیا ہے شاید انہیں۔ مجھے بتاؤ۔ مجھے بتاؤ۔"

"کیسے ہیں آپ۔"

"اچھا ہوں۔"

"اور جاوید۔"

"زندہ ہے وہ بھی"

"اور رانی بیٹی۔ اسے ساتھ نہیں لاتے آپ۔" سنجیدہ ہو کر بولے۔

"اب وہ کبھی میرے ساتھ نہیں ہو گی۔"

"ہائے اللہ۔" زرین سن سی رہ گئی۔ "کیا ہوا رانی کو۔ جلدی کہئے نا۔"

"ابھی ڈاکٹر کے پاس سے تو آ رہا ہوں.... بچنے کی کوئی امید ہی نہیں ہے۔"

اوہ۔ تو وہ سخت بیمار ہے۔ اور انہوں نے تو بس جان ہی نکال لی تھی۔

"وہ اتنی بیمار ہے۔ اور آپ نے مجھے خبر بھی نہیں کی۔"

"بس یہ سوچ کر بار بار کیوں تکلیف دوں آپ کو۔ اور پھر آپ نے خود بھی تو نہیں پوچھا ہے۔ جاوید تو بار بار آپ کو پوچھتا تھا۔"

"ارے ہاں۔ واقعی۔ مجھے جانا چاہیے تھا۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔ "اچھا تو۔ چلئے اب چلتی ہوں۔"

گھر کا نقشہ ویسا ہی بگڑا ہوا تھا۔ منی بچاری بے قاعدہ جل رہی تھی۔ پسینے میں بھیگا فراک۔ اترا ہوا چہرہ۔ رک رک کر چلتی ہوئی سانسیں۔ جاوید قریب بیٹھا تیمارداری کے ارمان میں [illegible] جل رہا تھا۔ اس نے لپک کر جاوید کو گلے سے لگا لیا۔

[illegible] سنبھالنے [illegible] بیس منٹ نہیں لگے آپ پہنچ کر۔"

انتہائی بے قراری سے بولے۔ "اچھا ہے جدھر ہو جائے دور دور تک یہ مصیبت تو ختم ہو۔"

توبہ توبہ۔ کیسا شقی ہے۔ باپ ہے یا اللہ جو بجھ ہے۔
وہ منی کو دعا لیا کر چلی آئی۔ پھر اس نے یہ معمول بنا لیا کہ ہفتے کے ہفتے جا کر دونوں کو دیکھ آتی۔ ساتھ ہی بگڑے گھر کو سنوار آتی۔ یوں تو اب بچوں کی آیا بھی لوٹ آئی تھی مگر پھر بھی وہ ان سب کی خبر گیری کو اپنا فرض سمجھنے لگی تھی۔ کس قدر بے تکلف ہوتی جا رہی تھی وہ اس گھر سے اور اس گھر میں رہنے والوں سے۔

منی تو بس جیسے پیدائشی مریض تھی۔ ایک بار پھر نمونیہ کا حملہ ہوا۔ ندیم صاحب کے تو ہوش اڑ گئے وہ اس جان سے عزیز بیٹی پر تو وہ یوں بھی فریفتہ تھے۔ رات رات بھر جاگتے اور دعائیں مانگتے۔ کبھی زرینہ کی خوشامد کرتے کہ وہ آ کر اسے سنبھال لے۔ ایک دن جو وہ پہنچی تو منی کی طبیعت بری طرح بگڑی ہوئی تھی۔ اس کا آتا ہوا ہر سانس آخری لگ رہا تھا۔ ندیم صاحب گھبرا گھبرا کر اس کے ہاتھ پاؤں چوم رہے تھے۔

"دیکھئے زرین۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آج یہ نہیں بچے گی۔ ویسے ابھی سانس تو آ رہا ہے نا۔"

ان کو یوں پریشان اور مضطرب دیکھ کر زرین بے تاب ہوتی جا رہی تھی۔ اللہ۔ میں کیسے کام آ سکتی آپ کے۔ کیسے یہ دکھ بانٹ لوں۔ آپ نے کتنا بڑا احسان کیا تھا مجھ پر یا ورنہ۔ اور میں۔ کیا کروں الٰہی۔ اور پھر منی کی بگڑتی حالت کے پیش نظر زرین کو فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ منی کو یوں بے وقت نہیں مرنے دے گی۔ ندیم صاحب کی عزیز از جان بیٹی کی زندگی ایسی معمولی نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ان کی رانی بیٹی کے لئے وقف کر دے گی۔ حل صرف ایک ہی تھا کہ وہ منی کو علاج کے لئے اپنے ساتھ گھر لے جائے۔ ندیم صاحب نے سنا تو کچھ دیر تو چپ رہے پھر بولے۔ "میں جانتا ہوں [illegible] آپ کو بہت [illegible]

" دیکھتی نہیں ہو زرین۔ صحت کس قدر خراب رہتی ہے
کام ٹھیک سے کر نہیں پاتا تھا تو ندامت ہوتی تھی۔ اور پھر
میری بیماری بھی تو "
" آپ تو بس خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ علاج
کروائیے ذرا سنجیدگی سے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا "
" علاج — ہاں کرا ہی لوں گا۔ اسپتال میں رہنا پڑے گا
شاید۔ پھر بچوں کے پاس کون رہے گا۔ اتنا بہت سا خرچ
بہت سی باتیں ہیں۔ سیکڑوں پریشانیاں۔ تم کیا جانو زرین — "
وہ گویا تھک کے کہہ رہے تھے۔
" تو پھر — تو پھر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے ندیم صاحب "
" شادی.... " وہ پھیکی سی ہنسی ہنس پڑے۔ " تم واقعی
بہت بھولی ہو زرین۔ لو۔ بھلا اب کون شادی کرے گا مجھ سے "
" کیوں — اتنے برے تو نہیں ہیں آپ — " وہ برا مان کر بولی۔
" تم نہیں جانتی زرین۔ میں بہت برا ہوں۔ دیکھو نا پہلی شادی
تو ہو چکی ہے۔ دو بچے ہیں۔ بہت دنوں سے بیمار رہتا ہوں۔ اب
ملازمت بھی ختم ہو گئی — اب بتاؤ۔ کون کرے گا مجھ سے شادی "
" خیر — یہ سب تو ادھر ادھر کی باتیں ہیں۔ اور آخر آپ
اپنی بیماری کا اس قدر چرچا کیوں کرتے ہیں۔ علاج تو کرواتے نہیں۔
دو روز میں اچھے ہو جائیں گے انشاءاللہ ! "
" دو روز میں " ان کا چہرہ اداسیوں میں ڈوب گیا۔
" تم یوں نہیں سمجھو گی زرین۔ تم سے اب کہاں تک چھپاؤں۔ مجھے
بڑی لمبی بیماری ہے۔ دق ہے دق "
دق — دق — دق — مارے حیرت اور خوف کے
زرین کی چلتی سانسیں رکنے لگیں۔ دق۔ کھانسی۔ بخار۔ اچھا
تو تمہیں یہ بیماری ہے۔ اور تم.... تم پھر بھی اتنے اطمینان سے
یہاں بیٹھے ہو۔ الم غلم جو کچھ پکتا ہے وہ کھاتے ہو۔ نہ کوئی
علاج نہ پرہیز۔ ہر وقت کی پریشانیاں اور افکار الگ.....
میرے زرد چہرے والے حسین ساتھی۔ تو تمہاری سانسیں اسی لئے
اس قدر گرم ہیں۔ آنکھیں اسی لئے زرد ہیں۔ تمہارا سرا پا اسی لئے
اس قدر گرم ہے مگر یہ سب کچھ تم نے مجھ سے چھپایا کیوں ؟
" اور سنو۔ اب تم یہاں زیادہ مت آیا کرو زرین "
" کیوں — ؟ " اس کی آنکھیں بھر آئیں " بہت پریشان
کرتی ہوں کیا "
" آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ مجھے ٹی بی ہے۔ اب تم مجھ سے
بچو۔ اس گھر سے بہت دور چلی جاؤ۔ ورنہ —
دیکھئے ندیم صاحب — ایسی باتیں مجھ سے آئندہ کبھی
مت کہئے گا۔ کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ میں کس دل کی لڑکی ہوں "
وہ ان کی خدمت اسی لگن سے کرتی رہی مبادا ایسا ہو کہ
وہ اس کی توجہ میں کمی پا کر خود کو اور زیادہ بیمار سمجھ بیٹھیں۔
پھر وہ انہیں اصرار سے ڈاکٹر کے پاس لے گئی جس نے
یہ کہہ کر مزید ستم ڈھا دیا کہ اگر صحت اور زندگی عزیز ہے تو مریض
کو فوراً سینی ٹوریم میں داخل کرا دیا جائے۔
" میں تو خود چلا جاتا زرین۔ بہت پہلے چلا جاتا۔ مگر یہ جاوید
اور منی بہت برے ہیں۔ نہ خود مرتے ہیں۔ نہ مجھے مرنے دیتے ہیں "
" ارے — تو کیا میں نہیں ہوں ان کے پاس "
" تم۔ ہاں تم ہو تو۔ مگر تمہاری اور بات ہے زرین "
" اور بات ہے۔ صاف کہہ دیجئے نا کہ آپ مجھے غیر
سمجھتے ہیں۔ اپنی خدمت کے قابل ہی نہیں سمجھتے "
" تم بہت جذباتی ہو زرین۔ آخر سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ.... "
وہ سمجھاتے رہے۔ مگر اس کا دل بری طرح بھر آیا تھا وہ رونے لگی۔
" کیا ہوا۔ اس طرح کیوں رو رہی ہو بھئی۔ " وہ سسکیاں
بھر رہی تھی۔
" بولو تو سہی زری۔ کیا ہوا " وہ سخت خفا تھی۔ جواب
کیا دیتی۔ وہ بگڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو ندیم صاحب نے بڑھ کر
آنچل تھام لیا۔ پھر شانوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ سامنے کیا۔
" زرین پاگل۔ بس اتنی سی بات پر خفا ہو گئیں۔ اچھا چلو
مجھے اپنے ہاتھوں سے سینی ٹوریم چھوڑ آؤ "
" آخر آپ تیار ہو ہی گئے۔ بہت ہی اچھا " فرط مسرت سے

اس کی حالت غیر ہوتی تو وہ ان کے شانے پر سر ٹکا کر لاڈ سے بولی

" زری پاگل آپ سے پیار کرتی ہے ندیم صاحب " آہ

اس نے دل کا بوجھ اتار پھینکا۔ وہ بات جسے وہ آج تک اپنے آپ سے چھپاتا آ رہا تھا۔ وہ اس نے ندیم صاحب کے کانوں میں منتقل کر دی۔

وہ روز شام کو منی اور جاوید کو لے کر سینی ٹوریم ملنے جاتی۔ ندیم صاحب منع کرتے ہی رہ جاتے " بس اتوار کو آجایا کرو زری "

جل کر کہتی " اتوار کو بھی کیوں آؤں آخر جس دن چھٹی ملے گی۔ اس روز آکے لے جاؤں گی "

ابتدا میں تو ایسا ہوا کہ ان کی طبیعت بجائے سنبھلنے کے اور بگڑ گئی۔ مرض نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ خون تک آنے لگا۔ زرین بیچاری لرز گئی۔ اللہ بس تو ہی شفا دینے والا ہے ان کو۔ مرض کی شدت کے باعث ڈاکٹر نے کمرے میں آنے جانے سے منع بھی کیا مگر زرین تو ایسی دیوانی تھی کہ کسی کے روکے نہ رکتی۔ روز آتی۔ دوائیں اپنے ہاتھ سے کھلاتی۔ مالٹوں کا رس پلاتی۔ کتابیں پڑھ کر سناتی۔ سر دباتی۔ منی اور جاوید کی شرارتوں کے قصے مزے لے لے کر سناتی۔ ندیم صاحب سوچتے زرین تو تو فرشتہ ہے۔ میری اس ویران اور اجڑی دنیا میں تیرا کیا کام تھا۔ تو یہاں کیوں چلی آئی۔ بار بار منع کرتے کہ وہ ان کے قریب نہ آیا کرے۔

" خدا کے لئے کچھ تو سوچو زری۔ یہ جراثیم۔ یہ جراثیم اگر خدانخواستہ تم تک جا پہنچے تو " ؟؟

مسکرا کر کہتی " بھلا میں ایسی خوش نصیب کہاں۔ ؟ "

جب وہ خون اور بلغم تھوکتے تو وہ اپنے اجلے ہاتھوں سے اسے صاف کرتی۔ کھانسی اٹھتی تو وہی سنبھالتی۔ اور جب کھانستے کھانستے بے دم ہو کر گر پڑتے تو ان کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ جاتی۔

" وہ بیٹھو زری "

" نہیں بیٹھتے۔ " وہ ضدی بچوں کی طرح مچل جاتی۔

" پاگل لڑکی۔ تو اپنی زندگی برباد کرے گی "

" زرین پاگل۔ آپ سے پیار کرتی ہے نا "

" آخر کیوں جان بوجھ کر خود کو کنویں میں ڈال رہی ہو "

" اچھا یہی سہی " وہ مسکرائے جاتی۔

" زری۔ میرے پھیپھڑوں میں زخم ہیں " وہ منت سے کہتے۔

" تو پھر کیا ہوا۔ " وہ اتنی ہی محبت سے جواب دیتی۔ " میرے دل میں بھی تو آپ کے پیار کے گھاؤ ہیں "

زرین نے اور اس کی بے لوث محبت نے انہیں نئی زندگی بخش دی۔ اور بالآخر وہ صحت یاب ہو کر گھر لوٹ آئے۔ اپنے بچوں کے پاس اپنی پیاری زری کے پاس۔ بچوں اور زرین میں ڈوب کر ندیم صاحب ماضی کا ہر دکھ بھلا بیٹھے تھے۔ گھر کا ماحول ان دنوں بے حد خوشگوار تھا۔ ندیم صاحب نے کئی بار زرین سے بہت کچھ کہنا چاہا مگر پچھلے کئی ہفتوں سے خود زرین نڈھال نڈھال سی رہنے لگی تھی۔ ضدی ایسی تھی کہ لاکھ کہنے پر دوا کی پابندی نہ کرتی۔

چائے کی پیالی پکڑنے میں ندیم صاحب کا ہاتھ زرین کی سفید انگلیوں سے مس ہو گیا۔ اور پھر۔ پھر وہ اسے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اور اس کی زبان سے یہ سن کر کہ خدا کا شکر ادا کیجئے۔ مرض ابھی ابتدائی اسٹیج پر ہے فوراً اسپتال میں داخل کرا دیجئے۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز اٹھے۔ وہی ہوا۔ آخر وہی ہوا نا۔

" کیا بتایا ہے ڈاکٹر نے " زری لاپرواہی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ گم سم رہ گئے۔ ان کا حلق سوکھ گیا کس منہ سے بتاتے کہ تمہیں میں نے برباد کر دیا۔ تمہیں میرا زہر لگ گیا۔

اور اس کے بعد کی کہانی تو بہت مختصر ہے بلکہ یوں

بڑا مختصر سے مختصر ہے۔ ندیم صاحب کے اصرار پر وہ اسپتال پہنچ
گئی۔ جب منّی اور جاوید کو بہت [illegible] میاں سے
[illegible] ان کو نہیں تو میں خفا
ہو جاؤں گی۔ ہاں " جب ندیم صاحب اسے چھوڑ کے جانے لگے
تو اچانک [illegible] نے پر بھی آنسو ٹپکنے لگے۔

" اللہ۔ میں یہاں اکیلے میں کیسے جیئوں گی ندیم صاحب"

" دل تھوڑا مت کرو زری۔ تم انشاء اللہ جلد اچھی ہو جاؤ گی۔"

اونہہ۔ کیا رسمی سی بات کہہ دی آپ نے۔ دل تھوڑا مت کرو۔ وہ یہ کہہ گیا۔ "تمہارے ساتھ میں جو ہوں پیاری زرین۔ تم بھلا اکیلی کہاں ہو" یہ مرد اظہارِ محبت کے سلسلہ میں اس قدر پھیکے کیوں ہوتے ہیں میرے اللہ۔ وہ سوچتی رہ گئی۔

وہ شام کو آ جاتے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے۔ کچھ دن تو منّی اور جاوید کو ساتھ لاتے پھر یہ کہہ کر نہ لاتے کہ "تمہیں سکون کی ضرورت ہے اور بچے بلاوجہ شور مچاتے ہیں"

آپ سمجھتے ہی نہیں کہ میرا سکون کیا ہے، ہنستی ہوئی منّی اور کھلکھلاتا ہوا جاوید۔ بس یہی تو معراج ہے میرے سکون کی۔

اس کے جانے سے گھر کا نظام بھی درہم برہم ہو گیا تھا کبھی کہتے مجھے تو اپنے کپڑے ہی نہیں ملتے۔ بچوں کی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ وغیرہ وغیرہ۔

" بس ذرا سی ہمدردی اور محبت چاہئے آپ کی۔ پھر میں اچھی ہو کر گھر چلی چلوں گی تو ذرا برابر تکلیف نہیں ہونے دوں گی آپ کو۔"

" اچھا۔ اب چلتا ہوں زرین۔ پھر آؤں گا۔"

" بس۔ ابھی سے" اس کا دل دکھنے لگا۔

" آفس کا بہت سا کام ہے۔ پھر منّی اور جاوید اکیلے ہیں"

دل چاہا۔ کہے اور جیسے میں اکیلی نہیں ہوں۔ مگر بولی "اچھا جائیے۔ مگر کل ضرور آئیے گا اور بہت دیر تک بیٹھیے گا۔"

[illegible]

اس کے بار بار کہنے اور بے تاب ہونے پر ایک دن منّی اور جاوید کو لائے۔ منّی کو لاڈ سے گود میں بٹھا لیا۔ جاوید کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ان سے باتیں کرنے لگی۔ وہ قریب بیٹھے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔

" اب تم آرام کرو زرین۔ لاؤ بچوں کو مجھے دے دو"

" نہیں۔ نہیں۔ ابھی نہیں" وہ تو ان دونوں بچوں کو بہت دیر تک اپنے قریب رکھنا چاہتی تھی۔ بیچ میں وہ کئی روز تک نہ آئے تو اس نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔

کیا ہوا انھیں۔ خدا کرے بخیر ہوں۔ میرے لئے تو انھیں کی جان سب کچھ ہے۔

پھر آئے تو ذرا گھبرائے گھبرائے۔ شرمندہ شرمندہ سے۔ پھلوں کی ٹوکری سرہانے رکھ کر بولے "معاف کرنا زرین۔ ذرا جلدی میں ہوں۔ دراصل آفس کا کام اور گھر کی دیکھ بھال....."

وہ بات کاٹ کر بولی "مگر آپ تین دن سے... منّی رانی اور جاوید بیٹا۔"

ہاں۔ ہاں۔ وہ سب اچھی طرح ہیں۔ دراصل اسپتال کے قوانین ذرا سخت ہیں۔ ویسے اگر کبھی میں نہ آ سکوں تو کچھ خیال مت کیا کرو۔ خدا تمہیں جلد صحت دے" وہ چلے بھی گئے اور وہ نہ کچھ کہہ سکی نہ سن سکی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ کتنی مصروفیت ہے انھیں آج کل۔ اگر میں وہاں ہوتی تو کتنا ہاتھ بٹاتی ان کا۔

پھر ایک دن آئے تو بھی چپ چاپ سے بیٹھے رہے نہ منّی اور جاوید کو ساتھ لائے اور نہ ہی پھلوں کی ٹوکری۔ پریشان سی صورت۔

" ہائے میرے اللہ۔ کتنے پریشان رہتے ہیں آپ میرے لئے۔ زرین جیسی لڑکی کے لئے خود کو یوں نہ گھلائیے۔ [illegible] زرین آپ کو کتنا چاہتی ہے۔ یہ آپ کیا جانیں۔" وہ چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔ وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ میرے آنسوؤں

اٹھاکر نہیں دیکھتے۔

"سنئے" وہ پکارا ٹھی۔

"کیا ہے" انھوں نے افسردہ آنکھیں اٹھائیں۔

"یہاں آیئے" مگر انھوں نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔

"اللہ۔ بھئی یہاں آیئے نا" اٹھ کر قریب چلے آئے۔

"یہاں۔ میرے نزدیک آیئے نا" وہ بے حد پیار سے انھیں بلا رہی تھی۔

"کوئی آنہ جائے۔ اسپتال ہے۔"

"نہیں بھئی۔ کوئی نہیں آتا" وہ ان کے یوں ڈر جانے پر ہنس پڑی۔ اسنے ان کے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لئے۔ پھر اپنے زرد زرد ہاتھ کے مقابلہ پر ان کا سرخ و سفید ہاتھ کسقدر بھلا لگ رہا تھا اسے۔ کیا ہوا۔ کچھ ہی دن میں وہ بھی تو انھیں جیسی ہو جائے گی۔ دکھ کے دن سدا تو نہیں رہتے نا۔ یہ انگلیاں۔ خوبصورت سی لمبی لمبی۔ وہ دیوانوں کی طرح ان کے ہاتھ کو تک رہی تھی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ وہ ننھے بچوں کی طرح ان کی انگلیاں گننے لگی۔ کیسا اجلا ہاتھ ہے آپ کا۔ پیارا۔ صاف صاف جیسے سنگ مرمر۔ جیسے دودھ۔.... جیسے .... اسے تشبیہیں سوجھنے لگیں۔ پھر اس نے یہ نہیں بے سوچے سمجھے اس ہاتھ کو اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ ابھی ڈھنگ سے چوم بھی نہ سکی کہ وہ ہاتھ چھڑا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ تیکھے اور کچھ تلخ لہجہ میں بولے۔

"تم تو فردوس پاگل ہو گئی ہو نذرین۔ کیسا مہلک مرض ہے تمہیں۔ آخر۔ تم اپنے ساتھ اوروں کو بھی...."

"یہ نذرین پاگل۔ اب بھی آپ سے پیار کرتی ہے ندیم صاحب۔"

وہ تکیے میں منہ دے کر خون کے آنسو رو دی۔

داغ داغ

بات دراصل یہ ہوئی کہ ناٹک نویس نے نظر اٹھا کر کھڑکی کے باہر جو دیکھا تو عجیب منظر تھا۔ چاندنی بے داغ سفید چادر کی مانند گھاس پر بچھی ہوئی تھی نیلے آسمان پر چاند یوں کسی داغ کی طرح چمکدار اور ساکت تھا۔ غرض کہ ایک چیز سفید، روشن اور ٹھہری ہوئی تھی۔ بس ایک چیز میں جنبش تھی۔ کھڑکی پر رکھا ہوا کھلا استرا۔ اسکے سفید چمکدار بلیڈ کی تیز دھار میں چاند ہلکورے لے رہا تھا۔

بس بیچارہ ناٹک نویس محو ہو گیا۔ احساسِ زیاں کا دھواں اس کے تن من پر چھا گیا۔ اس کی اپنی زندگی خاک آلود تھی اور دل داغ داغ۔ اس کا دل دماغ پر قابو پا گیا اور دل پر داغ۔

ایک ہی لمحہ میں چاند، چاندنی، باہر لان پر سوتی گھاس، کھڑکی کا چمکدار چوکھٹا اور میز پر آدھا لکھا سفید کاغذ سب اچھل کر ایک ہو گئے کچھ دیر چیزیں واضح رہیں پھر گڈ مڈ ہو گئیں۔

بھاگتی ہوئی، چمکدار سفید چیزیں ہلکورے لیتی ہوئی ایک سفید لکیر بن گئیں۔ جیسے کالی ریت پر تا حدِ نگاہ، سمندر کے پانی کی چھوڑی ہوئی سفید کف کی لکیر یا کھڑکی پر رکھے ہوئے تیز استرے کی دھار۔

اس وقت اسے نہ میں یاد آیا، نہ تم یاد آئیں۔ ایک ہی جھٹکے میں وہ ٹیڑھی میڑھی لکیروں کے جال میں سے تیر کر نکل گیا۔ اب کچھ سفید تھا۔ نہ چاندنی، نہ کھڑکی، نہ دھاردار تیز لکیر، اگر کچھ سفید تھا تو میز پر پھڑپھڑاتا آدھا لکھا کاغذ۔

سو مالتی! یہ ہوا۔ جو گاڑی تم نے اس کو صبح کے سفر کے لئے بھیجی تھی، اس میں ڈال کر ہم اس کے جسم کو لاش گھر کے سرد خانے میں چھوڑ آئے۔

ایک بات کہوں۔ برا نہ ماننا ــــ تمہاری کل رات کی ناراضگی ناٹک کو بہت مہنگی پڑی ــــ وہ ایک ایسا آدمی باقی تھا جو کر داروں کو بہلا کے بادلوں سے اتار کر تمہارے گھر کے صحن کی الگنی پر ٹانگ سکتا تھا ــــ سو وہ بھی نہ رہا ــــ

م ۔ م راجندر

دو لڑکیاں

> لال قلعہ اور بجلی دونوں بدروش ہونہار طرح
> ہم بڑھ رہے تھے اور جب بجلی نے ایک اور
> جست لگا کر لال قلعہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا
> تو اجیت نے انتہائی جوش میں اپنا ٹیلین
> پھاڑ ڈالا ـــــ

اجیت تقریباً پچیس سال کا تھا اور اس عمر کے دوسرے نوجوانوں کی طرح طبعاً رومان پسند تھا۔ ان دنوں وہ ایک مقامی ہوٹل کا منیجر تھا کیونکہ اس نے بے کار رہنے پر اس ملازمت کو ترجیح دی تھی وہ کسی اچھی سرکاری نوکری کے لئے بھی کوشش کر رہا تھا لیکن آج کل اس کی پریشانی کا باعث ملازمت نہیں تھی۔ درصل اس کے ذہن پر ان دنوں دو لڑکیاں سوار تھیں!

ایک نلنی، سادہ صورت، سادہ مزاج جو اجیت کو دل سے چاہتی تھی اور دوسری اندرا۔ فیشن ایبل چنچل اور طرار جو اکثر اس کے ہوٹل میں آیا کرتی تھی۔ نلنی کوئی انیس سال کی ناتجربہ کار، الھڑ اور جذباتی لڑکی تھی، جس کا ذہن صاف شفاف تھا اور جس کا دل ایک معصوم پیار اور خلوص سے پُر تھا وہ اور اجیت ایک ہی بلڈنگ میں رہتے تھے اور دونوں کے والدین میں بھی کافی میل جول تھا۔ وہ اور اجیت آسانی سے بات چیت کر سکتے تھے اور ان کا بے روک ٹوک ملنا جلنا ہی انہیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا۔ لیکن ان دونوں کے مطمح نظر میں بڑا فرق تھا۔ نلنی کے دل میں خلوص، پیار اور عقیدت کا ننھا سا پیچ پھوٹ پڑا تھا لیکن اجیت صرف موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

اور اندرا سے جب اجیت کی پہلی ملاقات ہوئی تھی تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا اور جوانی کے شوریدہ سر جذبے مچلے تھے وہ لمبے قد کی ایک بے حد حسین لڑکی تھی جس کے تمام اعضا متناسب تھے جیسے کسی سانچے میں ڈھلے ہوں۔ اس کے خد و خال بڑے دلکش تھے اور اس کے چہرے کی رنگت گلاب کی سی تھی وہ اپنی جسمانی دلکشی کو ایک اعلیٰ لباس، خوشنما میک اپ اور ایک مسلسل سحر کن مسکراہٹ سے زیادہ ابھارا کرتی تھی۔ اس کا حسن خاموش سا، خوابیدہ سا نہیں تھا۔ وہ بولتی تھی تو اس کا انگ انگ پھڑکتا تھا۔ اس کے چہرے کے زاویوں، اس کی آنکھوں کی حرکت اور اس کی ہنسی کی کھنک میں ایک بھرپور جوانی کی بیتابیاں صاف محسوس کی جا سکتی تھیں! اس کے دیکھنے اور مسکرانے کے انداز میں ایک شرارت سی، ایک بلاوا سا تھا اور اجیت نے اندرا سے پہلی ہی ملاقات میں اس بلاوے اور چھل بل کی بے پناہ طاقت کو محسوس کیا تھا۔ اس نے اندرا کی بے پناہ کشش کے سامنے اپنے آپ کو بالکل مجبور پایا۔

اندرا ایک پُرکشش تحفہ تھی، ایک بیش قیمت تحفہ جسے پانے کے لئے اجیت کا دل مچلنے لگا۔ اس کے بعد سے اس کی توجہ نلنی کی طرف کم ہو گئی، جو ایک پاکیزہ ایک گھریلو لڑکی تھی اور اندرا ایک

اجیت ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں کوئی
شک نہیں کہ چونکہ اندرا خود خوبصورت تھی۔ اس لئے کچھ خوبصورتی
اور مردانگی کی بھی متلاشی تھی اور یہ دونوں خوبیاں بھی اسے امیر
نوجوانوں میں مل جاتی تھیں۔ اس لئے کسی ایسے غیر معمولی نوجوان
سے اس کی محبت ہو جائے۔ یہ امکان نفی کے برابر تھا۔ اجیت کو
اپنی کم مائیگی کا احساس تھا لیکن یہ بات اس نے جھوٹ بول کر پوری
کرنی چاہی تھی۔ اس نے اندرا کو بتایا تھا کہ وہ ہوٹل کے مالک کا
لڑکا ہے اور یہ بات اس لئے چل گئی تھی کہ ہوٹل کا مالک ہوٹل
میں شاذ ہی بیٹھتا تھا اور سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ
اپنے کسی دوست کو بغیر چارج کئے جو چاہے کھلا پلا سکتا تھا۔

ہوٹل کی ملازمت میں ایک رکاوٹ یہ تھی کہ اجیت دن
بھر کے لئے بندھ جاتا تھا اور کسی رومان کو پروان چڑھانے کے لئے گھومنے
پھرنے کی آزادی بڑی ضروری تھی۔ اسے ہوٹل میں صبح ہی آنا
پڑتا تھا اور رات کے نو بجے فارغ ہوتا۔ جب ہوٹل کا مالک
حساب وغیرہ چیک کرنے کے لئے خود آ بیٹھتا۔ عام حالات
انہی مالی دشواریوں کے باوجود وہ شاید اس نوکری کو چھوڑ دیتا
لیکن اس میں ایک دلچسپی بھی تھی۔ دن بھر اس ہوٹل میں
لوگ آتے رہتے تھے جن میں خوبصورت نوجوان لڑکیاں اور
عورتوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہوتی۔ وہ آرام سے کاؤنٹر
پر بیٹھا ان چہروں کو دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔
کبھی کبھی ان خوبصورت چہروں کو بالکل قریب سے دیکھنے
اور ان سے بات کرنے کا موقع بھی مل جاتا اور اس طرح اس
کی یکسانیت اور تھکان مٹتی رہتی۔ وہ اپنے ذہن میں آنے
والی اور جانے والی عورتوں کا موازنہ کرتا رہتا کہ کس کی کونسی
بات اچھی تھی یا ہے اور یہ ایک دلچسپ شغل تھا جس سے
اس کا ایک عجیب سا جذبہ تسکین پاتا رہتا۔

یوں تو وہ بہت سے چہرے ہر روز دیکھتا لیکن جو
[illegible]

کے اوپر کی جانب ابھارا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور اس
کے ہونٹوں کی شادابی ایک عجیب طرح کی [illegible] اندرا
اس کے ذہن پر چھاتی چلی گئی۔ وہ جانتا تھا کہ اندرا اور بھی
کئی نوجوانوں کے ساتھ گھومتی ہے لیکن اس بات نے اسے
مایوس نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے اوپر بھروسا تھا اور اسے یقین
تھا کہ اندرا اس کے قریب آگئی تو وہ اسے دور نہ جانے دے گا۔
ویسے جب سے اندرا کو یہ پتہ لگا کہ وہ ہوٹل کے مالک کا لڑکا
ہے وہ اس کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگی تھی اور وہ اب اکثر
ہوٹل میں اکیلی ہی آتی تھی۔ ادھر نلنی حیران تھی کہ اجیت کو کیا
ہوگیا۔ وہ کھویا کھویا سا پریشان کیوں رہتا ہے وہ اپنے معمول
کے خلاف رات کو بہت دیر سے کیوں لوٹتا ہے اور جس روز
اس کی چھٹی ہوتی ہے وہ صبح ہی کیوں اور کہاں چلا جاتا ہے۔
ملاقاتیں کیا ہوئیں۔ اب تو کئی کئی دن گزر جاتے تھے اور بات
تک بھی نہیں ہوتی تھی۔ نلنی گزری ہوئی باتوں کو یاد کر کے
کئی بار چپکے چپکے رو لی۔

ایک رات جب سو گئے تھے تو دریچے سے [illegible]
پر کھڑی ہوگئی۔ وہ دیوار سے لگی کھڑی رہی اور اجیت کا انتظار
کرتی رہی۔ اجیت آیا تو نلنی اندھیرے میں اس کے سامنے آگئی
اجیت بولا۔

"کون نلنی؟ میں تو ڈر ہی گیا تھا!"

نلنی خاموش کھڑی رہی اس نے اپنا ہاتھ اجیت کے
سینے پر رکھ دیا۔ اس کے دل میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا اور
وہ رونے لگی۔ اجیت اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"تو رو کیوں رہی ہے پگلی کہیں کی!"

لیکن نلنی کے آنسوؤں نے اس کے دل کو موم نہیں کیا۔
جب نلنی اس کے سینے سے لگی رو رہی تھی تو اس وقت بھی وہ
اندرا کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اس نے نلنی کو [illegible]
دی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اگلے ہی روز جب وہ اجیت اندرا رات کے سناٹے میں جامع بیچ کے ایک تنہا بنچ پر بیٹھے تھے تو اندرا بولی

" میں نہیں جانتی تھی کہ میں آپ کے اتنا قریب آجاؤں گی آپ میں بے پناہ کشش ہے۔"

اجیت اندرا کے خوشبو میں بسے ہوئے ریشمی بالوں سے کھیل رہا تھا اور ایک لطیف ٹھنڈی ہوا اس کے ذہن کو تھپکے دے رہی تھی وہ بہت فخر محسوس کر رہا تھا کہ اندرا جس کا پانا کبھی اس کے لئے ایک خواب سا تھا ۔اب اس کے اتنی قریب تھی۔ لیکن وہ اندرا کو صرف اپنے لئے چاہتا تھا۔ اندرا کے کہنے کے باوجود اسے یہ یقین نہیں تھا کہ وہ صرف اس کی ہے۔ دن بھر اندرا کہاں اور کس کے ساتھ گھومتی ہے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور شام کو بھی کسی کسی دن تو اسے ملتی بھی نہیں تھی چند ہی روز پہلے کی بات تھی کہ اس نے اندرا کو ایک کافی ہاؤس میں دو نوجوانوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا جن میں سے ایک رام کشن تھا جو بہت بدنام تھا۔ ایک بار اور اس نے اندرا کو ایک سینما گھر میں ایک امیر نوجوان کیلاش کے ساتھ دیکھا تھا۔ کیلاش کو اجیت بھی تھوڑا بہت جانتا تھا۔ اسے کیلاش سے نفرت تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اندرا کیلاش کا ساتھ چھوڑ دے اور اجیت نے موقع دیکھ کر کیلاش کا ذکر چھیڑ دیا تو اندرا بولی ۔

" آپ مجھ پر خواہ مخواہ شک نہ کیا کریں۔ میں خود کیلاش کو پسند نہیں کرتی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ آئندہ مجھے اس کے ساتھ نہیں دیکھیں گے۔"

اس کے کئی دنوں بعد اندرا نے اجیت سے کہا کہ اسکے گھر والوں کو سوموار کو تین سو روپے کی سخت ضرورت ہے اور وہ اس کے لئے اجیت کے سوا اور کسی سے نہیں کہہ سکتی ۔ سوموار میں ابھی دو روز باقی تھے اور اجیت نے بے سوچے سمجھے وعدہ کر لیا۔ اس کے سوا شاید اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا اس رات اندرا جلدی چلی گئی لیکن اجیت گھر نہیں گیا۔ وہ اکیلا پارک میں بیٹھا سوچتا رہا کہ کہاں سے سوموار تک تین سو روپے پیدا کئے جا سکتے ہیں لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ تین سو روپے اس کے لئے بہت بڑی رقم تھی وہ مشکل سے صرف دس بیس روپے بچا سکتا تھا اسے کوئی بھی دوست ایسا نظر نہیں آیا جو اسے یہ رقم ادھار دے سکتا تھا۔

جب وہ پارک سے گھر جانے کے لئے اٹھا تو گیارہ بج چکے تھے اور ساری سڑکیں سونی ہو گئی تھیں۔ فضا میں کافی خنکی تھی اور وہ ایک سوچ میں ایک ڈوبا ہوا جھکا جھکا آگے بڑھ رہا تھا، کچھ آگے جا کر وہ ایک گلی میں مڑ گیا جس سے گزر کر وہ گھر جلد پہنچ سکتا تھا۔ اس گلی میں بڑا اندھیرا تھا۔ وہ ابھی گلی میں گھسا ہی تھا کہ دوسرے سرے سے ایک چیخ سنائی دی پہلے وہ ڈرا لیکن پھر دوڑ کر آگے بڑھا۔ ایک آدمی کو تین آدمیوں نے دبوچ رکھا تھا اجیت کے پہنچتے ہی وہ تینوں آدمی بھاگ گئے۔ نیچے گرا ہوا آدمی کراہ رہا تھا۔ اجیت نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور گلی کے باہر روشنی میں لے آیا۔ اجیت نے اسے غور سے دیکھا۔ یہ تو ریس کورس کا مشہور جوکی چارلی تھا۔ چارلی ہانپتے ہوئے بولا۔

" تم نے آج میری جان بچالی۔ یہ غنڈے گلا گھونٹ کر مجھے مارنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ساتھ میری پرانی دشمنی ہے اس احسان کا بدلہ میں صرف ایک شکل میں دے سکتا ہوں کہ پرسوں " بجلی " گھوڑے پر جو چاہے لگا دینا۔ جلدی جاؤ گے تو ایک اور آٹھ کا بھاؤ ملے گا۔"

اجیت کو ریس کا شوق نہیں تھا لیکن دو تین بار وہ ریس میں جا چکا تھا اور بدقسمتی سے ہار کر ہی آیا تھا۔ ریس اتوار کو تھی۔ اگر چارلی کا ٹپ ٹھیک نکلا تو عین وقت پر سوموار سے پہلے ہی اسے اندرا کو دینے کے لیے روپے مل جائیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا قدرت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ اس سے بمشکل پچاس روپے کا انتظام ہو سکا اور وہ وقت سے پہلے ہی ریس کورس پہنچ گیا۔

" بجلی " پہلی ہی ریس میں دوڑ رہا تھا۔ گھوڑا دیکھنے میں کوئی خاص نہیں تھا اور پبلک کی اس کے بارے میں خیال کچھ

تھا۔ اس کے مقابلے میں 'جھانسی کی رانی' اور 'لال قلعہ' کے بارے میں یہ عام خیال تھا کہ بالترتیب اول اور دوم آئیں گے۔ اور دیکھنے میں بھی ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ ادھر ادھر کی افواہیں سن کر اجیت کچھ گھبرایا۔ وہ بکنگ کی طرف آیا۔ 'بجلی' کا بھاؤ ایک اور آٹھ تھا اور کوئی بھی اس پر روپیہ نہیں لگا رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔ 'بجلی' پر کچھ روپیہ لگایا اور اس کا بھاؤ ایک اور سات ہوگیا۔ اس نے دل کڑا کر کے 'بجلی' پر پچاس روپے لگا دیئے۔ ریس شروع ہوگئی۔

اجیت کی نظریں 'بجلی' پر جمی ہوئی تھیں۔ گھوڑوں کی ٹاپ اس کے دماغ میں کیلیں ٹھونک رہی تھی۔ 'بجلی' بہت پیچھے تھا اور 'جھانسی کی رانی' امید کے مطابق سب سے آگے تھی لیکن 'لال قلعہ' اس سے صرف ایک دو ہاتھ ہی پیچھے تھا۔ اجیت کی گردن کھنچ کر بہت لمبی ہوگئی تھی وہ پریشان خاطر 'بجلی' کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک 'بجلی' کے قدموں میں بلا کی تیزی آئی، ایک غبار سا اس کی ٹانگوں میں الجھا اور وہ ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرنے لگا۔ وہ 'لال قلعہ' کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ بھیڑ میں ایک شور اٹھا اور اجیت کی گردن سارس کی گردن بن گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور اس کے گالوں پہ امید کی سرخی لپکی۔ 'بجلی' بالکل 'لال قلعہ' کے برابر چل رہا تھا اور پھر آناً فاناً 'جھانسی کی رانی' پیچھے رہ گئی۔ 'لال قلعہ' اور 'بجلی' دوش بدوش ہوا کی طرح آگے بڑھ رہے تھے اور جب 'بجلی' نے ایک اور جست لگا کر 'لال قلعہ' کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تو مجمع میں ایک شور پھوٹ پڑا۔ اجیت نے خوشی کی ایک چیخ ماری اور انتہائی جوش میں اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔

وہ اس ریس کے بعد یہاں سے فوراً چل پڑا۔ اس کے قدموں میں ایک تیزی تھی اور اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ٹیکس دینے کے بعد بھی اس کی جیب میں ساڑھے تین سو سے زیادہ روپے تھے۔ اس نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ ایک اسکوٹر پر بیٹھا اور سیدھا [illegible] ریسٹوران پہنچ گیا۔ یہاں کھانا کھا کر وہ باہر نکلا اور اندرا کی تلاش میں گھومنے لگا اگرچہ اسے [illegible] تھا کہ وہ اتوار کو ادھر نہیں آئے گی اور اس سے [illegible] لیکن پھر بھی وہ ایک چانس لینا چاہتا تھا کیونکہ [illegible] بر چل رہی تھی اور وہ اندرا کے سامنے ایک کامیاب [illegible] طور پر جانے کے لئے تقریباً تڑپ رہا تھا۔

وہ شام تک ادھر ادھر پھرتا رہا لیکن [illegible] کہیں نہیں ملی۔ شاید وہ بھی آج ادھر نہیں آئی تھی۔ [illegible] کی بجائے اس نے سینما دیکھنے کا فیصلہ کیا اور وہ پلازا کی [illegible] بڑھا۔ شو ختم ہونے پر وہ اندر سے نکلتی ہوئی بھیڑ کی لہروں میں گھسا ہوا باہر نکل رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اوپر سے اترتی ہوئی اندرا پر پڑی۔ وہ اس کی طرف لپکنا ہی چاہتا تھا کہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اندرا کے ساتھ کیلاش بھی تھا اور وہ دونوں شو دیکھ کر اتر رہے تھے۔

اجیت کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ایک [illegible] لئے تو اس کے جی میں آیا کہ وہ کیلاش کی گردن پکڑ لے اور اندرا کو بھی ٹھیک کر دے مگر کچھ سوچ کر رک گیا اور بھیڑ میں [illegible] گیا تاکہ اس کی نظریں اس پر نہ پڑیں اور جب وہ [illegible] گئے تو وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی مانند [illegible] سینما کے گیٹ سے باہر نکلا۔ اس نے اپنی آنکھیں [illegible] ایک کٹھ پتلی کی طرح چلنے لگا۔ اس کی نظروں کے [illegible] اندرا کیلاش کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے اتراتی ہوئی [illegible] تھی۔ پٹڑی پر سے گزر کر وہ دونوں پارک کی طرف [illegible] اور اجیت نے دیکھا کہ سڑک کو پار کرتے ہی کیلاش اور [illegible] دوسرے کے بہت ہی قریب ہو کر چلنے لگے تھے۔

اجیت چند لمحوں تک اس اندھیرے [illegible] جس کی گود میں اندرا اور کیلاش کی پرچھائیاں [illegible] پھر اس نے اپنے پھٹے ہوئے گریبان کی طرف [illegible] ایک شدید ذہنی کوفت کا احساس ہوا۔ وہ [illegible] ہی گھر کی طرف چلنے لگا۔ جب وہ [illegible]

[illegible]

چاند رعنا کی مسلسل آوارہ گردی کے بعد آخر اسی کلب میں پناہ ملی جہاں سلمیٰ کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ یہ کلب شہر کے ایک اونچے ہوٹل کی چھت پہ واقع ہے۔ اور مقصد اس کے قیام کا نوجوانوں کی تفریح ہے۔ نوجوانوں کی تفریح کے شہر میں کچھ کم ذرائع تو نہیں ہیں۔ سمندر کے کئی ایک ساحل ہیں۔ اولڈ کلفٹن ہے۔ پیراڈائز ہے۔ اور جگ مگ جگ مگ کرتی ہوئی سڑکیں ہیں جن پہ سب سے سستی اور بہترین تفریح ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کلب کی نوعیت ہی مختلف ہے اور یہاں بزرگ حضرات بھی عمر رفتہ کو آواز دینے آجاتے ہیں۔ شہر کے اکثر نوجوان اس کلب کے رکن ہیں جو ہر شام اپنے دوست احباب کے ہمراہ آتے۔ پینا اور پلانا ساتھ ہیں الکحل اور لڑکی دونوں ہی ہمراہ رکھتے ہیں اور شب کے پچھلے دھندلکوں تک لڑکیوں سے محو رقص رہتے ہیں۔ یہ کلب لندن کے کسی پبلک بار کا منظر پیش کرتا ہے۔

مجھے سلمیٰ اسی کلب میں ملی تھی۔ اپنے ایک دوست کے ذریعے میں اس کلب کا رکن بن گیا تھا۔ رکنیت کے لئے رقم بڑے بھائی سے لی تھی کیونکہ میں تو بیکار تھا اور میری کماؤ بیوی بھی مجھ سے ناراض ہو کر مجھے اپنے گھر سے نکال چکی تھی۔

عورت جب اپنے لبوں کو سرخ کرتی ہے تو اس کے چہرے پہ یقیناً تازگی آجاتی ہے لیکن جب وہ اپنے رخساروں کو سرخ کرتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ بازار میں کھڑی پکا رہی ہے کہ آؤ مجھے خرید لو۔!

میری شادی میری زندگی کا بدترین حادثہ تھی۔ ان دنوں میں پچیس سال کا نوجوان تھا۔ کئی جگہ ملازمتیں ترک کر کے گھر میں بیٹھا بھائی کی روٹیاں توڑ رہا تھا۔ ملازمت میں ایک تو تین چار سو سے زیادہ نہیں ملتے تھے۔ اور پھر دوسروں کے ماتحت ہو کر کام کرنا پڑتا تھا سا کھتی میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے جہاں جاتا لڑائی جھگڑا شروع کر دیتا۔ لیں میں بھی چاہتا تھا کہ ہر ماہ بے تحاشا روپیہ کہیں سے ملے۔ اور میری جیبیں ہر لمحہ بھری رہیں اور میں سوسائٹی میں اتنا مقبول ہو جاؤں کہ مجھے محبت کے کھلاڑی کا خطاب مل جائے۔

بھیا شہر کے تمام بڑے کلبوں کے رکن تھے۔ جہاں میں کبھی کبھار بحیثیت مہمان جاتا تھا۔ خود رکن بننے کے لئے ان کلبوں میں میرا کوئی سماجی رتبہ نہ تھا۔ اور میں معموں اور لاٹری سے دولتمند بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ گھوڑ دوڑ اور سٹے بازی سے یقیناً یہ سرمایہ مل سکتا تھا۔ لیکن میں جواریوں کو خودکشی کرتے بھی دیکھ چکا تھا اپنا ایسی چیزوں سے دور ہی رہتا تھا جن سے زندگی کی مہک کے بجائے موت کی بو آتی ہو۔

بابا بھی کچھ جائیداد یا سرمایہ ہم بھائیوں کے لئے چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ وہ کافی شوقین آدمی تھے۔ پابلا ہم سب یہاں گھر میں تھے

[illegible] گھر میں منڈلاتے نظر آتے تھے۔ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا میں تھا۔ اس لئے فٹ بال کی مانند مختلف ماؤں اور مختلف بہن بھائیوں کے درمیان لڑھکتا رہتا۔ گھر میں مجھے کوئی بھی پسند کرتا تھا۔ کوڑے کے ڈھیر میں پڑے کسی سستی سی سبزی ترکاری کے گلے سڑے چھلکے کی مانند میرا وجود تھا۔ میری اپنی ماں بھی میری پیدائش سے خوش نہ تھی۔ بس لے میری ولادت کے دو ہفتہ بعد ہی زمین میں دفن ہو گئی۔ اور مجھے کسی دوسری ماں نے بھی کبھی پیار نہ دیا۔ اپنی ماں سے ہم دو ہی بھائی تھے۔ بھیا مجھ سے چھ سال بڑے تھے۔ اور میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ لیکن ان کا خیال رکھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ بابا تو پیدا کرنے کے بعد ہی ہم دونوں بھائیوں کو بھول گئے تھے۔ کبھی بھولے بھٹکے سے کسی ماں یا بڑی بہن کو ہم پہ رحم آ جاتا تو ہمیں پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھانپنے کو کچھ مل جاتا۔ ورنہ ہم ملازموں کے بچوں میں شامل گلیوں میں آوارہ گردی کرتے رہتے۔

ہمارا گھر کچھ زیادہ بڑا نہ تھا۔ صوبہ سرحد کے ایک پہاڑی علاقہ میں بڑے بے ڈھنگے پن سے بنا تھا۔ اس میں گھروں والی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ مٹی کی اونچی اونچی دیواروں اور چھوٹی چھوٹی دیکھیوں کا گھر تھا جس پہ کسی قید خانہ کا گمان ہوتا تھا۔ دراصل بابا کے ذہن پہ ہر وقت قید خانہ ہی مسلط رہتا تھا۔ بابا انگریز سرکار کی قید میں شامل تھے۔ اور جب ہندوستان میں ہجرت تحریک چلی تھی تو بابا بھی انگریز سرکار کی جانب سے ہجرت کرنے والوں میں شامل ہو کر افغانستان چلے گئے تھے۔ اور ہندوستان واپسی پہ بھی تحریک آزادی کے دیوانوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ اس کارکردگی کے صلہ میں بابا کو کچھ زمین کاشتکاری کے لئے مل گئی تھی۔

تنگ [illegible] کے سبب بابا نے بڑے بیٹوں کے ساتھ ہی [illegible] پہ لگے رہتے تھے۔ بابا کے انتقال کے بعد زمین پہ بڑے بیٹے [illegible] ہو گئے [illegible] کے ساتھ ہم دونوں بھائی گھر سے نکال دیئے گئے [illegible] تھے ہم اپنی [illegible] میں [illegible] نے ہماری [illegible] کے

[illegible] رہتی تھیں [illegible] ایک [illegible] کی [illegible] کے [illegible] لمحہ بھی نہ دیا تھا۔

رونے دھونے کے بعد خالہ نے ہماری [illegible] پھر ہماری تعلیم و تربیت میں مصروف ہو گئیں۔ خالہ کے [illegible] قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی۔ تاہم ہمیں آزادی کبھی میسر نہ تھی [illegible] کے لئے خالہ کا ہی تابع ہونا پڑتا۔ خالہ بڑے بھیا کو [illegible] نہ رکھتی تھیں کیونکہ خالہ کی ایک صاحبزادی تھیں [illegible] تیز۔ صورت شکل کے معاملے میں کورا گھڑا۔ اور بھیا سے [illegible] بڑی تھیں۔ خالہ اکثر اس بیٹی افروز سلطانہ کے لئے پریشان [illegible] لیکن بھیا جب انٹر تک پڑھ گئے اور بابا کی مانند پولیس میں بھرتی ہو گئے تو خالہ بھی بے فکر ہو گئیں۔

بائیس سال کی عمر میں بھیا کی شادی افروز سلطانہ سے [illegible] ایم۔ اے کر کے ایک کالج میں پڑھانے لگی تھیں۔ وہ اپنی تعلیم [illegible] پہ نازاں تھیں اور بھیا کو چڑیا کا غلام سمجھتی تھیں

بھیا اس نازک مزاج۔ بد مزاج چڑیا افروز سلطانہ [illegible] غلامی کب تک کرتے۔ ایک روز ملازمت، بیوی اور [illegible] چھوڑ چھپے سے کراچی بھاگ آئے۔ اور یہاں کسی کمپنی میں ملازمت کر لی۔ اس ملازمت میں تیدریج بھیا کا رتبہ بلند سے بلند ہوتا [illegible] بھیا نے جدید فیشن کی ایک لڑکی سے شادی کر لی اور سوسائٹی [illegible] بنا کر رہنے لگے۔

بھیا کراچی مجھے بھی اٹھوا کر لائے تھے۔ اور یہاں کالج میں داخل کرا دیا تھا۔ لیکن پڑھنے لکھنے کا مجھے شوق نہ تھا [illegible] بائیس سال کی عمر تک کہیں کالج کے سال اول تک پہنچ پایا تھا۔ ناجائز شرارتوں کی وجہ سے کالج سے نکال دیا گیا۔ دوبارہ کہیں داخل ہونے کی زحمت گوارا نہ کی۔ بھیا نے بھی مجھے مجبور نہ کیا۔ بہت خیال رکھتے تھے۔ لیکن بھابی کو تو میرا گھر میں رہنا [illegible] کا کھانا ایک آنکھ نہ بھاتا۔ وہ بات بے بات مجھ سے [illegible] اس خواہش کا اظہار بھی کئی مرتبہ کر چکی تھیں کہ مجھے [illegible] رہنا چاہیئے۔

[illegible] کی تیز باتوں [illegible] نے

بیانات کو جواب دے دیا تو سیاسی کی بجائے گئے۔ اور بستر لپیٹ یہ

بغل میں دبائے میں اپنے ایک دوست کے گھر چلا آیا جو لاہور کے

میرے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ اور پیرس سے فنون لطیفہ کی تعلیم

لے کے کراچی آکر بہت بڑا آرٹسٹ بن گیا تھا اور پیرس

کے کئی آرٹسٹوں کے انداز میں رہتا تھا۔ اس کے گھر میں بڑی

وسعت تھی۔ میرے آوارہ دوست اس کے گھر میں پناہ لئے ہوئے تھا۔

دوستوں کے علاوہ ایک جرمن لڑکی بھی مقیم تھی۔ یہ لڑکی میرے

آرٹسٹ دوست کے ادارہ میں پینٹنگ کا درس دیتی تھی۔ جرمنی سے

یہ لڑکی محض آرٹ کی تعلیم دینے کراچی نہیں آئی تھی۔ آرٹسٹ

دوست کو یہ پیرس میں ملی تھی اور کراچی پاکستانی ماحول کا تجزیہ کرنے

آئی تھی۔ آیا وہ اس معاشرے کے تقاضے پورے کر سکتی ہے یا نہیں؟

اگر یہ معاشرہ پسند آیا تو آرٹسٹ دوست سے شادی کرے گی ورنہ

واپس لوٹ جائے گی۔

اس جرمن لڑکی کو مجھ میں جانے کیا خوبی نظر آئی کہ اپنے آرٹسٹ

دوست کے بجائے مجھ میں دلچسپی لینے لگی اور یہی بات میرے آرٹسٹ

دوست اور میرے درمیان فتنہ کا باعث بن گئی۔ اور مجھے آرٹسٹ

دوست کے گھر سے بھی بے آبرو ہو کر نکلنا پڑا۔

دو روز کسی دوست کے گھر میں بڑی پریشان حالت میں

گزارے اور تیسرے روز بشریٰ کے گھر کا راستہ لیا۔ بشریٰ پینٹنگ

سیکھنے اسی آرٹسٹ دوست کے ادارے میں آیا کرتی تھی۔ کافی بدصورت

اور غیر لنتعلیق قسم کی لڑکی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ مل کر کوئی

تجارت وغیرہ کا کام کرتی تھی۔ اب کوئی کہے کہ اس بدصورت۔

سرسوں کے تیل میں چپڑے بالوں اور کوئی تجارتی کام کرنے والی

لڑکی کو بھلا فنونِ لطیفہ سے دلچسپی لینے کی کیا مصیبت پڑ گئی تھی!

تمام لڑکے بشریٰ کا بہت مذاق اڑاتے تھے کہ یہ تو تلاشِ

نجر میں یہاں آنکلی ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے شہر میں ایسی ہوا چلی تھی

کہ لڑکیاں خود ہی شوہروں کی تلاش میں ہر ادارہ میں بھٹکتی پھرتی

تھیں۔

[illegible]

وہ رنگ گھولتے تو [illegible] میں اس کی پیالیاں الٹ دیتا۔ جب [illegible]

بورڈ پہ برش لگاتی تو میں برش چھین کر اس کی تصویر پر لکیریں کھینچ دیتا جو

تجریدی آرٹ کا بہترین نمونہ بن جاتیں۔ لیکن بشریٰ اعلیٰ [illegible] کے زمانہ

کی لڑکی تھی۔ بیٹھی کبھی سوہنی مہینوال بناتی اور کبھی ہیر رانجھا!

افوہ! بشریٰ کے دماغ میں کس قدر رومانس ٹھنسا تھا۔

بشریٰ کے مہینوال اور رانجھا کو ہم لڑکے اکثر بھیانک صورتوں

میں بدل دیتے تھے کیونکہ وہ مہینوال اور رانجھے کی صورت میں میری

صورت شامل کر دیتی تھی جس پہ لڑکے بہت ہنستے تھے اور مجھے سخت

غصہ آتا تھا۔ آخر ایک بدصورت لڑکی کو کیا حق پہنچتا تھا۔ کہ مجھے اپنا

مہینوال اور رانجھا بنائے۔ لیکن اس کے باوجود جب ہمیں پیسوں

کی تنگی ہوتی تو بشریٰ ہی آڑے آتی۔

آرٹسٹ دوست کے جمگھٹے میں سب سے زیادہ نکما

میں ہی تھا۔ بشریٰ میری بیکاری سے بہت متاثر تھی اور اکثر

کہتی تھی۔

"نکمے لڑکے۔ یوں وقت نہ گنواؤ، کچھ کر لو۔ جوانی میں کام

نہیں کرو گے تو کیا بڑھاپے میں کرو گے۔؟"

بشریٰ کی ان باتوں۔ اس کی ہمدردی اور لگاؤ کی مجھے

چنداں پروا نہ تھی۔ ایک سے ایک خوبصورت لڑکی مجھے پسند کرتی

تھی اور آرٹسٹ دوست کی جرمن محبوبہ تو بالکل ہی مجھ پہ فریفتہ تھی۔

بشریٰ نے جب مجھے جرمن لڑکی کی جانب متوجہ دیکھا۔ تو کچھ دنوں

تک تو رکھائی سے پیش آتی رہی۔ روئی روئی سی نظر آتی رہی اور پھر

ایک روز ادارہ چھوڑ گئی۔ جانے سے پیشتر اپنے گھر کا پتہ دے کر

بشریٰ نے کہا تھا۔

"نکمے لڑکے۔ اگر کبھی میری ضرورت پڑے، تو بلا جھجک

میرے گھر چلے آنا۔"

آرٹسٹ دوست کے گھر سے نکلا۔ تو بشریٰ کی یاد آئی۔

بشریٰ مجھے دیکھتے ہی خوشی سے یوں کھل اٹھی کہ [illegible]

بدصورتی میں بھی جاذبیت نظر آنے لگی۔ [illegible]

[illegible] کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی تھی تم لوٹ کے ۔ تم یہاں ضرور آؤ گے ۔ میں ہر روز تمہارا انتظار کرتی تھی ۔ مجھے اپنے پیار کی صداقت پر پورا اعتماد تھا ۔۔۔"

"پیار ۔۔۔ لمحہ بھر کے لئے میں چونک اٹھا ۔ اس گھر میں پناہ حاصل کرنے کے لئے کیا مجھے پیار کا ڈھونگ رچانا پڑے گا ۔ وہ بھی اس ناقابل برداشت لڑکی سے۔

مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ۔ زیادہ گھن تو اس وقت آتی جب بشریٰ اپنے پیار کا اظہار کرتی ۔ اس سیدھی سادی سی لڑکی میں اس قدر جوش [illegible] کہاں سے آگیا تھا کہ بالکل ہی طوفان بن گئی تھی ۔ اور اس طوفان کی رفتار اتنی تیز تھی کہ میرے قدم بھی لڑکھڑا گئے اور بشریٰ کے آگے میں نے سر تسلیم خم کرلیا۔

بھیا اور بھابی کو جب میں نے شادی کی اطلاع دی تو دفعتاً ان کی تمام تر محبت مجھ پر ٹوٹ پڑی ۔ وہ ہنگامہ کرتے بشریٰ کے گھر آئے ۔ اور ہر ممکن کوشش کی کہ میں بشریٰ سے شادی نہ کروں ان کا کہنا تھا کہ بھلا اچھے خاندانوں کی لڑکیاں کہیں خود لڑکے تلاش کرتی ہیں ۔ اور خود ہی لڑکے کو گھر میں رکھ کر بیاہ رچا لیتی ہیں بھابی بشریٰ کے والدین سے خوب لڑیں ۔ مجھے کسی اچھی خوبصورت اور خاندانی لڑکی سے شادی کا لالچ دیا ۔ لیکن مجھے بشریٰ سے بہتر کون مل سکتی تھی ۔ کیا ہوا اگر آٹھ سال بڑی تھی ۔ از خود سلطانہ بھی تو بھیا سے بڑی تھی ۔ اور پھر بشریٰ کی ماہانہ آمدنی اتنی تھی کہ میں ایک شاندار زندگی گزار سکتا تھا۔

"بعد [illegible] لڑکے ۔ یہ بشریٰ بیگم کچھ متوسط یا متوسط طبقے سے نکل کر نہ جانے کیسے امارت کے درجے تک پہنچی ہے ۔ اس طبقے کے لوگ کتنا آگے کیوں نہ بڑھ جائیں ان کی پچھلی عادات اور کچھ خصوصیات باقی رہتی ہیں" بھابی نے مجھے آخری مرتبہ سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن [illegible]

[illegible]

اور میں بھائی و بھابی سے [illegible] شوہر کی حیثیت سے رہنے لگا ۔ ہمارے بیاہ میں کوئی دھوم نہ ہوئی تھی ۔ نہ ہم ہنی مون منانے کیلئے کہیں گئے تھے ۔ [illegible] کا ایک ہفتہ ہم نے ایک اچھے ہوٹل میں بے فکری سے گزارا [illegible] پھر بشریٰ اپنے معمولات میں مصروف ہوگئی تھی ۔ میں نے بشریٰ کے کام کی نوعیت معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی ۔ میرے لئے یہ جاننا ہی کافی تھا کہ وہ باپ کی تجارت سنبھالتی ہے ۔ اس کا بڈھا بان کی کھری چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑاتا ہے اور ماں گھر بار [illegible] ہے ۔ میں دوستوں میں اترایا اترایا پھرتا رہتا ۔ شادی کے بعد سماج میں میرا بھی ایک مقام ہوگیا تھا ۔ اور ان لٹیرے دوست سے بھی میری صلح ہوگئی تھی ۔ میں شہر میں منعقد ہونے والی تصویروں کی ہر نمائش میں نظر آنے لگا تھا ۔ اونچے ہوٹلوں اور کلبوں میں جانے لگا تھا۔

شروع شروع میں بشریٰ نے ان معاملوں میں مجھ سے تعاون کیا ۔ جھم جھم کرتے کپڑے پہنے ، ڈھیروں زیورات لاد کے میرے ساتھ اکثر مقامات پر جاتی ۔ اور بے وقوفوں کی مانند یا تو اپنے پرانے وضع کے لباس و انداز کی نمائش کرتی ۔ یا پھر شرماتی چلی جاتی ۔

لیکن بعد میں بشریٰ نے میرے ساتھ باہر نکلنا ترک کر دیا وہ اس قسم کے ہنگاموں کی عادی نہ تھی ۔ فیشن ایبل [illegible] لوگوں کے درمیان بیٹھ کر مختلف زبانوں میں گفتگو کرنے کے بجائے وہ دفتر میں عجیب و غریب حلیے کے لوگوں میں بیٹھ کر [illegible] کی اردو یا پنجابی میں نامانوس الفاظ [illegible] کا کہنا تھا کہ وہ تجارتی اصطلاحات میں گفتگو کرتی ہے [illegible] درآمد برآمد کے سلسلے میں آتے ہیں ۔ بشریٰ کا دفتر سنبھالنے [illegible] نپٹانے کی خواہش کا اظہار جب میں نے بشریٰ سے کیا [illegible]

[illegible]

بیوی سے مجھے بے شمار شکایات کی ابتدا ہوئی۔ اور مجھے محسوس ہوا
بشریٰ میرے لئے انتہائی ناموزوں لڑکی تھی۔ وہ نہ صرف اجڈ،
بدمزاج، بدگفتار اور لڑاکا تھی بلکہ لباس کی بھی کوئی تمیز نہ رکھتی تھی۔
کبھی کسی فلم میں جانے کا اتفاق ہوتا تو بھڑکیلے زیورات لاد لیتی اور
شوخ رنگ کے چبھتے والے کپڑے پہن لیتی۔ بشریٰ کو غالباً ہر لمحہ اپنا یوم
شادی یاد آتا تھا اور اسے اس بات کا شدید رنج تھا کہ اس کی شادی
میں بہت کم لوگ شریک ہوئے۔ اور اس کے عجیب و غریب ملبوسات
کو چند ایک بیویوں کے علاوہ اور کوئی اسے دلہن بنتا نہ دیکھ سکا۔ اسی
لئے وہ دنیا بھر پہ اپنے دلہناپے کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔

میں ہمیشہ بڑے اچھے الفاظ میں بشریٰ کو سمجھانے کی کوشش
کرتا۔ اوہ! اس کے سرخی پاؤڈر سے مجھے کس قدر نفرت تھی۔ عورت
جب اپنے لبوں کو سرخ کرتی ہے تو اس کے چہرہ پہ یقیناً تازگی آجاتی ہے
لیکن جب وہ رخساروں کو سرخ کرتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ
بازار میں کھڑی پکار رہی ہے ——— آؤ مجھے خرید لو ———! لیکن جب
میں یہ کہتا تو بشریٰ کا اس بات پر چہرہ بگڑ جاتا۔ ان ہی معمولی معمولی باتوں پہ
ہمارے جھگڑے بڑھتے چلے گئے۔ ان جھگڑوں کے درمیان ایک روز
مجھ پہ انکشاف ہوا کہ بشریٰ بیگم کی تجارت دراصل کاروبار اسمگلنگ
ہے ———

خدایا! مجھے تو اپنی تمام تر بیکاری کے باوجود اس گھناؤنے
کاروبار کا خیال نہ آیا اور بشریٰ ——— یہ سیدھی سادی لڑکی ——— جو فنون
لطیفہ سے بھی رغبت کا اظہار کرتی تھی۔ ناجائز کام بھی کرتی تھی۔ اور
فنون لطیفہ کو ایک ڈھال بنا رکھا تھا تاکہ کوئی شک نہ کرے اور وہ
تمام ڈاکو نما لوگ جو دفتر میں آتے تھے، جن کے ساتھ بیٹھ کر تمباکو
والے پان چباتی تھی اور چرس بھرے سگریٹ پیتی تھی، دراصل لاہور
اور پشاور کے اسمگلر تھے اور بشریٰ جو بعض اوقات اپنی کسی خالہ زاد
بہن یا کسی ماموں زاد بھائی کے بیاہ میں شرکت کا بہانہ کر کے کبھی لاہور
اور کبھی ڈھاکہ جاتی تھی تو درحقیقت اسمگلنگ کے سلسلہ میں جاتی تھی
کس قدر مضحکہ خیز بات تھی کہ اسمگلرز کی بیویوں کا تو ذکر سنا کرتے تھے
اب اسمگلرز کے شوہر بھی ہونے لگے۔

اس انکشاف کے بعد مجھے یقیناً بشریٰ کا گھر چھوڑ کر چلا جانا
چاہئے تھا لیکن کہاں جاتا؟

کہیں بھی تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا لہٰذا وہیں ٹکا رہا۔ لیکن میرا
ذہنی سکون غارت ہوگیا تھا۔ میں نے الکحل میں پناہ لے لی تھی۔ میں
شب بھر اس کلب میں موسیقی کے سہارے پہ زندگی کو چھوڑ
دیتا تھا جہاں سلمیٰ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

دن کا ہر ہر لمحہ بشریٰ کی حرکات و سکنات پہ نگاہ رکھنے میں
گزرجاتا تھا۔ اسی جاسوسی کے دوران ایک اور تکلیف دہ حقیقت
کا علم ہوا کہ بشریٰ بیگم نے ایک ساقی خانہ بھی کھول رکھا ہے۔ جہاں نہ
صرف افیون اور گانجے کے دور چلتے ہیں بلکہ نشہ آور انجکشن اور گولیوں کا بھی
آزادانہ استعمال ہوتا ہے۔ بخدا! میری بیوی بھی کس قدر مہم جو اور
معرکۃ الآرا تھی۔

بشریٰ کی زندگی میں یہ دوغلاپن کہاں سے آگیا تھا۔ اس نے
ریاکاری اور فریب سے سمجھوتہ کیونکر کر رکھا تھا۔ اور وہ اتنے سکون و
اطمینان سے اپنے دھندے کیونکر چلاتی تھی؟

میں یہ تمام باتیں جاننا چاہتا تھا۔ یہ تمام سوالات کرنا چاہتا
تھا لیکن خاموش تماشائی کی حیثیت سے خود اپنی ذات کے سلگنے کا
تماشا دیکھ رہا تھا۔

کئی دنوں کی ذہنی کشمکش اور اندرونی تگ و دو کے بعد آخر
میں نے بشریٰ کو نرمی سے سمجھانے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے یقین تھا میری خاطر
وہ یہ معمولی سی قربانی دے دے گی اور کوئی جائز کاروبار اختیار کرے
گی۔ میرا خیال تھا بشریٰ اپنے تمام تر الٹے سیدھے کاموں کے باوجود
میری محبت میں دیوانی ہے۔ کیونکہ وہ ہر دوسرے لمحہ میرے گلے میں
بانہیں ڈال کر اپنی محبت کا بڑی گرم جوشی سے یقین دلاتی تھی۔

جب بشریٰ کو میں نے سمجھانا چاہا تو اس کی تمام تر محبت
دھوئیں کا ایک مرغولہ بن کر معدوم ہوگئی۔

بشریٰ اپنا کام نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ سمگلرز کے تمام راز
اس کے سینہ میں دفن تھے۔ اگر وہ [illegible] تو سمگلرز
اسے زندہ نہ چھوڑتے۔ بشریٰ کے [illegible] میرے

کے گھر اور اس کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل جاؤں۔ اپنی دو ماہ کی بچی سے بھی دستبردار ہو جاؤں۔ وہ میری بچی نہیں ــــ ایک عورت کی نہیں ــــ بشریٰ کی نہیں ــ ایک ماں کی نہیں ــ بلکہ ایک ستمگر کی بیٹی تھی جسے آگے چل کر ماں کے بڑھاپے کا سہارا بننا تھا۔

بیبیا کے گھر کے علاوہ اور کوئی در میرے لئے کھلا نہ تھا مجبوراً میں نے بیبیا کا ہی دروازہ کھٹکھٹایا ـــ بھابی نے جب مجھے بے بیوی اور بے بیٹی کے دیکھا تو فوراً کہا۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی یہ شادی ہرگز کامیاب نہ ہو گی اب تم ذرا اپنی بیکاری ترک کر کے کہیں ملازمت تلاش کرو اور میں تمہارے لئے لڑکی تلاش کرتی ہوں۔"

لیکن مجھے اچھی لڑکی اور اچھی ملازمت دونوں ہی عنقا نظر آتے تھے۔ ملازمت اور لڑکی میں فرق ہی کتنا ؟

ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے ماڈلنگ شروع کر دی۔ اشتہاری کمپنیوں کے ماڈل بننے لگا۔ ساتھ ہی نئی نئی لڑکیوں سے بھی گزرنے لگا جو ماڈلنگ کے لئے آیا کرتی تھیں۔ یہ سب کی سب بے تحاشا بولتی تھیں۔ بے تحاشا ہنستی تھیں اور ماڈل لڑکوں کے ہمراہ فلموں اور ریستورانوں میں جانے کے لئے فوراً تیار رہتی تھیں لیکن ان لڑکیوں میں کوئی بھی بیوی بننے کے قابل نہ تھی۔ عورتوں کے متعلق ہم مرد بھی عجیب عجیب نظریات رکھتے ہیں۔ ایک طرف تو ہم برابر یہ نعرے لگا رہے ہیں کہ عورتوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھنا چاہیئے اور مردوں کے دوش بدوش کام کر کے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا چاہیئے دوسری طرف ہم ان تمام لڑکیوں کو سامان تفریح تصور کرتے ہیں جو دفتروں میں کام کرتی ہیں۔ اور سوچتے ہیں کہ گھر سے نکلی لڑکی بھلا کسی گھر کے قابل کہاں ؟ اتنے مردوں کے درمیان رہ کر مختلف نگاہوں اور مذاق کا نشانہ بننے والی بھلا ایک مرد کے قابل کہاں ؟

بہرحال میرا وقت بشریٰ کے بغیر بھی اچھی طرح گزر رہا تھا اور میری ملاقات سلمیٰ سے بھی ہو چکی تھی۔ سلمیٰ نے سلائی کڑھائی کا ایک تجارتی ادارہ کھول رکھا تھا۔ دوسرے شوہر سے بھی علیحدگی ہو چکی تھی

اشتہار

وہ اپنے بچوں کو اپنے پہلے شوہر یا دوسرے شوہر کے حوالے کر دیتی یا بالکل ہی ایک آیا کے سپرد کر دیتی۔ اور سلمیٰ کے شب و روز مختلف کلبوں میں گزرتے تھے۔ سلمیٰ شوہر سے علیحدگی کی وجہ یہ بتاتی تھی کہ شوہر اس کی نگاہوں کے سامنے مختلف کلبوں میں مختلف لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کرتا تھا لیکن سلمیٰ بھی شوہر سے کم نہ تھی اب وہ تیسرے شوہر کی فکر میں تھی۔ نظر انتخاب مجھ پہ پڑی۔ لیکن اب میں نے بیوی کا انتخاب بھابی پہ چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا سلمیٰ کو اپنے ایک دوست کے سپرد کر دیا جو امریکہ سے تازہ تازہ وارد ہوا تھا۔

سلمیٰ یہ دوست پا کر اس قدر خوش ہوئی کہ اس نے میرے لئے ایک شریف خاندانی اور بڑے باپ کی بیٹی پسند کر ڈالی جو اپنی قمیص پہ کام کروانے سلمیٰ کے ادارہ میں آئی تھی۔

"بڑے باپ کی بیٹی" یہ الفاظ میرے لئے کافی پرکشش تھے بشریٰ کے بعد اب میں کسی بڑے باپ کی دختر کا ہی خواہاں تھا۔

بڑے باپ کی اس بیٹی سے ملاقات کا اہتمام ایک کلب میں کیا گیا تھا۔ وہ اپنے والدین کے درمیان بیٹھی تھی۔ اور سر جھکائے شرما رہی تھی۔ رخساروں پہ گلابیاں بکھیر رہی تھی۔ وہ کافی پرکشش اور جاذب نظر تھی۔ اور شرمیلی اتنی کہ اس سے رومانی گفتگو کی خواہش ہوتی تھی۔ وہ خود بھی عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی جس میں لڑکیاں رومانی خواب دیکھتی ہیں اور کسی نہ کسی شہزادہ گلفام کی آمد کی منتظر رہتی ہیں۔ میں نے خود کو فوراً اس کا شہزادہ تصور کر لیا۔ اور بھابی پہ زور دیا کہ ایک ملاقات مزید کی جائے۔

دوسری ملاقات کے لئے ہاکس بے کا انتخاب کیا گیا یہاں رومان پرور منظر کے علاوہ آزادی بھی میسر ہو سکتی تھی۔ بس ایک ابر آلود دن میں ساحل سمندر پہ اس شرمیلی لڑکی سے رومانی گفتگو شروع کر دی۔ وہ سر جھکائے گیلی ریت پہ اپنے نقش پا دیکھا کی اور میرے میرے مسکرایا کی۔ اس کی مسکراہٹ سیدھی جگر میں اترتی تھی میں بھی جوش میں آ گیا اور ایک فلمی گانا شروع کر دیا۔

پہلے تو وہ خاموشی سے سنا کی۔ لیکن جب میں نے باقاعدہ

بشیشور پردیپ

سنگِ بنیاد

> کالج کی بلڈنگ کے لئے چندہ مانگنے جاتا۔ ان سب کاموں میں وہ پہلے سے بھی زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ اس کے بھرے بھرے سڈول جسم اور گورے چہرے پر دوڑتی سُرخی دیکھ کر یہ خیال ہی نہیں آسکتا تھا کہ اسے کوئی مہلک مرض ہے۔

دیکھئے! مریضہ کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے کہ اُس کے پیٹ میں کینسر ہے۔ اس طرح آپ اُس کی عمر میں کچھ اضافہ کر سکیں گے۔"

ڈاکٹر نے مس جین کی ڈسچارج سلپ دیتے ہوئے کہا۔ اور اُس کے بھائی نے اُداس چہرے اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ حامی بھری۔ اور ڈیوٹی روم سے باہر نکل آیا۔

مس جین کے کمرے میں اِس وقت نیشنل انٹر کالج کے منیجر مسٹر بھارگوا ہیں۔ مس جین کی بڑی بہن ہے۔ اور اس کا چھوٹا بھائی ہے گھر سے لائی ہوئی سب چیزیں، صراحی، تھرماس، برتن، کپڑے وغیرہ باندھے جا چکے ہیں اور کچھ سامان باہر کھڑی کار میں پہنچایا جا چکا ہے مس جین کی زرد رنگ کے گول چہرے پر، جس پر ہڈیاں اُبھر آئی ہیں، خوشی کے آثار ہیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جو اِس کمزور چہرے پر خاص طور پر نمایاں ہیں چمک سی رہی ہیں۔ یہ ہسپتال سے ٹھیک ہو کر گھر جانے کی خوشی ہے۔ اتنے عرصے کے بعد کالج جانے کے تصور کی چمک!

مس نیلا جین شہر کے نیشنل گرلز انٹر کالج کی پرنسپل ہے۔ سترہ سال پہلے جب وہ اِس سکول میں ہیڈ مسٹرس مقرر ہوئی تھی تو سکول مڈل تک تھا۔ سو کے لگ بھگ لڑکیاں تھیں اور کرائے کے ایک تنگ منزلہ مکان میں تھا۔ اس نے اپنی محنت، اثر و رسوخ اور ملنسار طبیعت کی وجہ سے نہ صرف لڑکیوں کی تعداد ہی بڑھائی ہے بلکہ سکول کو بھی پہلے میٹرک اور پھر انٹر تک پہنچا دیا ہے۔ اب سکول کے درجے ہو گئے ہیں اسی علاقے میں ذرا فاصلے پر ایک بہت بڑی بلڈنگ کرائے پر لے کر آٹھویں کلاس سے آگے کی جماعتیں اس نئی بلڈنگ میں منتقل کر دی گئی ہیں۔ اور نیشنل جونیئر ہائی سکول اب نیشنل انٹر کالج ہو گیا ہے۔ سکول کو ترقی دینے کے ساتھ ہی ساتھ اُس نے اپنی قابلیت میں بھی اضافہ کیا ہے۔ ہندی لٹریچر میں کام کر کے الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری بھی لے لی ہے اور اب وہ ڈاکٹر مس نیلا جین ہے۔ کالج کی پرنسپل ہونے کے ناطے شہر بھر میں اس کی بڑی عزت ہے۔

وہ چار ماہ تک ہسپتال میں رہی اور ہسپتال میں رہنے کے دوران اُس کو اپنی صحت کی اِتنی فکر نہیں رہی جتنی کہ کالج کی۔ ہسپتال میں رہتے ہوئے بھی وہ اُستانیوں سے لڑکیوں کے کورس کے بارے میں پوچھتی رہتی۔ امتحان ہونے پر ہر جماعت کے نتیجے کے بارے میں پوچھتی۔ جن لڑکیوں کے بارے میں جانتی تھی کہ اچھے نمبر لا سکتی ہیں اُن کے نتائج منگوا کر خود دیکھتی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ اُستانیوں کی ڈائریاں بھی منگوا لیتی۔ کالج کے حساب کتاب اور نئی بلڈنگ کی تعمیر کے لئے جمع کئے جانے والے فنڈ کے بارے میں جاننے کی بھی اُسے فکر رہتی۔ منیجر صاحب سے اور سکول کی ٹیچروں سے لڑکیوں کی تعداد بڑھانے کے لئے کہتی رہتی۔

"مہارکو اماں [illegible] دستی نے مجھے وعدہ کیا تھا کہ
پنی دونوں لڑکیوں کو ہمارے کالج میں داخل کروائیں گی خدا میرے
[illegible] یا بدنامی کرا دیجئے گا۔"

"بھئی، آپ لوگ اپنے ملنے والوں کو کیوں نہیں کہتیں کہ وہ اپنی
لڑکیوں کو ہمارے سکول میں داخل کریں —؟ ہر ٹیچر کو کم سے کم دو نئی
لڑکیاں داخل کرانے کی ذمہ داری لینی چاہیئے —"

ڈاکٹر نے اُسے اس طرح کی دردسری کیلئے منع کیا تھا لیکن
جب دیکھا کہ یہ دلچسپیاں تو اُس کی غذا ہیں تو ایک حد تک اُسے اجازت
دے دی۔ اور یہ اجھا بھی ہی۔ اُن دلچسپیوں کو دوبارہ پا کر وہ جلد ہی
ہسپتال سے گھر جانے کے قابل ہو گئی۔

اُس کے پیٹ میں رسولی تھی۔ اور یہ رسولی آپریشن سے نکالی
گئی تھی۔ رسولی کے آس پاس کے گوشت کو بائی پسی (BIEPSY)
کے لئے بھیجا گیا تو پتہ چلا کہ پیٹ میں کینسر تھا۔ اور اُس کی جڑیں کافی دور
تک پھیل چکی تھیں۔ خیال تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد کینسر مزید پھیل جائے گا
اور اُس وقت اُس کا بچنا محال ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نے اس بات کو مریضہ
سے راز میں رکھنے کیلئے کہہ دیا تھا۔

اُسے ہسپتال سے چھٹی مل چکی ہے۔ اُس کے پیٹ میں لگے
ٹانکوں میں ایک جگہ اب بھی زخم ہے۔ مٹر کے دانے کے برابر زخم۔ ڈاکٹر
نے گھر پہ ہی اس زخم کو صاف کرنے اور دوا لگانے کیلئے کہہ دیا ہے۔
اور اس کی بڑی بہن جو اُس کے ساتھ رہ رہی ہے۔ بڑی مستعدی سے
یہ ڈیوٹی سرانجام دے رہی ہے۔ اس زخم کے باوجود اور کینسر کے
ہوتے ہوئے بھی مس جبین کی صحت حیرت انگیز طور پر اچھی ہو رہی ہے۔ اور
وہ اپنے اندر توانائی و چستی محسوس کر رہی ہے۔ ڈاکٹر خوش ہوتا ہے یہ دیکھ کر
کینسر کے بارے میں مریضہ کو اندھیرے میں رکھنے کا خاطر خواہ نتیجہ
نکل رہا ہے!

اب وہ ہر دوسرے یا تیسرے دن خود ہی زخم کو صاف کر کے
دوا لگا دیتی ہے۔ اور روئی کا پھایا رکھ کر اُسے پلاسٹر سے چپکا دیتی ہے۔ زخم
میں درد نہیں ہے لیکن تھوڑا سا مواد ہر بار رِس آتا ہے۔ اس زخم کو صاف
کر کے دوا لگانا اب اسکے لئے ایک معمول ہو گیا ہے۔ کالج جانا، کالج کے
سب کاموں کی دیکھ بھال کرنا، اور کالج کے بعد [illegible] کے ساتھ
سرکردہ ممبروں کے ہمراہ کالج کی بلڈنگ کیلئے چندہ مانگنے جانا۔ ان سب
کاموں کی وجہ سے وہ اپنے زخم کو تقریباً بھول سی گئی ہے۔ اسکے بھرے بھرے
سڈول جسم اور گورے چہرے پر دوڑتی ہوئی سرخی کو دیکھ کر یہ خیال
ہی نہیں آ سکتا کہ اُسے کوئی مہلک مرض بھی ہے!

جس دن کالج کی بلڈنگ کیلئے زمین خریدی گئی۔ اُس دن وہ بہت
خوش تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش
پوری ہو گئی۔ جانے کتنے ملنے والوں کو وہ زمین دکھانے کیلئے لے گئی جیسے
یہ زمین کالج کیلئے نہ خریدی گئی ہو اُس کے اپنے مکان کیلئے خریدی گئی ہو!
یہ زمین کالج کی پرانی بلڈنگ کے پاس ہی تھی اور ایک بہت
اچھے موقع پر تھی۔ کالج کی بلڈنگ کیلئے زمین کے اس ٹکڑے کو خریدنے
کی وہ بہت خواہش مند تھی۔ اس ٹکڑے پر مدت سے اُس کی نظریں
تھیں۔ بڑی محنت سے یہ سودا طے ہوا تھا۔

جب زمین خریدی گئی تو جیسے اُس کی رہی سہی بیماری بھی
جاتی رہی۔ اُس کی صحت پہلے سے بھی اچھی ہو گئی۔ لیکن زخم سے مواد اب
بھی رِستا تھا!

زمین خریدنے کے بعد، کالج کی بنیاد رکھنے کا سوال تھا۔ کچھ
روپیہ اکٹھا ہو جائے تو کام شروع ہو! روپیہ بہت کم تھا اور مس جبین کو
جانے کیوں اتنی جلدی پڑی تھی —؟! اُس نے بلڈنگ فنڈ جمع کرنے کی
مہم اور تیز کر دی۔ سکول کی لڑکیوں کو، ٹیچروں کو اور ملنے جلنے والوں کو
چندہ جمع کرنے کی کاپیاں بانٹی گئیں۔ جلسے کئے گئے۔ سینما کے چیریٹی شو کرائے
گئے۔ اور اس طرح دو ہی تین ماہ میں ایک خاطر خواہ رقم جمع ہو گئی۔

کالج کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں جب نئی بلڈنگ کی
بنیاد رکھنے کی تجویز پیش ہوئی تو ممبران نے مس جبین کی خواہش کا احترام
کیا۔ بنیاد رکھنے کے ساتھ ہی زمین کے ارد گرد چہار دیواری بنانے کی
منظوری بھی دے دی —!

اُس رات مس جبین کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ زخم سے
بہت سا مواد نکلا۔ درد بھی محسوس ہوا اور ہلکا سا بخار بھی آ گیا۔ لیکن اُس
رات وہ بہت خوش تھی!

دوسرے دن ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ ڈاکٹر نے فوراً ہسپتال میں داخل ہو جانے کیلئے کہا۔ لیکن مس جَبین نے ہسپتال جانا دو دن کیلئے ملتوی کر دیا۔ اگلے روز کالج کی بنیاد رکھی جانی تھی۔

کالج کی طالبات، ٹیچروں اور ممبران کمیٹی کی موجودگی میں ہوئے منتروں کے درمیان، کالج کی بلڈنگ کا سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اُس روز اور اُس کے دوسرے دن بھی مس جَبین اس پلاٹ میں کرسی ڈالکر بیٹھی رہی، اور کالج کی دیوار کی بنیاد کھُدتے دیکھتی رہی۔ اینٹوں کے چٹے لگتے دیکھتی رہی۔ ہدایات دیتی رہی کالج کی نئی بلڈنگ کا نقشہ سامنے پھیلائے اُس میں سُرخ پنسل سے ترمیم کے نشانات لگاتی رہی۔ سارا سارا دن طبیعت کے خراب ہونے کے باوجود۔ گھر والوں کے منع کرنے پر بھی وہ کام کرتی رہی۔ اور تیسرے دن وہ... ہسپتال چلی گئی۔

اُس کی طبیعت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ مرض بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ تیزی کے ساتھ۔ اسے دیکھ دیکھ کر دکھ بھی ہوتا ہے اور حیرت بھی ہوتی ہے — دو سال کے خوشگوار وقفے کے بعد یہ بھیانک موڑ کیسا ہے —؟!

ڈاکٹر کہتا ہے — کینسر کا مریض کینسر ہی سے مرتا ہے۔ اُس کی زندگی بڑھائی جا سکتی ہے۔ کینسر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی میڈیکل سائنس اس پر فتح حاصل نہیں کر سکی — تو کیا موت اُس کو ہم سے چھین لے گی —؟ اُس کی زندگی اور نہیں بڑھائی جا سکتی —!

ڈاکٹر کا خیال ہے۔ مریضہ کو اپنے مرض کا پتہ چل گیا ہے۔ یا شاید اُس کا دِل بُجھ چکا ہے۔ اب اُسے کسی قسم کا دلاسہ نہیں دیا جا سکتا —!

لیکن — مس جَبین نے تو اپنی مرض کے بارے میں کبھی بات ہی نہیں کی؟ اُسے تو اپنی مرض کی کبھی فکر ہی نہیں ہوئی —؟ اُس نے تو جاننے کی خواہش بھی ظاہر نہیں کی۔ اُسے کونسا مرض ہے —!!

زخم سے رِستا ہوا مواد — درد میں ڈوبی ہوئی گھُٹی گھُٹی سی چیخیں — مارفیا کے انجکشن — اب تو کالج کی چار دیواری مکمل ہو چکی ہوگی بہادر گرو صاحب ؟ — اب بلڈنگ کا کام شروع کروا دیجئے نا — آکسیجن کے سلنڈر — ہڈیوں کا ڈھانچہ —

زرد سوکھا سا چہرہ — نیم بے ہوشی — بہادر گرو صاحب... کیلئے... فنڈ... اکٹھا... کیا جا رہا ہے... ؟

نرسیں، سوکھے ہوئے بازوؤں میں انجکشن لگ رہے ہیں — ہچکی سی گھگھیاہٹ اور پھر ایک دن وہ ہم کو چھوڑ کر چلی گئی!

ابھی ابھی اُس کا انتم سنسکار کر کے لوگ واپس آئے ہیں

اُس کے اٹیچی کیس میں سے ایک ڈائری نکلی ہے — مرنے والی کی ڈائری —! — اُس ڈائری میں جگہ جگہ کالج کے بارے میں لکھا ہے — اور ایک صفحہ پر وہ تاریخ درج ہے جب وہ دو سال پہلے ہسپتال سے گھر آئی تھی — اُس صفحہ پر تحریر ہے — مجھے اپنی بیماری کا پتہ چل چکا ہے — مجھے کینسر ہے — اور کینسر موت کا دوسرا نام ہے۔ لیکن — اگر یہ موت ہی کا دوسرا نام ہے تو پھر یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے — گھر والے مجھ سے چھپا رہے ہیں — لیکن میں اس موذی مرض سے اس طرح نہ ہاروں گی! — میں مرنے سے پہلے نہیں مروں گی! — ابھی تو مجھے کالج کی نئی بلڈنگ کیلئے کام کرنا ہے! — اُس کیلئے زمین خریدنی ہے — فنڈ اکٹھا کرنا ہے — جب تک یہ کام شروع نہیں ہوتا مجھے اس مرض پر قابو پانا ہے۔ مجھے موت کو اپنے سے دُور رکھنا ہے! — لیکن وقت تھوڑا ہے اور کام بہت! — کچھ پتہ نہیں۔ دشمن کب اپنا بھرپور وار کر دے!

جہاں تک

نئے لکھنے والوں کا سوال ہے۔ ان میں سے بیشتر کے بنیادی نقطہ نظر سے مجھے اختلاف ہے۔ وہ اپنی ذات کے اندھیروں میں گم ہوتے ہیں۔ ان میں سماج اور فرد کے درمیان رشتے کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابہام نئی شاعری کی خصوصیت بنتی جا رہی ہے۔ میرے ذہن میں جو اچھی شاعری کا [illegible] ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے میں فن میں تجربے کو ضروری سمجھتا ہوں اور زندگی کی طرح آرٹ میں بھی تبدیلیوں کا قائل ہوں۔

(کیفی اعظمی)

خریدنے والے بہت ہیں۔ لیکن زندگی بھر مجھے خریدنا آیا اور نہ بیچنے کے فن کی آگہی ملی۔ جب میرا قلم بیچا اور خریدا نہ جا سکا تو الفاظ و اصطلاحوں سے بہ نام انسانیت، ملک و قوم کی دہائی دے کر لوگوں نے مجھ سے وہ کام لیا جو میں کر سکتا تھا اور جس کی انھیں ضرورت تھی۔ اور مطلب نکل جانے کے بعد وہ انجان ہو گئے اور میں نے بھی انھیں یاد دلانے کی سعی نہیں کی۔ فن میری زندگی تھی اور میں زندہ رہا۔ شہرت میرا مقدر تھی سو میں مشہور بھی ہوا۔ زندگی بھر میں نے خواب دیکھے۔ اور خوابوں کا سلسلہ ہمیشہ دراز رہا۔ خوابوں کے سوا مجھے دنیا میں کچھ اور نہ مل سکا۔

زندگی کی اس منزل پر جب کہ میرا دوست جمال شہر میں درجنوں عالیشان مکانوں اور شاندار بنگلوں کا مالک تھا۔ مجھے سر چھپانے کے لئے کرایہ کا ایک مکان تک نہیں مل رہا تھا۔ جمال نے ایک درجن بلکہ تین شادیاں کی تھیں اور میں ابھی تک کنوارا تھا۔ بوڑھی بیوہ ماں۔ چھوٹے بھائی بہن اور غیر مستقل آمدنی۔ میں کرائے کے مکان کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک ادبی جلسہ میں جمال سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اس جلسہ کی صدارت کر رہا تھا۔ سیٹھ جمال الدین کا ایک ادبی جلسہ کی صدارت کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ جمال کو ادب اور خاص طور پر شاعری سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ جمال مجھے دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل اٹھا۔ بڑی گرمجوشی سے بھری محفل میں مجھ سے بغلگیر ہوا۔ اور فخر و مسرت سے اعلان کیا کہ ملک کا یہ ممتاز افسانہ نگار اس کے اسکول کا ساتھی اور ظالم و بے مروت دوست بھی ہے۔ اس طرح لوگوں کو سیٹھ جمال الدین کے علمی و ادبی ذوق کی تاریخ سے آگہی ہوئی۔ جمال بڑے خلوص اور بے تکلفی سے مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ جلسہ ختم ہوا تو زبردستی مجھے اپنی شاندار حویلی پر لے گیا۔ دیر تک مجھ سے بے وفائی اور بے مہری کی شکایتیں کرتا رہا۔ اور دیر تک مجھے رنگین رومانی نظمیں اور غزلیں سناتا رہا۔ اور پھر اپنے انوکھے پیار کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس کی آگ میں وہ برسوں سے جل رہا تھا۔ عاشقی نے اسے شاعر تک بنا دیا تھا۔ قصہ مختصر تھا۔ اسے ایک ایسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی جو اس کے الفاظ میں چندے آفتاب و چندے ماہتاب تھی۔ برق تھی۔ مجسم قیامت تھی۔ اس نے اس لڑکی کی زلفوں، آنکھوں، لب و رخسار، رفتار، گفتار اور آواز۔ اس کی ایک ایک ادا پر صد ہا شعر کہے تھے۔ وہ اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن وہ مست و متوالی نازنین اس کی نہ بن سکی۔ ایک معمولی درجہ کے کلرک کی بیٹی ایک ایسے نوجوان کی محبت میں گرفتار تھی جو صورت شکل، اخلاق و عادات کے لحاظ سے لاجواب تھا۔ اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بے روزگار تھا۔ مفلسی میں محبت کا تصور جمال کے پاس مضحکہ خیز تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کمبخت مفلس نوجوان سے اس کے خوابوں کی ملکہ کی شادی ہو جائے گی۔ اور اس طرح وہ اپنی زندگی کی روشنی سے محروم ہو جائے گا۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے رقیب روسیاہ کو ایک فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ اور ملازم ہوتے ہی اس نے شادی کر لی۔ اور بڑی بدبختی تو یہ تھی کہ رقیب روسیاہ کو ملازمت اس فیکٹری میں ملی تھی جس کا وہ حصہ دار تھا۔ انتقام کا شعلہ بھڑکا۔ اور چند ماہ بعد ہی جمال نے اپنے رقیب کو ملازمت سے برطرف کروا دیا۔ بھوکے رہ کر تو محبت نہیں کی جا سکتی۔ اس نے سوچا تھا۔ ایک نہ ایک دن اس کمبخت کو مجبوراً ہی سہی اپنی بیوی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ لیکن خلاف توقع وہ دونوں بھوک اور مفلسی کا مقابلہ کرتے رہے۔ شادی طلاق پر ختم نہیں ہوئی۔ جمال عشق کی آگ میں جلتا رہا۔ اس نے اپنے رقیب کو رستے سے ہٹانے کی ہر وہ تدبیر کی جو اس سے ممکن تھی۔ لیکن اس کی ہر تدبیر بے کار گئی۔ اس کا رقیب روسیاہ بڑا سخت جان ثابت ہوا۔ تھک ہار کر وہ اپنی آگ میں آپ جلتا رہ گیا۔ دن گزرتے گئے۔ اور غم روزگار میں مبتلا اس کا رقیب زیادہ دنوں تک حالات کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اس کی صحت مسلسل گرتی گئی۔ اور اب وہ پورے سال بھر سے فریش تھا۔ ڈاکٹروں نے طرح طرح کی باتیں کیں۔ ٹی۔ بی۔ کینسر اور ذیابیطس۔ ان گنت بیماریوں کا حملہ اس اکیلے آدمی پر ہوا تھا۔ جمال کو پورا یقین تھا کہ اس کا رقیب چھ ماہ سے زیادہ نہ جی سکے گا۔ لیکن چھ ماہ بعد بھی وہ نہیں مرا تو غم و غضب کے مارے جمال نے ایک اور شادی کر لی۔

ایک حسین اور نوجوان لڑکی سے جو اس کی تیسری بیوی تھی۔ وہ مطمئن نہ ہو سکا۔ پھر اس نے ایک چال اور چلی۔ ہمدردی اور خلوص کا لبادہ اوڑھ کر وہ اپنی محبوبہ کے ہاں گیا۔ اس کے بیمار شوہر کا ہمدرد دوست بنا۔ علاج و معالجہ کے سلسلے میں ان کی مدد کرنے لگا۔ اور پھر نگار باغ کو خرید کر اس کے ایک حصہ میں انھیں مفت رہنے کی اجازت دے دی۔

"ایک بات ہے دوست،" جمال نے کہا۔ "نگار باغ بڑی پرفضا جگہ ہے۔ اب تو تم خود اسے دیکھ لوگے"!

مجھے جمال کی داستانِ غم سن کر حیرت نہیں ہوئی۔ افسوس اور غم بھی نہیں ہوا۔ احساس اس قسم کی باتوں کا کچھ اس طرح خوگر ہو گیا ہے کہ بہت سی ایسی باتیں جو کبھی مجھے بے چین اور مضطرب کر دیتی تھیں اور پہروں خون کے آنسو رلاتی تھیں۔ اب یوں گزر جاتی ہیں جیسے رات کے وقت گہرے سناٹے میں ہوا کا کوئی آوارہ جھونکا چپکے سے نکل جاتا ہے!

مجھے نگار باغ میں مکان مل گیا۔ اس دن جب میں اپنے نئے ٹھکانے پر پہنچا تو شہزادی کو دیکھ کر واقعی حیران و ششدر رہ گیا۔ زندگی میں بے شمار حسین لڑکیوں کو میں نے دیکھا ہے۔ لیکن شہزادی جیسی کوئی حسین عورت آج تک میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس کے حسن کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا تھا۔ الفاظ میں اس کے حسن کا بیان مجھ سے ممکن نہیں۔

شہزادی نے بڑے خلوص سے مجھے اپنے بیمار شوہر سے ملایا۔ میری بوڑھی ماں اور بھائی بہنوں سے تھوڑی ہی دیر میں کچھ اتنی گھل مل گئی کہ ہم اسے اپنے افرادِ خاندان میں سے ایک سمجھنے لگے۔

اس رات میرے دل و دماغ میں ایک طوفان سا آ گیا... یہی تھی وہ حسینہ جس کے عشق کی آگ میں جمال جل رہا تھا سیٹھ جمال الدین شہر کا ایک دولت مند اور با اثر آدمی جس سے سارا زمانہ مرعوب تھا وہ اس مجسم حسن کے آگے بے بس و مجبور تھا۔ اگر شہزادی کسی کی بیوی نہ ہوتی، کسی سے محبت نہ کرتی تو۔ شاید وہ میرے خیالوں اور خوابوں کی وہ عورت ہوتی جس کی تلاش میں میری روح صدیوں
اشجاع

سے سمندر پہ منڈلا رہی ہے۔ بیکراں فضاؤں میں بھٹک رہی ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ کسی کی بیوی تھی۔ کسی سے محبت کرتی تھی۔ کسی کی محبوبہ تھی۔ اور میں اتنا آزاد نہیں تھا کہ ان پابندیوں اور حدود کو خاطر میں نہ لاتا۔ پھر بھی مجھے اس سے ایسی ہمدردی اور ایسا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں اس کے کام آؤں۔ اس کے لئے کچھ کروں!

اور پھر شہزادی کچھ اس انداز میں اپنے شوہر سے محبت کرتی تھی کہ میں کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا محبوب۔ اس کا شوہر کسی زمانے میں ایک خوبصورت اور پرکشش نوجوان رہا ہوگا مگر اب تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ وہ اتنا نحیف و ناتواں تھا کہ بستر سے اٹھنے کے لئے بھی اسے شہزادی کے سہارے کی ضرورت پڑتی تھی۔ بیماری نے اسے چڑچڑا اور بدمزاج بنا دیا تھا۔ وہ زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اور کرب و اضطراب کے عالم میں موت کی راہ تک رہا تھا۔ موت جو یقینی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب ہو رہی تھی!

دن میں ایک بار بھاری بھرکم جمال پابندی سے آتا۔ اور جب بھی آتا اپنے ساتھ دوائیں۔ ٹانک۔ پھل اور تحفے لاتا۔ وہ شہزادی سے تو بات بھی نہیں کرتا تھا۔ البتہ اس کے بیمار شوہر کو طرح طرح کی باتوں سے دلاسہ دیتا۔ یا پھر مجھ سے شعر و ادب کے موضوع پر گفتگو کرنے لگتا۔ میں جو جمال کے رازِ دل سے واقف تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ جمال کو اپنی سوچ کی خامی اور گمراہی کا اندازہ نہ تھا۔ وہ جانتا تھا۔ سماجی اور اخلاقی جرم کو تسلیم کرتا تھا۔ پھر بھی وہ اس جرم سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا شہزادی کے بغیر اس کی زندگی ادھوری تھی۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا!

"جمال صاحب آدمی نہیں فرشتہ ہیں"۔ شہزادی اکثر کہا کرتی۔ "وہ ہر طرح سے ہمارا خیال رکھتے ہیں۔ دنیا میں کون ہے جو اتنا بے لوث اور بے غرض ہو کر انسانوں کی خدمت کرے۔ دولت مند تو یہاں بہت ہیں مگر جمال صاحب کی بات اور ہے!"

"ہاں۔ جمال آدمی نہیں" میں رک رک کر کہتا۔ "شاید فرشتہ

شہزادی کچھ چونک کر۔ کچھ سہم کر اور پھر مسکراتے ہوئے کہتی "۔ آپ تو ان کے بچپن کے ساتھی ہیں یہ

" میں جمال کو ہر طرح سے جانتا ہوں۔ اور یہ جانکاری، آگہی بہت بری شے ہے۔ آگہی ایک دو دھاری تلوار ہے۔ خوشی کی خیر منانا ہو تو آدمی بس بے خبر رہے.... کم آگاہ۔ !"

" آپ کی یہ گہری باتیں میں سمجھ نہ سکوں گی " وہ مسکراتی ہوئی کہتی " بھائی صاحب۔ میں نے کہا تھا نا۔ وہ بات یاد ہے آپ کو۔؟ "

" کونسی بات ؟ "

" دیکھئے آپ بھول گئے " وہ سنجیدگی سے کہنے لگتی " مجھے کوئی کام دلا دیجئے۔ اُن کی حالت تو آپ دیکھ رہے ہیں۔ آمدنی کے بغیر کب تک یوں ہی چلتا رہے گا۔ گھر کی کوئی چیز نہیں رہی جسے بیچ کر گذارہ کیا جاسکے۔ جو کچھ بھی تھا وہ ختم ہو گیا۔ بیماری اور علاج کا چکر جانے کب تک چلتا رہے۔ ہم بری طرح مقروض ہو چکے ہیں۔ پھر قرض دے گا بھی کون ؟۔ اور کب تک ؟۔ جمال صاحب کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ انھیں بار بار تکلیف دوں "

" میں کوشش کروں گا " میں گہری آواز میں کہتا " تم فکر مت کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھ سے جو بھی خدمت درکار ہو بلا تکلف کہہ دیا کرو "

" میں آپ کو غیر نہیں سمجھتی بھائی صاحب۔ آپ کے حالات کا بھی مجھے اندازہ ہے " وہ محبت بھرے لہجے میں کہتی " آپ میرے لئے کوئی موزوں کام تلاش کیجئے۔ مسئلہ بس اسی طرح حل ہو سکتا ہے۔ !"

اور میں وعدہ کر لیتا۔ ایک بار اور اسے یقین دلاتا ۔ !

برسات کی اندھیری رات تھی اور بجلی فیل ہو گئی تھی۔ دیا سلائی لینے کے لئے میں شہزادی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ شہزادی کے کمرے میں مٹی کے تیل کا چراغ مدھم لو میں جل رہا تھا اور وہ اپنے بیمار شوہر کے قدموں پر سر رکھے سسک رہی تھی۔

" مجھے تمہارے بے پناہ حسن سے ڈر لگتا تھا شہزادی " اس کا بیمار شوہر کمزور آواز میں کہہ رہا تھا " جمال نے جو بھی کہا وہ۔ ٹھیک ہی ہے۔ دنیا میں کوئی بلا وجہ اور بغیر کسی مطلب کے کسی سے ہمدردی نہیں کرتا " وہ کھوکھلی آواز میں کہنے لگا۔ " میں واقعی زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم میرے لئے ناحق بھاگ دوڑ کر رہی ہو۔ اپنی جوانی کو خاک میں ملا رہی ہو۔ یہ احساس مجھے چین نہیں لینے دیتا کہ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا۔؟ میں اب زیادہ دنوں تک واقعی زندہ نہیں رہوں گا۔ شہزادی۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ مجھ سے طلاق لے لو۔ اور جمال کی بات مان لو۔ !"

" ایسا مت کہو " وہ زخمی ناگن کی طرح تڑپ کر بولی " میں جان دے دوں گی اگر تم نے پھر ایسی بات کہی " وہ گلوگیر لہجے میں کہنے لگی " تم آخر مجھے سمجھتے کیا ہو جی ؟۔ میں صرف تمہاری بیوی ہی نہیں ہوں۔ تمہاری زندگی بھی ہوں۔ ہاں۔ طلاق دے کر تم بیوی کو خود سے الگ کر سکتے ہو۔ لیکن اس روح کو کیسے جدا کر سکو گے جو تمہاری اور صرف تمہاری ہے۔ مرنا ہی مقدر میں ہے تو ہم ساتھ ساتھ مریں گے۔ میں زہر کھا لوں گی۔ !"

" تم ایسی حماقت نہیں کرو گی۔ " اس کا شوہر خوف بھری آواز میں بولا " وعدہ کرو کہ نہیں کرو گی۔ قسم کھاؤ " وہ بری طرح لرزنے لگا " وعدہ کرو میری جان ۔۔ تم میرے بعد بھی زندہ رہو گی۔ خوش رہو گی۔ تم جب تک وعدہ کرو گی میں چین سے مر بھی نہ سکوں گا "

جواب میں شہزادی کی زوردار سسکیاں گونج اٹھیں۔ اور میرے قدم جیسے دروازے کی دہلیز نے جکڑ لئے تھے۔ میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا ۔ !

دوسرے دن مجھے واقعہ کی تفصیلات کا علم ہوا۔ جمال

نے اپنی موٹر بھیج کر شہزادی کو اپنے ہاں بلایا تھا۔ اور شہزادی نے جب اس سے بھی کوئی موزوں کام دلانے کی خواہش کی تو جواب میں اس نے اظہارِ عشق کر دیا۔ اور اس سے خواہش کی کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لے۔ اس لئے کہ اس کا شوہر اب زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا مرنا یقینی تھا۔ تو پھر کیوں وہ اپنی جوانی کو برباد کرے۔ اس نے بڑی فراخدلی سے اس کے بیمار شوہر کو تادمِ مرگ کسی اچھے ہاسپٹل میں رکھنے کا وعدہ بھی کیا۔ شہزادی نے غم و غصہ اور نفرت کے طوفانوں کو دباتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں جمال کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ اور گھر واپس آ گئی تھی ۔۔۔!

اس کے بعد جمال پھر کبھی نگار باغ نہیں آیا۔ شہزادی کے مسائل اور الجھ گئے۔ اس کے شوہر کی حالت اور ابتر ہو گئی۔ ڈاکٹر روز نئی نئی دوائیں اور انجکشن لکھ دیتا۔ اور شہزادی بھاگ دوڑ کرتی۔ جگہ جگہ سے قرض حاصل کرتی، دوائیں اور پھل۔ گھر کا خرچ الگ۔ ان ہی دنوں جمال کا آدمی روز تقاضہ کرنے آ جاتا تھا۔ دو ڈھائی ہزار روپیہ شہزادی کی طرف نکلتا تھا۔ جمال اب انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ کمرے کے کرایہ کی وصولی کے سلسلے میں بھی جمال کا رویہ سخت ہو گیا تھا ۔۔۔ میں نے جمال کو سمجھانا چاہا تو وہ مجھ ہی سے بدگمان ہو گیا۔ اس پہ ایک جنون سا سوار تھا۔ وہ سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے جیسے محروم ہو گیا تھا۔ شہزادی کی پریشان حالی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ مجھ سے جو کچھ بھی بن پڑتا میں اس کے لئے کر دیتا تھا ۔۔۔!

شہزادی کے شوہر کی حالت جب حد سے زیادہ بگڑ گئی تو اسے سینی ٹوریم میں داخل کر لیا گیا۔

شہزادی گذشتہ کئی مہینوں سے سینی ٹوریم کے عہدہ داروں کی منت و سماجت کر رہی تھی کہ اس کے شوہر کو وہاں شریک کر لیں۔ لیکن سینی ٹوریم میں کوئی پلنگ خالی نہ تھا۔ مجبوری تھی۔ اور اب آخری لمحات میں مریض کو سینی ٹوریم میں شریک کر لیا گیا تھا ۔۔۔!

گرمیوں کی ایک سہ پہر شہزادی میرے پاس آئی۔ پریشان پریشان اور گھبرائی گھبرائی سی آواز میں اس نے آتے ہی کہا۔

" وہ کل سے بے ہوش ہیں۔ ڈاکٹروں نے کچھ دوائیں لکھ دی ہیں جو بہت قیمتی ہیں۔ مجھے دوائیں دلا دیجئے بھائی صاحب کچھ بھی کیجئے۔"

میری بدقسمتی کی انتہا کہ میں اس وقت کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میری خاموشی ایک جواب تھی۔ اور وہ سر جھکائے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چلی گئی۔!

اور میں غم و اندوہ کے طوفانوں کو سینے میں دبائے ہوئے سیدھا سینی ٹوریم پہنچ گیا۔ شہزادی کے شوہر کی حالت آخری تھی۔ ڈاکٹروں کی ایک جماعت اسے گھیرے ہوئے تھی، وہاں شہزادی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ مریض کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ وارڈ میں ایک جان لیوا اداسی چھائی ہوئی تھی۔ پھر ایک زوردار ہچکی کے ساتھ مریض نے دم توڑ دیا۔ عین اسی وقت شہزادی وارڈ میں داخل ہوئی میلے کچیلے لباس میں پژمردہ و نڈھال سی اس کے ہاتھوں میں دواؤں کا ایک بنڈل تھا۔ انچارج ڈاکٹر نے رحم اور بے بسی سے اس کی وحشی نگاہوں سے نگاہیں ملائیں، اور آہستہ سے بڑھ کر لاش کے چہرے کو چادر سے ڈھانک دیا۔!

میں زندگی بھر اس لمحہ کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اس ایک لمحہ میں وہ سب کچھ ہو گیا جس پہ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا۔ شہزادی کے ہاتھ سے ایک دم دواؤں کا بنڈل چھوٹا۔ ایک دلخراش چیخ فضا میں گونجی اور وہ دھڑام سے فرش پر گر گئی ۔۔ اور دوبارہ اٹھ نہ سکی ۔۔!

اور میرا دوست سیٹھ جمال الدین وحشت، غم اور ندامت سے ڈاکٹروں کی منت و سماجت کر رہا تھا۔

" اسے ہوش میں لائیے۔ میں اپنی ساری دولت دے دوں گا۔ اسے بچا لیجئے ۔۔!"

" اب اسے ہوش میں لانا ناممکن ہے۔" وارڈ کے انچارج نے حیرت و افسردگی سے کہا۔ "شی از ڈیڈ ۔۔۔!"

انیسہ جلال

چراغ تلے

زینب! اپنے وجود میں علم کی روشنی کی تڑپتی کرنیں سمیٹے ایک بے چین اور اپنے ماحول سے ماورا ہستی بن چکی تھی۔ اب وہ خود اپنے لئے ایک الجھن تھی۔

میں نے بہت زیادہ تھک کر کتابوں پر سے نظریں اُٹھائیں اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے آہستہ آہستہ مسل کر ایک زور دار جمائی سے اپنی تھکن کا اظہار کیا اُف میرے اللہ اس پڑھائی۔ اس امتحان سے میں کتنا زیادہ تھک چکی تھی۔ ہر سال پابندی سے امتحان دیتے دیتے میں عاجز آچکی ہوں لیکن یہ چسکا ایسا نہیں کہ آسانی سے چھوٹ جائے۔ ایک تھکن سی میرے اعصاب پر سوار ہو چکی تھی اور میں ذرا سی دیر کو اس ماحول سے نجات چاہتی تھی۔ سو جب میں نے کتابوں پہ سے نظریں اٹھائیں تو زینب کا مسکراتا چہرہ میرے سامنے تھا۔ گلابی رنگت چمکدار سیاہ آنکھیں گھونگریالے بال اور چاند سی پیشانی پر بکھری ہوئی لٹ اور مُسکراہٹ کی قندیل کے پرتو سے روشن چہرہ اپنی خُشک کتابوں سے نظریں اٹھا کر جب میں نے زینب کا حسین چہرہ دیکھا تو مجھے اللہ میاں بے حد مہربان لگے یعنی ایسی ایسی صورتیں بھی موجود ہیں دنیا میں (بشمول میری اپنی اُجاڑ صورت کے)

گھر بھر کے شور سے بچ کر میں اپنے الگ تھلگ گوشے میں بیٹھی امتحانوں کی تیاری کر رہی تھی۔ اس شدید گرمی کے موسم میں اپنے پچھلے برآمدے کا ایک گوشہ جہاں پر سرخ پھولوں

اشتہار

والی گھنی بیل نیچے تک جھک آئی تھی اور جہاں اس قیامت کی گرمی میں کہ جب آسمان پر بلا شرکت غیرے سخت چمکدار سورج کا راج تھا اور کہیں کوئی پناہ نہ تھی اس کونے میں ایک خنک سا اندھیرا چھایا رہتا ہے اور یہیں پہ میں نے اپنا ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ ایک آرام کرسی ایک چھوٹی سائڈ ٹیبل اور کتابوں کا ڈھیر۔ اس خاموش گوشے میں مجھے ستانے کو نہ بچوں کا شور ہوتا ہے اور نہ ہی اماں بی کی بچوں اور نوکروں کو جھڑکتی ڈانٹتی آوازیں۔ اس برآمدے سے دو سیڑھیاں اُتر کر چھوٹا سا آنگن ہے اور پھر ہمارے گھر کا پچھلا دروازہ جو ماسی اور جمعدارنی کے علاوہ دھوبی کے لئے مخصوص ہے، سو یہاں میری پڑھائی میں مُخل ہونے والی آوازیں مجھ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ ماسوا اس کے کہ صبح دس بجے دھڑ سے دروازہ کھلنا اور جمعدارنی اپنا ٹوکرہ اور جھاڑو سنبھالے داخل ہوتی اور کچھ دیر میری خیریت دریافت کرتی پھر مجھے اور میری کتابوں کو تعجب خیز نظروں سے دیکھ کر آنگن کی صفائی میں جُٹ جاتی یا ہاتھ روم کا رُخ کرتی۔ یا اس کے بعد دس ساڑھے دس بجے برتن دھونے والی ماسی یا اس کی بیٹی زینب آتیں لیکن یہ کم سخن ہیں اس لئے چپ چاپ کچن کا رخ کرتیں۔ ہفتہ میں ایک دن دھوبی مجھے ستانے کو پہنچتا اور اسی برآمدے میں

جدید کپڑے گنوائے جاتے کپڑوں کا حساب لکھنے کو کبھی میرا قلم
کام آتی تسلی جاتی۔ بلکہ کبھی کبھی میری خدمات بھی حاصل کی جاتیں
یہ ساری تکلیفیں صرف چھٹیوں کے دنوں کی تھیں۔ اور اس شور سے
کم تھیں۔ جو اس برآمدے کو پار کر کے جو کمرے بنے ہیں۔ ان میں پہلا
ہے۔ سو میں اپنے گوشۂ عافیت میں (جی ہاں میں نے یہی نام رکھ
چھوڑا ہے اس آرام دہ اور پرسکون کونے کا) اس وقت تک پڑھائی کرتی
رہتی جب تک اماں بی کمرے کی کھڑکیاں کھول کر دوپہر کے کھانے کے
لئے نہ بلا لیتیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ میری نوابی یا میری موٹی پڑھائی کو دو
چار صلواتیں نہ سناتیں۔

"اٹھئے شہزادی صاحبہ خاصہ تناول فرما لیں۔" امی جب بھی بڑے
طنزیہ انداز میں اپنا یہ جملہ بولتیں مجھے بہت مزا آتا۔ اور میں واقعی شاہانہ
انداز میں اٹھتی اور آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی چلتی یوں کہ امی کے ہونٹوں
پر مسکراہٹ بکھر جاتی اور میں دوڑتی ہوئی جا کر ان سے چمٹ جاتی۔ ہٹ
دور ہو جا مجھ سے نہ چمٹ، امی چلاتیں۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں
یونہی خنک سایوں تلے زندگی گزارنے والی بڑی خوش نصیب ہستی
ہوں امی کی محبت کا سایہ اس گھنی بیل سے کہیں زیادہ خنک اور پرسکون
ہے۔ اسی لئے کھانا کھا کر میں پھر چلتی ہوئی اپنے گوشۂ عافیت تک آ پہنچتی
کہ آرام کے لئے میری آرام کرسی کافی تھی۔ میں ذرا کی ذرا آنکھیں موند کر
لیٹ جاتی۔ اپنی ٹانگیں چھوٹی میز پر پھیلا کر کسی نہ کسی کتاب کو سینے سے
لگائے لیٹ جاتی۔ تھوڑی سی دیر کے آرام کے بعد پھر میں اپنی پڑھائی میں
جت جاتی۔ یہاں تک کہ سورج ڈھلنے لگتا اور میرے گوشۂ عافیت
میں اندھیرا گہرا ہو جاتا اور میں اٹھ کر اپنی سلی ہوئی قمیص ٹھیک کرتی دوپٹہ
کو کاندھوں پر پھیلا کر تھکے تھکے قدموں سے کمروں سے ہوتی ہوئی اگلے برآمدے
میں پہنچ جاتی۔ جہاں امی تختوں پر چائے یا شربت اور سموسے پکوڑے
وغیرہ طشتریوں میں تقسیم کر رہی ہوتیں مجھے دیکھتے ہی ان کی آواز
میں اور زیادہ جوش پیدا ہو جاتا۔ اپنی قسمت کا رونا کہ گھر کی بڑی بیٹی
اور ایسی نکمی میرے پڑھائی کے لئے جلتے اب تو خیر امتحان ہیں۔ لیکن اور
دنوں میں تو سنے کو نہ سکھ مجھے دیدیا۔ ہر وقت اوندھی سیدھی کتابوں
میں منہ دیئے رہتی۔ اور پھر صورت جو پہلے ہی سے اجاڑ ہے کہ اور زیادہ
ہو جانے کے امکانات پر روشنی ڈالی جاتی۔ واقعی امی ٹھیک کہتی ہیں
کہ امتحان نہ ہوں اور چھٹیاں ہوں تب بھی میں اپنا بیشتر وقت اپنے
گوشۂ عافیت میں گزارتی ہوں۔ یوں کہ نہ صرف امتحان کا موسم بلکہ
ہر موسم مجھے اپنے اسی گوشے میں بیٹھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔ سردیوں میں جب
بھیا سے کہہ کر یا میں خود ہی بڑی سی قینچی لے کر اس گھنی بیل کو تھوڑا سا
چھانٹ دیتی ہوں تو یہ گوشہ سورج کی کرنوں سے منور ہو جاتا ہے۔ اور میں
آنکھیں موند کر آرام کرسی پر لیٹ جاتی ہوں تو یہ ہلکی ہلکی کرنیں میرے سرد
جسم کو ہلکی ہلکی پرسکون گرماہٹ سے بھر دیتی ہیں۔ یوں مجھے بہت سارے
اچھے اچھے خواب دیکھنے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔ بارشوں میں بھی جب
یہی بیل میرے اوپر ہلکے ہلکے موتی برساتی ہے۔ تو مجھے یہ دنیا بہت زیادہ
خوبصورت و رنگین لگنے لگتی ہے۔ خزاں میں ایک ایک کر کے پتے میرے
اوپر برستے رہتے ہیں۔ اور میں ان جانے دکھوں میں ڈوب جاتی ہوں۔
پھر بہار آ جاتی ہے۔ اور یہی بیل مجھے اپنے سرخ پھولوں کا تحفہ پیش کرتی
ہے۔ دنیا میں رنگ پھیل جاتے ہیں۔ سرخ سرخ پھول میرے اوپر رنگوں
کی دھیمی دھیمی بارش کی مانند برستے رہتے ہیں۔ اور پھر امتحان آ جاتے
یا گرمیاں آ جاتی ہیں۔ تب بھی یہاں خنک سا اندھیرا چھایا رہتا ہے اور
پھر جاڑے بارش خزاں اور بہار ....

سو مدتوں سے میں اسی ڈھنگ سے کبھی غم اور کبھی خوشیوں سے
دوچار ہوتی رہی ہوں۔ لیکن امی ابھی تک عادی نہ ہوئیں اور دنوں
میں تو خیر کم لیکن امتحانوں کے زمانے میں جب میں دن بھر کے علاوہ راتوں
کو بھی ایک ننھا سا ٹیبل لیمپ روشن کئے۔ یہاں کتابوں پر جھک جاتی ہوں
تو ان کی بڑبڑاہٹ میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے
امی کو یہ سب کچھ اتنا زیادہ برا نہیں لگتا وہ تو بس اپنی ماؤں والی عادت
سے مجبور ہیں کہ اولاد کی ہر ہر بات میں کیڑے نکالیں۔ اور میرا اس گوشے
سے عشق خاندان بھر میں مشہور ہوتا جا رہا ہے۔ یہیں بیٹھ کر میں نے پڑھائی
کی اور محنت سے امتحان بلا روک ٹوک پاس کر لئے۔ یہیں بیٹھ کر میں
نے اپنی سب سے پہلی کہانی لکھی۔ اور میں ایک دن یہیں آنکھیں
موندے آرام کرسی پر لیٹی تھی کہ بھیا نے میری بند آنکھوں پر ایک رسالہ
لا کر رکھ دیا۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ کہانی شائع ہی

جاگتے میں یہی خواب دیکھ رہی تھی۔ رسالہ بیچ سے کھلا ہوا تھا اور میرا منہ چھپا تھا پھر میرے شوق میں دو چند اضافہ ہوا۔ کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر وقت پڑھتے رہنے کے علاوہ میں کبھی کبھی آرام کرسی چھوڑ کر نیچے دری پر بیٹھی الٹی سیدھی کہانیاں لکھنے لگی۔ اس کے علاوہ ایک بہت اہم بات جو آج میں آپ کو سنانے والی ہوں وہ یہ کہ یہیں سے میری اور زینب یا زینب اور کتابوں کی دوستی آہستہ آہستہ بڑھنے والی بیل کی طرح بڑھی ہے۔ اور پھر ان کتابوں کی روشنی نے ایک خنک سایہ زینب کی جلتی ہوئی زندگی پر تان دیا۔

زینب جو ہمارے گھر برتن دھونے والی ماسی کی روشن صورت بیٹی ہے۔ اور جسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ بہت پرانے لیکن بہت صحیح محاورے اور کہاوتیں یاد آتی ہیں۔ جیسے گودڑی میں لال اور اللہ کی دین ہے۔ وہ جسے چاہے نوازے وغیرہ وغیرہ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اتنے حسین چہرے بہت کم دیکھے ہیں۔ گلابی مائل سفید رنگت سیاہ چمکدار آنکھیں، پتلی ناک مسکراتے ہوئے کومل سے گلابی ہونٹ اور روشن چہرے پر جھولتی ہوئی سیاہ بھونرا سی لٹ زینب کو دیکھنے کے بعد اگر کبھی میں غلطی سے آئینہ دیکھ لوں تو مجھے اپنے آپ پر ترس آنے لگتا ہے۔

سو اس دن جب میں نے کتابوں پر نظریں اٹھا کر زینب کو دیکھا تو میری ساری تھکن اتر گئی۔ وہ اس روز ہمارے یہاں کوئی نئی نہ آئی تھی کبھی کبھی جب اس کی ماں بیمار ہو جاتی تو زینب اس کا فرض نبھانے چلی آتی سو اس دن بھی یہی ہوا تھا کچن سے برتنوں کی اٹھا پٹک کی آواز جھاڑو کی شڑ شڑ اور نل کی ایک رفتار سے بہنے والی دھار کبھی بھی میری سماعت پر گراں نہیں گزرتی یوں کہ اتنے سے شور کی تو میں عادی ہوں۔ سو برتنوں کو چمکا کر اور کچن کو جگمگا کر زینب کو اس پچھلے دروازے سے واپس ہونا تھا اور اس دن دھوپ اتنی تیز تھی کہ وہ مجھے اس خنک اندھیرے میں بیٹھا دیکھ کر مارے شک کے سیڑھیاں اترنا بھول گئی اور ذرا کی ذرا وہیں کتابوں کی میز کے پاس ٹک گئی اور پھر جب میں نے زیادہ تھک کر کتابوں پر سے نظر اٹھائی تو میرے سامنے اس کا مسکراتا ہوا روشن چہرہ تھا جس پر تحیر کے ہلکے ہلکے سائے بھی پھیلے ہوئے تھے۔ شاید وہ کتابوں کے اس ڈھیر کو دیکھ کر متحیر تھی۔

"یا اللہ ایسے ایسے چہرے بھی ہیں تیری دنیا میں۔"

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کی کھنکتی ہوئی آواز سننے کے لئے بولی کیا ان کتابوں کو پڑھو گی زینب؟ اور جب اس نے حیران ہو کر اپنی سیاہ آنکھیں میری طرف اٹھائیں تو میرا جی چاہنے لگا کہ میں ان کے پیچھے میں ڈالنے والے الات کرتی چلی جاؤں۔

بی بی جی میں؟ میں تو ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتی لیکن اس کی پر اشتیاق نظریں کتابوں پر پھسل رہی تھیں۔ اور ہاں وہ کتابوں سے کھیلتے رہے تھے رسالے، ناول اور میری کورس کی کتابیں جو میں نے اپنے کالج کی لائبریری سے مستعار لی تھیں۔ اور جو ساری کی ساری باہر کے ملکوں کی چھپی ہوئی تھیں چکنے اور سفید کاغذ پر چھپی ہوئی ان کتابوں کی جلدیں دبیز اور خوبصورت رنگوں کی تھیں۔ اور ناول اور رسالے جو میرے اپنے ملک کے چھپے ہوئے ہیں اور جن کا کاغذ میلا کھردرا اور جلدیں بد رنگ ہیں۔ لیکن جن میں بہت سی ایسی باتیں لکھی تھیں جنہیں پڑھ کر میرے تخیل کی بلندیاں آسمان کو چھونے لگتی ہیں۔

میں دیکھ رہی تھی کہ اگرچہ حروف انجانے تھے لیکن زینب جو خود بھی حسین ہے اور حسن کی دلدادہ معلوم ہوتی ہے میری کورس کی کتابوں میں زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ میں نے پھر کہا زینب میں تمہیں پڑھنا سکھا دوں؟ پھر تم ان کتابوں کو پڑھنا (اس لئے شاید میرے ذہن میں ان کتابوں ہی کے نذر میں اقوال جگمگا رہے تھے) زینب ان چکنی اور خوبصورت کتابوں کے سحر میں ایسی گرفتار ہوئی کہ اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا پھر ایک سطر پر انگلی پھیر کر بولی آپ مجھے یہ سب کچھ پڑھنا سکھا دیں گی ابھی میں سب کچھ پڑھنے لگوں گی کیوں نہیں تم سب کچھ پڑھ سکو گی۔ ایک ملامت کرتی ہوئی کہ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے چھوٹے بھائی کو بہت محبت سے پڑھنے کا غلط طریقہ بتا رہی ہوں۔

اور منت سے بھلا زینب کو کیا عذر ہو سکتا تھا سو وہ کہنے لگی: اچھا تو بی بی جی پھر مجھے پڑھنا سکھا دو۔

(گویا زینب نے پہلے سے دکھ خود ہی چنے تھے۔)

زینب بڑی اچھی شاگرد ثابت ہوئی آہستہ آہستہ میرے سر پہ منی ہوئی بیل گھنی ہوتی گئی۔ میرے گرد کتابوں کے ڈھیر میں اضافے کے ساتھ ساتھ میرے ڈگریوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ زینب نے بھی ایک ایک کرکے کئی کتابیں ختم کر ڈالیں۔ علم شروع سے پھولوں والی گھنی بیل کی مانند ہمارے اوپر سایہ کر رہا تھا۔ ایسا سایہ جو ہر موسم میں لطف دے۔ ایسا سایہ جس میں خنک اندھیرے اور صبح صادق کے ٹھنڈے اجالے موجود ہوں۔

ماسی کو زینب کی پڑھائی سے روز اول سے شکایت پیدا ہو گئی پہلے ہی دن جب زینب بجائے کام نمٹانے کے بعد میرے پاس بیٹھی الف سے انار ب سے بلی والا قاعدہ پڑھ رہی تھی۔ تو ماسی کو اس پر سخت غصہ آگیا۔ اری تو کیا کرے گی اس کتاب کو پڑھ کر تو تو بس اتنا ہی سیکھ لے کہ برتن کیسے چمکائے جاتے ہیں۔

ماں کا یہ طعنہ زینب کو برا تو لگا ہی ہوگا۔ پر میں نے اسے بہت محسوس کیا۔

ارے ماسی میں تمہاری زینب کو اتنا پڑھا دونگی کہ وہ تمہاری طرح برتن دھونے کی بجائے کسی اسکول میں استانی بن جائے گی؟ اس پہ ماسی نے مجروح نظروں سے میری طرف دیکھا اور زینب کے ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں پھلانگتی آنگن پار کرکے دروازے سے نکل گئی۔

لیکن اس کے بعد کبھی ماسی زینب کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکی اس نے رو دھو کر اپنی ماں کو راضی کر لیا۔ اور پھر بڑی پابندی سے ہمارے یہاں آنے لگی۔ اپنی ماں کے بجائے اسنے اب ہمارے گھر کا کام خود سنبھال لیا۔ بڑی خاموشی سے وہ کچن کا رخ کرتی۔ اگر میری چھٹیاں ہوتیں تو صبح ہی میں کان دھرے نل کی آواز سنتی رہتی۔ ورنہ شام کے وقت میں فوراً زینب کی کتابیں لئے اسکی منتظر ہوتی۔ کام سے فارغ ہو کر اپنے سیاہ اور سرخ چھاپی لنگر بڑے سے دوپٹے سے اپنے ہاتھ پونچھتی ہوئی زینب آن کرسی پر بیٹھ جاتی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کی پڑھائی کے بعد رخصت ہو جاتی شروع شروع میں تو زینب کی پڑھائی میں میں نے اتنی زیادہ دلچسپی نہ لی لیکن پھر جب میں نے اسکا شوق اور ذہانت دیکھی تو میرا دل خود بخود اسے پڑھانے کی طرف مائل ہو گیا۔ دراصل پڑھنے کے علاوہ پڑھانے کا شوق بھی میری جان کو لگا تھا۔ لیکن گھر کے بچے میرے ہتھے نہ چڑھتے اور اگر کبھی ہاتھ بھی لگتے۔ تو ایسی کند ذہنی دکھاتے کہ میں عاجز ہو کر رہ جاتی۔ زینب کے اس شوق نے ماسی کے اعتراض کی شدت میں بھی کمی کر دی۔ لیکن جب بھی کسی نئے گھر میں کام ملنے کے امکانات ہوتے تو وہ ہمیشہ یہ حساب ضرور ہی لگاتی۔ اری جتنی دیر تو یہاں بیکار مغز ماری کرتی ہے اتنے میں تو تو اس راشن والی کے یہاں کے برتن دھو سکتی ہے؟

پر زینب اپنی ہٹ پر قائم رہی اور ماسی کا دل کہ ماں کا دل ہے۔ اس کی بالک ہٹ کے آگے مجبور ہو جاتا۔

اور آہستہ آہستہ زینب کا ذہن میری کتابوں کے ساتھ سفر کرتا رہا اس کی شخصیت نکھرتی رہی۔ ایک سلجھا ہوا سا ایک خود اعتمادی سی اس میں پیدا ہونے لگی۔

زینب نے جب پہلے پہل پڑھائی شروع کی تو میرے برآمدے میں ایک ہلچل سی مچ گئی بچے امی اور ایک آدھ دفعہ تو ابا بھی یہ کھیل دیکھنے آگئے میرے اور میری شاگرد کے گرد کچھ عرصے تک بچوں کا جمگھٹا سا لگا رہا۔ منو اپنی ساری کتابیں لے آئے کہ زینب ہی انہیں پڑھ لے ان کے لئے تو بیکار ہی تھیں۔ چھمی نے پنسلوں اور ربر کا تحفہ زینب کو دیا غرض گھر بھر نے زینب کی پڑھائی میں بے حد دلچسپی لی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ کمروں کے پیچھے تنگ کے دروازے بند ہو گئے بس اب کبھی کبھی کوئی کھڑکی میں سے جھانک کر زینب کو انہماک سے پڑھتا ہوا پا کر مسکرانے لگتا۔

لیکن جب یہ بھیڑ چھٹ گئی تب بھی میں نے دیکھا کہ گھر کے ماحول میں بھیا کی کرسی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ بھیا نے کب پہلی دفعہ زینب کو پڑھتے ہوئے دیکھا لیکن اب میں انہیں اکثر و بیشتر اپنی طرف پاتی تھی۔ اور جب تک زینب پڑھتی رہتی تب تک وہ ہمیشہ اخبار بینی میں بے طرح مشغول رہتے اور پھر یہ معمول بن گیا کہ زینب جب بھی پڑھتی تب بھیا ضرور پائے جاتے۔ انٹر سے لیکر ایم اے تک میرا اور زینب کا اور کتابوں کا ساتھ رہا۔ قاعدے سے لڑکوں کی پچاس سالوں میں ہمارے اسکولوں میں پڑھتا بہت کم علم حاصل کر سکتا۔ لیکن

زینب نے اس عرصہ میں بہت کچھ سیکھ لیا۔ میرے کورس کی کتابیں
اپنے حسن کی وجہ سے اس کے لئے اب اتنی پر سحر نہ رہ گئی تھیں۔ دراصل
وہ میرے مضمون کو جو میں غیر ملکی زبان میں پڑھتی تھی۔ اتنا زیادہ
پسند کرتی تھی بلکہ اب وہ اپنی سمجھ بوجھ اپنے علم کے مطابق صرف وہی
کتابیں پسند کرتی تھی جن کے کاغذ پیلے اور گھٹیا ہوتے ہیں۔ ان کتابوں
نے اسے بہت سی باتیں سکھائیں۔ اس کے شعور کو جلا بخشی اس کے ذہن
کو وسعتیں عطا کیں پر ساتھ ہی ساتھ علم نے جو قندیل اس کے ذہن میں
روشن کی تھی۔ اس کے اجالے میں اسے اپنے گرد پھیلے ہوئے تمام اندھیرے
اور زیادہ گہرے نظر آنے لگے۔ صرف اس کا وجود اجالے میں تھا اور
باقی ہر چہار طرف اندھیرا۔ اگر اس کے پاس روشنی کی یہ ایک
کرن بھی نہ ہوتی تو وہ ان اندھیروں کی عادی ہو کر اپنی زندگی بڑے
آرام سے گزار دیتی۔ لاعلمی بہت سی حالتوں میں ایک نعمت ہے
اور آگہی کے دکھ جھیلنا کوئی آسان امر نہیں۔ زینب اپنے وجود میں
علم کی روشنی کی تڑپتی کرنیں سمیٹے ایک بے چین اور اپنے ماحول سے
علاحدہ ہستی بن چکی تھی۔ اپنے گھر اپنے ماحول اور اپنے لوگوں سے
وہ ذہنی طور پر مختلف ہو چکی تھی۔ اور اب وہ خود اپنے لئے ایک الجھن
تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اپنے آپ کو کس خانے میں فٹ کرے
اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ یہ سب کچھ کیا دھرا میرا ہی ہے میں جو
اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھی کتابوں سے سر پھوڑا کرتی ہوں زندگی
کی حقیقتوں سے کس درجہ ناواقف ہوں حتی کہ میں بھیا کی زینب کے
قریب بیٹھ کر اخبار بینی کے اس درجہ انہماک کو بھی نہ سمجھ سکی اس اخبار
کی آڑ میں وہ زینب کی کوئل کی طرح کوکتی آوازیں پڑھتے ہوئے سنتے
تھے۔ اسی اخبار کی آڑ میں وہ آنکھیں موندے زینب کی ایک ایک ادا
کو محسوس کرتے تھے۔ اس کے کومل ہونٹوں کو جنبش کرتا پاتے۔ اس کے
ہاتھوں میں لرزتے قلم کو بھی انہوں نے آنکھیں میچے ہی سے محسوس
کیا اور پھر جب زینب نے اعتماد کے ساتھ قلم کو ہاتھ میں لینا سیکھ
لیا تب بھی اس اخبار کی اوٹ میں بھیا نے اس کے اعتماد کو محسوس
کیا۔

اخبار ہٹا کر بڑی گہری نظروں سے بھیا نے زینب کو اس

روز دیکھا۔ جس دن وہ کتابوں کو آگے رکھے مسلسل روئے جا رہی
تھی۔ یوں کہ آج وہ اپنی ماں سے لڑ کر آئی تھی۔ ماں نے اس دن
اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ کہ زینب نے اپنے منگیتر سے شادی کرنے سے
انکار کر دیا۔ یوں کہ وہ جاہل تھا۔ شرابی تھا۔ اور اس طبقے کا جاہل
تھا۔ جو دن بھر مزدوری کرنے کے بعد رات میں اپنی بیوی کو پیٹنا
ضروری خیال کرتا ہے۔ پہلے شاید زینب کو احساس بھی نہ ہوتا لیکن
اب ان کتابوں نے اس میں بہت سے احساسات جگا دیئے تھے۔
برائی اور بھلائی کی تمیز پیدا کر دی تھی اور۔ اور اس کی ہستی کو بے چین
کر دیا تھا۔

زینب مسلسل آنسو بہاتی رہی اور بھیا بڑی دیر تک اس
برسات میں بھیگتی زینب کو دیکھتے رہے۔ اور میں یہ سوچتی رہ گئی
کہ کاش میں زینب کی کچھ مدد کر سکتی؟

میں یہ ضرور چاہتی تھی۔ کہ زینب کے دکھوں کا مداوا ہو سکے
لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے اس سلسلے میں بھیا کی مدد
بھی طلب کی ہو۔ اسی لئے جب بھیا نے زینب کو ہر وقت یونہی
آنسوؤں کی برسات میں بھیگتا پا کر ایک دن مجھ سے کہا کہ وہ
میری شاگرد کی ہر طرح کی مدد کو تیار ہیں۔ تو میرا دل چاہا کہ میں
ان تمام کتابوں کو پھلانگ کر کہیں دور بھاگ جاؤں مجھے اعتراف
ہے کہ میں نے زینب یا بھیا کی کوئی مدد نہ کی۔ ابا کا طنطنہ امی کے آنسو
میرے لئے تو دیوار بن گئے۔ لیکن بھیا نے وہی کیا جو وہ چاہتے
تھے۔ انہیں وہی کچھ مل گیا۔ جو وہ چاہتے تھے۔ اور زینب بھی زینب
بھی یقیناً خوش ہو گی بھیا کے ساتھ بھیا کا تو اب اس گھر میں کوئی
ذکر تک نہیں کرتا۔ پورے گھر میں ایسا سناٹا سا طاری رہتا ہے۔
کہ میں اگر چاہوں تو اگلے برآمدے میں یا کمروں میں بیٹھ کر سارا دن
پڑھتی رہوں بچے سہمے سہمے پھرتے ہیں ابا اپنے کمرے تک محدود
ہو گئے ہیں۔ اور امی کی اونچی آواز سننے کو کان ترس گئے ہیں۔

بھیا مجھے اپنے گھر کا سب سے زیادہ روشن خیال
فرد سمجھ کر میرے کالج کے چھپے ہوئے مجھ سے خود پڑھ لیا کرتے
تھے ہیں۔ لیکن میں ان کے خطبے دل سے کبھو بھی پڑھ نہ سکتی

رفعت نواز

دشتِ امکاں

> **فتح علی کی بیوی خوبصورت تو نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر بلا کی ملاحت تھی اور اس کی آواز بھی بڑی سریلی تھی شادی کے بعد اس نے شوہر سے جو پہلی فرمائش کی وہ ہارمونیم کی تھی۔**

بڑی اداس، ابر آلود دوپہر تھی۔ فضا میں دم گھونٹنے والی افسردگی تھی۔ گھر پہنچا تو ذہن بوجھل اور سر بھاری ہو رہا تھا۔ دیر تک پلنگ پر لیٹا رہا۔ دسترخوان بچھا تو کھانے کے لئے بیٹھ گیا کہ اتنے میں قدیر داخل ہوا اور ہانپتے ہوئے بولا "بھیا فتح علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔" ایک دھکا سا لگا۔ کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ معاً خیال آیا کہ قدیر اکثر بے پر کی اڑایا کرتا ہے پہلے بھی کئی زندہ افراد کے مرنے کی خبریں سنا کر سنسنی پیدا کر چکا ہے اس خیال کے پیش نظر میں نے اسے ڈانٹ پلائی وہ بولا "بھیا قسم سے ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اعتبار نہ آئے تو خود جا کر دیکھ لو۔"

عظیم کو دوڑایا کہ خبر لائے۔ عظیم نے بھی قدیر کے بیان کی تصدیق کی اور اس اضافہ کے ساتھ کہ محلے کے چند آدمی فتح علی کی تجہیز و تکفین کے لئے چندہ مانگنے کا مشورہ کر رہے ہیں۔

فتح علی کی تجہیز و تکفین کے لئے چندہ! کانوں کو اعتبار نہ آیا۔ وہ شخص جو زندگی بھر دوسروں کی امداد کرتا رہا آج چندے کا محتاج ہے۔ وقت کی نیرنگی پر رونا آیا۔

فتح علی ایک عرصے سے ہمارے قصبے میں رہتے تھے کچھ عرصہ پہلے تک ان کا شمار قصبے کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔ کپڑے کا کاروبار تھا۔ نوکر چاکر تھے۔ کپڑوں کی خریداری کے لئے ان کا اکثر شہر جانا ہوتا تھا۔ ایک بار فتح علی لوٹے تو کپڑوں کی گانٹھوں کے ساتھ ایک سانولی سلونی دوشیزہ بھی لے آئے۔ گھر میں کہرام مچ گیا کہ کما پوت اپنی مرضی سے شہر کی نہ جانے کس گھر کی لڑکی بیاہ لایا تھا۔ گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ فتح علی اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی بس ایک بوڑھا باپ تھا سو وہ بھی ایسا بگڑ کر بہو کی شکل دیکھے بغیر ہی بیٹے کے منہ پر تھوک کر اپنے بھائی کے یہاں دوسرے گاؤں چلا گیا۔

فتح علی نے گاؤں والوں کو سنانے کے لئے اعلان کر دیا کسی کو اس کے خانگی معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی گاؤں میں فتح علی کی ساکھ تھی کہ گاؤں کے اکثر لوگ اس کے مقروض تھے اس لئے کسی نے بھی اس سلسلے میں کچھ کہا نہیں شادی کے بعد فتح علی بدل سا گیا۔ کہاں وہ فتح علی کہ نمازیں پڑھا کرتا درود وظائف کیا کرتا اور کہاں اب اس کی نمازیں قضا ہونے لگیں۔ گھر میں ریڈیو آ گیا اور دن رات فلمی گیت بجنے لگے۔ فتح علی کی بیوی خوبصورت تو نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر بلا کی ملاحت تھی اور اس کی آواز بھی بڑی سریلی تھی۔ گانے کا اسے بہت شوق تھا۔ شادی کے بعد اس نے فتح علی سے جو پہلی فرمائش کی وہ ہارمونیم کی تھی۔ ہارمونیم آیا تو وہ دن رات بجا کر گانے

شام میاں فتح علی دوکان نوکروں کے حوالے کرکے اٹھ کر بازار جاتا۔ پھولوں کے گجرے چنبیلی کا جوڑا۔ مٹھائی اور فلو کے یہاں کے کباب لے کر گھر پہنچتا۔ بیوی کے بالوں میں اپنے ہاتھوں سے جوڑا باندھتا۔ خود بھی گلے میں پھولوں کا ہار اور ہاتھوں میں گجرے ڈال کر بیٹھ جاتا۔ بیوی اجلی چاندنی پہ ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتی اور بڑے ناز و انداز سے آنکھوں کے بھاؤ دکھاتی ہوئی گانے لگتی کیف و مستی میں ڈوبے ہوئے گیت اور غزلیں۔ گانے بجانے کا سلسلہ نو دس بجے رات تک چلا کرتا پھر کھانا ہوتا اور فتح علی کے بیفکرے دوست آجاتے اور شطرنج بچھ جاتی۔ نسرین بھی کھیل میں شامل رہتی۔ رات گئے تک کھیل ہوا کرتا۔ اور جب سب پر نیند مسلط ہوجاتی۔ جماہیاں آنے لگتیں۔ حقے کی نے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتی۔ پان بے مزہ لگتے۔ تب محفل برخاست ہوجاتی اور صبح دیر تک میاں بیوی سوئے پڑے رہتے۔ نوکر آکر جاہیاں لے جاتے فتح علی لاٹ صاحب کی طرح گیارہ بجے دوکان پہ جاتا۔ اس کے دوکان پہنچتے ہی غرضمندوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ فتح دل کا غنی تھا۔ ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ ہر غرضمند کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرتا۔ گاؤں والوں میں فتح علی کی بڑی عزت تھی۔ اس کے برخلاف نسرین انتہائی غیر مقبول تھی۔ ایک تو وہ بد دماغ تھی پھر اسے پیسے کا غرور الگ تھا۔ اپنے تئیں وہ خود کو حسین بھی سمجھتی تھی۔ فتح علی کی ناز برداری نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

میں ان دنوں آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا فتح علی مکان کے پڑوس میں رہتے تھے۔ اکثر ان کے یہاں جانا ہوتا تھا میاں بیوی مجھے بہت چاہتے تھے۔ نسرین کو ناولیں پڑھنے کا ازحد شوق تھا میں ہی اسے ناولیں لاکر دیتا تھا۔ نسرین تمام دن ناولیں پڑھا کرتی۔ گانے کا ریاض کرتی یا نوکرانی سے جھگڑتی رہتی تھی۔ فتح علی سے بات بے بات الجھا کرتی تھی۔ ان کی شادی ہوئے آٹھ سال ہوچکے تھے مگر ان کے کوئی بچہ نہیں تھا۔ فتح علی بچے کے لئے بڑے فکرمند تھے۔ حکیموں، ویدوں، ڈاکٹروں اور عاملوں سے اکثر بیوی کا علاج کرواتے تھے۔ نسرین کو بچوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی چونکہ وہ آرام پسند تھی اس لئے اکثر کہا کرتی کہ بچہ ہوگئے تو ان کو کون پالے گا۔ راتوں کو جاگنا پڑے گا آرام چین جائے گا نہ ہی ہوں تو اچھا ہے۔ فتح علی نسرین کی ان باتوں سے بیزار سے لگتے تھے مگر پھر بھی نسرین کی فرمائشوں کی تکمیل ہوا کرتی تھی شاید اوپری دل سے۔ ایک بار انہیں سیر و تفریح کا شوق چرایا۔ نسرین کو لے کر اجمیر شریف گئے۔ ایک ڈیڑھ مہینے بعد لوٹے۔ دوکان نوکروں کے حوالے کر گئے تھے۔ نفع تو نہیں نقصان ہی رہا۔ فتح علی نے کوئی بازپرس نہیں کی۔ کچھ دن بعد دلی، آگرہ کی طرف نکل گئے۔ اب کے نسرین ساتھ نہیں تھی ہاں نسرین کا ایک رشتہ کا ایک بھائی دوکان سنبھالنے آگیا تھا۔ فتح علی تین مہینے بعد لوٹے تو دوکان خالی ہوچکی تھی اور خالی گھر کے منہ چڑھا رہے تھے بیوی کے برادر عزیز مال کے کوڑے کرکے فرار ہوچکے تھے۔

دوکان کا بیوپار نہ ہونے کے برابر تھا۔ قرض ہوگیا تھا وصولی کا کوئی انتظام نہیں تھا کوئی ایمانداری سے قرض کا روپیہ لاکر دیتا تو فتح علی شکریہ کے ساتھ قبول کر لیتے کوئی نہ دیتا تو تقاضا بھی نہ کرتے۔ نسرین کی فرمائشوں کی تکمیل نہ ہوتی تو وہ جھگڑتی تھی۔ جب تنگی بڑھی اور دوکان کا کرایہ دینا بھی بار ہوگیا تو دوکان خالی کر دی گئی۔ بچا کھچا سامان بیچ دیا گیا اور فتح علی گوشہ نشین ہوگئے اب وہ دن تمام حقے کی نے منہ میں لئے پڑے رہتے۔ علم نجوم اور طب کی کتابیں پڑھا کرتے۔ میں اکثر شام میں جاتا تھا۔ ادھر ادھر کی گپ لگتی۔ کبھی کبھی میں کسی رسالے سے کوئی غزل کوئی افسانہ پڑھ کر فتح علی کو سنایا کرتا۔ غمگین شعر سنکر فتح علی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ نسرین انہیں خوب برا بھلا کہتی۔ فتح علی چپ چاپ سب سن لیتے تھے۔

رفتہ رفتہ نسرین کے زیورات بکے۔ پھر گھر کے برتن بھانڈے فرنیچر اور قیمتی کپڑے بکے۔ اور فتح علی بڑا والا مکان چھوڑ کر ایک چھوٹے سے مکان میں آکر رہنے لگے۔ ان کے کسی دوست کی سفارش پہ انہیں مسلم وقف بورڈ میں ستر روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ نسرین بہت چڑچڑی ہوگئی تھی اور روز فتح علی سے جھگڑتی تھی اسے غم تھا کہ فتح علی کی کاہلی کی وجہ سے بہت پھلتا پھولتا کاروبار ٹھپ

ہوگیا اور یہ سمجھنے دان دیکھنا پڑھنے لکھنے کام کاج کرنا پڑتا تھا۔ چناؤ سنگھار کو وقت نہیں ملتا تھا۔ میک اپ کا سامان نہیں آتا تھا۔ ہوائے کے رہائش کے لئے وقت نہیں ملتا تھا۔ فتح علی اپنے حال میں پریشان تھے۔ اب وہ دن کہاں کہ بیگم کے سامنے بیٹھ کر اس کے گیت سنا کریں۔ اس کے ناز اٹھائیں۔ کبھی کبھار ہی اصرار کرتا تو نسرین ہار مونیم لے کر بیٹھ جاتی اور پورے طمطراق سے گانے لگتی۔ فتح علی سر دھن کر زیر لب بڑبڑاتے

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بےجا کا

نسرین کھا جانے والی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھتی اور دانت پیس کر کہتی " انہیں تو میرا ہنسنا بولنا گانا بجانا چلنا پھرنا سب برا لگتا ہے۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ میں ان کی طرح روتی رہوں روتے میری بلا۔ میں تو تمہارے سینے پر مونگ دلوں گی جب بیاہ کر لائے ہو تو اب بھگتو بھی "۔

فتح علی مسکرا کر کہتے۔ "بھگت تو رہا ہوں بی بی"

- ہاں میرے لئے تو مرے جارہے ہو۔ کما کر لاتے ہو تو خود بھی ٹھونستے ہو اور گھر کے نگتوں کو بھی کھلاتے ہو"

فتح علی رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے باہر نکل جاتے اور نسرین خوب خوب گالیاں دیتی۔ نسرین کا پھوہڑ پن کم نہیں ہوا تھا۔ شوہر کی غیر موجودگی میں بچا کھچا سامان اونے پونے داموں بیچ کر کھا پی لیتی تھی اور دن تمام بیمار بنی پڑی رہتی تھی۔ گھر میں ہفتوں جھاڑو نہ لگتی۔ سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا رہتا۔ تنگ آکر فتح علی جھاڑو سنبھالتے اور گھر صاف کیا کرتے تھے۔ نسرین روز ایک نئی بیماری کا بہانہ کرتی تھی اور فتح علی اس کی تیمارداری کیا کرتے تھے۔ ایک بار تو وہ سچ مچ ہی بیمار ہوگئی۔ خوب تیز بخار چڑھا اور بے ہوشی طاری ہوگئی۔ فتح علی دھاڑیں مارنے لگے پچھاڑیں کھانے لگے اور بیوی سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگنے لگے۔ ڈاکٹر آیا۔ انجکشن لگایا دو تین دن بعد نسرین چنگی ہوگئی مگر اب کھانا پکانا اور تیمارداری فتح علی کے ذمے تھی۔ نسرین کا دماغ پہلے ہی کون سا آسمان

درست تھا اب تو بیماری کی وجہ سے اور بھی خراب ہوگیا تھا جو منہ میں آتا بکے جاتی۔ زبان رکتی تو ہاتھ چلنے لگتے۔ دھول دھپا تو ہر روز ہوا کرتا۔ فتح علی ہنس ہنس کر بیوی کے ظلم سہتے تھے۔ اور گڑگڑا کر خدا سے نسرین کی صحت کی مانگتے تھے ــــــ کبھی کبھی نسرین اچھے موڈ میں ہوتی تو فتح علی سے کوئی شعر سنانے کو کہتی۔ فتح علی خوش ہوکر شعر سنانے لگتے۔ مگر بعض اشعار میں دل کا مدعا بھی بیان کر دیتے مثلاً ایک بار انہوں نے یہ شعر پڑھا

تیری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

نسرین نے غصے سے گھور کر انہیں دیکھا اور فتح علی سنبھل کر لگاوٹ کی باتیں کرنے لگے ــــــ مگر یہ پیار محبت کا ڈرامہ کبھی کبھار ہوا کرتا تھا ورنہ اکثر نسرین جھگڑتی رہتی تھی ــــــ ایک دن میاں بیوی میں خوب تو تو میں میں ہوئی۔ پہلی بار محلے والوں نے فتح علی کو اونچی آواز میں نسرین کو ڈانٹتے ہوئے سنا۔ میں لپک کر پہنچا، دیکھا کہ نسرین کی چٹیا فتح علی کے ہاتھ میں ہے اور وہ نسرین کے کولھوں اور کمر پر لاتیں لگا رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے نسرین کو ان کے شکنجے سے چھڑایا۔ فتح علی کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور ان کی آنکھوں میں خون کے ڈورے اتر آئے تھے ــــــ تھوڑی دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے پھر کہنے لگے۔ "نسرین جیسی سنگدل اور کم ظرف عورت کو قتل کر دینا چاہیئے ذلالت کی انتہا ہے کہ کسی موت پر بھی اس کا دل نہیں پسیجتا مرنے والے کو گالیاں دیتی ہے"

"ہوا کیا آخر" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

معمولی سی بات ہے۔ محلے کا بوڑھا بھکاری مر گیا چندہ ہونے لگا۔ کفن دفن کے لئے میں نے بھی کچھ دیدیا۔ گھر پہنچا تو نسرین نے راشن کے لئے پیسے مانگے۔ راشن کے پیسے تو میں دے آیا تھا بس بک بک جھک جھک کرنے لگی۔ مرنے والے کو کوسنے لگی کہ خود تو مر جاتے ہیں اور دوسروں کو پریشان کرتے ہیں میں نے سمجھایا تو مجھ سے لڑ پڑی تنگ آکر میں نے کہہ دیا کہ ایک وقت بھوکا تو رہا جا سکتا ہے مگر مرنے کو بے گور و کفن چھوڑا نہیں جا سکتا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ نسرین بالکل خاموش تھی اور پہلی بار میں نے نسرین کو خوفزدہ سا دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پہاڑ کی برف سرد پڑ گئی ہے۔ فتح علی نے میرے کاندھے پر سر رکھ کر بڑی گلوگیر آواز میں کہا تھا "بھیا۔ خدا کسی کو کفن دفن کے لئے کسی کا محتاج نہ کرے۔ میں نے خدا سے کوئی چیز نہیں مانگی بس ایک ہی دعا مانگتا ہوں کہ تجہیز و تکفین چندے سے نہ ہو" اور فتح علی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور نسرین اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

اس کے بعد کوئی دو مہینے میرا جانا ان کے یہاں نہیں ہوا ایک دن گھر میں سنا کہ فتح علی بیمار ہیں۔ کئی دنوں سے بستر پر پڑے ہیں۔ دیکھنے گیا۔ بیٹھک والے کمرے میں وہ ایک چارپائی پر پڑے تھے وہ کافی دبلے اور کمزور ہو گئے تھے۔ ضعف کے مارے بار بار ان پر غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ میں کافی دیر تک ان کے سرہانے بیٹھا دل ہی دل میں ان کی حالت پر افسوس کرتا رہا۔ نسرین نے بتلایا کہ تین ہفتوں سے بیمار ہیں۔ حکیم کا علاج چل رہا ہے۔

"کچھ کھاتے پیتے بھی ہیں" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں دودھ پیتے ہیں حکیم نے مربے دیئے وہ کھاتے ہیں کبھی کبھار مونگ کی کھچڑی بھی کھا لیتے ہیں مگر بھیا، ان کی دوا دارو کے لئے پیسے کہاں سے لاؤں گھر کی حالت تم سے چھپی ہوئی نہیں ہے، پڑوسیوں سے قرض لے کر کام چلا رہی ہوں۔ ادھر میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

دوسرے روز میں نے اور محلے کے کچھ لوگوں نے فتح علی کو سمجھا منا کر سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیا۔ آج فتح علی کو دواخانے میں داخل ہوئے آٹھواں دن تھا پرسوں میں باہر گیا ہوا تھا اس لئے انہیں دیکھنے اسپتال نہ جا سکا تھا شام میں جانے کا ارادہ تھا کہ ان کے انتقال کی خبر ملی۔

میں جب فتح علی کے مکان پر پہنچا تو پانچ آدمی چبوترے پر بیٹھے صلاح مشورہ کر رہے تھے میرے پہنچتے ہی امام علی موذن نے کہا "جناب فتح علی صاحب کی مالی حالت جو کچھ بھی تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ ان کی بیوی بے چاری پاگل پن سوار ہے۔ شوہر کا انتقال ہوا۔ مردہ گھر میں پڑا ہے اور وہ بنا کچھ کہے گھر سے چلی گئی ہے کفن دفن کے لئے سوائے چندہ جمع کرنے کے کوئی چارہ نہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ کیسی مجبوری تھی ہم سب کتنے بے بس ہو گئے تھے۔ فتح علی نے کتنی حسرت سے دعا مانگی تھی کہ ان کی تجہیز و تکفین چندے سے نہ ہو کسی سے پیسے لے کر بھی ان کی موت مٹی نہ کی جائے ــــــ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں فتح علی کے مکان میں چلا گیا۔ عجیب ویرانی تھی۔ دالان کے ایک کونے میں فتح علی کی لاش پڑی تھی پڑوسنیں قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ دو تین عورتیں پان چبا رہی تھیں اور سرگوشیاں کر رہی تھیں میں نے ایک عورت سے نسرین کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی "میاں وہ تو پاگل بن رہی ہے ــــــ میں جب آئی تو ٹک ٹک خاوند کی لاش دیکھ رہی تھی دیر تک گم سم سی کھڑی رہی پھر کیا سمائی کہ کمرے میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ تو کھل گیا تو بی بی پچھلے دروازے سے نہ جانے کدھر نکل گئیں ــــ دو گھنٹے ہوتے ہیں اسے گئے ہوئے"

دوسری عورت نے مجھے سنانے کے لئے سرگوشی کی۔ "اسے معلوم فتح علی کے مرنے کی راہ دیکھ رہی تھی اب دوسرا خصم تیار ہوگا ہی اس کا" میں گھبرا کر باہر نکلا کہ دروازے میں نسرین سے مڈبھیڑ ہو گئی اس نے مجھے کمرے میں آنے کے لئے کہا کمرے میں پہنچا تو اس نے نوٹوں کا ایک بنڈل میرے حوالے کرتے ہوئے کہا "یہ روپے ان کے کفن دفن کے لئے ہیں چندہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نسرین کی آواز میں عزم تھا اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح ستا ہوا تھا اور آنکھیں خشک تھیں۔ جا کفن لائیے دیر ہو رہی ہے" ــــــ نسرین کی آواز اب گلوگیر ہو گئی تھی میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی اور میری نگاہیں کمرے کے کارنس پر ٹھہر سی گئیں وہاں رکھا ہوا اس کا جہیز غائب تھا ــــــ

ہربنس لال ساغر

چلتے چلتے لڑکی نے ایک دوبارمڑ کر راج کو دیکھا اب وہ اس کے گھر کے قریب پہنچ گئی تھی اور جب لڑکی نے اپنے گھر میں قدم رکھا تو وہ ایک انجانے خوف سے لرز اٹھا۔ خدا جانے یہ لڑکی کیا گل کھلانے والی ہے؟

راج شاعر ہے، پیدائشی شاعر، ایسا شاعر نہیں جو صرف باوزن اور برمصرعے کہہ لیتا ہے بلکہ ایسا شاعر جس کی تیکھی نگاہیں قدرت کے حسین نظاروں میں کھب جاتی ہیں جس کی پلکیں دکھی اور مایوس روحوں کو پہچان کر بھیگ جاتی ہیں، جس کا دل ہمدردی کے دو بول سن کر پگھل جاتا ہے جو ہاتھ نہ آنے والی کسی شے کیلئے نٹ کھٹ بالک کی طرح ضد کرنے لگتا ہے جس کا دماغ شاہوں کو خاطر میں نہیں لاتا اور مفلس اور پرخلوص دوستوں کی راہوں میں بچھ بچھ جاتا ہے جس کا ذہن بڑے سے بڑے ہجوم میں بھی تنہا تنہا رہتا ہے اور تنہائی میں تصور کی ان گنت محفلیں سجائے رہتا ہے، اس کی اکثر نظمیں اور غزلیں اس کے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی کہانیاں بیان کرتی ہیں۔ وہ رومان پسند شاعر ہے۔ اس کے نزدیک عورت کائنات کی حسین ترین تخلیق ہے اور اسی لئے اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ اگر عورت نام کی کوئی شے دنیا میں نہ ہوتی تو آدمی میں زندہ رہنے کی خواہش اتنی شدید نہ ہوتی۔"

عورت کو مختلف زاویوں سے اس نے اپنے گیتوں، نظموں اور غزلوں میں جگہ دی ہے۔ مختلف حادثے اور واقعے اس نے نظم کئے ہیں اور اپنے دوستوں کو لہک لہک کر سنائے ہیں لیکن اس واقعہ کو ابھی تک وہ نظم نہ کر پایا تھا جو اس نے اپنے ایک قریبی دوست کو سنایا تھا۔

دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ راج حسب معمول دوپہر کے بعد نیند سے بیدار ہوا، ہفتہ بھر کا بڑھا ہوا شیو بنایا، غسل کیا، کھانا کھا کر اور رات کو گیارہ بارہ بجے تک گھر سے باہر رہنے کے خیال سے گرم کپڑے پہنے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ خراماں خراماں وہ گلی سے گزر رہا تھا کہ ساتھ والے پھاٹک میں اس نے ایک لڑکی کو دیکھا جو اسے کچھ اجنبی سی لگی۔ اس سے پہلے اسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔۔۔ لڑکی بے حد جاذب نظر تھی۔ وہ گلی پار کر آیا اور نکڑ والی پان کی دوکان پر پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ حسب معمول پنواڑی نے پان بنا کر پیش کیا۔ اس نے پان کلے میں دبایا اور انجانے میں اس کے قدم پھر گلی کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ اس لڑکی کو پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ لڑکی ابھی تک پھاٹک میں کھڑی تھی اور اس کو بڑی متجسس نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اس نے لمحہ بھر کو اس سے نظریں ملائیں مگر ان گھورتی ہوئی نگاہوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ نہ تو وہ شرم سے جھکیں اور نہ ہی ان نظروں نے اس کی نظروں سے مل کر کوئی پیغام دیا۔ اس نے رکنا مناسب نہ سمجھا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

راج ڈاکٹر نصیر کے ہاں پہنچ چکا تھا جہاں اس کی ہر روز گھنٹہ دو گھنٹہ نشست رہتی تھی۔ ڈاکٹر نصیر اس کے مخلص دوستوں میں سے تھا اور بڑی پیاری شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے ہاں ادیب، شاعر، شاطر، رمی کے رسیا، پتنگ باز اور کبوتر باز، شکاری اور کیمیاگر سبھی جمع ہوتے تھے۔ راج کے کانوں میں وہاں بیٹھے ہوئے عجیب و غریب مکالمے دھاچوکڑی مچاتے رہتے تھے مگر اس کا ذہن اشعار کی تخلیق میں مصروف رہتا۔ آج بھی سب کچھ ہمیشہ کی طرح ہی تھا مگر راج کا ذہن آج اشعار کے تانے بانے نہیں بن رہا تھا۔ آج اس اجنبی لڑکی کا پیکر اس کے خیالوں پر چھایا ہوا تھا۔ وہ وہاں بیٹھا سوچ رہا تھا یہ لڑکی کون ہے! اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔ شاید کہیں سے مہمان آئی ہے۔

معمول ہر روز کیلئے ـــــ اسی ادھیڑ بن میں گھر جانے کا وقت ہو گیا گھر پہنچ کر ہر روز دستک دینے سے پہلے پدما کی خفگی کا خوف اُس کے بدن میں بجلی کی کے کرنٹ کی طرح لہرا جاتا تھا۔ اور پھر وہ اس کی خفگی دُور کرنے کیلئے دل ہی دل میں نت نئے بہانے تراشتا ہوا دروازہ کھلنے کا انتظار کرتا تھا ـــ لیکن آج دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے پدما کی ناراضگی کا خوف اُس کے ذہن سے کوسوں دُور رہ گیا تھا۔ دستک ہوتے ہی ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ پدما نے غصے میں وہی گنے چُنے شکایتی جملے اپنے منہ میں بڑبڑائے اور اندر آکر اپنے بستر پر دیوار کی جانب منہ کر کے لیٹ گئی۔

پدما دیوار کی جانب منہ کئے اس انتظار میں پڑی تھی کہ راج ہمیشہ کی طرح اپنی غلطیوں کی معافی مانگے گا اور اگلے روز اُس کی مرضی کے مطابق اُس کے حضور میں سرِ شام حاضر رہنے کا وعدہ کرے گا۔ کھانا کھانے کے بعد رات کو روز پدما کو ساتھ لیکر سیر پر جانے کے وعدہ کی تجدید کرے گا لیکن راج آج خاموش پڑا تھا۔ پدما نے کروٹ لینی چاہی مگر شکست کے احساس نے اسے کروٹ لینے سے روک دیا ـ وہ اُس وقت تک دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹنے کی عادی تھی۔ جب تک راج اُس کے شانوں پر پیار سے ہاتھ رکھ کر اُسے اپنی جانب منہ کرنے کیلئے نہ کہے۔ اُسکے دو چار تلخ تُرش جملے ہضم نہ کرے اور پھر اُسے اپنی باہنوں میں نہ بھر لے ـــ پدما ہر روز اسی طرح من جایا کرتی تھی بلکہ اب تو یہ سب کچھ اس کی زندگی کا ضروری جزو ہو گیا تھا اور آج وہ اسی انتظار میں خالی آنکھوں سے دیوار کو گھورے جا رہی تھی لیکن راج تھا کہ گم سُم پڑا تھا۔ وہ چت لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا تھا جہاں بڑے پھاٹک کے بیچوں بیچ وہ صبح والی اجنبی لڑکی ابھی تک اس طرح کھڑی تھی جیسے فریم میں تصویر جڑی ہوئی ہو۔ وہ لڑکی اُسے ابھی تک گھور رہی تھی۔ وہ لڑکی سارا دن اُس کے ذہن پر سوار رہی تھی اور اب اُس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ اُس کے ذہن میں پدما کی خفگی کا خوف بھی نہ تھا آج اُس کے ذہن میں صرف وہ اجنبی لڑکی تھی جسے اُس نے آج پہلی بار دیکھا تھا ـــ اجنبی لڑکیوں کو تو وہ ہر روز دیکھتا ہے لیکن کوئی لڑکی اس طرح اس پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ یوں تو اس قسم کے مواقع اس کی زندگی میں شادی سے پہلے کئی بار آئے تھے لیکن اب اس عمر میں جب کہ وہ جوانی کی دہلیز پار کر چکا تھا آیا تھا اُس کے لئے یہ ایسی ہی بات تھی جیسے تپتے ہوئے صحرا میں بارش کی بوندیں برس گئی ہوں ـــ راج نے چھت سے نگاہ ہٹا کر تسلی کیلئے پدما کی جانب دیکھا وہ ابھی تک دیوار کی جانب منہ کئے یہ سوچ کر کہ شاید وہ سو گئی۔ اُس نے بھی کروٹ لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا ـــ وہ تھوڑی دیر آنکھیں مُوند کر لیٹا رہا لیکن نیند کا گذر نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے شانوں پر اُس نے پدما کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ آج خلافِ معمول پدما کے لہجے میں ملائمت تھی۔ غصہ نہیں تھا۔ پدما پوچھ رہی تھی۔ "کیا پریشانی ہے؟ نیند نہیں آرہی! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اور جواب میں اُس نے پدما کا ہاتھ پکڑ کر اُسے خود پر جھکا لیا تھا۔ اور تب وہ اجنبی لڑکی بجلی کی تیزی سے اس کے ذہن سے بھاگ نکلی۔ اب اس کا ذہن خالی تھا اور ہمیشہ کی طرح خاموش اور خنک تھی کچھ ہی لمحوں میں وہ دونوں گہری نیند میں ڈوب گئے۔

اگلے دن پھر بڑے پھاٹک کے پاس پہنچتے ہی راج کی نظر اس لڑکی پر پڑی۔ وہ اب بھی عین اُسی جگہ کھڑی تھی جہاں وہ اسے کل ملی تھی۔ وہی لباس اُسی طرح گلے میں دوپٹہ لہرا رہا تھا دلآویز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ اسی طرح اس کی زلفوں کی ایک باریک لٹ اُس کے ماتھے پر بدلی بن کر منڈلا رہی تھی اور وہ کل کی طرح اُسے اس وقت بھی گھورے جا رہی تھی۔ راج نے محسوس کیا جیسے وہ کل سے یہیں کھڑی ہے صرف اُسے دیکھنے کیلئے۔ راج نے نظر بھر کر اُسے دیکھا لیکن وہ خود اُسے دیکھنے میں کھوئی ہوئی تھی کہ اُس نے راج کی دعوت بھری نگاہوں کی گستاخی کا برا نہ مانا وہ اُسے یوں ہی دیکھتی رہی جیسے کوئی مشکل عبارت پڑھ رہی ہو۔ راج دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ نکڑ والے سے پان کی گلوری لیکر منہ میں دبائی اور پھر گلی کے نکڑ پر کھڑا ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا ـــ آج اس کا کہیں جانے کا موڈ نہیں تھا۔ گھر واپس ہونے کیلئے اس نے جیسے ہی گلی میں قدم رکھا، لڑکی جو ابھی تک دیکھے جا رہی تھی اُس کے آگے آگے چل پڑی۔ اُسی کے گھر کی طرف۔ راج نے ایک بار رُک کر ذرا غور کیا۔ "یہ ادھر کہاں جا رہی ہے؟" ...

چلتے چلتے لڑکی نے [illegible] دوبارہ پیچھے مڑ کر راج کو دیکھا۔ اب وہ اُس کے گھر کے قریب پہنچ گئی تھی اور جب لڑکی نے اُسکے گھر میں ہی قدم رکھا تو وہ ایک انجانے خوف سے لرز اُٹھا۔ طرح طرح کے وسوسے اُس کے ذہن میں سما گئے: "خدا جانے یہ لڑکی کیا گل کھلانے والی ہے"۔۔۔ وہ بوجھل قدم اُٹھاتا ہوا سر جھکائے ہوئے گھر کی مردانہ بیٹھک میں آکر خاموش بیٹھ گیا۔۔۔ وہ سوچنے لگا اِس ہنگامے کو جو دو سال پہلے پدما نے کھڑا کیا تھا اُس میرانی جی پر۔۔۔ ۔۔۔ میرانی جی جو قصبے کے داروغہ پولیس کی بیٹی تھی اور کنیا پاٹھ شالہ میں پڑھتی تھی۔ صبح سات بجے لڑکیوں کے غول راج کے مکان کے پاس سے گزرتے تھے۔ گذشتہ کئی سال سے گزرتے رہے تھے اور آج بھی گزرتے ہیں۔ لیکن راج نے کبھی ادھر توجہ نہیں کی تھی۔ میرانی جی ہی تھی جس نے پہلے روز ہی لڑکیوں کی ایک بڑی بھیڑ میں چلتے چلتے بھی راج کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس کی مورجیسی چال نے اُس سے قطعات کہلوائے۔ اس کی سیاہ گہری آنکھوں اور لانبی پلکوں نے اس کی غزلوں کو نئی کیفیت بخشی۔۔۔ اُس کے خوبصورت پیکر نے اسکی راتوں کی نیندیں اڑا دیں اور اُس نے جاگ جاگ کر اس کے سراپا پر طویل نظمیں لکھیں۔ راج کی شاعری کو میرانی جی نے ایک نیا روپ اور تازگی دی تھی۔ راج نے اس کا نام جاننے کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ تھانیدار صاحب کی لڑکی ہے اسلئے میرانی جی ہے۔ وہ اس کی شاعری کا محور تھی جس کے گرد ان گنت مصرعے، شعر اور خیال جوان خواہشات کی طرح مچل رہے تھے۔ میرانی جی کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ کوئی ہر روز مقررہ وقت پر راستے میں اسکا انتظار کرتا ہے اور اُسے دیکھ کر اپنی شاعری کو نئے نئے عنوان دیتا ہے۔۔۔ میرانی جی نے یہ جان کر ایک انجانا سا لطف محسوس کیا تھا لیکن سب کچھ جب پدما نے بھانپ لیا تو اُس نے مہا بھارت کے اکھنڈ پاٹھ کا افتتاح کر دیا۔ راج نے لاکھ طرح سمجھایا اپنی محبت کا یقین دلایا اور میرانی جی کو محض اپنی شاعری کا ایک موضوع بتایا مگر پدما اپنے شاعر شوہر کی منطق کو کسی طرح نہ سمجھ سکی۔ دن رات رو رو کر اُس نے اپنی حالت خراب کر لی تب راج کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اُس نے میرانی جی کے گیت گانے چھوڑ دیئے اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود وہ اپنی بیوی سے پیار کرتا تھا اور وہ اُسے ایک پل کیلئے بھی رنجیدہ نہ دیکھ سکتا تھا۔۔۔

اور آج یہ لڑکی پھر کسی نئے ہنگامے کا سبب نہ بن جائے۔ وہ کسی ناگہانی آفت کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اچانک اُسے اپنی بیوقوفی پر ہنسی آگئی۔ اس نے خیال کیا کہ ہو سکتا ہے لڑکی پہلے سے ہی پدما کی شناسا ہو۔ اور اسی تعلق سے اسے اس طرح دیکھا کرتی ہو۔ پھر اُسے یہ سوچ کر اپنے آپ سے شرم آگئی کہ اگر اس نے اس کی بھوکی اور شرارت بھری نظروں کی کہانی پدما کو سنائی؟۔۔۔ چھی چھی۔۔۔۔۔ کتنی بُری بات ہے۔۔۔ وہ یہ سوچ کر خفیف ہو رہا تھا کہ اندر سے پدما کی آواز آئی۔۔۔

"اجی سنتے ہو۔۔۔ ذرا اندر آیئے"

وہ کرسی سے اُٹھا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ برسوں کی بیماری کے بعد پہلی بار کھڑا ہوا ہو۔ اُسے اپنے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی محسوس ہوئیں۔ بھاری قدموں سے وہ گھر میں داخل ہوا۔ سامنے پدما اور اُسکے ساتھ ہی چارپائی پر وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں جیسے اُسکی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ صورت حالات کا اندازہ کر کے اس کی ٹانگیں کانپ کر رہ گئیں اور وہ اُن سے نظریں ملائے بغیر کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

پدما نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سرلا" کو آپکے سوئیٹر کا نمونہ بہت اچھا لگا ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ پچھلے دو دن میں جب آپ گلی سے گذرتے رہے ہیں یہ اُسے پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی ہیں کہ شاید نمونہ سمجھ میں آجائے۔۔۔ مگر یہ نمونہ اتنی آسانی سے سمجھ میں آنیوالا کب ہے۔۔۔ آپ ذرا سوئیٹر اتار دیں۔ ان کو ایک دو روز کیلئے دینا ہے۔۔۔"

پدما اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے سوئیٹر کی تعریف سُنکر ہواؤں میں اُڑتی ہوئی بولے جا رہی تھی اور راج سوئیٹر اپنے گلے سے نکال رہا تھا۔ لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سوئیٹر اُس کے گلے میں ہی پھنس کر رہ گیا ہو۔۔۔

مانک ٹالہ

دوسری تصویر

اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چیخنے لگی
چندر! مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ میں پاپن ہوں
اس کوڑھ زدہ جسم اور اس ناپاک وجود
کو ہاتھ نہ لگا۔ میں تمہارے پیار کے
قابل نہیں رہی۔

میں گے لارڈ کے آخری سرے کی خالی میز کے گرد بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ میرے سامنے لائف میگزین کھلا پڑا تھا، اور لیکھے پن کی بوریت دور کرنے کے لئے گاہے گاہے اس کے ورق الٹ پلٹ لیتا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا اس لئے رش نہیں تھا۔ بہت سی میزیں خالی پڑی تھیں۔ میرا رُخ دروازے کی طرف تھا۔ اس لئے آنے جانے والے صاف نظر آ رہے تھے۔

دروازے سے دو اشخاص اندر داخل ہوئے اور دروازے بالکل قریب والی خالی میزوں کے گرد بیٹھ گئے۔ جس شخص کا رُخ میری طرف تھا وہ پرکاش تھا ــــــ میرے بچپن کا ساتھی۔ بچپن میں ہم ایک ساتھ پڑھے۔ کالج تک ساتھ رہا۔ پھر دو آزاد مملکتوں کے قیام کے بعد آج تک ہمیں ایک دوسرے کا پتہ نہیں چل سکا تھا، بیس بائیس برس کے بعد آج اچانک اس کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ بیس بائیس سال کے بعد بھی وہ بالکل بیس بائیس سالہ کا بانکا جوان نظر آ رہا تھا۔ بالکل ویسے کا ویسا جیسے میں نے آخری مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ جیسے اتنا طویل عرصہ وہ کولڈ اسٹوریج میں پڑا رہا ہو ــــــ وہی بکھرے ہوئے سیاہی مائل سنہرے چمکدار بال، چمکدار نیلی آنکھیں، کشمیر کے سیب کی طرح سرخ و سفید بھرے بھرے گال۔ تر و تازہ بہار آفریں معصوم چہرہ۔ اس کے خدوخال میں بال برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ حالانکہ میری طرح وہ بھی پینتالیس پچاس کے لپیٹے میں تھا۔ میرے سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے، چندیا ـ فارغ البال ' ہو رہی تھی، اور چہرے پر مکڑی نے جالا بننا شروع کر دیا تھا۔ آنکھوں پر دبیز چشمہ چڑھ چکا تھا اور زندگی کے بوجھ سے کندھے جھک رہے تھے۔

میں نے کافی کی ایک چسکی بھر کر لائف میگزین کا صفحہ پلٹ دیا۔ اب میرے سامنے پورے صفحے کا احاطہ کئے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص کی تصویر تھی۔ بکھرے ہوئے بے ترتیب بال۔ چہرے کے خدوخال میں رچی بسی ہوئی خباثت اور شیطنت! چہرے پر بڑی چھوٹی جھریوں کا جال تنا ہوا ــــــ

لیکن ہائیں یہ کیا ــــــ! اس کی شکل و شباہت دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے پرکاش سے ملتی جلتی تھی ایسا لگتا تھا جیسے پرکاش کا سراپا منجمد ہو کر اس تصویر میں آ بسا ہے۔

میں نے چشمہ اُتار کر صاف رومال سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور پھر تصویر کی طرف دیکھ کر نگاہیں پرکاش کے چہرے پر گاڑ دیں جو ہو بہو وہی شکل و صورت، صرف جھریاں اور تصویر کے چہرے میں رچی بسی شیطنت کا فرق تھا۔ جو کہ سامنے بیٹھے پرکاش کی شکل بالکل

اسے ہی ... اگر اس کی عمر رک نہ گئی ہوتی تو اس کے
چہرے پر معصومیت بکھرنے کی بجائے بالکل اس تصویر کے چہرے کی
طرح خباثت نازل رہی ہوتی۔

میں کتنی ہی دیر تصویر اور پرکاش کے چہرے کا موازنہ
کرتا رہا۔

معاً مجھے آسکر وائلڈ کے ڈورین گرے کا خیال آیا۔ ڈورین
گرے جس نے دنیا کی کوئی بدمعاشی نہیں چھوڑی تھی جس نے گناہ کو
عبادت کا درجہ دے دیا تھا جس نے زندگی کی ہر غلاظت کے جوہڑ
کو گنگا سمجھ کر ڈبکیاں لگائیں۔ معصوم لڑکیوں کو ورغلا کر اپنی ہوس
کی آگ بجھانا جس کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن ان گناہوں اور خباثتوں
کے باوجود اس کے چہرے پر فرشتوں کی سی معصومیت کھیلتی تھی۔ مگر ہر
گناہ کی تکمیل کے بعد اس کی تصویر کے چہرے پر ایک جھری کا اضافہ ہو جاتا
تھا کہ اس تصویر کا چہرہ جھریوں کے جال سے مسخ ہو گیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے ڈورین گرے کا ڈرامہ نئے سرے سے
کھیلا جا رہا تھا۔ ڈورین گرے کی دوسری تصویر میرے سامنے
پڑی تھی!

اور میرا دماغ فلم کے فلیش بیک کی طرح بچپن اور جوانی
کی طرف واپس سرپٹ دوڑا۔ زندگی کے وہ لمحے جو ہم نے ایک ساتھ
گزارے تھے ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے ٹیلی ویژن کی
تصویروں کی طرح گھومنے لگے۔ اس کی چھوٹی بڑی کئی خباثتیں ایک
ساتھ میرے تصور کے پردوں ناچ گئیں۔

میری آنکھوں کے سامنے اسکول کے زمانے کے وہ لمحے گھوم
گئے ---- جب ہم دونوں ایک ساتھ ایک شام نہر کے کنارے
کنارے مٹرگشت کر رہے تھے۔ سامنے سے ہمارا ایک ڈنڈ پیل قسم کا
ہم جماعت آ گیا۔ ان حضرت نے بلا سوچے سمجھے اپنی عادت کے مطابق
ان پر ایک عامیانہ سا فقرہ چست کر دیا۔ جواب میں پہلوان جی نے
ایک چٹکی لی اور یہ چاروں شانے چت نہر کے کنارے کی مٹی چاٹتے
نظر آئے۔ لیکن یہ بھی باعزم اور حوصلہ مند شخصیت کے مالک، یوں
سیدھے سیدھے ہار ماننے والے کہاں تھے۔ کپڑے جھاڑ کر مقابلے میں

آ ڈٹے۔ بیسیوں مرتبہ پٹے۔ چٹخیاں کھائیں مگر خم ٹھونک کر
لڑنے مرنے کو تیار۔ بیچ بچاؤ کرنے والے بھی مجھے خواہ مخواہ دونوں طرف
سے بے بھاؤ کی پڑ گئیں۔ آخر ہار کر میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔
آخر اس نے پرکاش کا پلیتھن نکال ڈالا تو مجھے اس پر کچھ رحم آ گیا،
اور میں نے پھر ایک مرتبہ پہلوان بھائی سے اسے چھوڑ دینے کی اپیل کی
وہ کہنے لگا اسے منع کر لو، میں چھوڑنے کو تیار ہوں۔ میں نے اس سے
بہتیرا کہا لیکن وہ پٹتا جا رہا تھا اور گالیاں بکے جا رہا تھا اور اس سے
لپٹا ہوا تھا۔ آخر میں نے پرکاش کو پکڑ کر الگ کرنے کی کوشش کی۔
کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق اس نے اپنی مار کا بدلہ مجھ سے لیا
اور مجھے دو تین جڑ کر زور کا دھکا دے دیا۔ میں اس اچانک حملے کے
لئے ہرگز تیار نہیں تھا چنانچہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا اور تھوہڑ
کی جھاڑیوں میں جا گرا۔ میرے دونوں پاؤں میں تھوہڑ کے کانٹے گھس
گئے اور میں درد کی شدت سے چلا اٹھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس
ہوا تو مدد کو آنے کی بجائے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ دوسرے لڑکے
نے مجھے باہر نکالا۔ مجھے زمین پر بٹھا کر جتنے کانٹے نکل سکتے تھے نکالے
اور پھر مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کر گھر چھوڑ آیا۔ میں کئی روز تک
پاؤں پر پیاز کی پولٹس باندھتا رہا اور کانٹے نکالتا رہا۔ لیکن وہ
ایک روز بھی میری خبر لینے نہیں آیا۔ . . . . .

میں نے یہی باتیں سوچتے سوچتے تصویر کی طرف دیکھا --
ہائیں! یہ کیا۔ میری نظروں کے سامنے تصویر کے چہرے پر ایک
اور جھری ابھر آئی تھی۔

میں چند لمحے تصویر کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ اس عرصہ
میں میرے ذہن میں پرکاش کی اس زمانے کی کئی بڑی چھوٹی کمینگیاں
اور بے ہودگیاں گھومتی رہیں اور ہر واقعہ کے تصور کے ساتھ اس
تصویر پر ایک نئی لکیر ابھر آتی . . . .

یادداشتوں کے اس جمگھٹ میں میرے تخیل کے افق پر
ایک اور واقعہ ابھرا ---- ہمارا میٹرک کا امتحان تھا۔ ہمارا
ہال ہمارا سنٹر تھا۔ ایک روز دوپہر کے امتحان سے پہلے ہم ہال
ہال کی طویل سیڑھیاں چڑھ کر وہاں بیٹھے لگے پرچے کی تیاری

رہے تھے۔ درمیان میں ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانکی جا رہی تھیں کہ پرکاش نے حسب عادت اپنے ایک ہم جماعت سے چھیڑ خانی کی، دوسرے اگر کسی کو اپنے مذاق کا نشانہ بناتے ہیں تو پہلے اس کا اطمینان کرتے ہیں کہ مدمقابل ان سے شہ زور تو نہیں۔ لیکن یہ حضرت اس معاملے میں اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ مدمقابل کمزور تو نہیں۔

نتیجتاً ان حضرت نے پکڑ کر دو چار پٹخنیاں دیں اور اٹھا کر سیڑھیوں کی منڈیر پر لٹا دیا کہ پھینکتا ہوں نیچے۔ اب یہ حضرت ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ واسطے دے رہے ہیں اور وہ ہے کہ اکڑ رہا ہے ـــــ اگرچہ وہ گیدڑ بھبھکیاں ہی تھیں۔ لیکن مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں سچ مچ ہی نہ پھینک دے کیونکہ چند ہی روز پہلے کا واقعہ تھا کہ اسکول گراؤنڈ میں کسی جھگڑے پر اس کے دو ساتھیوں نے منوہر کو اس قسم کی سزا دی تھی۔ چنانچہ اس واقعہ کے زیر اثر میں نے بھی اس کی منت سماجت کی۔ لیکن اس نے پرکاش کو چھوڑ کر مجھے اٹھا لیا اور سیڑھیوں کی منڈیر پر لٹا دیا کہ اس کے بدلے میں مجھے پھینکتا ہے ـــــ خیر یہ تو مذاق تھا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا ـــــ

اسی شام کو کسی کام سے ماموں جان کے ہاں گیا۔ ہمارے مکان بالکل آمنے سامنے تھے۔ ماموں جان سے دراصل ہماری کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ بس اسکول میں ہمیں پڑھاتے تھے، انہیں ہمارا ماموں جان بننے کا شوق چرایا اور ہمیں بھانجا بنا ڈالا وہ دن اور آج کا دن ـــــ ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ، یہ نہ کرو وہ کیا کیا ـــــ ہر وقت پڑھتے ہو۔ دوستوں میں وقت مت برباد کیا کرو ـــــ وغیرہ وغیرہ

ماموں جان پرائمری اسکول میں ٹیچر ہونے کے باعث زبان سے زیادہ ہاتھ سے بات کرنے کے عادی تھے۔ میں نے ابھی ان کے گھر میں قدم رنجا فرمایا ہی تھا کہ ایک زنانے دار تھپڑ دائیں گال پر ـــــ ایسا کہ دونوں کانوں سے شائیں شائیں کی آوازیں نکلنے لگیں اور آنکھوں کے سامنے ستارے رقص کرنے لگے۔ ابھی اس پہلے حملے سے ہی نہیں سنبھلنے پایا تھا کہ انہوں نے گل پاشی شروع کر دی۔ جب جی بھر گیا یا ہاتھ تھک گئے تو میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور ان سے اس بندہ نوازی اور کرم گستری کی وجہ معلوم کی تو بر پلا بال والے واقعہ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ تم بڑے لڑکوں سے چھیڑ خانی کیوں کرتے ہو۔ میں عرض گو ہوا کہ چھیڑ خانی میں نے نہیں کی تھی۔

فرمانے لگے کہ انہیں دوپہر کے واقعہ کی اطلاع ملی تھی۔ چند گھنٹے پہلے پرکاش اور اس کے والد یہاں آئے تھے۔ انہوں نے پرکاش سے تفصیل معلوم کی تو اس نے بتایا تھا کہ چندر نے (یعنی میں) کسی بڑے لڑکے سے چھیڑ خانی کی تھی اور وہ اسے (یعنی مجھے) نیچے پھینک رہا تھا کہ پرکاش نے بیچ بچاؤ کروانا چاہا تو اس لڑکے نے اسے ہی اٹھا کر نیچے پھینکنا چاہا۔

اگلے روز میں نے پرکاش سے اس بارے میں ذکر کیا تو بتیسی نکال کر کہنے لگا "میرے بابوجی ساتھ تھے اگر میں بات نہ پلٹتا تو میری مرمت ہو جاتی" ....

یہ واقعہ مجھے یاد آیا تو وہ تھپڑ میرے کانوں میں گونجنے لگا اور تصویر کے چہرے پر ایک اور گہری سی لکیر ابھرتی نظر آئی۔

کالج پہنچ کر تو اس نے اور ہی قسم کے گل کھلانے شروع کر دیئے تھے۔ آوارہ اور اوباش لڑکوں سے اس کی گہری چھننے لگی تھی۔ کالج کی لڑکیوں سے چھیڑ خانی معصوم لڑکیوں کو دھوکا دینا، اس کے گینگ کا خاص مشغلہ تھا۔ یہاں تک اطلاع ملی تھی کہ ان حضرت نے طوائفوں کے کوٹھوں پر جانا بھی شروع کر دیا تھا چنانچہ میں نے عمداً اس سے میل ملاپ بند کر دیا تھا۔ بس راہ چلتے کی ملاقات ہی رہ گئی تھی۔

ہمارا بی اے کا آخری سال تھا۔ سشما تیسرے سال کی سٹوڈنٹ تھی اور ہمارے کلچرل گروپ کی ممبر تھی۔ بہت اچھا گاتی ایسا کہ بس سماں ہی بندھ جاتا۔ میری غزلیں اور گیت جب ترنم سے سناتی تو ایسے لگتا جیسے ہر شعر عاشق کے دل کی طرح دھڑک رہا ہے۔

ہماری دوستی بڑھتے بڑھتے عشق کی آخری منزل تک پہنچ چکی تھی ایک دوسرے کو دیکھے بنا ہمیں چین نہیں پڑتا تھا ہم نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان باندھ لئے تھے۔

ایک مرتبہ کالج ٹک شاپ سے ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ پرکاش سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں نے پرکاش سے سشما کا رسماً تعارف کرا دیا۔

وہ دن اور آج کا دن۔ وہ پرکاش کی ایسی دیوانی ہوئی کہ میرے ساتھ کئے گئے سارے وعدے فراموش کر دیئے۔ پرکاش کی چکنی چپڑی باتوں میں ایسی پھنسی کہ اس کی محبت میں آنکھیں موند کر پھسلتی چلی گئی۔

میں نے ایک روز اسے پرکاش کی اصلیت سے آشنا کرانے کی کوشش کی۔ اسے بتایا کہ وہ بھولی بھالی لڑکیوں کو پھانس کر ان کی عزت سے کھیلتا ہے۔ کہنے لگی۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ تم محبت میں ناکام ہو کر اس قدر گر جاؤ گے کہ پرکاش پر جھوٹے الزام لگا کر اسے میری نظروں سے گرانے کی کوشش کرو گے۔"

اور جب میں نے اُسے یہ بتایا کہ وہ طوائفوں کے یہاں بھی جاتا ہے تو اس نے مجھ پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ کر دی۔ اور پھر اٹھ کر چلی گئی۔ پھر کبھی ہمارا سامنا بھی ہو جاتا تو مُنہ موڑ کر چلی جاتی۔

میں ہجر کی آگ میں جلتا رہا۔ تڑپتا رہا اور تلملاتا رہا۔ میرے لئے زمین تنگ اور آسمان دور ہو گیا۔ مرنا چاہا مر نہ سکا۔ جینا دوبھر ہو گیا۔ جی چاہتا دیوار سے ٹکریں مار مار کر اپنے آپ کو لہولہان کر لوں۔ یا کپڑے پھاڑ کر مجنوں کی طرح جنگلوں میں نکل جاؤں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے میں نے اپنے آپ کو کیسے سنبھالا۔

پھر ایک روز وہ میرے پاس آئی۔ میں کالج لان میں ایک بنچ پر بیٹھا آنکھوں کے سامنے کتاب رکھے بظاہر پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن در اصل اپنے دل کے زخموں کو کرید کرید کر [illegible] بےکل سا تھا اور ان ٹیسوں سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک وہ آئی اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں ابھی کچھ کہہ رہا تھا کہ اُسے کیا کہوں یا کیا کروں ــــ کیا بات کروں کیسے بات شروع کروں کہ اُس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر سسکنا شروع کر دیا۔ میں اس اچانک تبدیلی پر ہکا بکا رہ گیا۔

دیر آید درست آید کے مصداق میں سمجھا کہ شاید اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں نے پچھلی ساری باتیں بھلا دیں اور اسے دلاسا دینے کے خیال سے اس کے ملائم ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ اور زور زور سے سسکنے لگی۔ سسکتی رہی سسکتی رہی۔

پھر یک لخت آنسو پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی: "چندر مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ میں اس قابل نہیں۔ چندر میں پاپن ہوں۔ اس کوڑھ زدہ جسم، اس ناپاک وجود کو ہاتھ مت لگاؤ۔ میں تمہارے پیار کے قابل نہیں رہی ــــ"

"کیا بات ہے سُشما! کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو۔ میں نے تو تمہیں کبھی بُرا بھلا نہیں کہا۔ میرے لئے تو تم نہ پہلے گنہگار تھیں نہ اب ہو ــــ میرے لئے تم گنگا کی طرح ہی پوتر ہو۔"

"چندر!" وہ چیخی ــــ "بھگوان کے لئے گنگا میّا سے میرا مقابلہ مت کرو۔ میں نیچ ہوں۔ پاپن ہوں" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"سشما! تم کیسی باتیں کرتی ــــ ہوش کی باتیں کرو۔"

"میں سچ کہتی ہوں چندر! میں سچ کہتی ہوں میں تمہارے قابل نہیں رہی۔ کسی قابل نہیں رہی چندر! وہ لٹیرا پرکاش" وہ چپ ہو گئی اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں ماں بننے والی ہوں۔ پرکاش کے بچے کی ماں!" یہ کہہ کر اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "چندر! میں لٹ گئی۔ تباہ ہو گئی۔ پرکاش نے مجھے برباد کر ڈالا۔ دھرتی پھٹ کیوں نہیں جاتی کہ میں اس میں سما جاؤں ــــ مگر دھرتی مجھ جیسی گناہ گار کو اپنی گود میں کب جگہ دے گی! ــــ"

جب اُس کی سسکیاں بند ہو گئیں اور اس کی [illegible]

ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ سشما! تم پرکاش سے شادی کر لو۔ وہ یقیناً تمہیں خوش رکھے گا۔"

"چندر! میں نے اُس نردئی کے سامنے بہت سر پٹخا۔ بہت منتیں کیں۔ لیکن اس نے شادی سے صاف انکار کر دیا ہے میں نے کہا میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ تو کہنے لگا۔ کل خرید کر لا دوں گا بہت زود اثر ہوگا۔ بالکل تکلیف نہیں ہوگی ——"

میں نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ میں پرکاش کو منانے کی کوشش کروں گا۔ کہنے لگی کہ کوئی فائدہ نہیں۔ اس بے رحم انسان کے سینے میں دل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے۔

"بہرحال کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ آخر وہ بھی انسان ہے کچھ نہ کچھ انسانیت، تھوڑی بہت شرافت تو ہوگی ہی اس میں"

میں نے پرکاش سے بات کی۔ اُسے انسانیت، شرافت دھرم ایمان ہر چیز کا واسطہ دیا۔ لیکن سشما سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کہنے لگا وہ کمینی نہ جانے کس کے چہرے کی کالک میرے چہرے پر ملنا چاہ رہی ہے۔ میں تو پہلے روز ہی سمجھ گیا تھا کہ بکاؤ مال ہے —— جو تیری نہ ہو سکی وہ میرے ساتھ کیسے رسم وفا نبھا سکتی ہے؟"

میرے جی میں تو آئی کہ اس ذلیل کے منہ پر تھوک دوں لیکن موقعہ کی نزاکت کے احساس سے خون کے گھونٹ پینے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا۔ سشما کی حالت زار کا نقشہ کھینچا۔ دنیا، سماج میں بن بیاہی ماں کی جو درگت ہوتی ہے اس کی تصویر کشی کی۔ لیکن وہ بے حیا سب کچھ سننے کے بعد کہنے لگا۔ اگر تمہیں سشما سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو تم خود ہی اُس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ اس بے چاری کا بھی کلیان ہو جائے گا "

"پرکاش!! اب ایسا ہی ہوگا۔" یہ کہہ کر میں چلا آیا۔

اگلے روز میں نے اسے صرف اتنا ہی کہا کہ پرکاش شادی پر راضی نہیں ہے۔ لیکن میں تیار ہوں۔ آج ابھی اسی وقت، کل پرسوں —— جب چاہو میں تم سے شادی کر سکتا ہوں۔"

وہ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے سمجھا شاید سوچ سمجھ کر فیصلہ دے گی۔

اگلے روز اطلاع ملی کہ وہ زہر کھا کر مر گئی ہے......

میری نگاہیں پھر لائف میگزین کی تصویر پہ مرکوز ہو گئیں۔ ایسے لگا جیسے تصویر کا چہرہ بالکل مسخ ہو گیا ہے۔ کسی کوڑھی کی طرح مکروہ!

میں بے چین ہو اٹھا۔ میں نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ آج پرکاش سے پوچھوں گا۔ آخر یہ کیا راز ہے —— تم —— تم یہ جو تمہارا سارا وجود گناہ آلود ہے۔ گندگی سے ملوث ہے —— لیکن تمہارے چہرے پہ آج بھی معصومیت کھیل رہی ہے۔ ملکوتی مسکراہٹ جگمگا رہی ہے۔ تمہارا چہرہ بیس سال پہلے کی طرح آج بھی شگفتہ و تر و تازہ ہے —— ایسا کیوں ہے ایسا کس لئے ہے ——؟

میں لائف میگزین والی تصویر ہاتھ میں لئے اس کی طرف بڑھتا چلا گیا —— اس کے قریب پہنچ کر میں نے وہ تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے میز پہ پٹخ دی —— اور —— وہ پرکاش نہیں کوئی اور تھا۔

دو لڑکیاں —— صفحہ [illegible] کا بقیہ

اس کا دل ایک گہرے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ باہر ہی پڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ایک اٹھتی ہوئی ندی کی طرح بل کھاتی ہوئی نلنی کی یاد اس کے ذہن پر چھا گئی اور ایک انجانے احساس سے اس کی تھکی ہوئی بوجھل آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ وہ اٹھا اور آہستہ سے دروازے میں داخل ہوا۔ اندھیرے میں سمٹی ہوئی نلنی نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔ اجیت کو دیکھتے ہی وہ اٹھ گئی لیکن اس سے پہلے کہ نلنی اور اس کی نظریں ملتیں اجیت نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے اور ان سے اپنی نمناک آنکھوں کو ڈھک لیا۔

جمیل زبیری

دردکا رنگ

> عبیر کے لئے میں ایک شریر چنچل لڑکی تھی لیکن میرے دل میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہوتا جارہا تھا۔ عبیر اب مجھے بہت اچھا لگنے لگا تھا فاصلے آہستہ آہستہ کم ہورہے تھے۔

میں اس وقت کراچی کے ہوائی اڈے پر اپنی چھوٹی بہن اور اپنے بیٹے دونوں بچوں کے ساتھ کھڑی ہوں۔ میرے شوہر مجھ سے کچھ دور کھڑے ہوئے اپنے کسی جاننے والے سے باتیں کررہے ہیں۔ وہ اس وقت وردی میں ہیں جب وہ یہ لباس پہنتے ہیں تو کتنے اچھے لگتے ہیں۔ وردی چاہے کیسا ہی ہو مگر وردی پہن کر ضرور اسمارٹ لگنے لگتا ہے آج ہم لوگ عبیر کو لینے آئے ہیں۔ عبیر کی بھاوج زاہدہ بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ وہ مجھ سے کچھ دور ایک صوفے پر بیٹھی جہاز کے آنے کا انتظار کررہی ہے۔ وہ بہت موٹی ہوگئی ہے۔ بچپن میں جب میری اور اس کی دوستی ہوئی تھی اس وقت وہ اتنی موٹی نہیں تھی۔ اسے موٹے ہونے کا بہت دکھ ہے وہ جب کبھی غور سے میری جانب دیکھتی ہے تو مجھے اس کی آنکھوں میں بجائے خلوص اور دوستی کے حسد اور جلن دکھائی دیتی ہے وہ مجھ سے کیوں جلتی ہے شاید اس لئے کہ وہ شادی کے بعد اتنی موٹی ہوگئی اور میں ابھی تک ویسی ہی ہوں دبلی پتلی۔ بھلا یہ بھی کوئی حسد کی بات ہوئی

لندن سے آنے والا ہوائی جہاز آگیا ہے مسافر اتر رہے ہیں۔ زاہدہ مجھے اشارے سے عبیر کو دکھا رہی ہے۔ بچے تالیاں بجا رہے ہیں مگر میں بالکل گم سم کھڑی ہوں۔ وہ بار بار مجھے عبیر کو دکھانے کی کوشش کررہی ہے "تجھے نظر نہیں آتا کیا تیری آنکھیں خراب ہوگئی ہیں" مگر مجھے تو نظر تب آئے جب میں دیکھنے کی کوشش کروں وہ بارہ سال بعد لندن سے واپس آیا ہے۔ تو میں کیا کروں۔ میں زاہدہ کے اشاروں کی مدد سے اسے دور سے دیکھنے کی کوشش کیوں کروں۔ وہ ذرا دیر میں خود ہی یہاں آجائے گا۔ شاید زاہدہ اپنے دل میں سوچ رہی ہے۔ میں عبیر کے آنے سے بہت خوش ہوں۔ شاید میرے پاس اس سے کہنے کو بہت کچھ ہو۔ شاید وہ سوچ رہی ہے جب ہم گھر چلے جائیں گے اور جب عبیر ذرا آرام سے بیٹھے گا اس وقت میں اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھدوں گی۔ ہونہہ! کتنی بے وقوف ہے زاہدہ۔ میرے پاس عبیر سے کہنے کے لئے کچھ نہیں بس مجھے تو اس سے ایک ہی سوال پوچھنا ہے' یہ نہیں کہ وہ بارہ سالوں میں اتنا بدل کیوں گیا۔ یہ بھی نہیں کہ وہ اتنے دنوں میں مجھے ایک خط بھی کیوں نہیں لکھ سکا؟

کسٹم ہوچکا ہے۔ اب مسافر باہر آرہے ہیں۔ اس وقت عبیر مجھے سامنے ہی نظر آرہا ہے۔ زاہدہ ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھ رہی ہے میں اپنی جگہ خاموش کھڑی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میرا چہرا ہر قسم کے جذبات سے عاری ہے۔ میں بڑی دیر سے اس بات کی کوشش کررہی ہوں کہ عبیر میرے چہرے کو دیکھ کر میرے احساسات کا اندازہ نہ کرسکے۔ جو بات میں نے آج تک کسی کو نہیں معلوم ہونے دی اس کا اظہار اب بھی نہ ہو تو اچھا ہے۔ عبیر اب ہمارے پاس آگیا ہے زاہدہ میرے شوہر کا تعارف کرارہی ہے۔ وہ میرے شوہر سے

بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملا رہا ہے اس کے بعد وہ میری طرف بڑی توقعات سے متوجہ ہوا ہے۔ مگر میں نے بجز اسے سلام کرنے کے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے میری آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا ہے۔ اور کوئی شے تلاش کی ہے مگر وہاں کچھ نہ پاکر اس نے چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں جھکالی ہیں۔ وہ ان دنوں میں بوڑھا ہو گیا ہے۔ اسکے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ سرد ملک میں رہنے کے باوجود اس کا رنگ کچھ اور سیاہ ہو گیا ہے۔ اس کے گالوں میں گڑھے سے پڑ گئے ہیں۔ اس کی ہنسی بھی بدل گئی ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہنستا ہے جیسے کوئی منہ چڑا رہا ہو۔ بہرحال مجھے اس سے کیا۔ وہ جیسا بھی ہو۔ اس کی شکل میں کوئی بھی تبدیلی ہو گئی۔ مجھے اس سے کیا مطلب۔ اس سے میرا کیا رشتہ ہے سوائے اس کے کہ وہ میری بچپن کی ایک دوست کے شوہر کا بھائی ہے۔ دوست کے شوہر کا بھائی۔ بھلا یہ بھی کوئی رشتہ ہوا ـــــ اس کا سامان آگیا ہے۔ اب ہم لوگ کار میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ اگلی سیٹ پر میرے شوہر کے قریب بیٹھا ہے۔ میں زاحدہ اور بچے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ میرے شوہر اس سے لندن کے حالات پوچھ رہے ہیں۔ وہ وہاں کی زندگی کی تعریفیں کر رہا ہے کبھی کبھی مڑ کر وہ میری طرف اس طرح دیکھتا ہے گویا اپنی جھوٹی سچی کہانیوں کی داد مانگ رہا ہو۔ اس کی بھاوج بڑے انہماک سے اس کی باتیں سن رہی ہے۔ بچے کبھی کبھی بیچ میں بول پڑتے ہیں۔ زاحدہ کو ان کا بولنا بڑا ناگوار گزر رہا ہے وہ انھیں اشارے سے چپ رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ میرا جی چاہ رہا ہے اس سے کہوں اب گھر میں کر ہی سب قصے سن لینا۔ بچوں کا دل کیوں چھوٹا کرتی ہو۔ مگر میں بالکل چپ ہوں۔ کہنا تو بہت کچھ چاہتی ہوں مگر کس سے کہوں اور کیا کہوں۔ میرے دل میں جو ایک زخم تھا اس کا کسے پتہ ہے۔ بارہ سال گزر گئے وہ اب مندمل ہونے لگا تھا۔ آج پھر سے ہرا ہو گیا ہے۔ زندگی ایک ڈگر پر آگئی تھی۔ مجھے زندہ رہنے کی ساری آسائشیں مہیا ہو گئی تھیں۔ خدا نے مجھے دو اچھے بچے بھی عطا کر دیئے ہیں۔ مگر آج میں پھر بارہ سال پیچھے لوٹ گئی ہوں۔ جب میں نے اسے زاحدہ کے گھر پہلی مرتبہ دیکھا تھا میں اس وقت ایک بڑی شریر سی لڑکی تھی اور اس کو دیکھتے ہی مجھے اچھو ہو گیا تھا۔ میں نے ایک زوردار لگایا تھا اور اس کی بے ہنگم مونچھوں کا مذاق اڑایا تھا۔ وہ کھسیانا ہو گیا تھا۔ زاحدہ نے شکایت آمیز نظروں سے مجھے دیکھا تھا مگر میں اس طرح ہنستی رہی تھی۔ یہاں تک کہ عبیر خود ہی اٹھ کر چلا گیا تھا۔

ہم لوگ گھر پہنچ گئے ہیں سامان اتروا کر گاڑی سے اندر لایا جا چکا ہے۔ بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے ہیں۔ میری چھوٹی بہن مہمانوں کے لئے کھانا تیار کرنے چلی گئی ہے۔ میرے اوپر ایک عجیب سی تھکن سوار ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں بالکل شل ہو گئے ہیں۔

زاحدہ اور عبیر دوسرے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں انھیں اس طرح باتیں کرتے ہوئے ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ مگر نہ معلوم عبیر کونسی الف لیلیٰ سنا رہا ہے۔ میں نے بھی ہمت کر کے منہ ہاتھ دھو کر ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا ہے۔ میں نہیں جانتی میں نے اس وقت میک اپ کیوں کیا ہے؟ کیا عبیر کو دکھانے کے لئے؟ انسان بہت سی باتیں نہیں بھی کرنا چاہتا ہے مگر اس کے باوجود کرتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟ ہم لوگ کھانے کی میز پر بیٹھ چکے ہیں۔ عبیر بالکل میرے مقابل بیٹھا ہے۔ میرے شوہر میرے سیدھے ہاتھ پر بیٹھے ہیں۔ عبیر کی نظریں ذرا ذرا دیر بعد اٹھتی ہیں اور میرے چہرے پر آکر رک جاتی ہیں۔ وہ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے۔ شاید وہ میری اس تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے پہلے جب اس نے مجھے دیکھا تھا تو میں ایک چنچل اور شوخ لڑکی تھی۔ سوائے ہنسنے اور دوسروں کا مذاق اڑانے کے مجھے کوئی کام نہ تھا۔ مگر آج میں دو بچوں کی ماں اور گھر کی ایک ذمہ دار عورت ہوں۔ میری شوخی میرے قہقہے۔ میرا مذاق اڑانے کا انداز سب گزرے وقتوں کی کہانیاں بن چکے ہیں۔ زندگی کتنے ہی موڑوں سے گزر کر اب اس جگہ پہنچ چکی ہے جہاں سے واپس آنا ناممکن ہے۔ میرے شوہر ایک اچھے انسان ہیں۔ وہ میری خوشی اور آرام کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں میرے بچے بڑے اچھے ہیں۔ مجھے ان سے بے پناہ محبت ہے۔ جب وہ اسکول سے واپس آکر مجھے آہستہ سے پیار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں اب اور کسی خوشی کی ضرورت باقی نہیں۔ مگر

جیسے اتنے سال بعد آکر مجھے ایک بار پھر جھنجھوڑ ڈالا ہے میں نے جن یادوں کو وقت کی ریت میں دفن کر دیا تھا وہ آج پھر باہر نکل آئی ہیں۔ میں آج پھر اپنے آپ کو اتھاہ سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبتا محسوس کر رہی ہوں

کھانا ختم ہو چکا ہے۔ سب لوگ خاموش ہیں۔ صرف عبیر اپنے سفر کے قصے سنا رہا ہے اور ساتھ ہی کبھی مجھے اور کبھی زاہدہ کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں اس میز سے اٹھ کر بھاگ جانا چاہتی ہوں مگر میرے شوہر کو ان قصوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے کئی دفعہ اٹھنے کا ارادہ کیا ہے۔ مگر ہر مرتبہ انھوں نے مجھے زبردستی بٹھا لیا ہے۔ میں طبیعت پہ جبر کر کے بیٹھی ہوئی ہوں۔ مگر میرا ذہن کہیں اور ہے۔ پچھلی یادوں کے دھارے مجھے بہائے لئے چلے جا رہے ہیں۔ میں ڈوبتی جا رہی ہوں۔ میری ساری کوشش بیکار ثابت ہوتی ہے۔ ماضی میرا تعاقب کر رہی ہے اور مجھے گھسیٹ کر پیچھے لئے جا رہی ہے۔ میں نہیں نہیں کہتی کھنچی چلی جا رہی ہوں۔ مجبور و لاچار

یہی وہی عبیر ہے جس کی شادی پہلے زاہدہ سے ہونے والی تھی مگر عبیر کے بھائی کو زاہدہ پسند آ گئی تھی اور اس نے زاہدہ کی بہن کی بجائے زاہدہ سے شادی کر لی تھی۔ اس شادی میں زاہدہ کی رائے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ اب بھی عبیر کو بہت عزیز رکھتی ہے اور اس کو کسی نہ کسی طرح اپنے قریب رکھنا چاہتی تھی۔ شاید اس نے اس لئے سوچا تھا کہ وہ میری شادی عبیر سے کرا دے۔ اور شاید اسی لئے جب میں عبیر کی مونچھوں کا مذاق اڑا کر چلی گئی تھی تو مجھ سے لڑی تھی۔ مگر میں نے اپنی عادت کے مطابق اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اسے منا لیا تھا۔ وہ میرے سامنے ہمیشہ عبیر کی تعریفیں کیا کرتی تھی۔ مگر میں اس کی ہر بات کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی جب ہم دونوں تنہا ہوتے اور مجھے سنجیدگی کا دورہ ہو جاتا تو وہ کہا کرتی۔ اچھا ہوتا کہ اب تیری بھی شادی ہو جاتی۔ میں چپ رہتی۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتی۔ "بتا تو کس سے شادی کرے گی؟" مگر میں کوئی جواب نہ دیتی۔ اس وقت ہمارے گھرانے میں میری عمر کے کتنے ہی اچھے لڑکے موجود تھے۔ میری ہی طرح شوخ اور چنچل۔ وہ ایک ایک کا نام لیتی۔ مگر میں ان لڑکوں کو تو اپنے سامنے بچہ سمجھتی تھی۔ میرے ذہن میں شوہر کا تصور جب بھی آتا تو وہ ہمیشہ ایک سنجیدہ سا انسان ہوتا۔ وردی پہنے باوقار اور سمجھدار۔ آخر میں نے اسے ایک روز بتا ہی دیا۔ اس نے مجھے سمجھایا۔ بیگی! "عبیر میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو تجھے پسند ہیں۔" "مگر اس کی مونچھیں" میں قہقہہ مار کر ہنس دی۔ "مونچھوں سے کیا ہوتا ہے۔ کل صاف کروا دوں گی۔"

میرے شوہر کو نیند آنے لگی ہے۔ وہ ایک لمبی جماہی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں میرے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ ہم لوگ اپنے بستروں پر لیٹ گئے ہیں۔ میں سونے کی کوشش کر رہی ہوں۔ لیکن آج نیند مجھ سے کوسوں دور چلی گئی ہے یہ بات بہت دنوں تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تھی کہ آخر وہ میری شادی عبیر سے ہی کیوں کرانا چاہتی تھی۔ لیکن مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ در اصل میری دوستی اور قرب سے فائدہ اٹھا کر عبیر کے نزدیک رہنا چاہتی تھی۔ یہ دنیا کتنی عجیب ہے۔ مگر میں نے آج تک زاہدہ کو معلوم نہیں ہونے دیا ہے کہ میں اس کی اس چال کو سمجھ گئی تھی۔ جب عبیر کو پتہ چلا تھا کہ مجھے اس کی مونچھیں ناپسند ہیں تو اس نے مونچھیں صاف کر دی تھیں وہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ نظر آنے لگا تھا۔ اور جس روز مجھے یہ معلوم ہوا کہ پہلے اس کی شادی زاہدہ سے ہونے والی تھی مگر اس کا بھائی بیچ میں حائل ہو گیا تھا۔ اس دن سے مجھے عبیر سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ مگر میں نے کبھی اس کے سامنے اس کا اظہار نہ ہونے دیا تھا اس کے لئے میں اب بھی ایک شریر اور چنچل لڑکی تھی اور طرح طرح اسے تنگ کرتی رہتی۔ لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ جوں جوں وقت گزر رہا ہے میرے دل میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے وہی عبیر جو مجھے پہلی نظر میں کچھ عجیب سا لگتا تھا اب پہلے سے بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ فاصلے آہستہ آہستہ کم ہو رہے تھے

اوہ۔ شاید میں سوچتے سوچتے سو گئی تھی۔ صبح ہو گئی ہے۔ سب لوگ اٹھ چکے ہیں۔ میرے شوہر نے میرا انتظار کئے بغیر چائے تیار کر لی ہے۔ میری بہن نے ناشتہ میز پر لگا دیا ہے۔ میں گھبرا کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں ہزاروں میل کا سفر طے

[illegible] جو تیار ہو کر
دفتر چلے گئے ہیں۔ میں بھی تیار ہو کر [illegible] قریب آ گئے ہیں
اور معمول کے مطابق [illegible] چلے گئے ہیں۔ عبیر میرے سامنے والی
کرسی پر بیٹھا ہے۔ آج اس نے بھی اپنی وردی پہن لی ہے۔ مگر وہ تو بیکار
بیٹھا ہے۔ آخر اسے آج یہ جہازیوں والا لباس پہننے کی کیا ضرورت تھی۔
مجھے جلانے کے لئے۔ یا اس لئے کہ مجھے یہ لباس بے حد پسند ہے۔ مگر اسے
کیا معلوم۔ ہو سکتا ہے زاہدہ نے اسے بتایا ہو۔ خیر جو بھی ہو۔ وہ
کوئی بھی لباس پہنے مجھے اس سے کیا۔ میں نے اس سے پوچھنا چاہا ہے کہ
وہ کہاں جا رہا ہے۔ مگر میں نے صرف آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا ہے۔
مگر کوئی سوال نہیں کیا ہے۔ البتہ زاہدہ نے اس سے بڑے عجیب
انداز سے پوچھا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اور کب واپس آئے گا؟
جس کے جواب میں اس نے کہا ہے کہ وہ جہاز کی کمپنی میں جا رہا ہے اور شاید
شام تک واپس آ جائے گا۔ ساتھ ہی اس نے میری جانب دیکھ کر کہا ہے
"دوپہر کے کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا" اور اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر
چلا گیا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اس کی توقع کے خلاف بہت بے اعتنائی
برتی ہے جس کا اسے یقیناً دکھ ہے اس کے رویے سے مجھے اندازہ ہو رہا
ہے وہ میری موجودگی میں کچھ گھبرایا گھبرایا سا لگ رہا ہے۔ ہر وقت مجھے
ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن میں نے
اسے موقع ہی نہیں دیا ہے۔ میں ڈرتی بھی ہوں۔ نہ معلوم وہ مجھ سے کیا
کہہ دے گا۔ کوئی ایسی بات جس کے کہنے کا اب وقت گزر چکا ہے
میں زندگی کی بہت سی منزلیں طے کر کے کافی آگے بڑھ چکی ہوں۔
میں اب ایک شوخ و شریر لڑکی نہیں ہوں بلکہ دو بچوں کی ماں ہوں
وہ وقت جب میرے دل میں پہلی مرتبہ ایک کسک سی ہوئی تھی بہت
پیچھے رہ گیا ہے۔ میں انتظار کرتی رہی تھی مگر اس نے اس وقت مجھ
سے کچھ نہیں کہا تھا۔ [illegible] آگے بڑھ رہی تھی۔ دھیمے دھیمے اپنی
شرارتوں کی [illegible] ایک روز معلوم ہوا کہ وہ چپکے سے چلا
گیا ہے۔ ہم سب کو چھوڑ کر۔۔۔ مجھے چھوڑ کر۔ جاتے وقت وہ کسی
سے نہیں ملا۔ [illegible] اپنے بھائی سے بھی نہیں ——

[illegible]
سے پوچھوں گی۔۔۔ تم اس طرح کیوں چلے گئے تھے۔ [illegible]
مہینے اور پھر سالوں میں بدل گئے۔ میری شادی ہو گئی۔ میں دو
بچوں کی ماں بن گئی۔ بارہ سال گزر گئے۔ بارہ سال۔ اس طویل
عرصہ میں اس نے مجھے کوئی خط نہیں بھیجا۔ میری خیریت تک دریافت
نہیں کی۔ اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ وہ اس طرح ایکدم کیوں [illegible]
تھا۔ میں ہمیشہ اپنے سے سوال کرتی رہی ہوں۔ میں نے اس سوال کے
ہزاروں جواب سوچے۔ پھر خود ہی انہیں رد کر دیا ہے۔ نہیں یہ
ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا ——
بارہ سال بعد جب وہ واپس آ گیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں اسے
اپنے سامنے بٹھا کر اس سے صرف اتنا پوچھوں۔ تم ضرور جاتے۔ تمہیں
روک کون رہا تھا۔ مگر یہ تو بتا دیتے کہ کیوں جا رہے ہو مگر اب میں
اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتی۔ کچھ پوچھنے اور بتانے کا وقت گزر چکا ہے
جس طرح یہ بارہ سال گزر گئے ہیں۔ اسی طرح زندگی کے باقی سال
بھی گزر جائیں گے اور کسی کو پتہ تک نہیں چلے گا۔
شام ہو گئی ہے عبیر واپس آ گیا ہے۔ آتے ہی وہ زاہدہ کو
لے گیا ہے۔ کچھ دیر دونوں میں آہستہ آہستہ بات چیت ہوئی ہے اور اس
کے بعد انہوں نے میرے کمرے میں آتے ہی اعلان کر دیا ہے کہ وہ لوگ
آج رات ہی لاہور جا رہے ہیں اس نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی
منگوا لئے ہیں۔ میں یہ سن کر بھی خاموش ہوں۔ باوجود کوشش کے اس
سے یہ نہیں پوچھ سکی کہ انہوں نے ایک دم لاہور جانے کا فیصلہ کیوں
کر لیا۔ شاید عبیر کو میری بے اعتنائی سے تکلیف پہنچی ہے اور اسی لئے
وہ گھر سے جلد از جلد چلا جانا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے اس کا چلا جانا
ہی بہتر ہے ——
آج عبیر کو گئے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس
میں مجھے نہ تو اس کی ہی کوئی اطلاع ملی ہے اور نہ ہی زاہدہ نے
کوئی خط لکھا ہے
مگر ابھی ابھی مجھے زاہدہ کی ایک مشترکہ دوست کا [illegible]
[illegible]

اس نے لکھا ... نے بڑی کوشش کی کہ جمیر اس کی چھوٹی بہن سے شادی کرلے میں بھی اس کوشش میں شریک رہی لیکن وہ ٹالتا رہا۔ آج اتفاقاً جمیر سے میری ملاقات زاہدہ کے گھر ہوئی جب زاہدہ ہم دونوں کے لئے چائے بنانے گئی ہوئی تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔ آخر تم اس کی بہن سے شادی کیوں نہیں کرلیتے۔ جانتی ہو اس نے کیا جواب دیا۔ اس نے کہا " عقیلہ جانتی ہو جب تک میں انگلستان میں تھا زاہدہ مجھے خط لکھتی رہی کہ جب تم اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ ہمیشہ تمہارا انتظار کرتی رہتی ہے۔ تم سے ملنے کے لئے بیتاب ہے۔ وہ تمہیں یاد کرتی ہے اور جب میں واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ میں نے تو تمہیں اپنی بہن سے شادی کے لئے بلایا ہے۔ میں عام حالات میں اس کی بہن سے شادی کرلیتا۔ مگر اب نہیں کرسکتا زاہدہ نے مجھے فریب دیا۔ میں کتنے چاہ سے پاکستان آیا تھا کہ کوئی میرا منتظر ہوگا۔ لیکن میں نے کسی کی آنکھوں میں انتظار نہیں دیکھا میں نے کسی کو اپنے لئے بیتاب نہیں پایا۔ میرا یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں جہاں سے آیا تھا وہیں واپس جا رہا ہوں۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ میں جہاز پر ملازم ہوں . . . . میں اپنا دل بہلانا جانتا ہوں میں نے جس طرح بارہ سال گزارے ہیں اسی طرح زندگی کے باقی دن بھی گزار لوں گا میں نے بارہ سال پہلے ایک غلطی کی تھی مگر اب میں دوسری غلطی نہیں کرسکتا۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے اٹھ کر چلا گیا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ اگلے دن پتہ چلا کہ وہ واقعی انگلستان چلا گیا ہے شاید کبھی نہ آنے کے لئے۔

وہ واپس چلا گیا ہے۔ مگر وہ آیا ہی کیوں تھا۔ وہ خود تو نہیں آیا تھا اسے آنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ زاہدہ میری بچپن کی دوست ہے۔ کیا آج کی دنیا میں دوستی اسی طرح نباہی جاتی ہے۔ کیا زاہدہ نے دوستی کا حق ادا کردیا؟ میرا ذہن ماؤف ہوگیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جمیر شاید ہمیشہ کے لئے واپس چلا گیا ہے۔ اس مرتبہ بھی بغیر مجھ سے ملے ہوئے۔ میرا سوال میرے ہونٹوں پہ چپکا چھوڑ کر ــــــــ

بانو سرتاج

انتقام

شنکر دھاڑا۔ میں سمجھ گیا تم ٹھاکر کی جا سوس ہو۔ میں اپنی بھولی سی بیٹی کو اس منحوس کے سے بیاہ دوں۔ تمہارا خون ہو جاتا مارا گیا تو تمہارا حصول ہو گئی۔ پارو گھر چلی تو حزن و ملال وسوسے اس کے دل میں جاگ رہے تھے

سر پہ چھاچھ کی مٹکی اور ہاتھوں میں روٹی لئے چھم چھم کرتی کھیتوں کی منڈیر منڈیر چلتی پارو جب کھیت کے نزدیک پہنچی تو ہمیشہ کی طرح برگد کے نیچے رُک کر اس نے دو تین گہری گہری سانسیں لیں اور پیڑ کے تنے کی آڑ لے کر شنکر کو دیکھنے لگی۔ گھٹنوں سے اوپر دھوتی باندھے ہوئے ننگے بدن ننگے سر شنکر کو تپتی دوپہری میں کھیتوں میں کام کرتے دیکھ کر پارو کو ایک عجیب قسم کی لذت اور سکون ملتا۔ اس طرح مرمر کر کام کرتا ہوا شنکر، پارو کو بہت زیادہ پیارا محسوس ہوتا۔ شام کو گھر لوٹنے پر شنکر جب نہا دھو کر اس کے نزدیک آ بیٹھتا تو اُسے شنکر کی چھاتی کے بالوں میں پھنسی ہوئی صاف شفاف بوندوں میں کوئی چمک، کوئی کشش نہ دکھائی دیتی۔ اس کا چمکتا ہوا گٹھیلا سیاہ بدن بھی اُسے اپنی طرف متوجہ نہ کرتا۔ لیکن کھیتوں میں دوپہر کی روٹی کھاتے ہوئے شنکر کو وہ تکتی بیٹھی رہتی تو اُسے شنکر کی ہر ادا پیاری لگتی۔ اس کی چوڑی چھاتی کے گنجان بالوں میں اٹکے پسینے کے قطرے اس کے دل میں گدگدی پیدا کر دیتے۔ اُس کا جی چاہتا ان قطروں کو چھو کر سمیٹ لے، اپنے ہونٹوں میں انہیں جذب کر لے، اس سے لپٹ جائے اور کہے...... بس تم ایسے ہی رہا کرو...... تمہارے پسینے کی بو اچھی لگتی ہے...... تمہارے پیر کیچڑ میں بھرے ہوئے...... تمہارے ہاتھوں سے محنت جھلکتی ہے

...... وہ نہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی۔

شنکر کو تیزی سے بڑے بڑے نوالے کھاتے دیکھ کر پارو اکثر اس سے کہتی بھی ...... سلے جی! ذرا دھیرے کھاؤ نا ...... تو شنکر بنا رُکے ہاتھ چلاتا ہوا کہتا ......

"کھانے سے نپٹ لوں تو چند منٹ تمہاری گود میں سر رکھ کر لیٹ لوں گا ...... پھر تمہیں گھر جانا ہی ہے" ...... پارو شرما جاتی۔ وہ سمجھ نہ پاتی ...... کھانے میں تیزی تو وہ اس لئے کرتا ہے کہ اسے پارو کی گود میں آرام کرنا ہوتا ہے لیکن رات کو شنکر اتنا بے صبرا کیوں ہو جاتا ہے ؟ ......

شنکر نے پل بھر رُک کر سورج کی طرف دیکھا پھر سوکھی پگڈنڈی کو دیکھ کر اپنے کام میں جُٹ گیا ...... وہ جانتا تھا کہ ٹھاکر کا آنا تو اب پہنچتی ہی ہو گی۔ پارو نے شنکر کو پگڈنڈی کی طرف دیکھتے دیکھا تو من ہی من مسکرا کر برگد کی اوٹ سے نکل آئی۔ بیس سالوں سے اس کا یہی معمول تھا۔ بیس سال پہلے جب وہ دلہن بن کر اس گاؤں میں آئی تھی تو اس کی ساس نے اپنے بوڑھے پیروں کو آرام دینے کا سوچ لیا تھا اور تب سے پارو شنکر اور بوڑھے کشن کے لئے کھیتوں کی روٹی لے جانے لگی تھی۔ اسی وقت سے شنکر کو چھپ چھپ کر دیکھنے کی عادت

کا فرض پورا کر لیا ہے ... وہ شنکر کہہ رہا تھا۔ مجھے بھی ماں کی گالی دی تھی ——"

"ابے! تو کیا کہہ رہا ہے کوڑے!" کہنے کو جگرو دوست کتنا ہلا اٹھا تھا۔ "تو ..... کوڑو ..... جس نے بولنا سیکھتے ہی پہلا لفظ ماں کی گالی دی ہوگی ..... تجھے ماں کی گالی کا اتنا غصہ آیا ..... تو جھوٹ بولتا ہے"

اس کے بعد کوڑو نے اور کچھ نہیں کہا تھا۔ گاؤں والوں کی گالیاں سنتا ہوا چپ چاپ جیل کی کوٹھری میں جا چھپا تھا جہاں کچھ ہی عرصے بعد کام کے دوران اسے سانپ نے ڈس لیا تھا ..... شنکر تب سارے گاؤں میں اچھلتا پھرا تھا۔ "دیکھا! بھگوان نے میرے باپ کا بدلہ لے لیا ......"

شنکر جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا، بھولتا گیا کہ کسی نے اس کے باپ کو مار ڈالا تھا ..... کوڑو کے خاندان میں تو کوئی نہ تھا جس سے وہ اپنا بدلہ لے سکتا۔ لیکن بھورو کے گاؤں میں لوٹ آنے کے بعد کئی بار اس کا جی چاہا تھا کہ بھورو کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، باپ کی موت کا بدلہ لے لے، پر ہر بار پارو نے اسے روک دیا۔ —— "تم تو پاگل ہو جی! بھورو ایک تو کوڑو کا سوتیلا بھائی ہے، وہ خود بھی اُس سے تنگ آیا ہوا تھا۔ اُس کو کوڑو سے ذرا بھی محبت ہوتی تو گاؤں چھوڑ کر کہیں بھاگ جاتا۔ اُس لونڈے کو کیا معلوم کہ کوڑو نے یہاں کیا گُل کھلائے ہیں؟ ——" شنکر کبھی بھورو کے دلیر سکل جسم کا دھیان کرتا اور اپنے بوڑھے ہوتے جسم کو دیکھتا تو سوچتا —— بھگوان نے تو کوڑو کو مار ہی دیا ہے ..... میں بھورو کو ختم کر کے پاپ اپنے سر کیوں لوں؟

شنکر اور پارو دونوں کو کشنا کی یاد آ گئی تھی۔ دونوں اپنے خیالوں میں گم تھے۔ شنکر کو ہارو کے ابھی کہے ہوئے جملے یاد آئے تو وہ مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہو گیا —— "اس حرامی کے بچے کی آنکھ نکال کر میں [illegible] ..... اس کی آنکھیں نکال لوں ..... اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں ——"

[illegible] ماں کے پیر پکڑ لئے۔ "مت کرو!

میری بات تو سنو ..... [illegible] ..... اور تمہیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہوگا ..... [illegible] ہمارے کوئی بیٹا بھی تو نہیں جو تمہارے بعد" ..... [illegible] پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

شنکر رُک گیا۔ اس میں بس یہی ایک بُری عادت [illegible] بنا سوچے سمجھے کسی بھی کام کو کرنے تیار ہو جاتا تھا ..... لیکن جلد اُس کا غصہ اپنی حد پار کرنے لگتا۔ صابن کے جھاگ کی طرح ہی بیٹھ بھی جاتا - پارو اس کی اس کمزوری سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ اس لئے شنکر کو غصے میں دیکھ کر اپنی آواز میں تھوڑی مٹھاس گھول لیتی اور شنکر نرم پڑتے پڑتے اتنا نرم ہو جاتا کہ پارو جس رُخ پہ چاہتی اس موم کی ناک کو موڑ لیتی —— اسے رُک کر کچھ سوچتے دیکھا تو پارو نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی —— "بھورو اچھا لڑکا ہے ..... ہے ..... اس کے پاس اس کی اپنی زمین ہے ..... اپنے بیل ہیں ..... پھر اس کو کوئی بُری عادت بھی تو نہیں ..... [illegible] ہاتھ بٹانے کے لئے کسی کی مدد چاہیئے ..... پھر آج بھی .....

"خاموش رہو ..... شنکر دھاڑ کر بولا ..... میں [illegible] چاہتی ہو؟ تم چاہتی ہو میں اپنی پھول سی بیٹی کو اس [illegible] بیاہ دوں، تمہارا کوئی ہوتا سوتا مارا گیا ہوتا تو تمہارے دل کو [illegible] جاؤ چلی جاؤ ......"

شنکر کی دہاڑ سن کر آس پاس کے کھیتوں سے [illegible] اُبھرے ..... کوئی خاص بات دکھائی نہ دی تو پھر کام سے [illegible] ہو گئے۔ پارو گھر کو چلی تو ہزاروں وسوسے اس کے دل میں [illegible] تھے۔ کہیں شنکر بھورو کو مار نہ بیٹھے اسی ڈر سے وہ [illegible] کے گھر پہنچی۔ کھیت پہ اسے دیکھا۔ بھورو تو ملا ..... [illegible] گھر لوٹ کر کام کرتی رہی ..... رات کو شنکر [illegible] بھلی ستھری! وہ میری دوپہر کی باتوں کو بھلا [illegible] نہ لگے دیتا"

شنکر نے ہاتھ [illegible]

شنکر لاجو کی طرف [illegible] تیز لہجے میں بولا ۔
"تم پہلے بات کی بات کیوں نہیں کرتی ہو ...... میں تو اُسے —
بھول گیا تھا ۔" پارو دیکھ رہی تھی کہ شنکر کے چہرے پر سوچ
بہت گہری ہیں وہ اُسے ٹالنے کی بہلانے کی کوشش کر رہا ہے
[illegible] کا خیال کر کے وہ چپ رہ گئی ۔
رات کو کام دھندے سے نپٹنے کے بعد وہ لیٹنے جا رہی
تھی کہ لاجو دوڑی دوڑی چلی آئی ۔
"ماں! بابو جی پال سے لوٹ آیا ہے اُس کے ساتھ وہ
بھی ہے ...."
"بھورو!" پارو تڑپ کر کھڑی ہو گئی "ہے بھگوان!
دیا کرنا" اس کے منہ سے نکلا۔ لپک کر وہ دروازے تک پہنچی ۔
تب تک وہ دونوں کھاٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ شنکر کڑی نظروں سے
بھورو کو دیکھے جا رہا تھا۔ بھورو کچھ بے چین سا نظر آ رہا تھا شنکر
نے صاف لیکن درشت لہجے میں کہا۔
"میں اگر صاف انکار کر دوں تو ؟"
"تو میں تمہارے پیر نہیں پڑوں گا۔" بھورو ایک دم
اٹھ کھڑا ہوا ..... چار قدم چل کر لوٹ پڑا۔
"شنکر دادا! اگر تم کوڑھ کی وجہ سے انکار کر رہے ہو تو
پھر نہیں کہوں گا۔ پر مجھے اپنی بیٹی کے قابل نہیں سمجھتے تو یہ تمہاری
بھول ہے۔"
پارو کا جی چاہا دوڑ کر بھورو کو روک لے اور اس سے
کہے ..... ایک بار شنکر سے کہہ کر تو دیکھے ...... ایک بار
اور سہی مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ بھورو سے اُسے کوئی خاص لگاؤ
تھا ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اپنی ایک ہی بیٹی پارو کو وہ اپنے سے
دور کرنے سے ڈرتی تھی۔ اس کی ممتا چاہتی تھی کہ بیٹی گاؤں میں ہی
بیاہی جائے جس سے لاجو سدا اُس کے سامنے رہے ..... بھورو پلٹ
گیا تو اُسے اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہوا ..... وہ جانتی تھی شنکر
اب [illegible] غیر برادری سے بات پکی کر آئے گا ..... نہ صرف بات
پکی کر آئے گا بلکہ بیاہ بھی جلدی کر دے گا ...... اور اسکی لاجو

اس سے جدا ہو جائے گی ...... وہ اگر بیٹھنے کو تھی کہ شنکر کی
آواز اس کے کانوں میں پڑی ..... "بھورو! ادھر آ —"
بھورو کے قریب آ جانے پر شنکر نے مسکان [illegible] ہونٹوں میں
دباتے ہوئے کہا۔ "جا کسی بڑے بوڑھے کو اپنی طرف سے بات
طے کرنے کے لئے بھیج دے۔ میں بچوں سے بڑی باتیں نہیں
کرتا ۔"
بھورو نے مسکرا کر شنکر کے پیر چھوئے اور چل دیا
..... تیز تیز قدموں سے ..... شنکر نے پکارا "پارو —
پارو! پارو —" پارو کواڑ سے لگی — آنکھیں بند
کئے اپنے آنگن میں شہنائیوں کی گونج میں کھو چکی تھی .....
شنکر پکارتا رہ گیا پارو! ...... پارو ......! —

جدید ادب

کے نام پر ہم عجیب و غریب تخلیقات پیش کر رہے ہیں ایسی
تخلیقات کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ وہ قابل فہم ہیں۔ ہم ان
رجحانات کے قصے لکھ رہے ہیں جو ہمارے اپنے نہیں۔ ہم علامتوں
کے واضح اظہار کے بغیر علامتی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ نہ کہانی کو
تیکنک کی ایک تبدیلی نہ سمجھ کر کہانی کا حاصل سمجھ رہے ہیں
ہم داخلی اور خارجی احساسات کو خانوں میں تقسیم
کرنے لگے ہیں۔ جنسی کج روی ہمارا ادبی موضوع بن گیا ہے
شہری زندگی کے بعض مسائل کو ہم نے ہمہ گیر سمجھ لیا ہے
شعور کے نام لا شعوری احساسات کو فن کا درجہ دینے
لگے ہیں۔ اور اس سارے ہنگامہ میں بیرونی اثرات
غیر صحت مند طور پر کام کر رہے ہیں۔ اچھی باتیں مستعار لے
لینا برا نہیں لیکن افادیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم
کہاں تک اپنے مزاج اور ماحول میں اسے ڈھال سکتے ہیں
[illegible]

ابراہیم شفیق

تماشائی

خود احمد علی کی حالت اپنی سائیکل کی سی تھی وہ زندگی کے راستے پر مسلسل چل چل کر تھک گیا تھا۔ چاہنے والے کتنی دور چلے گئے لیکن احمد علی جیسے سائیکل کا ایک پہیہ تھا جو اپنی محدود رفتار سے گردش کرتا تھا۔

ابھی سورج ڈھلا ہی تھا کہ مارکیٹ کے سامنے والے فٹ پاتھ پر سائیکل کی لال ٹینوں میں مٹی کا تیل ڈالنے والے اپنی اپنی دکانیں لگا چکے تھے۔ دُکانیں کیا تھیں بس لکڑی کے چھوٹے چھوٹے صندوق تھے جن پر مختلف سائز کی شیشیاں تیل سے بھری ہوتیں۔ ان میں تیل ختم ہوجاتا تو تیل کے ڈبے سے ان میں تیل بھر لیا جاتا تھا۔ ان صندوقوں پر دو چار چراغ جلتے رہتے تاکہ دور سے دیکھ کر بھی لوگ اندازہ لگا سکیں کہ وہاں تیل کی دکانیں ہیں۔ ان چراغوں کی بتیاں اتنی بڑی ہوتیں کہ ہوا کے تیز جھونکوں میں بھی نہیں بجھتے تھے۔ سائیکل کی لال ٹینوں میں مٹی کا تیل ڈالنے کے علاوہ وہ لوگ لال ٹین کی بتیاں بھی فروخت کرتے تھے اُن دکانداروں میں زیادہ تر نوعمر لڑکے ہوتے یا پھر عمر رسیدہ لوگ۔ وہ لڑکے تو خیر نت نئے طریقوں سے گاہکوں کو پکار کر اپنا دھندہ جما لیتے۔ لیکن بوڑھے اپنی جگہ پر سمٹے سمٹائے بیٹھے راہ رووں کی بجھی ہوئی لال ٹینوں کو حسرت سے دیکھتے۔

ان دکانوں سے ذرا دور ہٹ کر جام باغ روڈ کے فٹ پاتھ پر کچھ فاصلے سے ایک اور دکان نظر آنے لگی تھی۔ جہاں ایک دس سالہ لڑکی بھی تیل ڈالنے کا کام کرتی تھی۔ پہلے پہل وہ شرما کر [illegible] لکڑی کے ایک ڈبہ پر رکھ لیتی۔ اور وہیں ایک چٹائی پر گاہکوں کا انتظار کرتی ہوئی خاموش بیٹھی رہتی۔ اس کی شیشیاں دوسرے دکانداروں کی شیشیوں سے قدرے بڑی تھیں۔ شاید اس لئے کہ اس کا کاروبار نیا تھا۔ وہ سانولی رنگت کی دبلی پتلی بہت معصوم لڑکی تھی۔ چہرے کے خطوط اور آنکھوں سے وہ کسی اچھے گھرانے کی معلوم ہوتی۔ آس پاس کی دوکانوں والے اس کو تاجو کہہ کر پکارتے تھے۔ شاید اس کا اصلی نام تاج ہوگا۔ اگرچہ کہ وہ اپنے چہرے کو اندھیرے میں چھپائے، شرما کر بیٹھتی تھی لیکن لوگ زیادہ تر اس کے ہی پاس سے تیل ڈلواتے تھے۔ وہ اپنا کام پھرتی اور خندہ پیشانی سے کرتی۔ چاہے لوگ تیل ڈلوائیں یا نہ ڈلوائیں وہ کبھی ان کو سائیکلوں سے اتر کر جانے کا مشورہ دیتی اور آگاہ کرتی کہ بغیر لال ٹین سائیکلیں پکڑی جارہی ہیں۔

گاہک چلے جاتے تو وہ پھر اپنی جگہ پر پشیمان سی بیٹھ جاتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی سہیلیوں کو یاد کرکے افسردہ ہو جاتی۔ دن بھر گھر کا کام کاج کرنا پڑتا تھا اور شام کو یہ تیل کا دھندا۔ دوسری لڑکیوں سے وہ کس قدر مختلف تھی۔ ہر شام اسکول سے آتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ کر تو اس کی آنکھیں بھر آتیں [illegible] چراغوں کی طرح اس کے ارمان اندر [illegible]

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ یہ تو دو روپے ہوئے تین آنے کے
پیسے" احمد علی نے جیب سے دو روپے نکال کر کہا۔

یہ سارا ماجرا پان والا اور اس کا دوست بہت غور سے
دیکھ رہے تھے۔

تاجو کچھ سہم سی گئی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

"ڈرو نہیں بی بی۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں میرے ساتھ
چلو" احمد علی نے تسکین دی۔

تاجو نے اپنا سامان اٹھا کر لکڑی کے صندوق میں ڈال لیا
اور جب سر پر وہ صندوق رکھنے لگی تو احمد علی کہا۔

"نہیں نہیں — ادھر لاؤ۔ میں اسے سائیکل پر رکھ
لیتا ہوں"

احمد علی نے صندوق کو کیریر پر باندھ لیا۔ اور تاجو کو ساتھ
لے کر چلنے لگا۔ ان لوگوں کے پیچھے پیچھے پان والے کا دوست بھی برابر
چلا آ رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ احمد علی آخر اس بچی کو کہاں لے جاتا ہے
وہ لوگ تو بہت دنوں سے احمد علی کو شک کی نظروں سے دیکھ رہے
تھے۔ آج وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا شک یقین میں کس طرح
بدلتا ہے۔

چلتے چلتے وہ لوگ گوشہ محل سے آگے ایک چھوٹی سی
بستی کی طرف چلنے لگے۔ جہاں گھاس پھوس اور کویلوں کے خستہ
مکانات بنے ہوئے تھے۔ پھر وہ لوگ ایک گلی میں مڑے اور کچھ دور
چلنے کے بعد احمد علی کا مکان آ گیا۔ ایک سفال پوش اور خستہ مکان
جس کے دروازے پر ایک ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ پہلے احمد علی اندر
چلا گیا۔ اور سائیکل اندر رکھ کر تاجو کو اندر لے گیا ...... باہر دور
پان والے کا دوست بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ لوگ آپس میں کچھ
سرگوشیاں کرنے لگے اور پھر ان میں سے ایک شخص دوڑ کر کہیں چلا گیا
دوسرے لوگ قریب کے ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ ان کے تیور بتا رہے
تھے کہ وہ معاملہ کی تہہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ شخص
ایک پولیس کانسٹیبل کو لے آیا۔ اور پھر بڑی چالاکی سے اس
[illegible] احمد علی باہر نکل آیا۔ پان والے کے
[illegible]

دوست نے اس کی نشاندہی کی۔

"کیا تم ایک لڑکی کو گھر لائے ہو؟" پولیس کانسٹیبل نے
پوچھا

"ہاں۔ لایا ہوں"

"کیوں؟" پولیس کانسٹیبل نے پھر سوال کیا۔

"کھانا کھلانے کے لئے" احمد علی نے کہا۔

"خود کبھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے؟ چلے ہیں دوسروں
کو کھانا کھلانے "چلو تھانہ چلو!"۔ کانسٹیبل نے ذرا سختی سے کہا
محلے کے کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ سب لوگوں کے لئے ایک تماشا ہو گیا۔
احمد علی اس محلے میں نیا نیا آیا تھا۔ اس لئے محلے والوں کو اس کے بارے
میں کم معلومات تھیں۔

"آخر میں نے کیا جرم کیا ہے؟ میں کیوں تھانہ چلوں؟"
احمد علی گڑگڑایا۔

"یہ سب تمہیں وہاں معلوم ہوگا" کانسٹیبل نے کہا۔
احمد علی ایک عجیب الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ اس کی آنکھیں
نم ہو گئیں۔

"چلو چلتا ہوں" اس نے کہا۔
"بچی کہاں ہے۔ اس کو بھی بلاؤ" کانسٹیبل نے ٹوکا۔
احمد علی نے تاجو کو آواز دی۔ تاجو باہر آئی۔ وہاں لوگوں کی
بھیڑ دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

"اتنے لوگ کیوں آئے ہیں کاکا" اس نے احمد علی سے پوچھا۔
احمد علی نے چپ سادھ لی۔ اس کی زبان گنگ تھی۔ آخر وہ
اس معصوم سی بچی کو کیا سمجھاتے۔

لوگوں میں عجیب سی میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ احمد علی اور
تاجو پولیس کانسٹیبل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ان کے پیچھے لوگوں
کی ایک بھیڑ چلی جا رہی تھی۔ سب کو تشویش تھی کہ کیا ہونے والا ہے
کوئی کہہ رہا تھا "اتنا عمر رسیدہ ہو کر [illegible]
کسی نے آواز دی "بڈھا بہت [illegible]"
سن کر احمد علی کو یوں لگ رہا تھا جیسے گرم گرم [illegible] کے کان

میں گر رہی [illegible] اور زہر میں ڈوبے تیر اس کے جسم میں دھنسا کر جیسے کھینچ لیے ہیں۔ وہ سر جھکائے مغموم چلا جا رہا تھا۔

"دنیا میں انسان اتنی محنت صرف عزّت کے لئے کرتا ہے"

احمد علی نے سوچا۔ اس کی برسوں سے قائم کی ہوئی عزت آج آج احمد علی سر بازار خاک میں مل رہی تھی۔

ابھی تھانہ قریب ہی تھا کہ ایک اجنبی راہرو کی احمد علی اور تاجو پر نظر پڑی ..... وہ بجلی کی سی تیزی سے مجمع کے پیچھے ہو گیا سب لوگ تھانہ میں چلے گئے تو یہ دور کھڑا معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پولیس والوں نے کچھ کاغذات نکالے اور احمد علی کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"احمد علی!"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"ملازم سرکار ہوں"

"یہ بچی کون ہے تمہاری۔ اس کو کہاں لے گئے رکھتے اپنے ساتھ؟"

"جی! ..... جی! ....." احمد علی کی آواز حلق ہی میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ لرز کر رہ گیا۔

"یہ جی جی کیا لگا رکھا ہے بولتا کیوں نہیں یہ لڑکی کون ہے تیری .....؟" ایک جمعدار نے گرج کر کہا۔

"یہ بچی احمد علی کی بیٹی ہے۔ سنا تم نے" اُس اجنبی نے لوگوں کو ہٹا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

تاجو نے اسے دیکھ منہ سے ایک چیخ نکلی۔ "بابا" .....

سارے تھانے میں ایک تہلکہ مچا۔ سب کے سب اس نووارد کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"تاجو! میں نہیں ....! یہ ہیں ..... تمہارے باپ" اس اجنبی نے کہا۔

"پھر تم کون ہو۔" ایک پولیس کانسٹیبل نے کہا۔

"میں نے اس بچی کو پالا پوسا ہے جب یہ چھوٹی تھی تو اس کی ماں دق میں مبتلا ہو کر چل بسی۔ غریب احمد علی کے بچے زیادہ تھے۔ اس نے صرف ایک بیٹے کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور بقیہ لڑکیوں کو اپنے عزیزوں رشتہ داروں کے ہاں بھیج دیا۔ اس بچی کو احمد علی نے مجھے سونپا تھا۔ آج اس کی بیوی کی برسی تھی۔ سال میں بس وہ اسی ایک دن اپنے بچوں کو بلا لیتا ہے لیکن ان کو معلوم نہیں ہونے دیتا کہ وہ ان کا بدنصیب باپ ہے۔ اس بار شاید وہ مجھ سے کہنا بھول گیا اور بچی کو سیدھے اپنے ساتھ لے آیا۔" اس شخص نے کہا۔

احمد علی کے ساتھ آنے والے تماشائی اپنی گردنیں نیچی کر کے جانے لگے تھے۔ پولیس والوں کو بھی شرمندگی اور ندامت سی ہو رہی تھی۔

"معاف کیجیے! احمد علی صاحب۔ آپ جا سکتے ہیں"

لیکن احمد علی کی روح تو کب کی پرواز کر چکی تھی۔ وہ بہت پہلے ہی جا چکا تھا۔

چراغ تلے — صفحہ ۱۷۷ کا بقیہ

ہوں۔ لیکن اکثر جواب دینا بھول جاتی ہوں۔

پھر کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ آخر میں نے بھی تو پڑھا تھا ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔

پھر آخر میرے علم میں کون سی کمی رہ گئی ہے جو میں بھی ابا اور امی کی طرح سیما کو معاف نہ کر سکی۔

اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

نانی اماں کہا کرتی تھیں عورت کی نہیں لڑکا ہے۔ اوّل تو گھر نصیب نہیں ہوگا اور اگر مل گیا تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجادے گی اس نے کھ زندگی بھر اس نے مٹو نچایا ہے۔ پتنگ اڑائی ہے گلی ڈنڈا کھیلا ہے۔ کنگیر وہ پہچانتی نہیں اسے سوئی میں تاگا ڈالنا اسے آتا نہیں ـــــــــ

اُرے ہائیں ـــــ! ہائیں ہائیں! نانی ہائیں ہائیں کا ورد ہی کرتی رہیں لیکن اس نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اٹھا کر زمین پر دے ہی تو مارا اور ساتھ ہی بپھر کر بولی: "پھر گالی دے گا ـــــ؟!"

اور پھر سارا گھر نانی نے سر پہ اٹھا لیا ـــــ!

نانی نے پرانی کلکتیا جوتی کھینچ ماری اور لگیں چلانے جیسے واقعی غضب ہی تو ہو گیا ہو اور آگ ہی تو لگ گئی ہو۔ کلکتیا جوتی تو خیر لگی نہیں لیکن نانی کے حلق پھاڑ کر واویلا کرنے پر وہ مڑی اور نتھنے پھلا کر بولی: "اس نے گالی کیوں دی تھی؟"

"چپ کتیا!" نانی نے اس کے دیدے دیکھ کر سر پیٹتے ہوئے کہا: "تجھے شرم بھی نہیں مردذات پر ہاتھ اٹھاتے بے حیا ادھر آ تو مزہ چکھاؤں۔"

"لو! آ گئے ہم!" وہ دندناتی ہوئی آنگن سے برآمدے میں نانی کے پلنگ کے پاس آ کھڑی ہوئی اور بولی: "مردذات گالی دے تب بھی سن لوں کیا؟ ایسی کی تیسی مردذات کی . . ."

"چپ کلموہی!" نانی نے بپھر کر کہا: "اللہ سے ڈر! کہیں آسمان نہ پھٹ پڑے؟" وہ ہنس دی حسب عادت۔ نانی کی ہر بات پر اسے ہنسی آتی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ اس وقت بھی وہ ہنس دی اور بولی ـــــ "جب مردذات عورتوں کو مارتے ہیں تب آسمان نہیں پھٹ پڑتا ہے۔ پھر اب کیوں پھٹے گا؟" نانی کی ایک سانس اوپر تھی ایک نیچے۔ وہ تو یوں بھی اس سے جیت نہیں پاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ مات ہی کھا گئیں لیکن پھر بھی بولیں: "جانتی ہے تو نے کیا کیا! مرد بچے پر ہاتھ اٹھانے والی لڑکی کے ہاتھ مڑ جاتے ہیں بے شرم۔"

وہ پھر ہنس دی۔ نانی کی بات اس کے حلق سے نہیں اتری۔ چمک کر بولی: "مڑ جانے دو ہاتھ! میں مڑے ہاتھوں سے گالی دینے والے کا منھ نوچ لوں گی۔" یہ کہتی اور ہنستی ہوئی وہ تو بھاگ گئی۔ لیکن نانی کبھی سر اور کبھی سینہ پیٹتیں۔ وہ کبھی زمانے کو کبھی اپنی لڑکی عذرا کو اور کبھی خود اسے کوستیں اور باتیں سناتی رہیں۔

نانی کی اٹھاسی برس کی عمر تھی۔ اس عمر میں نہ تو کبھی انھوں نے ایسا بھیانک منظر دیکھا تھا اور نہ سنا تھا کہ عورت ذات مرد بچے کو اٹھا کر دے مارے؟ وہ تو یہ جانتی تھیں کہ عورت ذات کے نہ تو ہاتھ ہوتے ہیں نہ آنکھیں ہوتی ہیں اور نہ زبان ہوتی ہے۔ کم از کم ان کی نانی نے تو انھیں یہی تعلیم دی تھی۔ اس تعلیم پر انھوں نے عمل بھی کیا تھا۔ ان کے شوہر نے پچاسوں مرتبہ تھوں ان کی کھال کھینچی تھی لیکن زندگی بھر انھوں نے کبھی الٹ کر مجازی خدا کو جواب تک نہیں دیا تھا۔

انکی نظر میں وہ عورت جنتی نہیں ہو سکتی تھی جو مرد کا مقابلہ کرے پھر وہ کیسے جنتی بن جاتیں!؟ اور ان کے زمانے میں ساری کی ساری عورتیں ان کی ہی جیسی اطاعت گزار تابعدار ہوتی تھیں۔ کیا

جہاں چاہا [illegible] کو دیکھیں سمجھو —— لیکن اب بقول نانی
کے پچھلا پہر آ زمانہ آگیا تھا کہ عورتیں تو عورتیں لونڈیاں تک ——
مردوں کا مقابلہ کرنے لگیں اور ہاتھ اٹھانے لگی تھیں۔ قیامت کی
نشانی ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح ہاتھ پیر چلانے لگی تھیں۔
نانی یہ سب کچھ جتنا سوچ رہی تھیں اتنا ہی ان پر لرزہ طاری ہوتا جاتا
تھا —— !

جب عذرا محلّے کی عورتوں سے مل کر آئی تب اس نے ماں
کی پیشانی چھوئی تو بخار میں جلتا پایا۔ اس نے پوچھا: "کیا ہوا اماں؟"
وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں سوکھے ہونٹوں سے زبان پھیر پھیر کر انھوں نے
سارا ماجرا کہہ سنایا۔ جو کچھ انھوں نے دیکھا بیٹی کے گوش گزار کر دیا
"اوّل تو لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کا کھیل کود ہی میرے تن بدن میں
آگ لگاتا ہے۔ ہم چار برس کے بعد پردے بٹھال دیئے گئے تھے۔
لڑکوں کے ساتھ کھیلنا کودنا تو بڑی بات ہے۔ بات نہیں کر سکتے تھے
لیکن تمہاری لاڈلی نو برس کی بوتھا ہو گئی اور گلے دار لٹو کھیلتی
ہے لڑکوں کے ساتھ اور تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ..."
"اماں! ہوا کیا؟" عذرا نے پرانی کنتھری سنتے سنتے اکتا
کر پوچھا۔ نانی نے بمشکل کہا: "ہوا کیا؟ سن لو کان کھول کر غضب
ہو گیا —— تمہاری لاڈلی نے اصغر کو اٹھا کر زمین سے دے مارا۔
یہ بھی نہ سوچا کہ وہ کر کیا رہی ہے؟ —— مرد بچے کو مارنا عورت
ذات کے لئے کتنی منحوس بات ہوتی ہے۔ .."
عذرا منہ پھیر کر مسکرا دی —— اس لئے کہ وہ سارا قصہ
سن چکی تھی۔ دوسرے لڑکوں نے بتا دیا تھا کہ لٹو کا کھیل ہو رہا تھا
اصغر نے بے ایمانی کی۔ اس نے اعتراض کیا تو اصغر نے اسے گالی
دی۔ اسے غصہ آ گیا اس نے اٹھا کر دے مارا۔ اس لئے ماں کی
کہانی اسے کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ اس نے کہا: "اماں تم بلاوجہ اپنی طبیعت
خراب کرتی ہو —— بیٹھے بٹھائے بخار کو بلا لیا!" یہ کہہ کر عذرا تو
چلی گئی لیکن نانی نے مینہ کوٹ لیا۔ "بلاوجہ" کی گردان کرتی ان کے
حلق میں پھنس گئی اور نانی عذرا کو برا بھلا کہنے لگیں: "یہ سب تیری ڈھیل
کا نتیجہ ہے۔ میں خوب جانتی ہوں کہ تو نے بڑی دراز کی ہے۔ مگر
یاد رکھنا کہ سر پہ ہاتھ رکھ کر روئے گی۔ کوئی تھوکنے بھی نہ آئے گا اور یہ کہ
خصم کے بیٹا کو —— مرد مار لڑکی کو کون بیاہ کے لے جائے گا!
لئے بیٹھی رہنا اپنی لاڈلی کو —— میں تو نہیں ہوں گی لیکن دیکھ
لینا کہ بیٹا خصم کی چاند گنجی کر دے تب کہنا اور کھڑے کھڑے نخاس
میں نہ بیچ دے تو منہ پر تھوک دینا —— غضب خدا کا۔ کہتی ہے
بلاوجہ —— میں شرم سے گڑ گئی۔ اور اس کے نزدیک کچھ ہوا ہی
نہیں —— بھانڈوں پھیروں ایسے مونڈی کاٹے زمانے پہ ——
آگ لگاؤں —— جب بیٹا پہلوانی کرے اور اماں تالی بجائیں
تھو ہے زمانہ پہ —— !" یہ کہتے ہوئے نانی نے زمین پر تھوک دیا۔
اور منہ لپیٹ کر لیٹ گئیں —— جبکہ باورچی خانے میں ماں بیٹی
کھانا کھا رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں —— !

"نانی!" اس نے شام کو پلنگ کے پاس آتے ہی ہاتھ
پھیلاتے ہوئے کہا: "ملیدہ تو کھلاؤ! میری نانی!" اس کی بات
سن کر نانی نے اس کی طرف سے پیٹھ کر لی۔ لیکن وہ جب خوشامد
کرنے لگی۔ تب انھوں نے کچھ سوچ کر کہا: "نذر ننگے سر نہیں
کھاتے۔ جا کر دوپٹہ اوڑھ۔" وہ لپک کر دوپٹہ سر پہ ڈال آئی
نانی کا جی اچانک خوش ہو گیا۔ ہاتھ پکڑ کر پائنتی بٹھالا اور بڑی
نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا: "نذر دوں گی۔ لیکن پہلے وعدہ کر کہ
اصغر سے معافی مانگے گی —— دیکھ نیک بخت! تجھ کو اللہ نے
عورت بنایا ہے۔ جلاد نہیں۔ مرد تو اللہ میاں کی نظر میں اونچا ہوتا
ہے۔ خبردار کبھی بھول کر بھی مرد سے بے ادبی نہ کرنا ورنہ اللہ میاں
خفا ہو جائیں گے —— ساری بولتی کیوں نہیں سمجھی؟" وہ ہنس دی۔
اور جلدی سے بولی: "سمجھ گئی نانی۔" نانی خوش ہو گئیں ملیدے
کا لوندا اس کی ہتھیلی پر رکھا اور کہا:
"اور دیکھ! دوپٹہ اوڑھ کر باہر نکلا کر۔ اور لڑکوں کے ساتھ

دیکھا کرتی۔ وہ ہاں میں ہاں ملاتی رہیں۔ نانی باغ باغ تھیں۔
انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ واقعی سنبھل گئی ہے ۔۔۔ لیکن
کل جب اسے بغیر دوپٹہ کے ننگے سر دیکھا لڑکوں کے ساتھ کھیلتے
تو ان کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ سمجھ گئیں کہ ان کی چکنی
چپڑی باتیں صرف نذر کھانے کے لئے تھیں۔ جل گئیں اور اعلان
کردیا کہ اب کی جمعرات کو خاک نہیں ملے گی نذر۔

منہ پھٹ تو وہ شروع سے تھی اور نڈر فطرت رکھتی تھی۔
دوسرے باپ نے اسے لڑکی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ تو
شروع سے اسے لڑکوں کی طرح خطاب کرتے تھے۔ کوئی لڑکی
کہہ دیتا تو برا مان جاتے تھے فوراً کہتے: یہ میرا بیٹا ہے۔ بیٹی نہیں؛
وہ باتیں بھی لڑکوں کے انداز میں کرتی تھی۔ وہ اپنے لئے صیغۂ مونث
نہیں مذکر استعمال کرتی تھی۔ لڑکوں کے ساتھ کھیلتی تو یہ سمجھ کر کہ
وہ لڑکا ہے اسی انداز میں ان سے بولتی، لڑتی جھگڑتی تھی۔ دبتی تو
تو کبھی تھی ہی نہیں۔ اس لئے اس کے باپ نے اسی اٹھان پر اٹھایا تھا
یہی وجہ تھی کہ ہم عمر لڑکے اس کی مار سے بھاگتے تھے۔ کوئی اس
کے ساتھ کھیلنے پر تیار ہی نہ ہوتا تھا۔ جب وہ لڑکیوں کی طرف
مڑتی کہ ان کے ساتھ کھیلے تو لڑکیاں کانوں پر ہاتھ رکھتی تھیں، کیونکہ
وہ گڑیوں کی چوٹیاں نوچ ڈالتی تھی۔ گڈے کی ٹانگیں چیر ڈالتی تھی
ہنڈکلیا پر لات مارتی۔ سوئی چھین کر پھینک دیتی۔ اور کپڑے لے
کر بھاگ جاتی۔ لہٰذا کوئی لڑکی اسے اپنے ساتھ کھلانے پر رضامند
ہی نہیں ہوتی تھی ۔۔۔ اس لئے کہ لڑکیوں کی نظر میں وہ لڑکی ہوتے
ہوئے بھی لڑکی نہ تھی۔ اسے گڑیوں کے کھیل سے لگاؤ ہی نہ تھا۔
فطری طور پر وہ تو دوڑ بھاگ کے لڑکوں والے کھیل پسند کرتی
تھی جن سے لڑکیوں کو قطعی لگاؤ نہ تھا ۔۔۔!

محلے کے لڑکوں میں وہ "مار تو خان" مشہور تھی۔ لڑکے
اس سے بڑے لڑکوں کی فریاد کرنے آتے تھے۔ وہ لڑکوں کی
حمایت میں دوسرے لڑکوں سے لڑا کرتی تھی۔ جھگڑتی تھی جہاں
نہیں تھی کہ کوئی لڑکا کمزور لڑکے کو دبائے اور زیادتی کرے
پیر اور گھونسہ بازی سے وہ ڈرتی نہ تھی۔ ضرورت پڑتی تو کسی کو
لڑنے میں اسے عار نہ تھا۔ البتہ گالیوں سے اسے چڑ تھی۔ مجال
تھا کہ کوئی لڑکا اس کے سامنے کسی کو گالی دے جائے۔ جذبہ اس
میں اس قدر تھا کہ اپنے حکم کی نافرمانی اسے غصہ دلا دیتی تھی۔ مجال
نہ تھی کہ کوئی اس کے حکم سے سرتابی کرے۔ غرض کہ گھر ہی میں نہیں
بلکہ محلے میں اسی کی حکومت تھی۔ پڑھنے میں وہ تیز تھی۔ جتنی وہ شریر
تھی اتنی ہی ذہین بھی تھی۔ ان خوبیوں نے اس کو گھر ہی میں نہیں بلکہ
محلے میں بھی چاند بنا دیا تھا۔ لے دے کے صرف نانی سے اس کی کبھی
نہ پٹ سکی نانی اس سے اور وہ نانی سے دور ہوتی گئی۔

جب وہ زمانہ آیا کہ اسے دوپٹہ اوڑھنا پڑا تب اس کی انفرادیت
پھر بھی نمایاں رہی ۔۔۔ دوپٹہ کو کمر کے گرد پٹی کی طرح لپیٹ لیتی
تھی۔ نانی اپنا منہ پیٹا کرتی تھیں۔ ہزاروں سنایا کرتی تھیں اور وہ
ان کے چلانے کی پرواہ تک نہ کرتی تھی۔ دوپٹے کے لئے اس کا
فلسفہ ہی الگ تھا ۔۔۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑکی کے لئے دوپٹہ اس لئے
ہوتا ہے کہ کام کرتے وقت اس سے کمر کس لی جائے۔ دوپٹے کا
صحیح استعمال تھا اس کی نظر میں۔ اس فلسفہ نے نانی کا دم برہم کر دیا
تھا ۔۔۔ اور جب باہر جاتی تو دوپٹہ کو کمر سے ضرور کھول لیتی تھی۔
باہر اس نے نکلنا ترک نہ کیا تھا۔ نانی چلایا کرتی تھیں کہ دوپٹہ اوڑھنے
کے بعد لڑکی کو گھر سے باہر نہ نکلنا چاہئے۔ لیکن نانی کا فلسفہ
اور نانی کے اصول اس نے قطعی نہ اپنائے۔ وہ گھر میں پرندوں
کی طرح پنجرے میں بند ہونے کے لئے تیار نہ تھی کہتی تھی: میں
کوئی طوطا یا مینا ہوں جو پنجرے میں بند ہو جاؤں۔ نانی اسے
سمجھاتیں کہ باہر نکلنے والی لڑکی کے چہرے پر نور نہیں رہتا وہ
بدصورت ہو جاتی ہے تو وہ جواب دیتی کہ: بدصورتی بھی حسن ہے
نانی جب اسے ڈراتیں تو وہ پوچھتی: کوئی میں مٹھائی ہوں جو
لوگ مجھے کھا جائیں گے ؟ اور جب وہ دوپٹے کا آنچل الٹا
اوڑھتی تب نانی غضبناک ہو کر چلاتیں: انگلی پھر سر کھول کر کھلا
الٹا آنچل اوڑھتی ہے؟ الٹا آنچل نحوست ہوتی ہے [illegible]

...نصیب ہے مجھے الٹا آنچل ہی پسند ہے "! اس دن الٹا آنچل چھوٹی سی
بچی۔ اس سارے محلے میں وہ الٹا آنچل کے نام سے مشہور ہو گئی۔!
نانی اتنی ناراض تھیں کہ انھوں نے آئے گئے کے سامنے الٹا
کی برائی شروع کر دی۔ اس لئے کہ وہ الٹے آنچل سے ناامید
ہو چکی تھیں ـــــ کہا کرتی تھیں کہ وہ لڑکی نہیں لڑکا ہے۔ جسم لڑکی کا
ہے فطرت مرد کی ہے ـــــ دیکھنا کوئی پوچھے گا نہیں۔ اماں اور
ابا الٹے آنچل کو لے بیٹھے رہیں گے ـــ کھانا بازار سے منگایا کرے
گی اور ٹانکے تک کپڑوں میں درزی لگائے گا۔ اس لئے کہ زندگی بھر
اس نے لٹو نچایا ہے۔ پتنگ اڑائی ہے۔ گلی ڈنڈا کھیلا ہے کنگیرو
پہچانتی نہیں ہے اور سوئی میں تاگا ڈالنا اسے آتا نہیں ہے ـــ
اول تو گھر کبھی نصیب ہی نہ ہوگا اور اگر دھوکے سے مل گیا تو اس
گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گی ـــ وہ نانی سے خوش کیسے
رہ سکتی تھی۔ انھوں نے آج تک کبھی کسی بات کو سراہا تک نہ تھا۔
جوں جوں وہ بڑی ہوتی جاتی تھی اس میں غیرت اور حمیت پیدا
ہوتی گئی۔ لیکن نانی اس کی تعریف تو درکنار اور برا بھلا کہنے لگیں۔
یہی وجہ تھی کہ وہ نانی سے دور ہوتی گئی لیکن الٹا آنچل برقرار ہی نہ تھا
بلکہ اس کی جوانی اور انفرادیت کا پرچم بن گیا تھا ـــــ!
اس الٹے آنچل نے اسے کیسے کیا بنا دیا تھا اس کا اندازہ
ہی نہیں بلکہ شہرہ اس وقت ہوا جب ایک نوجوان نے اپنی جوانی اکڑ
اور امارت کے زعم میں اس کے الٹے آنچل کو چھونے کی غلطی کی۔
وہ الٹے آنچل کو لوٹ پھیر کر روئی کی لڑکی، ریشم کی دوشیزہ ہی سمجھ
بیٹھا تھا۔ اسے چھیڑا ہی نہیں دیا بلکہ اسے باہوں میں قید کرنے کی
جرأت کی۔ تب نوجوان کو اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا کہ الٹا آنچل
ایک نرم و نازک لڑکی کا آنچل نہیں بلکہ شیرنی کا پنجہ ہے! ـــ
اس واقعہ نے الٹے آنچل کی دھوم مچا دی۔ باپ نے خوب سراہا
اس لئے کہ وہ ان کی کسوٹی پر پوری اتری تھی ـــ اگر وہ
احساس کمتری میں مبتلا ہونے والی لڑکی ہوتی تب وہ بے آب
موتی بن چکی ہوتی۔ لیکن انھوں نے اسے شیرنی بنایا تھا اور
وہ شیرنی ثابت ہوئی ـــ!

اور اس دن ـــ جب وہ دلہن بنی بیٹھی تھی تو دل ہی
دل میں بہت خوش تھی کہ نانی کو آج اس نے ایک اور شکست
دی! وہ کہا کرتی تھیں کہ الٹے آنچل کو بھلا کون اپنائے گا! لیکن
اسے نہ صرف اپنایا جا رہا تھا بلکہ بڑے چاؤ سے ہاتھوں ہاتھ
لیا جا رہا تھا۔ نانی اپنی شکست پر مغموم نہیں بلکہ بہت خوش تھیں۔
اس وقت اس کا دل پہلی بار بھر آیا جب نانی لکڑی ٹیکتی ٹیکتی
اس کے پاس آگئیں۔ منھ دیکھا۔ بلائیں لیں دعائیں دیں اور منھ
پھیر کر کہا: "میں تیری دشمن نہیں۔ اپنی ہار پر بہت خوش ہوں۔
میرا ارمان ہے کہ تو جیتے اور میں ہارتی رہوں اور یہاں تک کہ میں
نہ رہوں۔ اس وقت بھی اس کا آنچل الٹا تھا۔ لیکن الٹے آنچل پر
نانی برا نہیں مانیں۔ خوش ہوئیں۔ مسکرائیں اور پیار سے چپت مارتے
ہوئے کہا: "دلھناپے میں بھی آنچل الٹا رہا۔!!"
جب وہ بیاہ کر اپنی سسرال پہنچی تب آس پاس کے محلے
خالی ہو گئے اور عورتیں لڑکیاں اور بچے اسے دیکھنے کے لئے امنڈ
آئے ـــ "الٹے آنچل والی دلہن" کو دیکھنے کے لئے عورتوں کی
بھیڑ بھاڑ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ کئی بار اس کا آنچل پلٹنے کی
کوشش کی گئی لیکن شرم و حیا کے باوجود اس نے اس کوشش کو
کامیاب نہیں ہونے دیا اور پھر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی جو الٹے
آنچل کو بدل دیتا ـــ!
سسرال میں بھی وہ اپنی انفرادیت لے کر آئی تھی جبکہ عام
لڑکیاں صرف ریشم کی گٹھری بن کر آتی ہیں۔ لیکن وہ بے جان ریشمی
گٹھری تھی اور نہ گیند اور نہ کھوکھلا بانس ہی تھی کہ بانسری بنا کر
اسے لوگ حسب منشا بجاتے ـــ وہ خود گیت تھی زندگی کا نغمہ
جس سے زندگی میں عزم استقلال اور ہمت ابھرتی ہے نہ کہ نغمہ
مغموم کہ رقت طاری ہو۔ اسی لئے کسی کو دکر آنے سے یہی وجہ تھی کہ
اس نے اپنی زندگی اور انفرادیت کا آتے ہی ثبوت دیا۔ بلا وجہ کی
شرم و لحاظ کو اس نے ترک کیا۔ اور الٹا آنچل ڈال کر گھر کی ذمہ داریں

کھانا بنایا — کچھ بے مزہ سے بھی ہوتی لیکن سارا گھر لیلٰے آنچل کا جھوٹا کھا گیا —— پھر جو وقت گزرتا اس کی خوبیوں میں چار چاند لگتا گیا —— اس وقت اس کی بڑی واہ واہ ہوئی جب وہ باورچی خانے یہ کہہ کر پہنچ گئی کہ اسے کھانا پکانے کی پوری مشق نہیں ہے لہٰذا وہ خود کھانا پکائے گی تاکہ اسے کھانا پکانا تو آ جائے۔ اسی طرح کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کے بجائے سوئی لے کر بیٹھ جاتی تھی تاکہ سینے پرونے میں مشاق ہو جائے۔ وہ جانتی تھی کہ زندگی نشیب و فراز سے گزرتی ہے۔ اور وہ چاہتی تھی کہ زندگی کی جنگ شروع ہونے سے پہلے صرف آرام کر کے وقت برباد کرے اور ناکارہ بنی رہے۔ ان باتوں نے اس کے عزم و سادہ زندگی اور سادہ رہن سہن نے اسے ماہ کامل بنا دیا۔ نانی تو اسے ناکارہ بچہ ہی سمجھا کرتی تھیں مگر دوسرے گھروں سے لڑکیاں اس کے پاس تربیت لینے آنے لگیں۔

نانی کی اب بانچھیں کھلی رہتی تھیں۔ انھیں خود حیرت تھی کہ کمر سے دوپٹہ لپیٹ کر پائنچے چڑھا کر لڑکوں سے گتھم گتھا ہو جانے والی کھلنڈری لڑکی گھر کی سلطنت کا انتظام کیسے کر رہی ہے!۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ آئی اور نانی نے بلائیں لیں اور اس پر سے پیسے نچھاور کئے تو وہ ہنس دی۔ نانی نے اس کی بانہہ پکڑی اور پوچھا: "تو چھپی رستم نکلی — کیوں میری جمیلہ؟" یہ پہلا موقع تھا کہ نانی نے اس کا نام زبان سے ادا کیا وہ بھی بڑے پیار سے ورنہ وہ تو اتنا ناراض تھیں کہ اس کا نام زبان سے لیتے ہوئے گھبراتی تھیں۔ اسے تو — اری او لڑکی! — اے لو تھے! — ادھر آ الٹا آنچل! کہہ کر پکارتی تھیں یا نام بھی لیتی تھیں تو بگاڑ کر اور "کلو" کہہ دیتی تھیں۔ اس لئے کہ وہ سانولی تھی۔ نانی اس کے سانولے رنگ کو ادھیا کہہ دیتی تھیں۔ لیکن آج انھوں نے "میری جمیلہ" کہہ کر اسے مخاطب کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شاید زندگی میں پہلی بار نانی سے چمٹ گئی تھی —!

غرض کہ نانی جو ہمیشہ اس سے ناراض رہی تھیں آج وہی اس کا دم بھرتی تھیں۔ مجال کیا کہ جمیلہ کو کوئی الٹی بات تو کہہ دے؟ نانی ٹھیلے چھاڑ کر کہتی تھیں۔ "ہاں بہن! الٹا آنچل تمہیں کیسے چبھنے لگا! — تم لوگ سیدھا آنچل پسند کرتی ہو جو دیکھنے میں سیدھا ہوتا ہے اور اندر اندر ٹیڑھا ہوتا ہے —!؟"

اب نانی کو یقین ہو گیا تھا کہ جس الٹے آنچل کو وہ منحوس کہتی تھیں وہ ان کی بھول تھی۔ دراصل الٹے آنچل میں جمیلہ کی جملہ طاقتیں اور بلندیاں پوشیدہ تھیں الٹا آنچل جمیلہ کے کردار و اقدار کا نشان تھا۔ اگر الٹا آنچل کھو جائے تب جمیلہ کا وجود ہی بیکار ہو کر رہ جائے گا۔ اب انھیں یہ سوچ کر دکھ ہوتا تھا کہ وہ جمیلہ کو برا بھلا کہتی رہی ہیں اس کے دل کو چرکے لگاتی رہی ہیں۔ اسی لئے وہ ہر نماز کے بعد اپنی مغفرت کی دعا کرتیں ساتھ ہی جمیلہ کے لئے دعائیں مانگا کرتی تھیں —!

ادھر جمیلہ کو سوچ کر کوفت ہوتی تھی کہ اس نے نانی کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔ نافرمانی کی ہے ستایا ہے۔ لہٰذا وہ اس کی تلافی نانی کو ہر طرح خوش رکھ کر کر رہی تھی۔

اس روز نانی کی خوشی بے ٹھکانہ تھی جب جمیلہ گود میں بچی کو لے کر گھر پہنچی اور اسے نانی کی گود میں لٹا دیا۔ نانی نے اسے چھ دعائیں پڑھ کر پھونکیں پھر اپنی گٹھری کھولی اور ڈبیہ سے ایک گنی نکال کر بچی کی ننھی سی مٹھی میں دے دی۔ دو گنیاں جمیلہ کو دیں۔ تعویذ بچی کی بانہہ پر باندھا اور چمکار کر پوچھا: "کیوں ری! تو بھی الٹا آنچل اوڑھے گی یا نہیں!؟" پھر خود ہی کہنے لگیں: "اوڑھنا ضرور اوڑھنا! سیدھا آنچل تو اب خاک میں مل گیا۔ لڑکیوں نے سیدھے آنچل کی ایسی تیسی کر دی۔ اچھا ہوا الٹے آنچل چلیں گے۔ سیدھے آنچل اپنی خوبیاں کھو چکے ..." جمیلہ نانی کے تبصرے سے بے انتہا خوش ہوئی۔ اس لئے کہ نانی نے الٹے آنچل کو خاص رخ عطا کیا تھا —!

جب نانی اور جمیلہ میں مفاہمت پیدا ہوئی۔ دونوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ تب نانی نے اچانک ایک دن سب سے منہ موڑ لیا۔ جمیلہ کے آنسو نہیں رکتے تھے وہی جمیلہ جو نانی سے خار کھاتی تھی آج وہی سب سے زیادہ نانی کے لئے اشکبار تھی —!

نانی کے جانے کے بعد زندگی کا ڈھانچہ ہی بدل گیا — جمیلہ کی ساس بھی دنیا سے کوچ کر گئیں اور ان کے مرتے ہی جیسے گھر کی

پھوٹ پڑا ہو سا آگیا۔ حالات تیزی سے بدلنے لگے اور دیکھتے دیکھتے ...ل ...سال میں چڑھا ہوا دریا ہی اتر گیا ___ تجارت میں مسلسل نقصانات نے گھر کی بنیادیں ہلا دی۔ جمیلہ کے شوہر نے گھبرا کر ہاتھ پیر مارنے شروع کردیئے لیکن ہر جگہ ناکامی کا روپ دھارنے ... بیماری تک کہ قرض بڑھتا گیا۔ اب نازک لمحات سامنے تھے ___ زندگی کے خدوخال سیاہ پڑ گئے تھے۔ جمیلہ کے اب امتحان کی گھڑیاں شروع ہوگئی تھیں۔ شوہر بیمار ہوکر اسپتال چلا گیا تھا۔ گھر میں اب وہ تنہا تھی۔ پیسہ بھی نہیں تھا۔ کٹھن منزل سامنے تھی جمیلہ گھبرائی گھبرائی سی تھی ___ دو ہی راستے تھے۔ فرار یا پھر زندگی کے لئے جدوجہد! جمیلہ نے محسوس کیا کہ اسے ڈوپٹہ آنچل کے امتحان کا اب وقت آگیا ہے۔ اسے آنچل پر وہ خود بھی حیران رہا کرتی تھی۔ اور سوچا کرتی تھی کہ روایات سے ہٹ کر مروجہ راستے سے کترا کر وہ نئی راہ نکالنے کے لئے بے چین کیوں ہے؟ کیا الٹا آنچل کسی خاص کردار کا غماز ہے یا یوں ہی مذاق ہے۔ اگر وہ کسی خاص فطرت کی نشان دہی کرتا ہے؟ تب اس کو ثبوت دینا پڑے گا اور تب اس نے دوپٹہ کو اتار کر کمر سے تو نہیں لپیٹا لیکن ذہنی طور پر اس نے کمر ضرور کس لی۔ زندگی کا اب ایک چھوٹا سا دروازہ کھلا تھا۔ اس کے شوہر کا ایک چھوٹا سا کارخانہ باقی رہ گیا تھا جو شوہر کی بیماری سے روز بروز گرتا جاتا تھا۔ لہٰذا اس نے کارخانے کی خود دیکھ بھال شروع کردی۔ جب وہ الٹا آنچل ڈال کر کارخانے کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے پہنچی تو اس کا استقبال حیرت زدہ نگاہوں سے ہوا لیکن اس نے ان متجسس نگاہوں کی پرواہ نہیں کی بلکہ اپنی صلاحیتوں کو نکھارتی رہی۔ صبح وہ تڑکے اٹھتی تھی۔ اسپتال کے لئے کھانا بھی تیار کرتی۔ بچی کو لے کر کھانا لے کر اسپتال جاتی۔ وہاں سے کارخانے کا رخ کرتی۔ پھر شام کو کارخانے سے اسپتال جاتی بعد گھر آکر بقیہ کام کرتی۔ وہ خود مشین بن گئی۔ اس کی صحت پر اثر پڑنے لگا لیکن عزم اور راسخ ہوگیا۔ اس نے والدین کی پیشکش قبول نہیں کی کہ وہ ان کے گھر آکر آرام کرے۔ اس کا اپنا گھر بسا ہوا ہو اسے کیسے چھوڑ دے ___! جب وہ کارخانہ پہنچی تھی

تب کارخانہ گھاٹے میں چل رہا تھا۔ اس نے آمدنی کی نگرانی شروع کی۔ کام کا جائزہ لیا۔ ادھر ادھر دوڑ لگائی تاکہ اس کو کام ملے اور کارخانے کا گھاٹا پورا ہو۔ اس جدوجہد و عزم نے اسے خود کو فراموش کردیا تھا البتہ اپنے شوہر اور بچی کو یاد رکھا تھا۔ چند ماہ کی تگ و دو میں وہ خود تو دبلی ہوگئی رنگ کالا پڑ گیا لیکن کارخانے کو اس نے جلا دیا اور اب وہ گھر ہی کے معاملات میں نہیں بلکہ بازار کے رموز بھی سمجھنے لگی تھی۔ جب ہی اس نے حالات ناموافق ہونے کے باوجود نئی مشین قسطوں پر حاصل کی اور کارخانے کو توسیع دی۔ اس کے لئے یہ بڑا اقدام تھا اور خطرناک لیکن وقت نے اس کی لگن کو کامیاب کیا۔

اس کا شوہر قریب دو برس بیمار رہا۔ کبھی نازک لمحے بھی آئے کہ یقین ہوگیا کہ وہ دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔ لیکن خدا نے اس کی مدد کی۔

جب وہ صحت یاب ہوکر گھر آیا تو توقع کے خلاف اس نے گھر میں زندگی کے نئے خدوخال دیکھے اور وہ یہ دیکھ کر بہت مسرور ہوا کہ ڈھائی برس میں اس کی بیوی نے کارخانے میں مزید اضافہ کیا ہے اور کام چوگنا بڑھ گیا ہے۔ وہ جمیلہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ جو آج بھی الٹا آنچل ڈالے مشین بنی ہوئی گھر اور باہر حرکت میں مصروف تھی۔ زندگی کی گاڑی کا بھی ایک پہیہ حرکت میں تھا۔ لیکن اس کے شوہر نے زیادہ انتظار نہیں کیا۔ اس لئے کہ دیکھ رہا تھا کہ ایک پہیہ گردش کرتے کرتے گھسنے کے قریب پہنچ چکا ہے ___!

پانچ سال بعد جب اس کی بچی نو برس کی ہوگئی۔ تب اس نے پہلی بار اسے دوپٹہ اوڑھایا اور عین اس وقت اس کی بچی نے مسکرا کر کہا: "امی! میں بھی الٹا آنچل ڈالا کروں؟" ہاں! اس نے مسکرا کر کہا: تمہاری پرنانی نے کہا تھا کہ سیدھا آنچل ... مل چکے ہیں اب الٹا آنچل زندگی کے نئے موڑ کی ... ہے" اسے یقین تھا کہ اگر آج نانی زندہ ہوتیں تو ... کر خوش ہوتیں ... آکر وہ خود ... آنچل ...

عوض سعید

آج اس کے ذہن کے دریچوں سے
بہت سی باتیں۔ بہت سی یادیں سر اٹھا
کے جھانک رہی تھیں۔ چاہت جب حد
سے سوا ہو جاتی ہے تو جا و بے جا امیدیں
سر نکالا کرتی ہیں یہی حال کچھ جمیل بھائی کا تھا

رات کے آخری سسکتے ہوئے لمحوں میں کوئی اسے دونوں شانوں سے جھنجھوڑ رہا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن اسے احساس ہو رہا تھا جیسے کوئی اسے جگا رہا ہے۔ اس پر کچھ جاگنے اور سونے کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ آج ایک طویل سفر سے لوٹ کر گھر آیا تھا۔ نیند کا وہ ہچکولا جس میں وہ کسی معصوم بچے کے مانند میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ اچانک شاہدہ کی چیخ سے نیچے آ رہا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا بیڈ لیمپ کی مدھم روشنی میں شاہدہ کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ سہمی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ڈر اور خوف نے اس کی زبان پر تالے ڈال رکھے تھے۔ وہ کچھ دیر اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی اور پھر اچانک اس سے ایسے لپٹ گئی جیسے کوئی اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خالد سے جدا کرنا چاہتا ہو۔ اس کا دل اب بھی بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ خود بھی ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ "شاہدہ تم ڈر گئی ہو۔ دیکھو یہاں کوئی بھی تو نہیں ہے۔ کچھ کہو میری جان تمہیں آخر ہو کیا گیا ہے۔" مگر اس کی زبان ساکت تھی۔ پتہ نہیں اس کے ذہن میں کیا بات آئی کہ اس نے زور سے شاہدہ کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ اور شاہدہ نے بدقت تمام صرف اتنا کہا: "حمام میں کوئی نہا رہا ہے۔"

وہ جو اپنے آپ کو کافی نڈر سمجھتا تھا اس جملے کو سن کر کانپ گیا۔ تھوڑی دیر پہلے گھر کی فضا [illegible] سماعت لگا رہی تھی۔

اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے واقعی نل کی ٹونٹی کھول دی ہو۔ اب اسے واضح طور پر احساس ہو رہا تھا جیسے کوئی شخص حمام میں گھسا نہا رہا ہے اور باضابطہ جسم پر صابن کا جھاگ اٹھاتا ہوا پانی سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ لمحہ لمحہ سردی کے باعث اس کے منہ سے شو شو کی آواز نکل رہی ہے۔ اس نے خود پر قابو پانے کی شعوری کوشش کی۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا حمام کی دیوار سے لگے ہوئے تار پر سے ایک ہاتھ آگے بڑھا اور اچانک شرٹ تار پر سے غائب ہو گیا۔ وہ بت بنا کھڑا رہا۔ "ارے بھئی خالد کھڑے کھڑے کیا تماشہ دیکھ رہے ہو میں سردی سے مرا جا رہا ہوں ذرا تولیہ تو دو"۔ اس کے قدم جیسے زمین میں دھنس کر رہ گئے۔

یہ اس کے بڑے بھائی سے ملتی جلتی آواز تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

صبح جب وہ بستر سے بیدار ہوا تو شاہدہ اس سے کہہ رہی تھی۔ "رات کو نیند میں آپ کافی بڑبڑا رہے تھے۔ میں تو مارے خوف کے آپ سے لپٹ گئی تھی۔" وہ بڑی دیر تک اپنی آنکھوں کو ملتا رہا۔ اس نے اپنے اطراف و اکناف کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ سیدھا اٹھ کر بیڈ روم سے باہر آیا۔ شاہدہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ سفید شرٹ حمام کی دیوار سے لگے تار پر لٹک رہا تھا اور نل کی ٹونٹی بدستور کھلی ہوئی تھی۔ "کیا رات تم نے حمام میں کچھ کپڑے دھوئے تھے؟" اس نے شاہدہ

"مجھے یاد ہے میں نے کل کھڑکی بند کر دی تھی۔ شاید کسی نوکر کے باعث وہ کھل گئی ہو۔"

"بہت پہلے شاید سات کی عمر میں ڈر گیا تھا۔ یہ خوف بھی عجیب شے ہے۔ یہ خوف پتہ نہیں انسان کا تعاقب کب تک کرتا ہے۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ گھپ اندھیری راتوں میں تنہا کسی بھوت کی مانند گھومتا پھرتا رہوں۔ لیکن مجھ جیسے نڈر آدمی کو بھی اس وقت خوف کے سامنے نے ڈرا دیا۔"

"ہو سکتا ہے آپ کے لاشعور میں موت کے خوف نے کسی طرح جگہ پالی ہو۔ ورنہ آپ جیسا بہادر آدمی یوں نہ گھبراتا۔" شاہدہ نے کسی ماہر نفسیات کی طرح کہا۔

"موت سے تو سب ہی ڈرتے ہیں۔ کیا تمہیں موت سے خوف نہیں آتا؟"

"نہیں۔ ذرہ برابر بھی نہیں۔ میں انسانوں سے گھبراتی ہوں خاص طور سے آپ کے بڑے بھائی سے۔ جن کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر پہلی بار مجھے وحشت کا سا احساس ہوا تھا۔"

"تمہیں بھائی جان سے خواہ مخواہ کد سی ہو گئی ہے۔ ان بے چاروں کا مدت سے کوئی خط بھی نہیں آیا۔ بہت دنوں پہلے سارنگ پور سے آنے والے ایک کنٹریکٹر نے مجھے اطلاع دی تھی کہ وہ آج کل بیمار رہنے لگے ہیں اور ان کی صحت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن ملازمت کی مصروفیت ایسی ہے کہ مجھے بھائی جان کو جا کر دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ لیکن یہ احساس ہی کیا کچھ کم ہے کہ میں آج نہیں تو کل ان سے ملنے سارنگ پور ضرور جاؤں گا۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس بھاگتی دوڑتی زندگی کی مصروفیت اس احساس کا بھی گلا نہ گھونٹ دے۔"

"چلیے، میں نے ناشتہ میز پر لگا دیا ہے۔" شاہدہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے پلیٹوں پر نظر دوڑائی۔ سب سے پہلے اس نے آملیٹ کے ٹکڑے اٹھائے پھر تھوڑے سے توقف کے بعد وہ جیلی سلائس پر لگا کر کھانے لگا۔

"چیف انجینئر نے آپ کے ناشتہ ختم کرنے ... "

"تمہارا ساتھ تو جنم جنم کا ہے۔ مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔ چیف انجینئر نے بلوایا ہے۔"

"چیف انجینئر سے آپ اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟" شاہدہ نے اس پر چوٹ کی۔ "وہ میرا باس ہے۔ اس لئے ڈرنا ہی پڑتا ہے۔" وہ چاہتا تو یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ یہ اس کی ڈیوٹی ہے۔

اس نے تیزی سے اسکوٹر نکالا اور شاہدہ کے کانوں نے اسکوٹر کی گڑگڑاہٹ سنی پھر یہ آواز آہستہ آہستہ فضا میں گونجتی ہوئی اچانک غائب ہو گئی۔

پھر وہ کمرے سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آئی۔ بڑی دیر تک مختلف زاویوں سے اپنے چہرہ کا جائزہ لیا۔ شیشے میں آنے والے عکس نے جیسے چغلی کھائی۔

پگلی تو تو خاصی خوب صورت ہے۔

شام کو جب وہ گھر لوٹا تو شاہدہ نے بڑی بے چینی سے کہا

"HOW GREEN WAS MY VALLEY" کا آخری دن ہے جلدی منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ چل کر پکچر دیکھیں گے۔"

"شاہدہ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور میرا موڈ بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"سنا ہے بڑی خوب صورت پکچر ہے دیکھ لو گے تو موڈ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ چلئے نا پلیز۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں میں حمائل کر دیئے۔ پھر چار و نا چار خالد کو سپر ڈالنی ہی پڑی۔

جس وقت وہ سینما ہال میں داخل ہوئے تو پردہ پر سلائڈ دکھائی جا رہی تھی۔ شاہدہ خوش ہو گئی کہ اسے شروع سے پکچر دیکھنے کو مل رہی ہے۔ لیکن خالد کا عالم کچھ اور ہی تھا وہ تو صرف شاہدہ کی خوشنودی کے لئے یہاں با دل ناخواستہ آیا تھا۔

شاہدہ پکچر دیکھنے میں کچھ ایسی محو تھی کہ اسے بغل میں بیٹھے ہوئے خاوند کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔ تھوڑی دیر بعد جب شاہدہ نے دیکھا تو خالد اونگھ رہا تھا۔

خودکشی کی۔

"دیکھو یہ کیسا آدمی ہے اسے اب بھائی یاد آیا ہے"

اسے یوں لگا جیسے سر بازار کسی نے اس کا منہ نوچ لیا ہو۔

جمیل بھائی بستر پہ نیم بیہوشی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے وہ ہڈیوں کا ایک پنجر ہو کر رہ گئے تھے۔ اسے اپنے بھائی کو اس عالم میں دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ آج اس کے ذہن کے دریچوں سے بہت سی باتیں۔ بہت سی یادیں سر اونچا کئے جھانک رہی تھیں۔

جب اسے شروع شروع ملازمت ملی تھی۔ اس وقت جمیل بھائی کی مالی حالت بڑی خستہ تھی۔ بھابی مر چکی تھیں۔ وہ تیمور اور ببلو کو لے کر چند دنوں کے لئے اس کے ہاں آگئے تھے۔

جب چاہت حد سے سوا ہو جاتی ہے تو جا بے جا ایسی ہی سرزنشا کرتی ہیں یہی حال کچھ جمیل بھائی کا تھا.... اور.... وہ خود کو جیسے ننگا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"اچھا ہوا تم آگئے ورنہ یہ خلش بھی میرے ساتھ دوسری حسرت ہوتی کہ تم مجھے دیکھنے نہیں آئے [illegible] فکر نہیں۔ مجھے ذہن اتنی ہے کہ میرے اللہ جانے کے بعد تیمور اور ببلو کا کیا حال ہوگا میں تم سے کیا توقع رکھ سکتا ہوں۔ تم تو ایک بیماری کے دوران نے مجھے نہلانے کے لئے کسی وقت تولیہ تک نہیں دیا تھا۔"

ایسا لگتا تھا جیسے وہ یہ کہے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

پھر وہ ٹیکسی میں ایسے آگیا جیسے مدت سے سویا نہ ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور جو اسٹیرنگ پہ ہاتھ رکھے اونگھ رہا تھا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ڈرائیور کار تیز چلاؤ ـــ اور تیز

موٹر کی سوئی ساٹھ اور ستر میل کے درمیان بھاگ رہی تھی لیکن وہ اس رفتار سے مطمئن نہیں تھا اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے موت اس کا تعاقب کر رہی ہو اگر وہ ہلکے دھوئیں پہ اڑتا ہوا فوری گھر نہ پہنچا تو آ دبوچے گا۔

علی احمد شاہدی

خزاں کا پھول

بھائی جان بہت خوش تھے لیکن وہ بات کا اس کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن ان کے چہرے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار لوٹ رہی ہے اور ان کی منزل ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر ہے!

ہم ابھی ابھی بھائی جان کو لحد میں اُتار کر قبرستان سے واپس ہوئے ہیں اور ان کی بھیانک اور ڈراؤنی آنکھوں کا منظر جیسے ہمارے دل میں ترازو ہو کر رہ گیا ہے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے وہ خالی خالی حلقۂ چشم ہیں جن میں رونق کے پھاہے کے سوا کچھ نہ تھا اور جن میں سے آنکھوں کے ڈھیلے نکال لئے گئے تھے۔ ماحول انتہائی سوگوار ہے۔ بہنوں کی آنکھیں ساون بھادوں کا منظر پیش کر رہی ہیں۔

جانے بھائی جان کو کس کی نظر کھا گئی۔ آخری وقت میں ان کی صحت بہت گر گئی تھی۔ چہرہ اتنا مسخ ہو گیا تھا کہ ان کی جوانی کی تصویروں سے چہرہ بالکل ملتا ہی نہ تھا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو بھائی جان کو نوکری کرتے دیکھا۔ وہ صبح ساڑھے چھ بجے روکھی سوکھی کھا کر اور ایک پیالی چائے کی پی کر اپنی سائیکل پر دفتر کے لئے روانہ ہو جاتے تھے۔ انکی فیکٹری شہر سے پندرہ میل دور تھی۔ بھائی جان نے ابھی میٹرک کیا ہی تھا کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ پہلے ہی داغِ مفارقت دے چکی تھیں۔ بھائی جان گھر میں سب سے بڑے تھے۔ ساری ذمہ داریاں ان کے سر آ پڑی تھیں۔ اس لئے انہوں نے نوکری کر لی۔

میں ابھی تک نہیں بھولا ہوں اس وقت بھائی جان کے چہرے پر گیندے کے پھول کی سی بہار تھی۔ چہرہ بھرا بھرا، رنگت گوری جسم گول مٹول، آنکھوں میں جوانی کی روشنی ہونٹوں پر ایک خاص متانت بھری، پُر وقار مسکراہٹ۔ اور یہ مسکراہٹ بھائی جان کے ہونٹوں کی ابدی مسکراہٹ بن گئی تھی، انہوں نے کبھی شکست کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔

بھائی جان کے علاوہ ایک میں اور تین بہنیں تھیں جن کی کفالت کا بوجھ بھائی جان کے سر آ پڑا تھا۔ انہوں نے اپنی غذا بہت کم اور معمولی کر دی تھی اور لباس بھی ہلکا پھلکا پہننے لگے تھے انہیں ہماری تعلیم سے گہرا لگاؤ تھا۔ کہتے تھے تم لوگ لائق ہو جاؤ تب ہی چین کی نیند سو سکوں گا۔

جب شہناز باجی نے ایف ایس سی میڈیکل کیا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے ہر کو یہ خبر سناتے پھرتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے شہناز کو اداس دیکھا تو پریشان ہو گئے اور پوچھا "خوشی کے موقع پر تم اداس کیوں ہے؟"

شہناز باجی نے اپنی لمبی پلکیں اٹھائیں "بھائی جان میڈیکل تو میں نے اس لئے کیا تھا کہ ایم بی بی ایس کروں گی۔ پھر ...

بھائی جان نے بات کاٹ کر کہا تو فکر کیوں کرتی ہے میں ...

بہت پارسا تھا [illegible]
اور پھر بھائی جان نے پارٹ ٹائم کام بھی تلاش کر لیے
وہ شام کو گھر پر ٹیوشن پڑھاتے۔ سویرے دفتر سے پارٹ ٹائم کے لیے
چلے جاتے اور رات گئے گھر واپس ہوتے۔ ہم اتوار کو انہیں دیکھتے تو
اپنا دل مسوس کر رہ جاتے —— بھائی جان کے چہرے کا رنگ
زرد پڑ گیا تھا۔

ہم تینوں بہنیں اکثر چھپ چھپ کر ان کے حال پر آنسو بہاتے
وہ کس بیدردی سے ہماری خاطر اپنی جوانی کو خاک میں ملا رہے تھے
بھائی جان کے سامنے کبھی ہم آنسو نہ بہاتے۔ وہ ہماری آنکھوں میں آنسو
نہیں دیکھ سکتے تھے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا کہ شہناز باجی نے ایم بی بی ایس کر لیا
ریحانہ آپا بی اے بی ایڈ ہو گئیں اور شاہینہ نے دستکاری میں ڈپلوما
لے لیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی بھائی جان کی صحت گر گئی تھی وہ بہت
کمزور ہو گئے تھے۔

شاہینہ، شہناز باجی اور ریحانہ آپا نوکر ہو گئیں۔ گھر میں
خاصی خوشحالی آنے لگی۔ چنانچہ تینوں بہنوں نے بھائی جان سے کہا کہ وہ
اب پارٹ ٹائم چھوڑ دیں تو وہ مسکرا کر بولے —— "پگلیو! تم
لڑکیاں ہو۔ یہ تمہاری خوشی ہے کہ نوکریاں کر کے کما رہی ہو۔ اپنے لیے
رکھو جہیز کے لیے۔ ابھی تو شہنائیاں بجیں گی۔ تمہارے ہاتھ بھی تو پیلے
کرنے ہیں" —— تینوں بہنیں شرما گئیں۔ وہ ہنستے رہے اور ان
کی سیاہ ہوتی ہوئی رنگت اور جھریوں والے چہرے سے مسرت
کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں ——

بھائی جان نے بہنوں کے ساتھ مل کر چار پانچ سال میں
اچھی خاصی رقم پس انداز کر لی۔ ایک روز بولے "شہناز ریحانہ
شاہینہ تینوں ادھر آؤ —— دیکھو جب تم بابل کے گھر کو دل میں بسا کر
چلی جاؤ گی پھر تمہارا بھائی تمہیں بلایا کرے گا اور تم سوچو گی کاش
ہمارے بھائی جان کا کوئی اپنا مکان ہوتا اور تمہارے سسرال والے
[illegible] ہوتے۔ پھر میرا دل دکھے گا —— اس لیے
میں نے ایک پلاٹ سوسائٹی میں لے لیا ہے۔ کچھ اپنے پاس لگاؤں گا
کچھ بینک سے قرض لوں گا اور تمہارے لیے ایک گھر بنوا دوں گا جو
اپنا ہو گا بہنو"

یہ سن کر تینوں بہنیں شرما گئیں لیکن ساتھ ہی مسرور
ہو گئے لبوں پر مسکراہٹوں کی کلیاں چٹک گئیں —— اور جس
دن ہم بھائی جان کے مختصر لیکن خوبصورت مکان میں منتقل ہوئے
تو جیسے ان کے دل میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں خوشی سے دیوانے
ہوئے جاتے تھے۔ ایک ہی سال کے مختصر عرصے میں بھائی جان نے
تینوں بہنوں کو بیاہ دیا اور اس گھر میں [illegible] بھائی اکیلے رہ
گئے۔ دن اب بڑے ہموار اور پرسکون گزر رہے تھے۔ بھائی جان نے
بھی جیسے برسہا برس کی جانفشانی کے بعد اب اطمینان کا سانس
لیا تھا کہ ایک روز تینوں بہنیں [illegible] آ دھمکیں
بھائی جان اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے
تھے۔ ان تینوں کو اچانک اکٹھے دیکھا تو کتاب رکھ کر اٹھ کھڑے
ہوئے ——

"ارے بھئی یہ قافلہ آج کیسے نکل پڑا؟"

شہناز باجی بولیں۔ "بھائی جان اس قافلہ کی منزل
آج آپ ہیں"

بھائی جان مسکرائے۔ "آؤ بھئی آؤ! مجھے تمہاری منزل
ہونے سے کب انکار ہے"

ریحانہ نے لقمہ دیا۔ "بھائی جان ہم آج انکار سننے
نہیں آئے ہیں"

"ارے بھئی کچھ کہو بھی یا معمہ میں بات کیے جاؤ گی"

شاہینہ چہکی۔ "دیکھیے بھائی جان پہلے وعدہ کیجیے کہ آپ
ہماری بات مان لیں گے"

بھائی جان نے کہا۔ "پہلے تم لوگ اپنی بات تو کہو"

"اب آپ تمام فرائض سے سبکدوش ہو چکے ہیں" شہناز
نے کہا اور پھر فوراً ریحانہ باجی بولیں۔ "بھائی جان! بات دراصل
میں یہ ہے کہ ہم بھابی لانا چاہتے ہیں۔ گھر [illegible] سونا سونا لگتا ہے"
بھائی ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ان کے چہرے پر ایک تاثر

لمحے پہلے تک بھائی جان اب کتنے بوڑھے لگنے لگے تھے۔ ان کی کن پٹیوں اور پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی چہرہ پر جھریوں کی لکیریں کثرت سے ابھر آئی تھیں۔ رنگ جل کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ ہنستے تھے تو سامنے ٹوٹے ہوئے دانتوں کا خلا دکھائی دیتا تھا۔ ہم پہلے کبھی ان میں اتنی تبدیلی محسوس نہ کر سکے تھے اس لئے کہ وہ پہلے کبھی ہمارے سامنے سنجیدہ ہو کر بیٹھے ہی نہ تھے بس مسکراتے رہتے تھے۔ اور مسکراہٹ بہت حد تک ان تبدیلیوں پر پردہ ڈالے رہتی تھی۔ آخرکار بھائی جان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود کر آئی اور جیسے وہ بہت دور سے بولے۔ "اچھا بھئی! اگر تم سب کی خوشی یہی ہے تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔"

تینوں بہنوں نے اس کام کیلئے ہمارے رشتے کے چچا شرافت علی کی خدمات حاصل کیں اور وہ بڑی تگ و دو کے بعد ایک مناسب رشتہ ڈھونڈ لائے۔ بھائی جان کو دیکھنے کے لئے لڑکی والوں نے ہمارے گھر آنے کا مطالبہ کیا۔ ہم اس شرط کو مان گئے اور اتوار کے دن انہیں بلا بھیجا۔ بھائی جان بہت خوش تھے لیکن وہ زبان سے اس کا اظہار نہیں کر رہے تھے لیکن ان کو خوش دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ بھائی جان کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار لوٹ رہی تھی۔ ان میں اب اپنی راہ بدلنے کی امنگ پیدا ہو گئی ہے اور ان کی منزل ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر ہے جس میں قہقہے گونجیں گے۔

شام کو بھائی جان کی ہونے والی سسرال سے چند عورتیں اور مرد کاروں میں ہمارے گھر پر آ کر اترے۔ شرافت علی چچا اور ننھے ماموں نے ان کا استقبال کیا۔ عورتوں میں تینوں بہنوں، چچی اور ممانی نے مہمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بھائی جان نے اس دن کئی برس بعد سوٹ زیب تن کیا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں سب کے ساتھ محفل میں جا بیٹھے۔ وہ اس وقت بڑے پُروقار بڑے متین اور بڑی شش شخصیت کے مالک لگ رہے تھے۔ بس ایک ان کے بہرے۔ ریال تھیں اور سر کے کھچڑی بال جو ان کی پُرمشقت زندگی کی کہانی کہہ رہے تھے۔ مہمانوں سے بڑے دوستانہ پُرخلوص ماحول میں

اور ہم سب لوگوں پر اپنے اخلاق محبت و شرافت کا بڑا اچھا تاثر چھوڑ گئے ـــــ

لیکن پہر دکھائی کے بعد ان لوگوں نے مکمل خاموشی اختیار کر لی جب یہ خاموشی ناگوار حد تک طویل ہو گئی تو شہناز باجی نے شرافت چچا کو بلا بھیجا اور کہا کہ آج ہی صاف جواب لڑکی والوں کی طرف سے لائیں شرافت چچا گئے اور جب لوٹے تو ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ سر جھکائے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر بولے۔ وہ لوگ کہتے ہیں: "لڑکا بہت اچھا ہے آپ لوگ بھی نہایت اعلیٰ خاندان سے ہیں۔ بس ایک کمی ہے لڑکے میاں کہ وہ بڑھاپے کی سرحد میں قدم رکھ رہا ہے اور ہماری لڑکی کی عمر اتنی نہیں ہے۔"

ہم سب یہ سن کر جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سب کو ایک چپ لگ گئی۔ شاہینہ بڑی جذباتی ہے وہ پیروں سے فرش کریدتے کریدتے رو پڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی صوفے پر جا گری ـــــ شہناز لبا پر دبا رہے چاچا سے بولی ـــــ خیر چچا جو کچھ ہوا سو ہوا اب یہ خیال رکھئے کہ بھائی جان کے کانوں تک یہ بات نہ پہنچے" لیکن بُری خبریں بھلا کہاں مخفی رہتی ہیں۔ یہ بات بھی پر لگا کر اڑی۔ ننھے ماموں کی زبان کون روک سکتا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے سنا جھٹ اچکن سنبھال بھائی جان کے دفتر جا پہنچے اور ان سے سب کچھ کہہ ڈالا اور اس شام جب بھائی جان دفتر سے لوٹے تو وہ ہمارے بھائی جان نہ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی دائمی مسکراہٹ ان کے لبوں سے آج روٹھ گئی تھی۔ ان کے چہرے پر مایوسی اور اداسی کے سائے تھے۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر بہنوں کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہمیں یقین تھا کہ چند روز کے بعد بھائی جان اس غم کو فراموش کر دیں گے اور ان کی وہ ابدی و ازلی مسکراہٹ پژمردہ ہونٹوں پر لوٹ آئے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بھائی جان کو چپ لگ گئی تھی وہ کسی سے بات نہ کرتے زبان بند ہونٹ سلے ہوئے چہرے پر غم و اندوہ کی پرچھائیاں!

شہناز باجی کا یہ حال دیکھ کر سراسیمہ ہو گئیں اور ایک دن

موتی پکڑ ان کے گرد جھنجھوڑ گئی۔ وہ بستر پر بیٹھا ہوا شیشے کی چھت کو گھور رہے تھے۔ اُسے [illegible] اٹھ بیٹھے ــــــ "کہو شہناز" اور اس کے جواب میں شہناز نے سب کچھ کہہ ڈالا ــــــ مگر ان باتوں کے جواب میں صرف بھائی جان نے ایک فقرہ کہا ــــــ "میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں شہناز ــــــ مجھے زندگی سے کیا لینا" شہناز مایوس ہو کر واپس آگئی ــــــ

ایک رات جب ہم سب لان میں بیٹھے تھے۔ بھائی جان اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے کہ ان کراہنے کی آواز آئی۔ ہم سب بھاگ کر گئے ــــــ بھائی جان سینہ کو ہاتھ سے دبائے لیٹے تھے ــــــ "میرے سینے میں شدید درد ہے شہناز" اور پھر وہ بے ہوش ہو گئے ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ پڑوسیوں کے گھر سے ڈاکٹر کو فون کیا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ آیا۔ انجکشن دیا۔ مکمل آرام کا مشورہ دیا ــــــ کہنے لگا ــــــ "انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ احتیاط کیجئے" ــــــ

بھائی جان چند ہفتوں بعد اٹھ کھڑے ہوئے لیکن دل نے زیادہ مہلت نہ دی اور ایک رات پھر دل کا ویسا ہی دورہ پڑا۔ اب کے بھائی جان کو صبح تک ہوش نہ آیا۔ ہم نے انہیں اسپتال میں داخل کر دیا۔ صبح کے وقت انہیں ذرا سا ہوش آیا۔ آنکھیں کھولیں اور سب کو دیکھا۔ شہناز کو اشارہ کیا کہ قریب آؤ۔ وہ ان پر جھک گئی۔ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولے "مجھے ایسا لگتا ہے میں اب بچ نہیں سکونگا میرے بریف کیس میں ایک معاہدہ دستخط کیا ہوا رکھا ہے اُسے میرے مرنے سے پہلے پڑھ لینا اور اس پر عمل کرنا" ــــــ شہناز کی ہچکیاں بندھ گئیں ــــــ "ایسا نہ کہیئے بھائی جان ــــــ ایسا نہ کہیئے"

شام تک بھائی جان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ جانکنی کا عالم دیکھ کر شہناز باجی کی ہدایت پر میں گھر آیا اور بھائی جان کے بریف کیس کے چھوٹے پاکٹ سے ایک فارم ملا جو مکمل تھا۔ اس کے ساتھ ایک پرزہ بھی بھائی جان کا لکھا ہوا تھا ــــــ "میں نے اپنی آنکھیں آئی بینک میں دینے کا معاہدہ کر لیا ہے۔ یہ اس کا ہی فارم ہے۔ میرے مرنے کے بعد میری آنکھیں نکال لی جائیں تا کہ [illegible] آئی بینک کے حوالے کر دی جائیں" ــــــ

وصیت کے مطابق بھائی جان کی آنکھیں نکال لی گئیں اور حلقۂ چشم میں سفید روئی کے پھائے رکھ دیئے گئے۔ شہناز باجی پچھاڑیں کھا کر بے ہوش ہو گئیں اور شاہینہ غش پر غش کھاتی رہی، ریحانہ کے آنسو اس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے ــــــ اور مجھے جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

بھائی جان کے وہ خالی خالی حلقۂ چشم آج بھی ہماری آنکھوں میں تازہ ہیں اور ہم اس شخص کو دیکھنے کے لئے مضطرب ہیں جس کی آنکھوں میں بھائی جان کی آنکھیں ڈالی گئی ہیں ــــــ کیا وہ آنکھیں اب بھی ویسی ہی اداس ہیں اور کیا وہ آنکھیں اس دنیا میں اب بھی کچھ تلاش کر رہی ہیں؟ ــــــ

نئی نسل

کے نوجوان اپنی پچھلی نسل سے حیاتیاتی ارتقائے ذہنی کے تحت زیادہ ذہین اور باشعور ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی اعلیٰ تعلیم، غیر ملکی علوم و فنون سے رابطہ کی آسانیاں اور حالیہ سائنسی معلومات و اختراعات سے مستفید ہونے کے باعث اپنے تخلیقی اذہان کے بہاؤ کے لئے سمتیں تلاش کرنے لگے۔ ترقی پسند نظریہ ادب انہیں مضحکہ نظر آیا، ساتھ ہی ناسازگار و منتشر پرورش ماحول اور کرب و بلا میں گھری حیات انسانی سے ان کی نگاہیں اور بالغ شعور نہ صرف متاثر بلکہ مجروح بھی ہوا۔ عالم سراسیمگی میں انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور وہ دروں بینی کی جانب رجوع ہو گئے۔ ان کی گفتگو میں خود کلامی پیدا ہو گئی اور بالعموم نتیجہ مروجہ تکلم سے ہٹ کر اپنی شعری تخلیقات کے لئے نیا انداز منتخب کر لیا اور اردو شاعری میں ترقی پسندی کی جگہ جدیدیت کے تازہ لفظ جیسے [illegible] بحث کی بات چل نکلی۔

ڈاکٹر [illegible] عظیم آبادی

[illegible]

تابش دہلوی

یہ دلِ وحشی نہ صحرا سے نہ بن سے لائے ہیں
ہم غزالوں کی محبت بھی ختن سے لائے ہیں

زخم ہائے نو بہ نو ہیں حاصلِ فصلِ بہار
کتنے تازہ پھول ہم صحنِ چمن سے لائے ہیں

ہم بھی اس کے آشنا ہیں سلسلے ہجومِ نوبہار
رنگ و بو یہ پھول جسکے پیرہن سے لائے ہیں

ہے اشارت بھی عبارت، خامشی بھی گفتگو
یہ سخن سنجی ہم اک جانِ سخن سے لائے ہیں

وائے محرومی کہ غربت بھی نہ راس آئی ہمیں،
اپنی یہ غربت بھی گویا ہم وطن سے لائے ہیں

شاید اندازہ نہیں ہے تجھکو اے دشتِ جنوں
کتنی نارفتہ بہاریں ہم چمن سے لائے ہیں

ہم اکیلے ہی نہیں آتے ہیں تیری بزم سے
آج تو تجھکو بھی تیری انجمن سے لائے ہیں

موت کو عمرِ ابد جانا ہے، یہ تشبیہ تام!!
ہم قد و گیسو سے یا دار و رسن سے لائے ہیں

ایک دل ہے اور تابش رنجِ الفت کا ہجوم
ہم یہ تنہائی کسی کی انجمن سے لائے ہیں

شاعر لکھنوی

ابر جس رہ سے برستا گذرا
دل اسی راہ سے پیاسا گذرا

جانے کس رنگ میں آئی تھی بہار
پھول پر زخم کا دھوکا گذرا

کہہ سکیں ہجر ہی جس کو نہ وصال
اپنا دل پہ وہ لمحا گذرا

خشک سمجھے تھے جنھیں اہل نظر
اکثر ان آنکھوں سے دریا گذرا

ساتھ تھے سیکڑوں سائے پھر بھی
میں رہ عشق سے تنہا گذرا

تیرے یا تیرے تصور کی چمک
شمع سی کوئی جلاتا گذرا

دیر تک ایک تری یاد کے بعد
شام آئی نہ سویرا گذرا

دل سے گذری وہ نظر اے شاعر
یعنی دیوار سے سایا گذرا

پروفیسر شاہد عشقی :

○

صبحِ طرب میری آنکھوں میں خواب کئی لہرائے تھے
شامِ الم کے ساتھی لیکن بڑھتے پھیلتے سائے تھے

ایک تمہارے پیار کی خاطر جگ کے دکھ اپنائے تھے
ہم نے اپنے ایک دیپ سے کتنے دیپ جلائے تھے

صرف جوانی کے کچھ دن ہی عمر کا حاصل ہوتے ہیں
اور جوانی کے یہ دن بھی ہم کو راس نہ آئے تھے

یوں بھی اپنا عہدِ جوانی خواب تھا دلکش چہروں کا
اور غبارِ وقت نے تو وہ چہرے بھی دھندلائے تھے

حسن کو ہم نے امر کہا تھا، پیار کو سچا جانا تھا
ایک جوانی کے کس بل پر سارے سچ جھٹلائے تھے

اس کے بنا جو عمر گذاری بے مصرف سی لگتی تھی
اس بے مہر سے دل کو لگا کر بھی ہم ہی پچھتائے تھے

بے مہری کی تہمت بھی ہے مہر و محبت والوں پر
اُسی ہوا نے مرجھاتے ہیں جس نے پھول کھلائے تھے

غرق بادۂ ناب ہوئے وہ چاند سے چہرے پھول سے جسم
ہم نے جن کی یاد میں عشقی جام کبھی ٹکرائے تھے

ڈاکٹر شمیم حنفی

○

لرزیدہ لمحوں کے قصے، بس یونہی دوہراتے رہنا
وحشی رات کے سناٹے کو، پلکوں سے بہلاتے رہنا

میں اپنے سائے میں ڈھل کر، آنکھوں کی کھڑکی سی جھانکوں
تم سورج کے چھپ جانے پر گھر کو آگ لگاتے رہنا

صحرا کی پیاسی خاموشی، پل دو پل کو سو جائے گی
تم اس راہ سے جب بھی گذرو، زہر صدا ٹپکاتے رہنا

میرا کیا، اس قید سے چھٹ کر، ایک معمہ بن جاؤں گا
تم مصروفِ تماشا ہو کر، یہ گتھی سلجھاتے رہنا

○

کچھ رات بھی سیاہ تھی، دل بھی اداس تھا
پھر بھی گماں یہ ہے کہ کوئی آس پاس تھا

تنہائیاں سی رینگ رہی تھیں نشیب میں
میں تھا فرازِ غم پہ مگر خود شناس تھا

کتنے اُجاڑ لفظ پڑے تھے چہار سمت
میرا وجود مجھ سے سوا بے لباس تھا

ہر بوند سنگ و خشت میں ڈھلتی چلی گئی
ہر شخص اس فضا میں بہت بدحواس تھا

احمد ہمدانی

○

کب اس سے فرق مگر چاہتوں میں پڑتا ہے
یہ بات سچ ہی سہی کوئی ہم سے روٹھا ہے
ترے کرم سے بھی آخر رہیں گے کے دن خوش
یہ زندگی ہے یہاں زندگی کا دھوکا ہے
دلوں کے کرب سے لیکر لبوں کی نغمے تک
ہزار موڑ ہوں کب راستہ بدلتا ہے
کٹی ہے عمر محبت کی جب کہیں جا کر
ملا یہ درد جو رہ رہ کے آج اٹھتا ہے

کہاں وہ ہجر سمجھتا تھا دل جسے اپنا
سہے گا قرب بھی کے دن کبھی یہ سوچا ہے

فرید جاوید

○

میکدے کے سوا ملی ہے کہاں
اور دنیا میں روشنی ہے کہاں
آرزوؤں کا اک ہجوم سہی
فرصتِ شوق کھو گئی ہے کہاں
جتنے وارفتہ سفر ہیں ہم
اتنی راہوں میں دلکشی ہے کہاں
ساتھ آئے کوئی کہ رہ جائے
زندگی مُڑ کے دیکھتی ہے کہاں

خوش ادا سب ہیں آشنا جاوید
اپنی آوارگی چھپی ہے کہاں

محسن بھوپالی

○

نعرۂ حق نہ سنیں اتنے تو مدہوش نہیں
لاکھ خوابیدہ سہی رند گراں گوش نہیں

یہ سکوتِ لبِ اظہار یہ بے حرف صدا
مصلحت گنگ سہی فکر تو خاموش نہیں

یہ گریباں ہے کہ یہ طوقِ گلو ہے کیا ہے؟
اے جنوں تو ہی بتا مجھکو تو کچھ ہوش نہیں

کیا بلا ہے شبِ غم ان کو بھلا کیا معلوم
زندگی جن کی مصائب سے ہم آغوش نہیں

راہِ پُرخار کو گلنار بنا رکھا ہے
میری دیوانگی احسان فراموش نہیں

لطفِ ساقی کا بہر گام ہے شہرہ محسن
میکدے کا ہے یہ عالم کوئی مے نوش نہیں

قمر اقبال

○

اُس کے مکتوبات سارے اسکی تحریریں تمام
آج ہم کر آئے واپس اس کی تصویریں تمام

دل کی اس سونی گلی میں قتل ہو جائیں نہ ہم
ہیں برہنہ آج پھر یادوں کی شمشیریں تمام

ایک دن قیدی مضامیں کے رہا ہو جائیں گے
ٹوٹ کر گر جائیں گی لفظوں کی زنجیریں تمام

تیز چلیئے گا ذرا بازار ہے یہ رات کا
بھیڑ میں خوابوں کی کھو جائیں نہ تعبیریں تمام

ہاتھ کٹوا لیں تو شاید قسمتیں آزاد ہوں
قید ہاتھوں کی لکیروں میں ہیں تقدیریں تمام

گو کہ اک عیسیٰ نفس بھی ساتھ تھا لیکن قمر
ہو گئیں اُلٹی بقولِ میر تدبیریں تمام

مظفر حنفی

○

رات پسماندہ ہوئی تاروں کا لشکر بڑھ گیا
دن ہوا تو بوجھ سا کیوں اور دل پر بڑھ گیا

جُزو کا یوں کُل میں ضم ہونا ہے گویا خودکشی
اس طرح خوش ہے ندی جیسے سمندر بڑھ گیا

محوِ حیرت ہوں کہ لوگ اس بات پر مسرور ہیں
آج کے انسان کا قد گھٹ گیا سر بڑھ گیا

جب میں تنہا تھا تو لگتا تھا کہ گھٹ جائے گا دم
آپ کے تشریف لانے سے مرا گھر بڑھ گیا

منزلیں آئیں تو میں نے پھیر لی اُن سے نگاہ
سنگِ میل آئے تو اک ٹھوکر لگا کر بڑھ گیا

سامنے آئے ہو کھل کر دشمنی کے واسطے
دوستو! میرا کلیجہ آج گز بھر بڑھ گیا

دیکھئے اب ناقدینِ عہد فرماتے ہیں کیا
قدِ فکر و فن سے بھی آگے مظفر بڑھ گیا

کمار پاشی

○

کیوں ڈراتے ہو مجھے موت کا سایہ بن کر
میرے سینے میں اتر جاؤ اُجالا بن کر

کیوں نہیں چلتے کہ جانا ہے بہت دُور ابھی
کیوں یہاں رک گئے بیکار تماشا بن کر

ٹوٹ کر بجھ گئے آکاش کے سارے سورج
اور میں رہ گیا اس دہر میں اندھا بن کر

میں ہی اک زہر لگا اپنوں کو بیگانوں کو
میں ہی اک قتل ہوا شہر میں سچا بن کر

کیوں بھلا چھوڑ نہیں دیتا وہ تنہا مجھکو
کیوں مرے ساتھ لگا رہتا ہے سایہ بن کر

خورشید احمد جامی

○

غموں کے شہر میں اقرارِ زندگی کیوں ہے
دلوں کے پاس ابھی تک یہ روشنی کیوں ہے
نکل کے گھر سے مری سوچ پاگلوں کی طرح
سیاہ رات کے جنگل میں گھومتی کیوں ہے

ملی تو کوئی تقاضہ نہ کر سکی مجھ سے
تمہاری یاد بھی اتنی تھکی ہوئی کیوں ہے
بھٹک رہا ہوں بگولوں کے ساتھ صحرا میں
مرے نصیب میں صدیوں کی تشنگی کیوں ہے

بیانِ درد کے اسلوب اور بھی ہوں گے
ہر ایک بات بہ عنوانِ شاعری کیوں ہے
کسی بدن کی پر اسرار چاندنی اب بھی
مرے قریب ہی بستر پہ لیٹتی کیوں ہے

ہر ایک دور نے معتوب جس کو ٹھہرایا
مری زبان پہ وہ حرفِ آگہی کیوں ہے
نہ جانے کون سخی اس طرف سے گذرے گا
فصیلِ شب سے پرے بھیڑ سی لگی کیوں ہے

پھر آج وقت کی پر شور آندھیوں کی طرح
کسی کے نام کا چرچا گلی گلی کیوں ہے
مٹی مٹی سی لکیریں ہیں جس طرف دیکھو
غمِ حیات کی تصویر ایک سی کیوں ہے

کسی کو آج نہیں کل بتاؤں گا جامی
قلم کی آگ میں خوابوں کی دلکشی کیوں ہے

عبیداللہ علیم

○

ایک نظارہ ہوں آنسو سے گہر ہونے تک
اک تماشا ہوں میں شعلے سے شرر ہونے تک

تُو ہے وہ رنگ کہ آنکھوں سے نہ اوجھل ہوگا
میں ہوں وہ خواب کہ گزروں گا سحر ہونے تک

لکھتے ہیں پر یہ نہیں جانتے لکھنے والے
نغمہ اندوہِ سماعت ہے اثر ہونے تک

تُو کہیں بھی رہے زندہ ہے لہو میں میرے
میں سنواروں گا تجھے خاک بسر ہونے تک

ہائے وہ شمع جو اب دُور کہیں جلتی ہے
میرے پہلو میں بھی پگھلی ہے سحر ہونے تک

لکھنے ہیں ابھی مرثیہ ہائے دل و جاں اور
کچھ زخم مجھے اے مرے مرہم نظراں اور

اتنا ہی کہ بس نغمہ سرایانِ جہاں ہیں
ملتا نہیں کچھ اس کے سوا اپنا نشاں اور

کھینچے ہے مری طبعِ سخن اپنی ہی جانب
اور گردشِ دوراں کہ دکھلائے سماں اور

کچھ نذر ہوئے وقت کی بے رحم ہوا کے
کچھ خواب ابھی میرے لہو میں ہیں رواں اور

ہر لحظہ میں آزادیٔ جاں کا تھا طلبگار
ہر گام پڑی پاؤں میں زنجیرِ گراں اور

ناصر زیدی

○

تم تو اَوروں پہ نہ پتھر پھینکو
آئینہ خانوں میں رہنے والو
کچھ تو ہو صورتِ تجدیدِ وفا
میں بھی سوچوں، ذرا تم بھی سوچو
میں بہر حال بھٹکتا رہا ہوں مگر
کاش تم بھی مجھے اپنا سمجھو
نہ سنو ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
دو گھڑی پاس تو آ کر بیٹھو

کھول کر بند دریچہ ناصر
ڈوبتے چاند کا منظر دیکھو

ندا فاضلی

○

منہ کی بات سنے ہر کوئی من کی پیر کو جانے کون
آوازوں کے بازاروں میں خاموشی پہچانے کون
لاکھ پکارے سورج سورج، لاکھ بجائے دھوپ گھڑی
اندھوں کی اندھی نگری میں، دیوانے کی مانے کون
جانے کیا کیا بول رہا تھا سرحد، پیار، کتابیں، خون
کل میرے بستر میں تھک کر لیٹ گیا تھا، جانے کون
صدیوں صدیوں وہی تماشا، رستہ رستہ ان تھک کھوج
لیکن جب ہم مل جاتے ہیں، کھو جاتا ہے جانے کون

کرن کرن السایا سورج، پلک پلک کھلتی نیندیں
دھیمے دھیمے بکھر رہا ہے ذرہ ذرہ جانے کون

شمس الرحمٰن فاروقی

○

کنارِ بحر ہے دیکھوں گا موجِ آب میں سانپ
یہ وقت وہ ہے دکھائی دے ہر حباب میں سانپ

وہ کون تھا؟ کوئی ہم زاد تو نہ تھا؟ کل رات
جب اس کے نام کو پوچھا، کہا جواب میں سانپ

تمام جلوۂ وحدت ہے، شام ہو کہ سحر
ہے جس حساب میں صحرا، اسی حساب میں سانپ

اسے نظارۂ ہستی سے سخت الفت تھی
ملا وہ شخص چھپائے ہوئے نقاب میں سانپ

گذشتہ رات مجھے پڑھتے وقت وہم ہوا
لکھے ہیں حرف ورق پر کہ ہیں کتاب میں سانپ

یہ ڈھلتی رات یہ کمرے میں گونجتا صحرا
امنڈتا خوف ہے دل میں کہ پیچ و تاب میں سانپ

صہبا اختر

○

کیوں الجھتا ہے زمانہ، مجھ سے شعلہ کار سے
سچ کا اِک فقرہ بڑا ہے، جھوٹ کے انبار سے

بیکراں، خود ساختہ زنداں میں گھٹ کر رہ گیا
آدمی کو کیا ملا، قیدِ در و دیوار سے

رات، اس کے ساتھ، میں نے چاند تک محسوس کی
روشنی اُڑتی ہوئی اس کے لب و رُخسار سے

عمر گزری ہے حسینوں کی پرستش میں تمام
میں کبھی کافر نہ ٹھہرا حُسن کے انکار سے

دمبدم باقی رہیں ترتیبِ آیاتِ جمال
روشنی چھنتی رہی اِک پردۂ اسرار سے

یہ کسی کی نیم خواب آنکھوں کا صہبا ہے کرم
دل مرا آباد ہے جس دولتِ بیدار سے

نسیم جبالی

○

تھا تصور تیرا غم افزا بہت
پر کٹھن لمحوں میں کام آیا بہت

گل بکثرت، اور دامن مختصر
تشنہ لب تھوڑے ہیں اور دریا بہت

غم کا بادل ایک سایہ تھا مگر
گھر کے جب آیا تو پھر برسا بہت

چھوڑ کے دنیا ہوئے ہم خوش مگر
تجھ سے چھٹنے کا ہوا صدمہ بہت

مطمئن بیٹھے تھے اس کو چھوڑ کر
وہ جو یاد آیا تو یاد آیا بہت

دل کی ویرانی ہوئی مشہور خلق
پھول مرجھایا مگر مہکا بہت

اے نگاہِ آشنا ہم کو بھی دیکھ
ہم بھری محفل میں ہیں تنہا بہت

عقل کہتے ہیں مگر جس کو ہمیں
کیا کریں لگتا ہے وہ اچھا بہت

سید تابش الوری

○

جن دنوں تھے ہم جنوں ساماں کہیں ایسا نہ تھا
عشق بے وقعت نہ تھا لیکن حسن بھی رسوا نہ تھا

ہم نے مانا، نامکمل ہی رہی دیوانگی
اس سے پہلے کوئی ہم سا بھی تو دیوانہ نہ تھا

ہم دیارِ یار سے پہنچے فرازِ دار تک
ہم سے پہلے عام اتنا حسن کا چرچا نہ تھا

ہم نے اپنے خوں سے کی اوروں کی تزئینِ بہار
ہم کو اپنی خانہ ویرانی کا اندازہ نہ تھا

اور جاگے شامِ تنہائی میں خوابیدہ خیال
میں بظاہر کتنا تنہا تھا مگر تنہا نہ تھا

چاہ کی امنگ بہاریں ہی خزاں بن جائیں گی
تم بھی موسم کی طرح بدلو گے یہ سوچا نہ تھا

ماہتابوں کی آرزو ہے وہی
آفتابوں کی جستجو ہے وہی
ایک مرکز پہ ہے نظر اب تک
شمعِ صد رنگ، رو برو ہے وہی
جلوہ ساماں وہی خیال ترا
نوبہاروں کی گفتگو ہے وہی
گل بداماں وہی ہے شوقِ وصال
لالہ رویوں کی جستجو ہے وہی
منزلِ قصرِ گل ملے نہ ملے
دل کو سودائے رنگ و بو ہے وہی
تشنہ کامانِ زندگی کو سلام
رنگِ مے، شعلہ سبو ہے وہی
کوئی کرتا قبول نذرانہ
جان دینے کی آرزو ہے وہی
زندگی اک حسین تنہائی
چاند تاروں سے گفتگو ہے وہی
خام کاروں پہ کیا ہنسی آئے
پختہ کاروں کی گفتگو ہے وہی
بن رہے ہیں نئے نئے زنداں
آدمی طوق در گلو ہے وہی
زہرِ ہستی، سرِ کشش پیتے ہیں
شورشِ غم کی آبرو ہے وہی

پروفیسر اختر نظمی

رات گئے تک میں جاگا ہوں، آنکھ ذرا جھپکانے دو
یادوں کو اک سایہ بنکر خوابوں پر چھا جانے دو
حسنِ چمن میں ممکن ہے کچھ اور اضافہ ہو جائے،
میرے دل کی بات صبا کو غنچوں تک پہنچانے دو
ایسے تنہائی کے لمحے کم ہی میسر آتے ہیں
اپنی سانس کی خوشبو میری سانسوں میں بس جانے دو
ہر آواز اک جسم ہے گویا، ہر پیکر اک نغمہ ہے
آوازوں کو آوازوں کی محفل میں کھو جانے دو

کمرے کی دیوار پہ نظمی اب کوئی تصویر نہیں،
اب ہستی کی بھیڑ کو میرے دروازے تک آنے دو

شبنم رومانی

ناز ک نازک قدموں کی رفتار یہ کہتی ہے
دیکھو ندی کیسی خاموشی سے بہتی ہے

گاتی سانسیں، ہنستا چہرہ، شعر سناتے ہونٹ
سوتے میں بھی حسن کی محفل جاگتی رہتی ہے

میری قسمت غم کے تحفے بھی کرتے ہیں قبول
میری فطرت خوشیوں کے صدمے بھی سہتی ہے

میرا دل ہے تیز ہوا کی زد میں تنہا پھول
مجھ کو ظالم دنیا جانے کیا کیا کہتی ہے

حور و قصور و کوثر پر ہیں قابض چند انسان
باقی دنیا خوابوں کی جنت میں رہتی ہے

منظر ایوبی

ملا ہے حکم کہ ہر بات برملا نہ کہو
وہ بے وفا ہے مگر اس کو بے وفا نہ کہو

خلش دلوں کی دکھائے ہزار رنگ مگر
حضور دوست کبھی دل کا مدعا نہ کہو

تمہارے شہر کی گلیاں ہمیں سے ہیں آباد
ہمیں حقیر نہ سمجھو، ہمیں گدا نہ کہو

خیال خاطر احباب ہے تو دیدہ ورو
بغیر سوچے کوئی بات برملا نہ کہو

یہ اور بات ہے کہ وہ ہم سے بدگماں ہے مگر
ہمارے سامنے یارو اسے برا نہ کہو

غریب شہر ہوں کچھ تم سے مانگتا تو نہیں
گناہ گار ہی سمجھو، جو پارسا نہ کہو

ہزار دار و رسن ہوں تمہارے رستے میں
بتانِ عصر کو منظر کبھی خدا نہ کہو

حزیں لدھیانوی

○

سوچتا ہی نہیں میں یہ برا کیا لگتا ہے
مجھکو ہر رنگ میں انسان بھلا لگتا ہے

پھول لگتا ہے کبھی بادِ صبا لگتا ہے
ہائے وہ شخص کہ ہر روز نیا لگتا ہے

مجھکو جینے دو کہ جینا مرا حق ہے یارو
زیست کا زہر مجھے آبِ بقا لگتا ہے

آندھیوں میں بھی جو جلتا رہا سورج کی طرح
وہ دیا کشتۂ اندازِ صبا لگتا ہے

غور سے دیکھیں تو لگتے ہیں صنم بھی پتھر
یونہی دیکھیں تو ہر اک سنگ خدا لگتا ہے

اہلِ دل پہ نہیں معلوم کہ کیا کچھ گذری
سونا سونا مجھے اب شہرِ وفا لگتا ہے

داِم فانوس میں جو شعلہ فروزاں ہی رہا
وہ کسی ٹوٹے ہوئے دل کا دیا لگتا ہے

جانے کس آگ میں جلنے کی تمنا ہے مجھے
مجھکو شعلہ بھی حزیںؔ شعلہ نما لگتا ہے

تاج سعید

○

شہروں کی رونقوں کا اضافہ ہیں بلڈنگیں
چل کر یہاں سے پیڑوں کا سنسار دیکھئے

سورج مکھی کا پھول بھی مصلوب ہو گیا
صحنِ چمن میں موت کی رفتار دیکھئے

حق بات پر کسی کو ندامت نہیں ہوئی
زنداں میں دیکھئے یا سرِ دار دیکھئے

بلبل کے پر کو خوش ہیں رگِ گل سے باندھکر
اس دور میں ہیں ایسے بھی فنکار دیکھئے

کانوں کے رس پہ دھیان نہ دیجئے میاں سعیدؔ
اس گلبدن کے پاؤں کی رفتار دیکھئے

خمارؔ انصاری

○

یاروتمھیں نویدِ سحر دے رہا ہوں میں
اک آفتابِ نو کی خبر دے رہا ہوں میں

وہ قافلہ کہ جس میں نہیں زندگی کی آنچ
اس قافلے کو ذوقِ سفر دے رہا ہوں میں

ناداریٔ حیات کی ظلمت کے باوجود
ذہنوں کو تابِ فکر و نظر دے رہا ہوں میں

شب کے حصارِ خواب کے زنداں کو توڑ کر
بیداریٔ طلوعِ سحر دے رہا ہوں میں

اپنے لہو سے پھول کھلا کر روش روش
صحنِ چمن کو رنگِ دِگر دے رہا ہوں میں

پستی کو کر رہا ہوں بلندی سے روشناس
ذرّوں کو قدرِ شمس و قمر دے رہا ہوں میں

مانگو نہ مجھ سے پھول کی نرمی صبا کا لوچ
شعلہ مجھے ملا ہے شرر دے رہا ہوں میں

روشن نگینوی

○

جب سے اس دشتِ تمنا میں قدم رکھا ہے
ہونٹ سی کر ترے وعدوں کا بھرم رکھا ہے

اہتماماً رہِ پر پیچ عطا کی مجھ کو
التزاماً تری زلفوں میں بھی خم رکھا ہے

خود بخود سوئے خرابات قدم اٹھتے ہیں
دامنِ ابر میں کیا ساغرِ جم رکھا ہے

دیکھنا یہ ہے اُدھر ردِ عمل کیا ہوگا
ہم نے اب نامِ ستم کا بھی کرم رکھا ہے

ہم زرِ گل جسے کہتے ہیں وہ ہے گردِ ملال
مسکراتے ہوئے ہر پھول میں سم رکھا ہے

ماند پڑتے نظر آتے ہیں مسرت کے چراغ
ہم نے یوں دل میں سجا کر ترا غم رکھا ہے

حسن کا فیض ہے تھا شعلہ و شبنم کی طرح
آب و آتش کو نگاہوں میں بہم رکھا ہے

کل یہی انجم و مہتاب کا وارث ہوگا!
آج انساں نے خلاؤں میں قدم رکھا ہے

کفر و اسلام میں کچھ فرق نہیں ہے روشنؔ
لب پہ ہے نامِ خدا دل میں صنم رکھا ہے

علیم افسر

O

اس کی مجھ سے بات ہوئی ہے اس نے حال بھی پوچھا ہے
تم کو یقین آئے کہ نہ آئے میں نے خواب سا دیکھا ہے

اے میرے ہم نفسو تم نے بھول کے بھی یہ سوچا ہے
کوئی تمہاری محفل میں بھی رہ کر تنہا تنہا ہے

ہم سے پوچھو شہرِ وفا میں کیسی کیسی رسمیں ہیں
پائے خواب میں زنجیریں ہیں یادوں پر بھی پہرہ ہے

میرا پیچھا چھوڑ دیا رو بیت چکی ہے رات بہت
اب تو مجھ کو سو لینے دو مجھ کو سویرے اٹھنا ہے

دشتِ وفا کو آنے والو یہ تو بتاؤ اب کے برس
خوابوں کی خوشبو کیسی ہے رنگِ تمنا کیسا ہے

شاید تم کو اس کی خبر ہو اے ہم نفسو چارہ گرو
جذبے کے اس اندھے کنوئیں میں کس نے کنکر پھینکا ہے

پھر تم نے کس کو چاہا ہے پھر کیسا پیمان کیا
شہر کے بازاروں میں افسر آج یہ کیسا چرچا ہے

غلام مرتضیٰ راہی

O

میرے واسطے بے سود زندگی کی تفسیریں
جم گئیں ہتھیلی پر آ کے ساری تدبیریں

لوگ اب بھی پڑھتے ہیں بیٹھ کر سرِ بازار
ہاتھ کی لکیروں سے زندگی کی تحریریں

لاد دیں فرشتوں نے آدمی کے کاندھوں پر
بے پناہ تقصیریں، بے شمار تعزیریں

کب گرفت میں آیا ہاتھ سے جو نکلا وقت
آدمی کو لے ڈوبیں آدمی کی تاخیریں

ہو گئے سب آمادہ توڑ پھوڑ کرنے پر
اب سنبھالئے صاحب، فکر و فن کی جاگیریں

دیر تک خیالوں میں ناچتی رہیں راہی
ٹیڑھے میڑھے خوابوں کی آڑی ترچھی تعبیریں

مجیب خیرآبادی

○

اپنا خوں دے کے ہم اے زمینِ وطن تیری مٹی کو گلنار کر جائیں گے
اپنی قسمت میں کانٹے ہی کانٹے سہی، تیرا دامن تو پھولوں سے بھر جائیں گے

کم سے کم یہ ہمارے چراغِ قدم، راستوں کو منور تو کر جائیں گے
پھر انھی راستوں سے گذرتے ہوئے، سیکڑوں کارواں سحر جائیں گے

ناخداؤں کا دل سے بھرم اٹھ چکا، اب سفینوں کو ان کی ضرورت نہیں
لاکھ طوفاں سہی، زندگی شرط ہے، عزم والے تو خود پار اتر جائیں گے

ظلمتیں چار سو پرفشاں ہی سہی، صبح افشاں چھڑکتی ہوئی آئے گی
رنگِ دوراں یقیناً نکھر جائے گا، گیسوئے شب یقیناً بکھر جائیں گے

بجلیوں نے بڑے مکر و فن کر لئے، آندھیوں نے ہزاروں جتن کر لئے
پھر بھی تعمیر ہم نے چمن کر لئے، ہم بھی تاریخ میں نام کر جائیں گے

اب وہ صحرا ہو یا صحن گلزار ہو، اب وہ زنداں ہو یا تختہ دار ہو
زندگی کے ہر اک موڑ پر نغمہ خواں، ہم کٹھن مرحلوں سے گزر جائیں گے

قحطِ فکر و نظر ہے مجیب اس قدر، خال ہی خال ہیں آج اہلِ نظر
لاکھ نا قدردانوں کی محفل سہی، پھر بھی ہم لے کے دادِ ہنر جائیں گے

عنبر چغتائی

○

ہم ذہنِ کائنات کے تازہ چمن بھی ہیں،
ہم ہی طلوعِ فکر کی پہلی کرن بھی ہیں!
گو سچ یہ ہے کہ ہم خس و خارِ چمن بھی ہیں،
لیکن غلط نہیں کہ وقارِ وطن بھی ہیں
ہم ظلمت آفریدہ "سنہری کرن" بھی ہیں
پیکر تراشتے ہیں مگر بت شکن بھی ہیں
برہم زنِ طلسمِ تمنا فقط نہیں
نذرِ صلیب و کشتۂ دار و رسن بھی ہیں
بے عز و بے وقار ہیں، بے خانماں ہیں ہم،
اپنے وطن میں رہتے ہوئے بے وطن بھی ہیں
صحرا و دشت کے خس و خاشاک ہی نہیں
رنگِ بہار و بوئے شگفتِ چمن بھی ہیں
ہر چند ہمنوا نہیں اس شہر میں کوئی
سرگوشیوں میں ارض و سما ہم سخن بھی ہیں
نشتر رواں ہیں گو رگِ احساس پر بہت
لیکن تصورات میں کچھ گلبدن بھی ہیں
تنہا رہے ہیں انجمنِ دوستاں میں ہم
تنہا خود اپنی ذات سے اک انجمن بھی ہیں
کچھ تو ابھی مجھے ہے خود آرائیوں کا ذوق
اور کچھ مری نگاہ میں "آئینہ تن" بھی ہیں
لطفِ امید و بیم ہے ہر گام پر نصیب
کچھ راہبر بھی ساتھ ہیں کچھ راہزن بھی ہیں

سید جعفری

نالۂ شب آہِ سحر چاہیئے
ایک نہ اِک راہ گذر چاہیئے

کوئی تعلق تو رہے آپ سے
کچھ تو ہمیں زادِ سفر چاہیئے

ایک زمانہ سے ہوں قید آپ میں
اب تو کوئی اور ہی گھر چاہیئے

پھونک دے جو خرمنِ احساس کو
ایسا کوئی ایک شرر چاہیئے

دار پہ پھر آج ہے خاموشی سی
رقص میں کیا پھر کوئی سر چاہیئے

تربیتِ عشق جنوں خیز ہو
شمع کو پھر رقصِ شرر چاہیئے

غلام مہدی مراز

کبھی غموں کی تمنّا، کبھی خوشی کی تلاش
تمام عُمر رہی ہم کو زندگی کی تلاش

ترے فراق میں یہ حال ہے بہاروں کا
ہر ایک پھُول کو ہو جیسے زندگی کی تلاش

قریب آکے مرے دل کے زخم دیکھ ذرا
مری غزل میں نہ کر میری شاعری کی تلاش

یہ زندگی کا اندھیرا ابھی کیا قیامت ہے
مگر مجھے ہے ترے رُخ کی چاندنی کی تلاش

رہِ حیات میں دو گام میرے ساتھ چلے
جسے عزیز ہو عرفان و آگہی کی تلاش

ستم بھی اسکا ہمیں تو وفاؤں جیسا ہے
وہ اجنبی ہے مگر آشناؤں جیسا ہے

ترے دیار سے عزم گریز پائی بھی
ترے حضور مری التجاؤں جیسا ہے

یہ کیسی دھوپ میں کجلا گیا ہے میرا بدن
تمہارا پیار تو سنتے تھے چھاؤں جیسا ہے

میں چھو سکوں نہ مگر روح میں اتر جائے
وہ اک بدن جو مہکتی شعاؤں جیسا ہے

یہ کس دیار خرابی میں ہم چلے آئے
ہر ایک شخص یہاں تو خداؤں جیسا ہے

وفا کے فیض سے کھلتے تھے عارضوں کے گلاب
وفا کا ذکر بھی اب تو سزاؤں جیسا ہے

اسی کے غم میں لبوں پر ہیں تشنگی کے الاؤ
وہ اک صنم جو برستی گھٹاؤں جیسا ہے

ضبط سہارنپوری

اللہ اللہ وہ عالم تیری زیبائی کا
ناطقہ سر بہ گریباں ہے تماشائی کا

جان دینا ہی جو معیار محبت ٹھہرا
کیوں اٹھائے کوئی احسان مسیحائی کا

جانے کس خاک کے پتلے ہیں یہ ارباب جنوں
غم پذیرائی کا ان کو ہے نہ رسوائی کا!

خوش ہوں نام آپ کا آتا ہے مرے نام کے ساتھ
یہ بھی کیا کم ہے بھرم رہ گیا رسوائی کا!

ضبط کیوں برہمی دوست پہ مغموم ہے تو
یہ بھی ہوتا ہے اک انداز پذیرائی کا

احمد جمال پاشا

بھابی جان

> اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کرسی پر بیٹھیں
> اور دھڑام سے زمین پر پہنچ گئیں۔ یہ بھی ہوتا
> ہے کہ کرسی تو نہیں ٹوٹی مگر وہ اس طرح فٹ
> ہوگئیں جیسے چوکھٹے میں تصویر یا انگوٹھی میں نگینہ

ہماری بھابی جان خدا نظرِ بد سے بچائے انتہائی تندرست واقع ہوتی ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہمیشہ انھیں یہی فکر کھائے جاتی ہے کہ خدانخواستہ وہ دبلی ہو رہی ہیں اور ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔

یہاں کی بات تو یہ ہے کہ بھابی جان نہ صرف موٹی ہیں بلکہ دیکھنے میں اچھی خاصی توپ معلوم ہوتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے بھائی صاحب جتنے دبلے پتلے، سینک سلائی ہیں، اتنی ہی بھابی صاحبہ موٹی تازی، تندرست اور توانا ہیں۔ معاف کیجئے گا وہ "موٹی" کے لفظ میں پورے طور پر سما نہیں سکتیں۔ ان کو موٹا کہنا، ان کے موٹاپے کے سلسلے میں انتہائی کسرِ نفسی سے کام لینا ہوگا۔

ماشاءاللہ سے وہ موٹی نہیں بلکہ بہت ہی زیادہ موٹی ہیں۔ بھابی جان اتنی موٹی ہیں کہ آپ سمجھئے کہ پورے ایک رکشے میں وہ مسلّم نہیں سما سکتیں، مجبوراً رکشے میں ترچھی بیٹھتی ہیں بشرطیکہ رکشے والا انھیں لے جانے پر تیار ہو جائے "اللہ پہیوں میں ہوا کم ہے"۔ کا بہانہ کرکے رفوچکر نہ ہو جائے۔

بھائی صاحب جتنے چڑچڑے اور کٹ کھنے ہیں وہ اتنی ہی ہنس مکھ اور خوش مزاج ہیں۔

لوگ ہاتھ پیروں سے کام لیتے ہیں یا پھر زبان سے۔ ہاتھ پیر آدمی اپنے لئے استعمال کرتا ہے اور زبان دوسروں کے لئے مگر بھابی جان نہ ہاتھ پیروں سے کام لیتی ہیں، اور اگر عورت ذات الشہادت نہ ہوتیں تو شاید زبان سے بھی کام نہ لیتیں۔ اس مجبوری کے باوجود بھی ان کی زبان قینچی کی طرح نہیں چلتی اور وہ اپنا سارا کام مسکراہٹ، ہنسی، ٹھٹھے اور اخلاق سے نکالتی ہیں۔ کبھی کسی سے مسکرا کر یا نداں کی طرف اشارہ کرکے کہیں گی۔

"لو بوا! خود بھی پان کھاؤ اور ہمیں بھی کھلواؤ — !"

کسی سے ہنس کر دس بیس کام نکال لیں گی اور کسی پر مہربان ہوں گی تو اس کے ذمہ روزمرہ کے سو پچاس کام کر دیں گی۔ ان کا کمال یہ ہے کہ یہ کام نہیں کرتیں مگر کھٹا کھٹ ان کے سب کام ہوتے رہتے ہیں۔ اور وہ بھی بیٹھے بیٹھے بلکہ زیادہ تر لیٹے ہی لیٹے۔ ان کی گھرداری چلتی ہے۔ مہمان داری چلتی ہے بچے پلتے ہیں۔ غرض خانہ داری کے جملہ امور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔

بھابی جان کہیں بھی جائیں اور ان کا میزبان ان سے نہایت ادب سے ساتھ بیٹھنے کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جائے تو بے چاری احتیاطاً خود ہی پوچھ لیتی ہیں :-

"آپ کے یہاں کوئی لوہے کی کرسی ہے ؟—؟"

"نہیں ! "

"لوہے کا پلنگ — ؟"

"جی نہیں — ! "

"اسٹیل فرنیچر — ؟"

"نہیں — ! "

آخر مجبور ہو کر یہ کہہ کر بیٹھ جاتی ہیں کہ :-

"پھر آپ سمجھئے ۔ !"

اور عام طور پر بیٹھتے ہی کرسی یا پلنگ بھی چرمرا کر بیٹھ جاتا ہے یہ تو روزمرہ کی "ٹریجڈی" یا مذاق ہے کہ ادھر وہ کرسی یا پلنگ پر بیٹھیں اور دھڑام سے زمین پر پہنچ گئیں ۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ کرسی تو نہیں ٹوٹی مگر وہ اس میں اس طرح فٹ ہو گئیں جیسے چوکھٹے میں تصویر یا انگوٹھی میں نگینہ ۔ کئی بار تو بتھے دار کرسی میں سے بھابی جان کو نکلوانے کے لئے بڑھئی کو بلوانا پڑا ۔ اور جب تک نہیں آیا بے چاری اسی طرح دو ناہی رہیں جیسے گلدان میں پھول ۔

بے عیب تو ذات خدا ہے ۔ اس لئے اگر ہماری بھابی جان صاحبہ میں بھی دو چار کمزوریاں نکل ہی آئیں تو ان کے یہاں بیان کر دینے میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا ۔

بھابی جان کو اس دنیا سے ایک ہی شکایت ہے ۔ وہ یہ کہ "دنیا کا کوئی بھی انسان نیک نہیں ہے ۔ نہ مرد ۔ نہ عورت" اس لئے ہر ایک کی خامیوں اور کمزوریوں پر ان کی نگاہ کھٹ سے پہنچ جاتی ہے ورنہ ناکامی کی صورت میں وہ دوسروں میں کچھ شرطیہ قسم کی کمزوریاں فرض کر لیتی ہیں ۔

انسانی فطرت بھی یہی ہے کہ ہم دوسروں میں چن چن کر خامیاں اور کمزوریاں نکالیں اور خوبیوں کو جہاں تک بھی ہو سکے نظر انداز کر دیں ۔ اس کمزوری کی وجہ سے بھابی جان انتہائی شکی واقع ہوئی ہیں ۔

یوں تو وہ ہر ایک پر بے سبب شک کیا کرتی ہیں مگر ان کا سب سے زیادہ زلزلہ اس سلسلے میں ان کے شوہر نامدار پر گرا کرتا ہے ۔ ہر چند کہ وہ جتنی گوری چٹی ہیں بھائی صاحب اتنے ہی سانولے سلونے ہیں ۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے میاں پر شک کر کر کے انھیں بالکل اپنے کنٹرول میں کر لیا ہے ۔ اور اچھا خاصا انسان جو دنیا بھر میں شیر ہے اور دفتر والے جس کے رعب داب سے تھر تھر کانپتے اور باہر والے انتہائی عزت و احترام کرتے ہیں ۔ وہ گھر میں بہ حیثیت شوہر کے نہایت ہی مریل بھیڑ نظر آتا ہے ۔

بھابی جان کو کھانے اور کھلانے کا بہت شوق ہے ۔ اس شوق کے صدقے میں بھائی صاحب شوہر سے زیادہ باورچی معلوم ہوتے ہیں وہ ایک سے ایک چیزیں پکایا کرتے ہیں یہ کھایا اور کھلایا کرتی ہیں ۔ چونکہ ہر اچھی چیز آجکل "ٹین" میں مل جاتی ہے اس لئے بھائی صاحب اپنی محنت بچانے کے لئے اتنے زیادہ ڈبے گھر میں لاتے ہیں کہ گھر پر کسی انگریز کے مکان سے زیادہ کباڑی کی دوکان کا شبہ ہوتا ہے ۔

بھابی جان کو ہر وقت یہی خطرہ رہتا ہے کہ کوئی کلموہی ان کے رشک یوسف شوہر کو نہ ہتھیا لے ۔ چنانچہ گھر کے کام کاج کے لئے احتیاطاً وہ نہ صرف انتہائی بوڑھی ملازمائیں رکھتی ہیں بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ وہ قبرستان سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی لوکرانیاں لاتی ہیں جن کی عمر کم از کم ۶۰ سال ہوتی ہے ۔ اس پر بھی یا تو وہ اسے خود ہی ایک دن قبرستان واپس بھجوا دیتی ہیں اور اگر وہ بہت سخت جان ہوئی تو ناراضگی کی صورت میں اس الزام کے ساتھ اسے برطرف کر کے زندہ درگور کر دیا جاتا ہے کہ "یہ میرے میاں کو دیکھ رہی تھی" ۔

صرف گھر کی ملازمہ ہی نہیں بلکہ دودھ والی ۔ گوشت والی ۔ ترکاری والی ۔ پھل والی ۔ دھوبن ۔ نائین ۔ بھنگن ۔ سب ایک سے ایک بڑھیاں تلاش کر کے مقرر کی جاتی ہیں ۔ جن کی آمد و رفت سے گھر پر عجب خزاں کا عالم طاری رہتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ہم بوڑھوں کے کلب میں زندگی کی پژمردہ شامیں گزار رہے ہیں ۔

بھابی جان کو ایک اور بھی مراق ہے ۔ وہ یہ کہ "ہم خدانخواستہ نجس سے ہو گئے ہیں" چنانچہ وہ اپنے آپ کو پاک و صاف رکھنے کے لئے برابر ہاتھ منہ دھوتی رہتی ہیں ۔ بس یوں سمجھئے کہ اگر وہ سو نہیں رہی ہیں تو ضرور نہا یا دھو رہی ہیں لہذا ان کے سونے جاگنے کا اندازہ ہمیشہ پانی گرنے کی آواز یا ان کے بے ہنگم خراٹوں سے ہوتا ہے ۔

بھابی جان کے پانی سے بے پناہ دلچسپی کا اندازہ آپ اس تازہ ترین واقعہ سے لگا سکتے ہیں ۔ ہوا یوں کہ سوتے میں دھم سے آواز آئی تو گھر بھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بے اختیار آواز کی سمت بھاگا ۔

مارا جہاں تھا کہ شاید کہیں [illegible] گری ہے۔

کیا دیکھتے ہیں کہ نل کے پاس بھابی جان لحاف میں لپٹی ہوئی کھڑی ہیں اور اس چلّے کے جاڑے میں ان کے پاؤں کے نیچے ایک شخص پڑا ہوا سمانے کی ناکام کوشش میں تھر تھر کانپ رہا ہے۔ نل کا پانی تیزی سے اس کے اوپر گر رہا ہے اور قریب ہی ایک گٹھڑی پڑی ہوئی ہے۔

معلوم ہوا کہ بھابی جان نے چور بالکل اس طرح پکڑ لیا ہے جیسے نڈھے کے ہاتھ بٹیر لگ جاتی ہے۔ اب اس کا قصہ جو معلوم ہوا تو سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ بات یہ ہوئی کہ بھابی جان اور بھائی صاحب سیکنڈ شو دیکھ کر لوٹے تو بچوں کو سلانے کے بعد بھائی صاحب بھی بے خبر سو گئے مگر بھابی جان جن کو ہر وقت اپنے نجس ہو جانے کا نہ صرف شبہ بلکہ مراق رہتا ہے۔ انھوں نے پہلے تو اس کپڑے کو دھویا جو سکھٹے کی گدی پر بچھایا گیا تھا تاکہ ان کے کپڑے ناپاک نہ ہو جائیں پھر انھوں نے اپنے کپڑے پاک کئے اس کے بعد وہ خود نہا رہی تھیں اس دوران ایک چور بغل والے مکان پر ہاتھ صاف کر کے چھت پر چڑھا اور دیوار پھاندنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نظر اندھیرے میں جو بھابی پر پڑی اور بھابی نے غیر مرد دئے کو دیکھ کر ہٹنا چاہا تو چور سمجھا کہ اس کڑکڑاتے جاڑے میں ضرور کوئی پہلوان نہا رہا ہے اور اس کی نظر مجھ پر پڑ چکی ہے لہٰذا اب یہ مجھے پکڑنے آ رہا ہے۔ اسی دہشت میں اس کا پیر پھسل گیا اور نیچے گرا تو بھابی جان جو تقریباً بھاگ رہی تھیں اتفاق سے ان کا پیر اس پر پڑ گیا۔ بھابی جان نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ وہ ان کے بھاری بوجھ کو نہیں ہٹا سکتا تو انھوں نے اپنا پیر اور جما دیا اور جلدی سے بے پردگی کے خیال سے لحاف کھینچ کر اس میں اپنے آپ کو لپیٹ لیا۔ اتنے میں ہم لوگ پہنچ گئے۔ گٹھڑی دیکھی تو اس میں پڑوس کے شرما صاحب کی کل پونجی تھی۔ جو اسی وقت ان کو جگا کر ان کے سپرد کی گئی۔ شرما صاحب پولیس میں انسپکٹر ہیں۔ انھوں نے بروقت تمام اپنا مال تو واپس لے لیا مگر یہ کہہ کر چور پکڑنے سے انکار کر دیا کہ "اس وقت میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں اس لئے چور نہیں پکڑ سکتا۔" مجبوراً چور صاحب کو پیٹ پاٹ کر تھانے بھجوا دیا گیا۔ اس کے بعد بھابی اپنا وہ پیر دھونے میں مصروف ہو گئیں جو انھوں نے چور کے اوپر رکھ کر اس کی روح قبض کرنے کی کوشش کی تھی اور ہم لوگ تھوڑی دیر کی ہلچل کے بعد سو گئے۔

اپنے آپ کو پاک کرنے کے لئے غوطہ دینے اور نہانے کا سلسلہ بھابی کے یہاں شب و روز جاری رہتا ہے۔ کوئی بھی چیز چھو تیں۔ انہیں کا کوئی بچہ انھیں چھو لے۔ کوئی چیز یا کوئی بھی بات ہو غرض ہر واقعہ کے بعد بھابی جان ایک بار اور ہاتھ پیر دھوتی ہیں یا نہا لیتی ہیں۔ خواہ سردی کی لہر چل رہی ہو یا کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہو۔ مگر ان کے اس روزمرہ میں فرق نہیں آنے پاتا۔ ہر چیز اٹھانے کے بعد اسی لئے بے اختیار ان کا ہاتھ نل کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

بھابی جان اتنی لحیم شحیم ہیں کہ بار بار غسل خانے تک جانے کی زحمت نہیں کر سکتیں اس لئے خود انھوں نے غسل خانے میں گھر بنا لیا ہے۔ یعنی ان کی چارپائی کے ایک طرف گھڑونچی ہے اور دوسری طرف نل لگا ہوا ہے جس کا پانی ہر وقت بہتا رہتا ہے اور کافی نیچائی پر ہونے کی وجہ سے ہر وقت بھابی جان کے خبط پر آنسو بہاتا نظر آتا ہے۔

بھابی جان کے پلنگ سے ذرا فاصلہ پر کرسیاں لگی رہتی ہیں پھر بھی اگر غلطی سے کوئی ان کے متبرک پلنگ پر بیٹھ جائے تو وہ پلنگ اس کی چادر اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو جاڑوں میں گدا۔ لحاف اور تکیے تک دھوئے جاتے ہیں۔

بھابی جان کے سونے اور جاگنے کی بھی یہی پہچان ہے کہ اگر پانی گرنے اور دھونے یا نہانے کی آواز آ رہی ہو تو اس کا یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ ابھی بھابی جان جاگ رہی ہیں اور اگر پانی نہ گر رہا ہو یا پانی گرانے کی آواز نہ آ رہی ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ بھابی جان اس وقت سو رہی ہیں۔

بھائی صاحب نے بھی آج تک اسی خیال سے کتا یا چوکیدار نہیں رکھا کہ "تمہاری بھابی کا نل جو گھر میں ہے۔" اور واقعی ان کے نل کی وجہ سے گھر میں بڑی جاگ رہتی ہے۔ اسی لئے بھائی صاحب کو

غالباً بھابی جان کے اس بے تحاشہ مسلسل نہانے دھونے پر کوئی خاص اعتراض نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے وہ آزادانہ طور پر جاڑے پالے میں بھی اپنے آپ کو دھو دھوکر پاک کرنے میں لگی رہتی ہیں۔

نہانے دھونے کے اس مسلسل مشغلے کی وجہ سے بھابی جان مستقل نزلہ، زکام کی شکار رہتی ہیں اور سال میں ایک آدھ بار نمونیا یا سردی کا بھی شکار ہو جاتی ہیں۔ مگر ان کے اس سلسلے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ البتہ ایک فائدہ یہ ضرور ہے کہ وہ بچوں کو پانی کے قریب نہیں پھٹکنے دیتیں اور گرمیوں تک میں نہلانا تو کجا بچوں کے ہاتھ منہ بھی گرم پانی سے دُھلائے جاتے ہیں۔

ایک دن بھابی سرِشام میکے سے لوٹیں تو حسبِ معمول تولیہ اور صابن اٹھاکر نہانے پہونچ گئیں۔ اس دن موسم کے تیور اچھے نہ تھے۔ سردی کی لہر چل رہی تھی اور ٹھنڈے سے لحاف کے اندر لرزہ طاری تھا۔ بندی خدا اپنے آپ کو دھو دھوکر پاک کرتی جاتی تھیں اور دانت کٹکٹاتی جاتی تھیں۔ نہا دھوکر جسم اور بال خشک کرکے جیسے ہی لحاف میں داخل ہوئیں گھسیٹے نے بڑھ کر بھابی کو گرما گرم چائے پیش کر دی اور جیسے ہی بھابی جان چائے پی کر لحاف میں گھسیں۔ موسم کے سرد و گرم سے ہل ہلاکر جو بخار چڑھا تو گھر بھر گھبرا گیا۔ بھائی صاحب نے تھرمامیٹر دیکھا اس کے بعد پریشان ہوکر بولے۔

" ارے او حلیم! دیکھ تو یہ کتنا ہے بھلا ؟ "

حلیم میاں نے بغور تھرمامیٹر دیکھا۔ پھر دوبارہ دیکھا۔ اس کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

" بھابی جان کو ۱۰۴ ڈگری بخار ہے "

۱۰۴ ڈگری کا سننا تھا کہ گھر بھر میں رونا پیٹنا پڑ گیا۔

بھابی جان بخار کی حدت سے سرسامی کیفیت میں اول فول بک رہی تھیں۔

" ارے کوئی ہے ؟ میرا منہ دھلا دے "

" ہاتھ پہ تو پانی ڈال دو ! "

" ارے سب مر گئے کوئی نہلانے والا بھی نہیں ہے ۔؟ "

بھائی صاحب نے پہلے تو ڈاکٹر خان کو فون کیا پھر گھبرا کر انھیں بلانے کے لئے خود ہی بھاگے۔

امی جان سرہانے پنج سورہ کھول کر بیٹھ گئیں مگر ان کی آواز نہ نکلتی تھی اور رقت طاری تھی۔

نازو، پارو، بے بی اور شاکر بھابی جان کے پاشویہ کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں بھائی صاحب۔ ڈاکٹر خان کو لے کر داخل ہوئے سب ایک طرف ہوگئے۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھی اس کے بعد آلہ لگاکر سانس کی کیفیت کا اندازہ کر کے بولے۔

" گھبرانے کی بات نہیں نمونیا کا خفیف اثر ہے جلدی ٹھیک ہو جائیں گی "

ڈاکٹر کی آواز پر بھابی جان نے آنکھیں کھول دیں۔ ڈاکٹر دوا دے کر اور خواب آور انجکشن لگا کر چلا گیا۔ اور ڈاکٹر کے جاتے ہی بھابی جان بے خبر سو گئیں۔

صبح بھابی جان کا بخار کم ہو گیا۔ ان کی طبیعت میں قدرے سکون تھا۔ خود ہی اٹھ کر انھوں نے ضروریات سے فراغت حاصل کی۔

اتنے میں گھسیٹے کی بڑے زور سے چلانے کی آواز آئی۔ دیکھا تو گھسیٹے گھبرا گھبرا کر منت سماجت کر رہے تھے اور بھابی جان اپنا ہاتھ نل پر دھو رہی تھیں۔

بھائی صاحب نے ان کو بستر پر لٹانے کے بعد پوچھا۔

" نل سے ہاتھ کیوں دھو رہی تھیں ؟ " بولیں۔

" کیسے نہ دھوتی۔ موئے ڈاکٹر نے نبض دیکھنے کے لئے ہاتھ پکڑ کر جو نجس کر دیا تھا۔ نہ جانے اس ہاتھ سے اس نے کیسے کیسے مریضوں کی نبضیں دیکھی ہوں اور کون کونسی دوائیں اور انجکشن اسی ہاتھ سے چھوکر اسے گندہ کیا ہو ۔ ؟ "

یہ سن کر ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ بھائی صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

" یہ ایک دن اسی نل کے نیچے نہاتے نہاتے جان دے دیں گی۔

اور میں نے بھی طے کر لیا ہے کہ نہانے دھونے میں جب ان کی جان چلی جائے گی تو میں بھی ان کی پکی قبر بنوا کر اس پر نل لگوا دوں گا تاکہ ان کی روح قیامت تک نہاتی رہے "

بھابی جان نے بگڑ کر کہا۔

" وہ تو میں پہلے ہی سمجھتی ہوں کہ تم میرے مرنے کے انتظار میں دن گن رہے ہو۔ کہ ادھر میری آنکھ بند ہو اور تم کسی مردار کو لا کے اس سے چٹ پٹ بیاہ رچا لو "

بھائی صاحب نے کہا۔

" میں نے شادی کے لئے کہاں کہا میں تو خدانخواستہ تمہاری قبر پر نل لگوانے کی بات کر رہا تھا "

بھابی بولیں۔

" ہاں ہاں! اپنے سہرے کے لئے میری تربت کا انتظام ہو رہا ہے۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ کان کھول کر سن لو۔ اسی حسرت میں بڈھے ہو جاؤ گے مگر میں ٹس سے مس ہونے کی نہیں "

بھابی جان اور بھائی صاحب کی اس دلچسپ نوک جھونک کا سلسلہ ابھی اور جاری رہتا کہ اچانک امی جان پوچھ بیٹھیں۔

" دلہن کو دوا دے دی ہے ؟ "

اور بھائی صاحب باتیں چھوڑ جلدی سے بھابی جان کو دوا پلانے کے انتظام میں لگ گئے۔

سرور جمال

ہوم سوئٹ ہوم
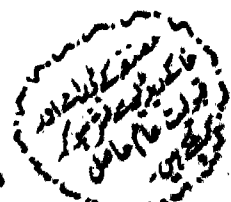
> اُن کا گھر خانہ جنگی کا بہترین میدان ہے۔
> یہ سلسلہ کھانا کھاتے وقت نمک کی کمی بیشی یا ہنڈیا
> کے جل جانے پر شروع ہوتا ہے اور کسی برتن
> کے ٹوٹنے اور منّے کی پٹائی کے ساتھ چیخ
> چیخ کر رونے کے تماشے پر ختم ہوتا ہے۔

ہمارے گھر کے ڈرائنگ روم میں اس وقت سے "ہوم سوئٹ ہوم" کا فریم آویزاں ہے جبکہ اس کے معنی یا مطلب سے ہمیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اب تو اس کا فریم اتنا پرانا ہو چکا ہے جتنا کہ ہمارا گھر۔ اور اس کے شیشے اور عبارت پر اسقدر گرد جم چکی ہے جتنی کہ ہمارے گھر کی ہر ایک شے پر۔ لیکن اگر سچ پوچھئے تو ہمارے گھر کی خوبصورتی اور شان کو بڑھانے میں اس فریم کا بڑا ہاتھ ہے کیونکہ جس گھر میں گھر کے پیارے ہونے کا تحریری ثبوت موجود ہو اس کی خوبصورتی اور جنت نشان ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔

ہم نے اس فریم کو اتنی بار دیکھا ہے کہ اس کی عبارت شیشے سے ہمارے دل پر نقش ہو چکی ہے اور اس کا مطلب تو نقش کالحجر سے بھی بڑھ کر ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس گھر کے علاوہ اور کسی کا گھر اچھا نہیں لگتا کیونکہ دوسرے گھروں میں اور سب کچھ تو مل جاتا ہے لیکن وہ فریم اور اس پر لگی ہوئی عبارت نہیں ملتی۔ بعض لوگ کتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ گھر کو سجا کر صاف ستھرا تو رکھتے ہیں لیکن اس کی گواہی دینے والی کوئی ایسی عبارت نہیں لگاتے۔ ایسے احمق بھی بہت پائے جاتے ہیں جو گھر کو واقعی پیارا بنانے کے لئے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں لیکن کاہلی کا یہ عالم ہے کہ محض یہ فریم نہ لگا کر اس کی وقعت کم کر دیتے ہیں۔

ہمیں دوسروں کے گھر اچھا نہ لگنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم ایک عدد مکان کے مالک نہیں تو کیا ہوا ایک مکان کے مکین تو ہیں اور وہ بھی ایسے مکان کے جہاں "ہوم سوئٹ ہوم" کا سائن بورڈ پکار پکار کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ گھر جنت ہے اور اس سے بڑھ کر اور کوئی جگہ روئے زمین پر نہیں۔

اس طرح ہمیں اپنے پیارے گھر سے اتنا پیار ہو گیا ہے کہ اس کے علاوہ ہمیں اور کہیں اچھا نہیں لگتا۔ اس پیارے گھر میں کوئی اکیلے ہم تو رہتے نہیں ہیں۔ یہاں میں نصف درجن سے زیادہ تو ہمارے چھوٹے بڑے بھائی بہن رہتے ہیں۔ پھر بھائیوں کی بیویاں اور بہنوں کے شوہر نامدار اور ہر ایک کے پانچ پانچ چھ چھ بچے ہیں۔

اور ہمیں صرف ان بچوں ہی سے پیار نہیں بلکہ ہم جانوروں کو بھی گلے لگاتے ہیں۔ اس لئے کہ گھر میں خدا کے فضل سے مرغیاں اور بطخیں بھی ہیں۔ بکریاں اور کتے بلیاں بھی۔ کسی کو شوق ہوا تو اس نے کبوتر پال لئے۔ کسی نے مچھلیاں پال لیں۔ کسی کو طوطا پالنے کا شوق ہے تو کوئی مینا پالنے کے شوق میں مرا جا رہا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ ہم صرف جانور پالنا ہی نہیں جانتے بلکہ ان کے گل

مساوات برتنا بھی جانتے ہیں جس طرح اس گھر میں ہر انسان
کو ہر جگہ بیٹھنے اور [illegible]وں کو ڈرائنگ روم کے صوفہ سیٹوں پہ
مسہریوں اور کرسیوں وغیرہ پر کود لے پھاندنے اور چھلانگ
لگانے کی پوری آزادی ہے اسی طرح یہ جانور بھی اپنے تمام
کاموں کے لئے آزاد و خود مختار ہیں۔ اگر کسی مرغی کو منچلے
بچھیا کے لحاف کے گھونسلے میں انڈے دینے کی عادت ہے تو
کسی کو اس پر احتجاج کا حق نہیں۔ بکریاں بڑے شوق سے
ڈرائنگ روم کے صوفوں پہ (جو اب صوفہ کم بیڈ نہیں بلکہ
"صوفہ کم جھولا" بن چکے ہیں) بیٹھ کر جگالی کر سکتی ہیں۔ بطخیں
کسی بھی آئے گئے پر گردنیں لمبی کر کے قیں قیں کرتی حملہ آور ہو
سکتی ہیں۔ کتے کسی بھی معزز مہمان کو کاٹ کھانے کے لئے دوڑ
سکتے ہیں۔ اور طوطے مہمانوں کو میٹھی میٹھی گالیوں سے خوش
آمدید کہہ سکتے ہیں۔

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ جس گھر کی کل آبادی اتنی ہو کہ
جس میں محلے کی آدھی سے زیادہ آبادی سما جاتے تو اس کے
مکیں کا جی بھلا کہیں اور کیا لگے گا۔

یہ نہیں کہ اس گھر کے صرف کمرے، برآمدے، لان اور
حوض وغیرہ ہی کسی نہ کسی جاندار کے دم سے آباد ہیں۔ بلکہ
اس گھر کا تو کونہ کونہ اور گوشہ گوشہ آباد ہے۔ یعنی یہ کہ
کسی کونے میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہے۔ کسی کونے میں
آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کا نقشہ دکھائی دے رہا ہے
کہیں ردی کاغذ پڑے ہوئے ہیں تو کہیں اخبار کے صفحات
پھڑ پھڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ کہنا یہ ہے کہ گھر کے
کونے کونے سے پیار و محبت کی بو آتی ہے۔ ایسی کہ اگر کہیں جاؤ
تو "ہوم سک" کا شکار ہو جاؤ۔ ظاہر ہے کہ ایسا پیارا اور شاندار
گھر تو کہیں ملنے سے رہا۔

ہمارے گھر کا ایک گوشہ یا حصہ وہ بھی ہے جہاں ہمارے
بھائی صاحب مع بیوی بچوں کے آباد ہیں۔ بھابی جہیز میں جہاں
دنیا بھر کی چیزیں لائیں وہاں "ہوم سویٹ ہوم" کا فریم لانا
نہ بھولیں۔ اور بھولتیں بھی کیسے جبکہ گھر کی تزئین و آرائش
اسی کے بغیر ادھوری ہے۔ چونکہ ان کا فریم نیا ہے اس لئے اس
کی قدریں بھی نئی ہیں۔ بھابی کا یہ گھر بھی بس ان کے فریم کی
طرح پیارا ہے۔ ایسا پیارا کہ وہ اس کو ایک پل کے لئے بھی
چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتیں۔ کیونکہ گھر تو
رحمتوں کا مسکن ہے وہ مسکن جہاں رحمت بصورت نزاع
رات دن برستی رہتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ ان کا گھر "خانہ جنگی"
کا بہترین میدان ہے۔ صبح ہوتی نہیں کہ ان کے یہاں سے
آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔

یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ بچے اپنے اسکولوں کے لئے۔ مرد
دفتروں کے لئے۔ نوجوان کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لئے اور
عورتیں اپنی دن بھر کی گپ شپ کی ابتدائی تیاریوں میں
مصروف ہوتی ہیں۔ عموماً یہ سلسلہ کھانا کھانے کے وقت
نمک کی کمی بیشی کے سلسلے میں یا روٹی کے جل جانے اور چاول
کے کچے یا گیلے رہ جانے کی تقریب میں یا بات آگے بڑھی تو
قمیص یا پینٹ کے بٹن غائب ہونے پر یا جوتے کی پالش
کی عدم موجودگی پر شروع ہوتا ہے اور کسی برتن کے ٹوٹنے
کپڑے کے پھاڑنے یا منے کی پٹائی کے ساتھ چیخ چیخ کر رونے
کے تماشے پر ختم ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود انھیں اپنے گھر سے پیار
ہے۔ اور ہر وقت ان کی زبان پر اپنے گھر کی تعریف کے
قصیدے جاری رہتے ہیں۔ ان کو تو جھٹلایا جا سکتا ہے
لیکن اس فریم کو آپ جھوٹا نہیں بنا سکتے۔ جو بڑے اہتمام
سے ان کے گھر میں ٹنگا ہوا ہے۔

تو یہ ہے میرا پیارا گھر جس کے بغیر ہم ایک
پل بھی کہیں نہیں رہ سکتے۔
اور رہیں بھی تو کیسے۔ ہمارا پیارا گھر

جو شفیرا۔

کردار
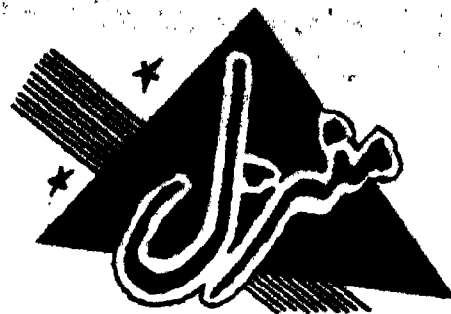
نسرین .... ایک ایم اے پاس دوشیزہ

لطیف .... نسرین کے والد

آمنہ .... نسرین کی والدہ

ندیم .... نسرین کا منگیتر

نجمہ اور شہناز .... نسرین کی سہیلیاں

(گھڑی تین بجاتی ہے ۔ پھر آمنہ کی آواز سنائی دیتی ہے)

آمنہ :۔ (گھبرائے ہوئے لہجہ میں) افوہ تین بج گئے اور آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے ۔

لطیف :۔ (زور سے) لاحول ولا قوۃ ۔ کیا مطلب ہے آپ کا ۔ ننگے پیر چلا چلوں ۔ جوتے نہ پہنوں ۔

آمنہ :۔ (جلدی سے) اگر آپ اسی اطمینان سے تیار ہوتے رہے تو ہم جہاز آنے کے بعد ہی پہنچیں گے ۔

لطیف :۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جہاز چار بجے آئے گا ۔

آمنہ :۔ (چیخ کر) ایئرپورٹ تک پہنچنے میں بھی کچھ وقت صرف ہوگا ۔

لطیف :۔ (ہنستے ہوئے) بھئی ایسا ہے تو آج آپ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں ورنہ ـــــــ

آمنہ :۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) جلدی سے شیروانی پہنیئے ۔ باتیں بعد میں کر لیجئے گا ۔

لطیف :۔ (قہقہہ لگا کر) لیجئے میں تو تیار ہو گیا ۔ اب اپنی صاحبزادی کی خبر لیجئے اُن کی تیاری میں کیا دیر ہے ؟

آمنہ :۔ اسے تیار ہونے کی کیا ضرورت ۔ وہ تو ایئرپورٹ نہیں جا رہی ۔

لطیف :۔ (تعجب سے) کیا مطلب ؟ کیا نسرین نہیں چلے گی ۔

آمنہ :۔ (بیزاری سے) نسرین کے جانے کا کیا تک ہے ؟

لطیف :۔ (سوالیہ لہجہ میں) ندیم جب لندن گیا تھا اس وقت تو وہ اسے رخصت کرنے گئی تھی ۔

آمنہ :۔ جب کی اور بات تھی ۔ اب سب کو معلوم ہے کہ ندیم شادی کرنے آ رہا ہے ۔

لطیف :۔ لیکن ابھی تاریخ تو مقرر نہیں ہوئی ہے ۔

آمنہ :۔ (تیز لہجہ میں) آپ تو بعض اوقات بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں ۔ اگر نسرین جائے گی تو سب کام

سکیں گے۔ خود بھابی اور بھائی جان بھی اسے
کو پسند نہیں کریں گے۔

لطیف۔ (خود سے) ندیم کیا سوچے گا۔؟

آمنہ۔ وہ کچھ نہیں سوچے گا۔ وہ میرا بھتیجا ہے آپ
یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ سات سال میں بدل
گیا ہوگا۔

لطیف۔ (بات کاٹ کر) میری رائے میں تو نسرین کو
ایئرپورٹ چلنا چاہئیے۔ یہ کوئی قابلِ اعتراض بات
نہیں۔

آمنہ۔ (بات کاٹ کر) اب چلئے بھی تقریر راستہ میں
کر لیجئے گا۔

لطیف۔ (جھلا کر) چل تو رہا ہوں۔ اور کیسے چلوں۔ کیا خود
ہوائی جہاز بن جاؤں۔ (قدموں کی چاپ)
(قدموں کی چاپ کار چلنے کی آواز میں تحلیل
ہوجاتی ہے)

منظر بدلتا ہے

(بارش کا ہلکا ہلکا شور۔ قدموں کی چاپ
پھر شہناز کی آواز سنائی دیتی ہے)

شہناز۔ (آہستہ سے) بجو دیکھو۔ صاحبزادی تصورات کی
دنیا میں کھوئی ہوئی ہیں۔

نجمہ۔ (آہستہ سے) بڑا اچھا پوز ہے۔ کیمرہ ہوتا تو تصویر
کھینچ لیتی (ہنستی ہے)

شہناز۔ (شرارت سے) باادب۔ باملاحظہ۔ ہوشیار۔

نسرین۔ (چونک کر) اوہ۔ تم۔ آؤ آؤ۔

نجمہ۔ (ہنستے ہوئے) ارے بھئی کہاں ہو؟

شہناز۔ (ہنستے ہوئے) یہ وہاں ہیں۔ جہاں سے ان کو
اپنی بھی خبر نہیں آتی (بجلی کی کڑک)

نسرین۔ (ہنستے ہوئے) اس بارش میں جب کہ بجلی بھی
چمک رہی ہے تم دونوں کیسے آگئیں۔؟

شہناز۔ (ہنستے ہوئے) بھئی ہم تو یہ سوچ کر آئے ہیں کہ
آج دل بھر کر باتیں کرلیں۔ پھر تم کہاں اور ہم
کہاں۔

نسرین۔ کیا مطلب؟

نجمہ۔ (ہنستے ہوئے) کیسی معصوم بن رہی ہیں جیسے
انہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ ندیم بھائی کیوں
آئے ہیں۔

شہناز۔ (شوخی سے) اور شاید آپ کو یہ معلوم ہے کہ
شادی کے بعد یہ ندیم بھائی کے ساتھ لندن
چلی جائیں گی۔

نسرین۔ (شرماتے ہوئے لہجہ میں) بھئی اللہ۔ ہمیں کچھ
نہیں معلوم۔

نجمہ۔ (شرارت سے) کچھ نہ معلوم ہونے پر تو یہ عالم
ہے۔

شہناز۔ (بات کاٹ کر) کہ ندیم بھائی کا نام آتے ہی
سرکار کا چہرہ سرخ ہوگیا (بادلوں کی گرج)

نجمہ۔ (جذباتی لہجہ میں) یہ تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے
نسرین کہ تم اتنی دور چلی جاؤگی۔

شہناز۔ تم تو کہا کرتی تھیں کہ ایم۔ اے کرنیکے بعد تم ایک
مثالی اسکول قائم کروگی۔

نجمہ۔ کتنے خوبصورت خواب تم نے دیکھے تھے۔

نسرین۔ (آہستہ سے) مجھے خود یہ بات معلوم نہیں تھی۔

شہناز۔ ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی تو نہیں کرسکتے (قدموں
کی چاپ)

نجمہ۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) سچ ہے لڑکیاں کتنی مجبور
ہوتی ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں کرسکتیں۔ (قدموں کی
چاپ قریب آتی ہے)

آمنہ۔ (ہنستے ہوئے) ارے تم ابھی تک یہیں ہو میں نے کہا تھا
یہاں آکر بیٹھ گئیں اور کسی بات کا ہوش

کو نہیں دیا۔

شہناز۔ (ہنستے ہوئے) باتوں میں یاد ہی نہیں رہا خالہ جان کہ آپ ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

آمنہ۔ (خوشگوار لہجہ میں) بھلا یہ موسم کہیں کمرے میں بیٹھنے کا ہے۔ باہر چلو۔ لو اُنہوں نے پوریوں کا آٹا گوندھ لیا ہے اور کڑھائی چڑھا دی ہے۔ (بارش کا شور)

نجمہ۔ (محبت بھرے لہجہ میں) آپ کتنی اچھی ہیں خالہ جان۔

آمنہ۔ (حکم دیتے ہوئے) اٹھو نسرین کیا سوچ رہی ہو!

نسرین۔ (گڑبڑا کر) چل رہی ہوں امی

(قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے)

منظر بدلتا ہے

(چائے کی پیالیوں کی کھنک پھر آمنہ کی آواز اُبھرتی ہے)

آمنہ۔ (خوشی کے لہجہ میں) آپ سمجھ رہے تھے کہ ندیم سات سال میں بدل گیا ہوگا۔ اب تو آپ نے خود دیکھ لیا

لطیف۔ (خوشگوار لہجہ میں) یہ دیکھ کر مجھے واقعی خوشی ہوئی کہ وہ بالکل نہیں بدلا۔

آمنہ۔ (فخریہ لہجہ میں) اتنا بڑا ڈاکٹر ہوگیا مگر ذرا غرور نہیں۔ نوکروں تک سے آپ جناب سے بات کرتا ہے۔

لطیف۔ (خوشگوار لہجہ میں) یہ ماں باپ کی تربیت کا اثر ہے۔ (ایک لمحے کے توقف کے بعد) لیکن اس نے لندن میں مستقل طور پر رہنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس سے میں متفق نہیں ہوں۔

آمنہ۔ (جلدی سے) کہیں بھی رہے۔ میری تو یہ دعا ہے کہ خدا میری نسرین کا نصیب بلند کرے۔

لطیف۔ (سنجیدہ لہجہ میں) میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہہ رہا ہوں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع دیا جائے۔

آمنہ۔ (تیز لہجہ میں) واہ یہ کیسے ممکن ہے اگر وہ دونوں ملیں گے تو دنیا کیا کہے گی۔؟

لطیف۔ (جھلا کر) دنیا والے کچھ بھی کہیں جب تک مجھے نسرین کی مرضی نہیں معلوم ہوگی اس وقت تک میں تاریخ طے نہیں کروں گا۔

آمنہ۔ (زور دے کر) کوئی نیا رشتہ نہیں ہے جو نسرین کا عندیہ لیا جائے۔ بچپن کی منگنی ہے۔

لطیف۔ (سمجھاتے ہوئے) بچپن کی منگنی ہے اسی لئے اس کی ضرورت ہے کہ ایک بار پھر اس سے پوچھ لیا جائے۔

آمنہ۔ نہ جانے آپ کو کیا ہوگیا ہے ؟

لطیف۔ (زور دے کر) بیگم سات سال میں سوچنے کے انداز بدل بھی سکتے ہیں۔ آپ نے ماں ہوکر یہ نہیں دیکھا کہ جب سے ندیم آیا ہے نسرین چپ چپ ہے۔

آمنہ۔ (طنزیہ لہجہ میں) تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ قہقہے لگائے۔

لطیف۔ (ہنستے ہوئے) قہقہے تو شادی کا نام سن کر آپ نے لگائے تھے۔ (زوردار قہقہہ)

آمنہ۔ (برا مان کر) ہائے نوج جو میں قہقہے لگاتی۔ میں نے تو جس دن سے شادی کا نام سنا تھا ایک منٹ کو میرے آنسو نہیں رکے تھے۔

لطیف۔ (قہقہہ لگا کر) خیر یہ تو جھوٹ ہے۔

آمنہ۔ اے ہے کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ بات نسرین کی ہو رہی تھی۔

لطیف۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) بیگم۔ شادی زندگی کی تکمیل کا نام ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ

دونوں یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں۔ ذرا سی غلطی
سے دونوں کی زندگیاں تباہ ہو سکتی ہیں۔

آمنہ۔ (زور سے) خدا نہ کرے آپ تو بلاوجہ فضول باتیں سوچ رہے ہیں۔ اگر آپ کی یہی ضد ہے تو میں شہناز کے ذریعہ نسرین سے معلوم کرا لوں گی۔

لطیف۔ (مطمئن لہجہ میں) اچھا تو اب میں چلا۔ حامد صاحب کو مبارکباد دے آؤں ان کی لڑکی پاس ہوئی ہے۔

(قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے)

منظر بدلتا ہے

(بلی کی میاؤں میاؤں پھر ندیم کی آواز ابھرتی ہے)

ندیم۔ (خوشگوار لہجہ میں) شرمایئے نہیں۔ ڈبہ کھولیئے یہ آپ کے لئے لایا ہوں۔

نسرین۔ (بدحواس ہو کر) ہائے اللہ (زور سے) امی جان

ندیم۔ (ہنستے ہوئے) بالکل نہیں بدلیں آپ۔ ماشاء اللہ ایم اے کر لیا۔ مگر چھپکلی سے اب بھی ڈرتی ہیں۔

نسرین۔ (کانپتے لہجہ میں) اسے بھگا دیجئے۔ نہیں تو۔ نہیں تو۔

ندیم۔ (قہقہہ لگا کر) محض یہ ربڑ کی چھپکلی ہے۔ یہ دیکھئے اب تو یقین آیا۔ (قہقہہ)

نسرین۔ (گھبرائے ہوئے لہجہ میں) آپ نے مجھے بُری طرح ڈرا دیا۔

ندیم۔ (ہنستے ہوئے) آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے لندن میں جو مکان خریدا ہے اس میں کوئی چھپکلی نہیں ہے۔

نسرین۔ (تیز لہجہ میں) اگر ہو بھی تو میرا کیا نقصان ہے۔

ندیم۔ (ہنستے ہوئے) تو گویا آپ خفا ہو گئیں یعنی میرے اس مذاق پر بُرا مان گئیں۔

نسرین۔ (گڑبڑا کر) جی۔ نہیں۔ بات یہ ہے کہ ——

ندیم۔ (بات کاٹ کر) ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے جو مکان لیا ہے۔ وہ بہت خوبصورت ہے آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

نسرین۔ (آہستہ سے) میری پسند ناپسند سے کیا فرق پڑتا ہے۔؟

ندیم۔ (زور دیکر) میں نے اسے سجانے میں آپ کی پسند کا خیال رکھا ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا باغ ہے جس میں گلاب کے درخت ہیں۔ بے شمار پھول لگتے ہیں۔ ایسے خوبصورت کہ بیان نہیں کر سکتا (جلدی سے) سچ ان کی مہک سے سرور طاری ہو جاتا ہے۔

نسرین۔ (سنجیدہ لہجہ میں) لیکن میرے وطن کی مٹی میں جو سوندھی سوندھی خوشبو ہے۔ وہ ان پھولوں کی خوشبو سے زیادہ روح پرور ہے۔

ندیم۔ (جذباتی لہجہ میں) سچ نسرین لندن ایسا خوبصورت شہر ہے کہ اس کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بس یوں سمجھو روشنیوں کا شہر ہے۔ ادب کی روشنی۔ علم کی روشنی۔ آرٹ کی روشنی۔

نسرین۔ (سنجیدہ لہجہ میں) وہ روشنی کس کام کی جس سے ہمارے گھر میں اُجالا نہ ہو سکے۔

ندیم۔ کیا کہہ رہی ہو تم۔ تابناک مستقبل۔ روپیہ اور زندگی کی ساری آسائشیں مجھے اسی روشنیوں کے شہر نے عطا کی ہیں۔

نسرین۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں یہ عرض کروں کہ روشنیوں کے اس شہر میں آپ نے اپنے کو گم کر لیا ہے۔

ندیم۔ تم غلط سمجھ رہی ہو نسرین! ان روشنیوں نے

ترقی کی منزل تک پہنچنے کے راستے روشن
کردیئے ہیں۔ میں تیزی سے منزل کی طرف بڑھ
رہا ہوں۔ اور وہ دن زیادہ دور نہیں جب
میرا شمار بڑے ڈاکٹروں میں ہوگا۔

نسرین۔ آپ یقیناً بہت بڑے ڈاکٹر بن جائیں گے۔ لیکن
یہ بتائیے کہ اپنوں کے لئے آپ کے پاس کیا ہے
مجھے توقع تھی (جذباتی لہجہ میں) کہ آپ ڈاکٹری
کی اعلیٰ ڈگریاں لینے کے بعد اپنے وطن واپس
آکر خلوص و محبت اور فن کے چراغ روشن کریں گے۔
لیکن ان تیز روشنیوں نے آپ کی آنکھوں میں
چکا چوند پیدا کردی۔ (ٹھنڈی سانس لیکر)
اور آپ اپنی منزل کھو بیٹھے ہیں (کربناک لہجہ
میں) کاش آپ کو یاد رہتا کہ آپ کے ملک کا
بھی آپ پر حق ہے۔

ندیم۔ (سنجیدہ لہجہ میں) نسرین دنیا میں ترقی کرنے کے
لئے انسان کو جذبات سے ہٹ کر سوچنا پڑتا
ہے۔ (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

نسرین۔ ہیلو — کون — نجمہ — شوق سے آؤ —
ہاں ہاں چائے ملے گی۔ دس منٹ میں پہنچ
رہی ہو — کیا کہا شہناز گھر پر نہیں ہے
اچھا میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ (ریسیور
رکھنے کی آواز)۔

ندیم۔ شاید آپ کی کوئی سہیلی آرہی ہیں۔

نسرین۔ (خوشگوار لہجہ میں) جی ہاں میری بچپن کی سہیلی
آرہی ہے۔ اسی کا فون تھا۔

ندیم۔ (ہنستے ہوئے) اس کا مطلب ہے کہ مجھے اب
نو دو گیارہ ہو جانا چاہئے۔ اچھا صاحب تو اب
اجازت دیجئے (چند لمحے کے توقف کے بعد) اس
موضوع پر آپ سے میں پھر گفتگو کروں گا۔ مگر

زبانی نہیں بلکہ خط کے ذریعہ (ہنستے ہوئے) در
اصل آپ کے سامنے لب کشائی کی جرأت نہیں
ہوتی۔ اچھا خدا حافظ۔

(قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے)

منظر بدلتا ہے

(باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں۔ پھر شہناز کی
آواز ابھرتی ہے)

شہناز۔ (سمجھاتے ہوئے) تمہارا دماغ خراب ہے اتنی
جذباتی نہ بنو نسرین۔ ایک بار پھر غور کرلو۔

نسرین۔ (غمگین لہجہ میں) میں نے پورے غور و فکر کے
بعد یہ فیصلہ کیا ہے (کربناک لہجہ میں) میں نے
کوشش کی تھی کہ وہ میرے ہم خیال ہو جائیں
لیکن بقول ان کے وہ اپنا مستقبل تباہ نہیں کرسکتے

شہناز۔ (غمگین لہجہ میں) نسرین! ندیم بھائی ہزاروں میں
ایک ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ انھیں ٹھکرا کر بعد میں تمہیں
افسوس ہو۔

نسرین۔ (تلخ لہجہ میں) اگر وہ اپنے مستقبل کی خاطر مجھے
ٹھکرا سکتے ہیں تو میں اپنے اصول کی خاطر اپنے
جذبات کا خون کرسکتی ہوں۔

شہناز۔ (اسے سمجھاتے ہوئے) میری اچھی بہن میری
کی بات مان لو۔ لڑکیاں بہت مجبور ہوتی ہیں۔
نسرین! مجھے اندازہ ہے کہ تم اپنے پر ظلم
کررہی ہو۔ تمھیں نہیں معلوم کہ تمہارے انکار
سے خالہ جان پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔

نسرین۔ (مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے) کمال ہے۔ میں ہنس
رہی ہوں اور تم آنسو بہا رہی ہو۔

شہناز۔ (آہستہ سے) ندیم بھائی کی تو کہیں نہ کہیں شادی
ہو جائے گی۔ مگر تم زندگی بھر تڑپتی رہوگی کیونکہ
مجھے معلوم ہے کہ تم ندیم بھائی کو پسند کرتی ہو۔

[illegible] آج تک تمھارے ذہن میں ان ہی کا تصور رہا ہے۔ وہ تمھارے خوابوں میں بسے ہوئے ہیں۔

نسرین۔ (سنجیدہ لہجہ میں) میں کسی ایسے شخص کو اپنی زندگی کا مالک نہیں بنا سکتی جو قابلِ اعتماد نہ ہو۔

شہناز۔ (تعجب سے) کیا کہہ رہی ہو تم۔!

نسرین۔ (سنجیدہ لہجہ میں) میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ تم خود سوچو شہناز جو شخص روپے کی خاطر اپنے ملک کو چھوڑ سکتا ہے۔ کیا وہ کل کسی دوسری لڑکی کی خاطر مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ (رُندھ کر) جو شخص اپنے وطن کا نہ ہوا وہ میرا کب ہو سکتا ہے تم ہی بتاؤ میں اس پر کیسے اعتماد کر سکتی ہوں۔؟

شہناز۔ (رندھ کر) سنا ہے کہ عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ اور۔

نسرین۔ (بات کاٹ کر) محبت کا جذبہ تو بے کراں اور بہت وسیع ہے۔ شہناز، وطن کی محبت کے مقابلے میں فرد کے ذاتی جذبات کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

شہناز۔ (سوالیہ لہجہ میں) تو میں خالہ جان کو کیا جواب دوں۔

نسرین۔ امی سے کہہ دو کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے میں اس پر قائم ہوں (رازدارانہ لہجہ میں) میں نے ابا جان کو اپنے خط میں تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ اور مجھے اندازہ ہے کہ انھوں نے میرے اس فیصلے کو ناپسند نہیں کیا۔

شہناز۔ (جذباتی لہجہ میں) نسرین! تم نے اپنی محبت کی قربانی دے کر ایک شاندار مثال قائم کی ہے۔ ان نوجوانوں کو سبق دیا ہے جو اپنے فرض کو بھلا بیٹھے ہیں۔ (پرجوش لہجہ میں) مجھے فخر ہے کہ تم میری سہیلی ہو۔ اچھا اب مجھے اجازت دو۔

(قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے)

منظر بدلتا ہے

(پس منظر میں دور سے نسرین کے کھانسنے کی آواز پھر آمنہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔)

آمنہ۔ (غمگین لہجہ میں) سُن رہے ہیں آپ کس بُری طرح کھانس رہی ہے۔

لطیف۔ (ٹالتے ہوئے) معمولی زکام ہے۔ آپ تو بلاوجہ پریشان ہو جاتی ہیں۔

آمنہ۔ (غمگین لہجہ میں) چھ مہینے میں میری بچی آدھی بھی نہیں رہی۔ میرے منہ میں خاک اگر خدا نہ کرے اسے کچھ ہو گیا۔ تو۔ تو۔

لطیف۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) اسے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہے (رندھ کر) وہ میری بیٹی ہے۔

آمنہ۔ (تلخ لہجہ میں) میری بچی کی تباہی کے آپ ذمہ دار ہیں (گلوگیر لہجہ میں) اگر آپ اسے مجبور کرتے تو شادی ہو جاتی۔

لطیف۔ (سمجھاتے ہوئے) اگر یہ شادی ہو بھی جاتی تو نسرین کبھی خوش نہیں رہتی۔ آپ نہیں جانتیں وہ بڑے نازک احساسات کی مالک ہے۔

آمنہ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اتنی خود سر ہو جائے گی تو میں کبھی اسے اتنا نہ پڑھاتی۔

لطیف۔ اس نے اعلیٰ تعلیم سے اچھا اچھا فائدہ اٹھایا۔ اس نے جو کچھ کیا ہے مجھے اس پر فخر ہے اور میں خوش ہوں بہت خوش (قدموں کی چاپ)

شہناز۔ تسلیم خالو جان!

لطیف۔ (جلدی سے) آؤ بیٹی آؤ بیٹھو۔ کہو تمھارا اسکول کیسا چل رہا ہے؟

شہناز۔ (فخریہ لہجہ میں) بہت اچھا جو بھی آتا ہے۔
نسرین بہن کے حسن انتظام کی بے انتہا تعریف
کرتا ہے۔
آمنہ۔ شہناز بیٹی! نسرین بہت غمگین رہتی ہے
تم اس کا خیال رکھا کرو۔
شہناز۔ (جلدی سے) نہیں خالہ جان! وہ تو ہر وقت
ہنستی رہتی ہیں۔ بڑی سے بڑی بات پر بھی
غصہ نہیں آتا (دروازے پر دستک)
لطیف۔ (اندر سے) کون ہے؟ ابھی حاضر ہوا۔ (قدموں
کی چاپ)
آمنہ۔ (آہستہ سے) تمہاری سہیلی کتنی دبلی ہو گئی ہے
تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے شہناز۔ وہ
ہر وقت چپ چپ رہتی ہے۔
شہناز۔ نہیں خالہ وہ تو خوب قہقہے لگاتی ہیں ہم
لوگوں کے ساتھ ٹینس کھیلتی ہیں (قدموں
کی چاپ)
لطیف۔ آہستہ سے ندیم کا خط آیا ہے۔ (کاغذ کی
سرسراہٹ)
آمنہ۔ (بیزاری سے) ہم لوگوں کو خط لکھنے کی کیا
ضرورت تھی۔ اسے اب واسطہ ہی کیا ہے؟
شہناز۔ (آہستہ سے) خالو جان کیا لکھا ہے ندیم بھائی
نے۔
لطیف۔ (قہقہہ لگا کر) خوب۔ بہت خوب۔ (ذرا
زور سے) مبارک ہو بیگم! ندیم آ رہا ہے۔
آمنہ۔ (تلخ لہجہ میں) اپنے گاؤں سے ناطہ کیا؟
لطیف۔ (ہنستے ہوئے) خط آپ کے نام ہے۔ لکھا
ہے ـــــ
آمنہ۔ (بیزاری سے) مجھے نہیں سننا۔ مجھے اس سے
نفرت ہے۔ اس نے میری لڑکی کی زندگی

برباد کر دی۔
لطیف۔ (خوشگوار لہجہ میں) مجھے معلوم ہے کہ تم
اس سے خفا ہو۔ لیکن خط تو سن لیجئے۔
لکھا ہے ـــ
ندیم کی آواز۔ پھوپھی جان! آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی
میں مستقل طور پر آ رہا ہوں۔ بہت دنوں تک
غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ
واقعی بقول نسرین میں نے منزل کی تلاش
میں خود کو گم کر دیا تھا۔ میری منزل میرا وطن
ہے۔ میں نسرین کا شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے
منزل کی نشاندہی کی۔
شہناز۔ (جلدی سے) میں ابھی آئی خالہ جان (تیز تیز
قدموں کی چاپ)
نسرین۔ (تعجب سے) کیا ہوا۔ اتنی بدحواس کیوں ہو؟
شہناز۔ (پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان) ندیم
بھائی آ رہے ہیں۔ خالو جان کے پاس خط
آیا ہے۔ (خوشی کے لہجہ میں) لکھا ہے
کہ میری منزل میرا وطن ہے۔ یہ بھی لکھا
ہے کہ میں نسرین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے
مجھے راستہ دکھایا۔
نسرین۔ (خوشی کے لہجہ میں) سچ۔
شہناز۔ (خوشی کے لہجہ میں) اللہ قسم! تم خط
دیکھ لو۔ آج میں (جذباتی لہجہ میں) بہت خوش
ہوں بہت خوش میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ
خوب گاؤں۔ بجز کوئی تو یہ خوشی کیسے
ٹیلیفون کے ٹیکل کرنے کو اطلاع رہی
ختم ہو کر تحلیل ہو جاتی ہے)
(ریڈ آؤٹ)
(بشکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

بادلوں کا سایہ

افرادِ تمثیل

ثاقب .... ایک نوجوان ڈاکٹر
بیگم .... ثاقب کی ماں
نصرت .... ثاقب کا دوست
عزیز الحسن .... ایک ریٹائرڈ ایس۔ پی
شائستہ .... عزیز الحسن کی لڑکی
کلثوم .... اسپتال کی ایک نرس

پہلا ایکٹ

(پہلا منظر)

منظر:۔ [ثاقب کا ڈرائنگ روم، خوب سجا ہوا۔ موجودہ فیشن کے تمام سامان سے آراستہ۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو ثاقب اور بیگم گفتگو کرتے نظر آتے ہیں، بیگم ایک صوفے پر بیٹھی ہیں اور ثاقب اس کے سامنے کھڑا ہے]

ثاقب:۔ ماں! آپ کو تو جانے کیوں ڈاکٹر نصرت سے کچھ بغض ہو گیا ہے۔ یقین کریں وہ انتہائی شریف اور نیک انسان ہے۔

بیگم:۔ ایک نمبر کا لفنگا ہے۔ باتیں تو دیکھو کیسی میٹھی میٹھی کرتا ہے۔

ثاقب:۔ (مسکرا کر) وہ میرا بچپن کا دوست ہے آپ نے کبھی کوئی ایسی بات دیکھی جس سے معلوم ہو کہ وہ لفنگا اور بدمعاش ہے

بیگم:۔ بچپن اور جوانی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تو مجھ سے بحث نہ کر مجھے تیرا اس سے ملنا جلنا ایک آنکھ نہیں بھاتا

ثاقب:۔ آپ تو دن رات میری ایسی نگرانی کرتی ہیں جیسے ابھی تک میں بالکل بچہ ہوں۔

بیگم:۔ تو اپنے آپ کو بوڑھا کب سے سمجھنے لگا۔ کل ہی اگر میں دوا نہ دیتی تو بغیر دوا کے رہتا۔

ثاقب:۔ (ہنس کر) لیکن ماں اب میں اپنا بھلا برا خود سوچ سکتا ہوں

بیگم:۔ تجھے اپنا بھلا برا سوچنے کا کیا حق ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں میں اپنا یہ حق تجھے نہیں دے سکتی۔

ثاقب:۔ (مسکرا کر) اچھا ماں جیسی تمہاری مرضی۔ مگر یہ تو بتلاؤ تم مجھے یوں کب تک قید کی سزا دیتی رہو گی۔

بیگم:۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) جب تک میں زندہ ہوں۔ میرے مرنے کے بعد جو تیرا جی چاہے وہ کرنا۔

(ثاقب ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ان سے لپٹ جاتا ہے پھر کچھ دیر بعد)

ثاقب:۔ [illegible]

لپیٹ کر رکھتا ہو۔

بیگم:۔ میں نے تجھے بڑی محنت سے پالا پوسا ہے اور تعلیم دلوائی ہے میں تیرے اوپر کوئی برا سایہ نہ پڑنے دوں گی۔

ثاقب:۔ مگر ماں! آپ نے مجھے ڈاکٹر بنایا ہے اگر میں یوں گھر میں بند رہوں گا تو میرے پیشہ کا کیا ہو گا۔ مجھے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملنا جلنا چاہئے ان کا دکھ درد سمجھنا چاہئے۔ جبھی تو میں اپنے پیشہ میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔

بیگم:۔ تیرے دل میں ہمدردی کا ہے خدمت کا جذبہ ہے ماں کی دعائیں ہیں تو ضرور کامیاب ہو گا۔

ثاقب:۔ (قہقہہ مار کر) اور وہ اس طرح پردہ میں رہ کر۔ ماں۔ تم تو مجھے ہر شخص سے ملنے جلنے سے منع کرتی ہو حتیٰ کہ مریضوں کو بھی تم لفنگا اور بدمعاش کہہ دیتی ہو۔ بھلا اس طرح میں اپنے پیشہ میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہوں۔

(ماں خاموش ہو جاتی ہے اور کچھ سوچنے لگتی ہے۔ ثاقب ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جاتا ہے اور آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر ٹائی باندھنے لگتا ہے۔ بیگم خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ ثاقب دوسرے کمرہ کی طرف جاتا ہے)

بیگم:۔ اب کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔

ثاقب:۔ ایک ضروری کام ہے۔ (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ثاقب رسیور اٹھا کر) ہلو۔ ہاں میں ڈاکٹر ثاقب بول رہا ہوں۔ ہاں ہاں آ رہا ہوں۔ بس روانہ ہونے ہی والا ہوں۔ (رسیور رکھ کر بیگم کی طرف دیکھ کر) میں جلد واپس آ جاؤں گا

بیگم:۔ مگر تو جا کہاں رہا ہے؟

ثاقب:۔ (ہنس کر) ایک ڈاکٹر اپنے مریض کے علاوہ اور کہاں جا سکتا ہے۔

بیگم:۔ مگر معلوم تو ہو وہ مریض ہے کون

ثاقب:۔ (مسکرا کر) مریض کوئی بھی ہو۔ ڈاکٹر کا فرض اس کا علاج کرنا ہے [illegible] سکتا ہے۔

بیگم:۔ [illegible]

نہیں رہوں گی۔

ثاقب:۔ (ہنس کر) مگر ماں ڈاکٹر ہر مریض کا حسب نسب تو پوچھتا نہیں ہے کہیں اس کی رپورٹ تمہارے روزنامچہ میں درج کرا دوں۔

بیگم:۔ اگر تو نہیں بتلائے گا تو میں تجھے جانے بھی نہیں دوں گی۔ جانے کیسے لوگ ہوں پھلا کر ہے۔

ثاقب:۔ (ایک کرسی پر بیٹھ کر) ماں! تم مجھے زندگی میں کچھ نہیں کرنے دو گی۔ اس شہر میں ہزاروں نوجوان ڈاکٹر ہیں کیا ان کی مائیں ان کی یونہی نگرانی کرتی ہیں۔

بیگم:۔ کرتی ہوں یا نہیں۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں پر میں تیری ایسی ہی نگرانی کرتی رہوں گی۔

ثاقب:۔ (مسکرا کر) میں نے کبھی تمہاری مرضی کے خلاف کوئی کام کیا ہے مگر تم تو میری ایسی نگرانی کرتی ہو جیسے میں تمہاری حکومت کا باغی ہوں اور اگر نگرانی نہیں کی گئی تو میں تمہاری حکومت کا تختہ الٹ دوں گا۔

بیگم:۔ تو یہ منحوس لفظ زبان سے نہ نکالا کر نہیں تو [illegible] باغی ہو جائے گا۔ سچ بتا کہاں جا رہا ہے؟

ثاقب:۔ اچھا ماں۔ میں آ کر ضرور بتا دوں گا

بیگم:۔ پر جانے سے پہلے کیوں نہیں بتلاتا۔

ثاقب:۔ (مسکرا کر) ابھی اپنے مریض کا حسب نسب معلوم کر کے آتا کا تبھی تو رپورٹ درج کراؤں گا۔ اچھا تو ماں جاؤں۔

بیگم:۔ نہیں۔ جب تک تو نہیں بتلائے گا میں جانے نہیں دوں گی آخر ماں کو یہ حق تو ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اس کی اولاد کہاں جاتی ہے کس سے ملتی ہے۔ بول کیا یہ میرا حق نہیں ہے؟

ثاقب:۔ ضرور ہے ماں۔ مگر۔

بیگم:۔ (بات کاٹ کر) تو پھر بتاتا کیوں نہیں ہے۔ (ثاقب کچھ [illegible] لگتا ہے اب [illegible] نہیں دیتا۔

[illegible]

جاسکتا تھا۔

بیگم :۔ یہ تو میں جانتی ہوں [illegible] شائستہ کرتی ہے [illegible] مرتبہ منع کیا کہ ایسی ویسی عورتوں سے ملا کر۔

ثاقب :۔ (غصے سے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینکتے ہوئے) ماں ! تم تو ہر کسی کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگتی ہو۔ (غصہ سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ ماں کچھ دیر خاموش بیٹھی رہتی ہے پھر دیوار پر لگی ہوئی تصویر کو دیکھ کر)

بیگم :۔ عورت ذات کہاں تک جوان لڑکے کی حفاظت کرے اب تو یہ سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ کون اچھا ہے کون برا۔ اے خدا تو ہی میری مدد کر۔ (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کچھ دیر بعد ثاقب پھر واپس آتا ہے اور ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرکے)

ثاقب :۔ ہلو۔۔ میں ڈاکٹر ثاقب بول رہا ہوں۔ میں اس وقت نہیں آسکتا۔ ایک فوری کام میں پھنس گیا ہوں۔ اسپتال جانا ہے۔ ایک فوری کیس ہے۔ (ریسیور رکھ دیتا ہے۔ بیگم اسے دیکھ کر)

بیگم :۔ اب جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ ماں نہیں آنے دیتی (ثاقب خاموش رہتا ہے) اب بولتا کیوں نہیں

ثاقب :۔ کیا بولوں۔ تم نے کہہ دیا، جانے نہیں جاؤں گا کس قدر (اکتاہٹ کے لہجے میں) بچپن سے ہی سنتا آرہا ہوں کہ یہ برا ہے وہ برا ہے۔ یہ لفنگا ہے وہ لچا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کون اچھا ہے ؟

بیگم :۔ تو میں تیرا برا چاہتی ہوں یہی کہنا چاہتا ہے نا۔

ثاقب :۔ یہ تو نہیں کہتا کہ برا چاہتی ہو مگر پیروں میں بیڑیاں ضرور ڈالے رکھنا چاہتی ہو۔

بیگم :۔ تو پھر جا۔ مجھے تجھ سے کوئی واسطہ نہیں اگر قسمت میں اور دکھ بھوگنا ہے تو وہ بھی بھوگ لوں گی۔

بہ شائستہ کے ماں باپ کیا کہیں گے کہ انھوں نے کھانے پر [illegible] جانا اور بہت [illegible] کستقدر بری ہوئی بات ہے۔

بیگم :۔ اور ماں کا حکم نہ ماننا تیرے نزدیک بڑا اخلاق ہے۔

ثاقب :۔ یہ بات نہیں ہے ماں ۔۔ مگر۔

بیگم :۔ (بات کاٹ کر) بس اب زیادہ نہ بول۔ اگر جانا ہے تو چلا جا یہ یاد رکھ بروں کی صحبت اچھوں کو بھی برا بنا دیتی ہے۔۔ (اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ ثاقب کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بیگم دوسرے کمرہ کے دروازے سے جھانک کر) تو گیا نہیں۔

ثاقب :۔ نہیں ماں اب نہیں جاؤں گا ۔ (اکتاہٹ کے انداز میں کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔)

(پردہ)

دوسرا منظر

منظر :۔ (وہی کمرہ دو تین دن بعد۔ کمرہ میں شائستہ اور ثاقب ہیں معلوم ہوتا ہے بہت دیر سے گفتگو کر رہے ہیں۔)

شائستہ :۔ کتنے ہی مہمان آئے تھے سب نے آپ کا پوچھا۔ کیا جواب دیتی۔ کتنی سبکی ہوتی ہے کہ دل ہی جانتا ہے۔

ثاقب :۔ سبکی کی کیا بات ہے (مسکرا کر) کہہ دیا ہوتا کہ ایک فوری کیس میں الجھ گئے ہیں اسلئے نہیں آسکے۔

شائستہ :۔ مجھے آپ کی طرح جھوٹ بولنا نہیں آتا۔

ثاقب :۔ اس میں جھوٹ بولنے کی کیا بات تھی۔

شائستہ :۔ اسلئے کہ آپ اسپتال میں نہیں تھے۔ میں خود اسپتال جاکر دیکھ آئی تھی۔

ثاقب :۔ (تعجب سے) تم اسپتال گئی تھیں !

شائستہ :۔ جی ہاں تاکہ جھوٹ سچ ظاہر ہو جائے [illegible] کے پاس حاضری بھی درج کرا [illegible] آپ [illegible] (ثاقب خاموش رہتا ہے) [illegible] گھبرائی ہوئی۔

ثاقب :۔ [illegible]

مشکل ہے۔

شائستہ:۔ آپ کہتے ہو مان گیا ہے۔ مگر آپ کو دھوکا دینے کی کیا ضرورت تھی؟

ثاقب:۔ دھوکا نہیں دیا مگر بات دراصل یہ ہے کہ۔

شائستہ:۔ (بات کاٹ کر) اب اور زیادہ دم دلاسے نہ دیجئے اگر نہیں آنا تھا تو کہہ دیا ہوتا دعوت کسی اور دن کے لئے ملتوی ہو جاتی۔

ثاقب:۔ مگر عین وقت پر۔

شائستہ:۔ ضروری کیس آ گیا ایک ضروری کام نکل آیا۔ جانے میں اتنی بدقسمت کیوں ہوں کہ جب بھی آپ آنے کا وعدہ کرتے ہیں تو کوئی ضروری کام نکل آتا ہے یا کوئی ضروری کیس آ جاتا ہے۔

ثاقب:۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں شائستہ یہ ہوتا رہا ہے۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ کب تک ہوتا رہے گا۔

شائستہ:۔ (غصے سے) تو یوں کہئے کہ آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔

ثاقب:۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔

شائستہ:۔ یہ بات نہیں ہے تو پھر کونسی بات ہے (ثاقب خاموش رہتا ہے۔ شائستہ اس کا چہرہ دیکھ کر) بتایئے کونسی بات ہے۔ آخر آپ بولتے کیوں نہیں۔ کیا کوئی ایسا راز ہے جو آپ مجھ پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔

ثاقب:۔ ہاں یونہی سمجھ لو۔ ویسے کوئی خاص راز ہے بھی نہیں جو تم سے کہا جائے۔

شائستہ:۔ میں جانتی ہوں کہ آپ نہ بتائیں گے۔ (طنزیہ) راز کسی دوسرے پر کیسے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ (بیگم کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے)

[illegible]:۔ [illegible] (ثاقب کھڑا ہو جاتا ہے شائستہ بھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ بیگم شائستہ کے پاس آتے ہوئے) [illegible] ہوں۔

شائستہ:۔ [illegible]

[illegible]:۔ [illegible] دیتی۔

شائستہ:۔ آپ نہیں [illegible]

بیگم:۔ ہاں۔ اسے کہہ [illegible] جھوٹ بولتا ہے اس لئے روک لیتی ہوں۔ اور مجھے یہ یقین نہ ہو جائے کہ یہ کسی غلط جگہ نہیں جا رہا۔ میں اسے نہیں جانے دیتی۔

شائستہ:۔ تو ہم غلط ہیں؟

بیگم:۔ یہ میں ابھی نہیں کہہ سکتی۔

ثاقب:۔ (بیگم کی طرف دیکھ کر) ماں! یہ شائستہ ہیں۔ اور شائستہ یہ میری ماں ہیں۔ (مسکرا کر) مجھے ایک منٹ نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔

بیگم:۔ مجھے تمہارا نام بہت پسند آیا۔ بیٹھ جاؤ۔ (پھر ثاقب کی طرف دیکھ کر) میں صبح سے دیکھ رہی ہوں کہ تو ایک منٹ کے لئے نہیں بیٹھا۔

ثاقب:۔ (مسکرا کر) اب ماں کام ہوتا ہے تو چلنا پھرنا پڑتا ہی ہے (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) شائستہ بیٹھو نا۔

شائستہ:۔ (بیگم کی طرف دیکھ کر) آپ بیٹھئے نا۔ (بیگم بیٹھ جاتی ہے شائستہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ بیگم پھر کھڑی ہو کر)

بیگم:۔ میں ابھی آتی ہوں (دوسرے کمرہ کی طرف جاتی ہے پھر پلٹ کر) دیکھ کہیں چلا نہ جانا۔ سمجھا۔ (اس طرح کھڑی رہتی ہے جیسے بلا جواب سنے نہیں جائے گی)

ثاقب:۔ (مسکرا کر) ماں! میں بلا تمہاری اجازت کے کہیں جاتا ہوں (بیگم دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہے۔ ثاقب شائستہ کی طرف دیکھ کر) میری ماں بھی عجیب ہیں مجھے ایک منٹ کے لئے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔

شائستہ:۔ (مسکرا کر) یہ تو ان کی سمجھداری ہے ورنہ آج کل کے نوجوان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔

ثاقب:۔ (ہنس کر) [illegible] میں نہ پڑ جاتی۔

شائستہ:۔ [illegible]

ثاقب :- ہاں - انھیں دنیا میں کوئی اچھا ہی نظر نہیں آتا۔

شائستہ :- تو مجھ سے زیادہ [illegible] اماں کا حکم ہے اماں کا حکم ہے۔

ثاقب :- مگر اس فرمانبرداری نے تو زندگی اجیرن کر دی ہے میں ایک قیدی کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں - اور جانے کب تک کروں گا۔

شائستہ :- جب تک ماں قید رکھے۔

ثاقب :- مگر زلفوں کی زنجیر نے ایسا قید کیا ہے کہ اب ہر بندھن توڑ ڈالنے کو جی چاہتا ہے۔

(شائستہ قہقہہ مار کر ہنستی ہے پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر)

شائستہ :- چھوڑئیے ان چوچلوں کو (طنزیہ مسکرا کر) آپ بھی کہاں کی باتیں لے بیٹھے معلوم ہوتا ہے فرصت زیادہ ہے۔

ثاقب :- کسی کا تصور ایک منٹ کی فرصت نہیں لینے دیتا اور تم فرصت کی بات کرتی ہو۔ ہر وقت کسی کا تصور کسی کا خیال۔

(بیگم چائے لے کر داخل ہوتی ہے)

شائستہ :- ارے آپ نے یہ تکلیف کیوں کی۔

بیگم :- اب بی بی تم پہلی مرتبہ آئی ہو کہیں یہ نہ کہو کہ میں بد اخلاق ہوں۔ بس ذرا اپنے بچے کے معاملہ میں سخت ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کا کسی سے ملنا جلنا کہیں آنا جانا بالکل پسند نہیں۔

شائستہ :- مگر ماں ـــ

بیگم :- (بات کاٹ کر) دیکھو بیٹی معاف کرنا میں ذرا پرانے خیال کی ہوں۔ آج کل کی لڑکیوں کے لچھن مجھے بالکل پسند نہیں (شائستہ کو چائے دے کر) لو چائے پیو۔ (شائستہ چائے لے کر اس کا گھونٹ لے کر)

شائستہ :- آپ چائے تو بہت اچھی بناتی ہیں۔

بیگم :- ہمارے زمانے کی مائیں گھریلو کاموں کی تعلیم دیتی تھیں۔ یہ آج کل کی لڑکیاں کیا جانیں بیچاری کپڑے درزی سے سلوائیں گی تو کھانا ہوٹل میں کھائیں گی۔

ثاقب :- (مسکرا کر) ماں! اس زمانہ میں یہ سب آسانیاں نہ ہوں گی۔

بیگم :- تمھیں کیوں نہیں - اللہ بخشے ہمارے ابا جان کو دونوں بچوں کے [illegible] رہے پر کبھی ہوٹل میں جا کر کھانا نہیں کھایا - مشہور لوگ ہوٹلوں کے دروازے پر قدم رکھتے شرماتے تھے۔ ہمیشہ اماں کے ہاتھ کا سلا انگرکھا پہنا۔ کبھی درزی سے نہیں سلوایا۔ خدا غریق رحمت کرے اماں کو۔ ایسا انگرکھا سیتی تھیں کہ درزی دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے تھے مگر آج کل کی لڑکیاں ایک بٹن ٹھیک سے نہیں ٹانک سکتیں کھانا پکانا تو دور رہا۔ جب ہی تو مجھے آج کل کی لڑکیاں ایک نظر نہیں بھاتیں۔

شائستہ :- میری امی بھی انہی خیالات کی ہیں آپ کسی روز ان سے ملئے آپ کو ان سے مل کر بڑی خوشی ہو گی۔

بیگم :- ارے گھر کے کام دھندوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے اور خدا نے بیٹا بھی دیا تو ایسا لاپرواہ کہ بس خدا بچائے اگر ذرا انتظار ہو کر جائے تو سارا گھر الٹ دے گا۔ بیمار پڑ جائے گا تو دوا سے جی چرائے گا لاکھ خوشامد کرتی ہوں تب کہیں جا کر ایک گھونٹ حلق سے اتارتا ہے۔

ثاقب :- ماں تم کو تو میں دن رات بیمار نظر آتا ہوں ہمیشہ دوا پیتے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔

بیگم :- بس اپنی ڈاکٹری رہنے دے تیری موٹی موٹی کتابوں میں وہ سب کچھ نہیں لکھا ہے جو ہم بوڑھے جانتے ہیں برسوں کا تجربہ ہمارا۔ (ثاقب مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ شائستہ کھڑی ہو کر)

شائستہ :- اب مجھے اجازت دیجئے۔

بیگم :- اچھا جا رہی ہو۔ پر دیکھو یوں بغیر اطلاع نہ آیا کرو پہلے سے کہلا دیا کرو بغیر اطلاع آنے سے میزبان کو شرمندگی ہوتی ہے۔

شائستہ :- یہ لیجئے آپ نے اسقدر مزیدار چائے پلائی اب اور کیا عزت ہو گی (مسکرا کر) اور بیچارے گھر میں کسی کو اطلاع دے کر آتے (سلام کر کے چلی جاتی ہے۔ بیگم کچھ دیر [illegible] ہے۔ پھر ثاقب سے مخاطب ہو کر)

بیگم :- دیکھا کیسی [illegible]

ایسی بات کہتے ہوئے [illegible]

[illegible]

ثاقب: [illegible] شفقت سے ایک [illegible] کی جان [illegible] ہوتی ہے تو
[illegible] ہمارا [illegible] تمہارے نامۂ اعمال میں ایک
سیاہ داغ ہوتا کہ زندگی بھر نہ دھلتا۔
ثاقب: [illegible] سائنس بھی کر [illegible] کے ہاتھوں سے جانے کتنی
موتیں ہوتی ہیں خدا ان کو معاف کر دیتا ہے۔
نصرت: خدا صرف انجانی غلطی کو معاف کرتا ہے پر دانی کو نہیں
اور تم نے شائستہ سے ملنا جلنا کیوں ترک کر دیا ہے۔
ثاقب: صرف ذاتی حالات کی بنا پر۔
نصرت: یہ ذاتی حالات نہیں ہیں تم اپنے آپ سے جنگ کر رہے ہو۔
اور اپنے آپ سے جنگ کا نتیجہ بہت برا ہوتا ہے۔
ثاقب: (الجھ کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ غیر ضروری اور غیر
دلچسپ موضوع کیوں لے بیٹھے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے
نصرت: تمہیں کوئی دلچسپی نہ ہو مگر مجھے ہے میں تمہیں اس وقت تک
معاف نہیں کر سکتا جب تک کہ تمہارے اس نامعقول رویہ
میں تبدیلی پیدا نہ ہو جائے۔
(ثاقب کوئی جواب نہیں دیتا۔ نصرت سگریٹ کا کش لے کر ثاقب
کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے۔ ثاقب کے چہرے سے پریشانی کے آثار ظاہر
ہوتے ہیں جیسے وہ کسی غیر معمولی الجھن میں گرفتار ہے۔ کچھ دیر
یہ کشمکش قائم رہتی ہے پھر آہستہ سے)
ثاقب: نصرت میری کچھ مجبوریاں ہیں کچھ کمزوریاں ہیں جو مجھے بہت
عزیز ہیں ان کو نہیں چھوڑ سکتا۔ (اسی وقت بیگم داخل
ہوتی ہے اور نصرت کو سگریٹ پیتا دیکھ کر)
بیگم: اچھا تو یہ دھواں اڑایا جا رہا ہے (نصرت گھبرا کر سگریٹ
پھینک دیتا ہے۔ بیگم ثاقب سے مخاطب ہو کر) کیوں تو بھی
سگریٹ پی رہا تھا۔
ثاقب: ہاں! ہم نے کبھی سگریٹ پیا ہے جو اب پیوں گا تمہیں تو ہر
بات میں شک رہتا ہے۔
بیگم: شک کیوں نہ ہو ہمیشہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ [illegible]
[illegible]

[illegible]
ثاقب: [illegible] تو میں جھوٹا اور مکار نظر آتا ہوں
بیگم: (اس کی بات پر مشتعل ہو کر) یاد رکھنا اگر کبھی سگریٹ کو ہاتھ بھی
لگایا تو تمام زندگی بات نہ کروں گی۔
ثاقب: ماں تمہاری حکومت تو اس قدر سخت گیر ہے کہ کبھی کبھی تو
اس سے بغاوت کرنے کو جی چاہتا ہے۔
بیگم: وہ تو تیرے لچھنوں سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن تو بغاوت
کرے گا مگر یاد رکھ ماں کے دل کو دکھا کر تو خوش نہیں رہے گا
نصرت: ماں! تم اس کی شادی کر دو سب بل نکل جائے گا۔
بیگم: بھلا اسے کوئی اپنی لڑکی دیتا ہے اور اگر دے بھی دے
تو بیچاری دو دن میں اکتا جائے گی میرا ہی ناک میں دم کر رکھا ہے
نصرت: اس کی دیکھ بھال سے تو کم از کم آپ کو فرصت مل جائے گی۔
بیگم: کیا ماں کی طرح وہ اس کی دیکھ بھال کرے گی۔ منہ پر
مکھیاں بھنکنے لگیں گی۔ صبح سے کہہ رہی ہوں داڑھی مونڈنے
پر سنتا ہی نہیں۔
نصرت: اور اب تو اس کو اسپتال میں کوارٹر مل گیا ہے دن رات
وہاں رہے گا آپ چوبیس گھنٹے تو اسے نہیں دیکھتی رہیں گی
بیگم: (گھبرا کر) کوارٹر مل گیا ہے۔
نصرت: جی ہاں۔
بیگم: (ثاقب کی طرف دیکھ کر) کیوں رے تو نے مجھ سے کہا
تک نہیں۔
ثاقب: کل ہی تو ملا ہے۔ تمہیں سمجھانے کے لئے فرصت کی
ضرورت تھی۔
بیگم: تو اب تو وہاں اکیلا رہے گا! نہیں میں تجھے وہاں نہیں
جانے دوں گی۔
ثاقب: مگر یہ نوکری ہے ماں جو حکم ملا ہے اس پر عمل کرنا پڑے گا۔
بیگم: مجھے ایسی نوکری نہیں چاہئے جس میں بیٹا ماں سے جدا
ہو جائے۔
ثاقب: تم بھی وہیں چل کر رہنا [illegible]

بیگم :- ہاں بلاؤ۔

(عزیز الحسن [illegible] داخل ہوتے ہیں اور بیگم کو سلام کرتے ہیں کو کہ چاروں طرف سے دیکھتے ہیں اور نظر الٹی ہوئی تصویر پر پڑتی ہے۔ ثاقب عزیز الحسن کو دیکھ کر)

ثاقب :- تشریف رکھئے اس وقت کیسے تکلیف فرمائی؟

عزیز الحسن :- (ایک کرسی پر بیٹھ کر) بھئی تم کئی روز سے ہمارے یہاں نہیں آئے کیا بات ہے۔

ثاقب :- کوئی بات نہیں آجکل مصروفیت زیادہ ہے۔

عزیز الحسن :- اس روز تم دعوت میں بھی نہیں آئے تمہارا بہت انتظار رہا

ثاقب :- جی ہاں چند مجبوریوں کی بنا پر نہ آسکا مجھے افسوس ہے۔

عزیز الحسن :- باہر سے کچھ مہمان آئے تھے وہ تم سے بالخصوص ملنا چاہتے تھے پھر شکار کا پروگرام تھا۔ تمہارے نہ ہونے سے سارا پروگرام بیکار ہوگیا (ثاقب خاموش رہتا ہے) شائستہ کئی دن سے بیمار ہے کل تمہیں فون کیا تو خود نہ آئے ڈاکٹر نصرت کو بھیج دیا۔

ثاقب :- میں اسپتال میں بے حد مصروف تھا۔ آپ کی کال ارجنٹ تھی اس لئے ڈاکٹر نصرت کو بھیج دیا تھا کہ شاید مجھے دیر ہو جائے

عزیز الحسن :- خیر اب آکر دیکھ لو۔ ڈاکٹر تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں مگر مریض کے عقیدہ کو علاج میں بڑا دخل ہوتا ہے۔

ثاقب :- مگر ڈاکٹر نصرت بھی معمولی ڈاکٹر نہیں ہے۔

عزیز الحسن :- ٹھیک ہے مگر ہم لوگوں کا عقیدہ ہے کہ خدا نے شفا تمہارے ہاتھ میں دی ہے۔

ثاقب :- شکریہ! مگر اس سائنٹفک دور میں عقیدہ تو ایک بے معنی چیز ہے آپ عقیدہ کی بات کہہ کر میرا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔

عزیز الحسن :- (مسکرا کر) بھئی ہم تو پرانے خیالات کے آدمی ہیں ہمارے زمانہ میں یہ سائنس پونہ سا تھا ہم لوگ صرف عقائد پر زندگی گذارنے کے عادی ہیں (ہنس کر) تھوڑی سی زندگی اور ہے وہ بھی یونہی گذر جائے گی (بیگم کی طرف دیکھ کر) آپ بھی کبھی ہمارے یہاں تشریف لائیے۔

بیگم :- بیس سال ہو گئے ہیں کہ میں نے ایک منٹ کے لئے اس گھر سے [illegible] کو قدم نکالا ہو۔

عزیز الحسن :- (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) اگر آپ نے ایسی کوئی قسم کھا رکھی ہے تو میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔

بیگم :- میں نے اس بیس سال میں پوری طرح اپنی قسم کو نبھایا ہے اگر یہ قسم نہ کھائی ہوتی تو ضرور حاضر ہو جاتی۔

عزیز الحسن :- (ثاقب سے) تو کسی وقت آکر شائستہ کو دیکھ لو۔

ثاقب :- ڈاکٹر نصرت برابر مجھ سے مشورہ کرتے رہتے ہیں۔ ویسے میں بھی کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔

عزیز الحسن :- ایک ہی لڑکی ہے اس کی ذرا سی تکلیف برداشت نہیں ہوتی (کھڑے ہو کر) اچھا تو اب میں چلوں۔ چاہو کسی وقت ضرور آجانا۔

بیگم :- خدا حافظ یہ میں چلنے کا۔

عزیز الحسن :- تکلیف نہ کیجئے پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔

بیگم :- (دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) پان تو کھاتے جائیے (دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہے۔ عزیز الحسن پھر کمرہ کا جائزہ لینے لگتے ہیں اور نظریں بار بار الٹی تصویر پر جم جاتی ہیں مگر خاموش رہتے ہیں۔ بیگم پان لے کر آتی ہے اور ثاقب کے ہاتھ میں دیتی ہے عزیز الحسن ثاقب کے ہاتھ سے پان لے کر کھاتے ہیں۔ پھر دروازے کے پاس پہنچ کر)

عزیز الحسن :- تو آج شام تک ضرور آجانا۔

ثاقب :- بہت بہتر۔ (عزیز الحسن چلے جاتے ہیں۔ ثاقب بیگم کو دیکھ کر) ماں! تم نے یہ تصویر کیوں الٹ دی۔

(بیگم کوئی جواب نہیں دیتی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ ثاقب حیرت سے اسے دیکھنے لگتا ہے)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

پہلا منظر

منظر :- (اسپتال کا کوارٹر۔ معمولی سازوسامان۔ عزیز الحسن کمرہ [illegible]

میں شامل رہے ہیں ان کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھ اور پریشان ہیں۔ (نصرت آتا ہے۔ عزیز الحسن اسے دیکھ کر)

عزیز الحسن :۔ کہو۔ ثاقب نہیں آیا۔

نصرت :۔ ماں ڈوس کے ساتھ آ گیا ہے۔ کہئے خیریت تو ہے۔

عزیز الحسن :۔ شائستہ کی حالت اور خراب ہو گئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اسے ایک مرتبہ آ کر دیکھ لے۔

نصرت :۔ میں نے جو بات دہرادی تھی وہ آپ نے بتا دی تھی۔ آپ تشریف تو رکھئے۔

عزیز الحسن :۔ ہاں بتا دی تھی (کرسی پر بیٹھ کر) مگر نیند نہیں آئی بے چینی رہی۔

نصرت :۔ (سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ کر) میرا خیال ہے کہ انہیں کوئی بیماری نہیں ہے صرف ذہنی الجھن ہے ذہنی الجھن ہی سے ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

عزیز الحسن :۔ اس روز ثاقب کے دعوت میں نہ آنے سے اسے سخت تکلیف ہوئی ہے۔ بلکہ وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی توہین کی گئی ہے۔

نصرت :۔ ثاقب نے غلطی تو کی ہے مگر اس کا انہیں اس قدر زیادہ اثر قبول نہیں کرنا چاہئے۔

عزیز الحسن :۔ حساس لڑکی ہے وہ محسوس کرتی ہے کہ اپنی سہیلیوں میں وہ بے عزت ہو گئی ہے بس سارا بخار اسی کا ہے۔

نصرت :۔ یہ خیال آپ ان کے دل سے نکالنے کی کوشش کیجئے۔

(عزیز الحسن کھڑے ہو کر ٹہلنے لگتے ہیں پھر کچھ دیر بعد)

عزیز الحسن :۔ یہ آجکل کا جو سماجی ڈھانچہ ہے اس میں انسان کے عجیب عجیب تصورات ہیں جن کو ہم نے اپنی زندگی بنالیا ہے۔ خیر چھوڑو میں کس وقت یاد کرنے آئے تھے

نصرت :۔ بے حد مشکور ہے کوئی ٹھکانہ نہیں آپ تشریف تو رکھئے۔

عزیز الحسن :۔ پھر میرا ٹھہرنا بیکار ہے۔

(جانے کے لئے دروازہ کی طرف بڑھتے ہیں)

نصرت :۔ مگر مجھے آپ سے دو چار باتیں کرنا ہے (عزیز الحسن رک جاتے

الشہاب

ہیں) آپ تشریف رکھئے۔ (عزیز الحسن کچھ سوچ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) آپ ثاقب کے معاملہ سے واقف ہیں

عزیز الحسن :۔ نہیں۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی (نصرت کا چہرہ غور سے دیکھ کر) مگر تم یہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو۔

نصرت :۔ یونہی۔ آپ جس روز ان کے گھر گئے تھے وہاں آپ نے کوئی تصویر الٹی لٹکی ہوئی دیکھی تھی۔

عزیز الحسن :۔ ہاں۔ اور مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ آخر ایک ہی تصویر کیوں الٹی ہے۔

نصرت :۔ وہ اسی وقت الٹی کی گئی تھی۔ وہ ثاقب کے باپ کی تصویر تھی جسے اسی وقت ثاقب کی ماں نے الٹا تھا۔

عزیز الحسن :۔ (سوچتے ہوئے) مگر انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔

نصرت :۔ یہی تو راز ہے خود ثاقب حیرت میں ہے اور اس کی ماں اس راز کو بتلانے کو تیار نہیں ثاقب کا کہنا ہے کہ اس کی ماں اکثر اس تصویر کو دیکھ کر بے تحاشہ رو پڑتی ہے اور ثاقب کے بار بار پوچھنے پر وہ اس راز کو بتلانے پر تیار نہیں ہوتی۔

عزیز الحسن :۔ اگر کبھی میں اس تصویر کو دیکھ لوں تو شاید کچھ جان سکوں۔

نصرت :۔ مگر اب اس کی ماں نے وہ تصویر بھی وہاں سے غائب کر دی ہے کہاں رکھی ہے اس کا ثاقب کو بھی پتہ نہیں۔

عزیز الحسن :۔ (سوچنے لگتے ہیں پھر نصرت کی طرف دیکھ کر) اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ بیس سال سے گھر سے ایک منٹ کے لئے نہیں نکلی۔ کیا یہ صحیح ہے۔

نصرت :۔ بالکل صحیح ہے میں بچپن سے ہی دیکھ رہا ہوں کبھی میں نے انہیں گھر سے ایک منٹ کے لئے باہر جاتے نہیں دیکھا۔

عزیز الحسن :۔ اس کے گھر کون کون لوگ آتے ہیں۔

نصرت :۔ پہلے تو باہر سے ان کے کچھ عزیز آیا کرتے تھے مگر کئی سال ہوئے انہوں نے بھی آنا چھوڑ دیا ہے وہ گھر پر بالکل تنہا رہتی ہیں۔

عزیز الحسن :۔ تمہارا ان کے متعلق کیا خیال ہے۔

نصرت :۔ دیکھنے میں بے حد سخت گیر ہیں مگر دل ان کا بے حد نرم ہے۔

(عزیز الحسن خاموش ہو جاتے ہیں کسی گہری فکر میں ڈوب جاتے

گلریز :- ڈاکٹر یہ تمہارے نصرت کو کیا ہو گیا ہے ہم اس کے ساتھ
ٹو آنہیں کر سکتا۔

نصرت :- (مسکرا کر) کیا ہوا مسٹر۔

گلریز :- ہو گیا کیا۔ کچھ دن سے پاگل ہو گیا ہے مریضوں کو جھڑکتا ہے۔

نصرت :- مسٹر وہ آجکل دماغی الجھنوں میں مبتلا ہے ذرا آپ
اس کا خیال رکھئے۔

گلریز :- ہم کیا خاک خیال رکھے وہ ہم سے بھی سیدھے منہ بات نہیں
کرتا ابھی اس نے ایک بچہ کی ماں کو جھڑک دیا۔ ہمیں بہت
دکھ ہوا۔ وہ بیچاری ماں اپنے بچہ کی ماں اپنے بچے کے لئے
التجائیں کرتا رہ گیا۔

نصرت :- آپ ہمیشہ اس کا خیال رکھتی ہیں کچھ دن میں ٹھیک ہو جائیگا

گلریز :- کیا خاک ٹھیک ہو جائے گا ایک اچھا ڈاکٹر بگڑا جا رہا ہے۔
کیا وہ عشق میں ناکام ہو گیا ہے جو یوں زندگی تباہ کر رہا ہے

نصرت :- (مسکرا کر) نہیں مسٹر ابھی اس کا عشق کرنے کا ارادہ نہیں
ہوا ہے۔

گلریز :- تو جلدی عشق کرے کیوں دوسروں کی زندگی سے کھیلتا ہے
(کمرہ سے چلی جاتی ہے نصرت مسکرا کر عزیز الحسن سے)

نصرت :- بڑی ہوشیار نرس ہے مگر شادی کو عشق کہتی ہے بس یہی
خرابی ہے۔

عزیز الحسن :- (مسکراتے ہیں پھر سوچ کر) ثاقب کے باپ کا کیا نام تھا۔

نصرت :- نجم الدین۔ انھیں مرے ہوئے بیس سال ہو گئے ہیں کیا آپ
اس نام کے کسی شخص کو جانتے ہیں۔

عزیز الحسن :- نجم الدین نام کے بہت سے لوگ ہوتے ہیں اور انہیں تو
مرے ہوئے بیس سال ہو گئے ہیں

نصرت :- اور ثاقب کی ماں نے بھی آج تک ان کے متعلق کچھ نہیں بتلایا
خود ثاقب کو بھی اپنے باپ کے متعلق کچھ زیادہ نہیں معلوم۔
یہ شاید چار برس کا تھا جب ان کا انتقال ہوا تھا۔ ثاقب کی
ماں خود اس کے لئے معمہ بنی ہوئی ہے مجھے تو کبھی کبھی یہ شک
ہوتا ہے کہ جیسے وہ اس کی ماں نہ ہو۔

عزیز الحسن :- یہ ہو سکتا ہے (سوچتے ہوئے) مگر اس نے وہ تصویر
مجھ سے کیوں چھپائی تھی ؟

نصرت :- یہی تو میں بھی سوچتا ہوں۔

عزیز الحسن :- مگر اس کا میری ذات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے ؟ (پھر خود
ہی جواب دیتے ہوئے) ممکن ہے کوئی راز ہو جس کا مجھے علم ہو
اور اس تصویر کو دیکھ کر کھل جائے (نصرت کی طرف دیکھ کر)
کیا وہ تصویر مجھے ایک مرتبہ نہیں دکھائی جا سکتی۔

نصرت :- وہ تصویر تو اس کی ماں نے چھپا دی ہے اس کا حاصل کرنا
مشکل ہے۔

عزیز الحسن :- اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو (کھڑے ہو کر) میں جب
تک یہاں رہوں گا شاید ثاقب واپس نہیں آئے گا۔ پھر اب میں
چلتا ہوں (دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) وہ آئے تو کہہ دینا
میں اس کا انتظار کرتے کرتے چلا گیا۔

نصرت :- میں شام میں کسی وقت آکر شائستہ کو دیکھ لوں گا۔ اور
(عزیز الحسن مڑ کر دیکھتے ہیں) کیا آپ کسی وقت شائستہ کو
یہاں نہیں لا سکتے۔

عزیز الحسن :- کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔
(کمرہ سے چلے جاتے ہیں)

(پردہ)

دوسرا منظر

منظر :- [وہی کمرہ۔ ثاقب اور گلریز کمرہ میں ہیں]

گلریز :- ڈاکٹر اب تم عشق کر لے ہم بلا وجہ پریشان ہوتا ہے

ثاقب :- (مسکرا کر) نہیں ابھی میرا ارادہ عشق کرنے کا نہیں ہے

گلریز :- تم نے کوئی لڑکی تلاش کیا جس سے عشق کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ثاقب :- نہیں ابھی ایسی کوئی لڑکی نہیں ملی۔

گلریز :- تم جھوٹ کیوں بولتا ہے۔ ڈاکٹر نصرت بولتا ہے کہ تم ایک جگہ
کرنا چاہتا ہے مگر تمہاری ماں نہیں کرنے دیتا

ثاقب :- (مسکرا کر) وہ یونہی کہتا ہوگا (بات ٹالنے کے انداز میں)
تم نے بیٹھے بٹھائے مریض کو آکسیجن دیا۔

گلریز :- ہماری لڑکی کو تم خوب سمجھتا ہے مگر تم بات کیوں ٹالتا ہے۔

ثاقب :- میں بات نہیں ٹالتا (مسکرا کر) میں جب عشق کروں گا تمہیں ضرور بلاؤں گا۔

گلریز :- اگر تم نہیں بلائے گا تو ہم خود آ جائے گا۔ ہم تمہاری مدر سے کہے گا کہ تم ڈاکٹر کی پسند کی لڑکی سے ڈاکٹر کو عشق کر لینے دو عشق اپنی پسند کا ہونا چاہئے۔

ثاقب :- (ہنس کر) نہیں مسٹر تم ان سے کچھ نہ کہنا۔

گلریز :- کیوں نہ بولنا۔ ہم نے بہت سے ڈاکٹروں کے ساتھ کام کیا ہے مگر تم سا بھلا آدمی نہیں دیکھا۔ تم ہم سے سچ بولے کہ تم اس لڑکی سے عشق کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔

ثاقب :- نہیں۔

گلریز :- تم جھوٹ بولتا ہے ہم کل ڈاکٹر نصرت کے ساتھ اس لڑکی کے گھر گیا تھا وہ کسقدر رنجیدہ ہو گیا ہے ہمیں بہت دکھ ہوا۔ ہم تم سے بولتا ہے کہ تم ایک بار اس سے ضرور جا کر مل لے۔

ثاقب :- نہیں مسٹر میں نہیں جاؤں گا

گلریز :- کیوں نہیں جائے گا۔ اگر نہیں جائے گا تو دو چار پیشنٹ کو مار ڈالے گا تم اتنا اچھا ڈاکٹر ہے آجکل الٹا سیدھا کام کر رہا ہے تم بدنام ہو جائے گا۔

ثاقب :- (پریشان ہو کر) تو پھر میں کیا کروں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

گلریز :- تم اس لڑکی سے عشق کر لے یہ ہمارا تم کو ایڈوائز ہے

ثاقب :- میں اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں اس سے نہیں مل سکتا مجبوری ہے۔ تم خدا کے لئے اس سلسلے میں کچھ نہ بولو۔

گلریز :- مگر ڈاکٹر نصرت بولتا ہے کہ تمہاری مدر اس سے نہیں ملنے دیتا کیا یہ سچ ہے۔

ثاقب :- ہاں سچ ہے۔

گلریز :- اوہ ہمارا تمہارا مدر کچھ نہیں سمجھتا [illegible] کبھی کبھی سب کا مدر بے وقوف ہو جاتا ہے ہمارا مدر [illegible] ہمارا فادر مرا ہمارا مدر نے دوسرا عشق کیا اس نے ہمیں بہت دکھ دیا۔ اوہ گاڈ۔

ثاقب :- (اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر) اب تمہارا مدر کہاں ہے۔

گلریز :- وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم گرجا میں جا کر رہے گا اور [illegible] ریڈنگ کیا اب اس کا کوئی پتہ نہیں (آنکھ سے آنسو پونچھتا ہے کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ پھر ثاقب سے مخاطب ہو کر) ہم تمہارا کیا مدد کر سکتا ہے۔

ثاقب :- شکریہ۔ جب تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی میں تم سے کہوں گا۔

گلریز :- ہم اس لڑکی کے گھر جائے گا اس کو سمجھائے گا کوئی تدبیر کرے گا کہ تم دونوں کا عشق ہو جائے (نصرت کمرہ میں داخل ہوتا ہے گلریز اسے دیکھ کر) یہ تمہارا دوست بالکل پاگل ہو گیا ہے یہ اپنی پسند کی لڑکی سے عشق نہیں کرے گا تو کس سے کرے گا۔

نصرت :- (مسکرا کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے) مسٹر یہ اپنی ماں کی پسند کی لڑکی سے عشق کرے گا۔

گلریز :- اوہ گاڈ۔ یہ تباہ ہو جائے گا (کچھ سوچتے ہوئے فکرمند ہو کر) ڈاکٹر تم اپنے کو سنبھالے ہم تمہارا مدد کرے گا۔

(چلی جاتی ہے۔ نصرت سگریٹ کے دو چار کش لے کر)

نصرت :- میں شائستہ کے گھر سے آ رہا ہوں۔

ثاقب :- اچھا۔

نصرت :- (ثاقب کو غور سے دیکھ کر) اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہوا۔

ثاقب :- اچھا۔

نصرت :- اس کے ماں باپ بے حد پریشان ہیں۔

ثاقب :- اچھا۔

نصرت :- (غصے سے) کیا اچھا اچھا لگا رکھا ہے کیا تمہارے دل احساس اور مروت کا نام نہیں ہے۔

ثاقب :- (طنزیہ مسکرا کر) احساس اور مروت! مجھے [illegible]

نصرت:۔ تمہاری طرح ضد سے، تو کیا تم شادی نہیں کرنا چاہتے،
اس سے شادی [illegible] نہیں چاہتے تو کرو۔ تم اس سے ملنا
جلنا نہیں [illegible] مگر یہ کونسی انسانیت ہے کہ تم ایک
ڈاکٹر اس کے معالج ہونا بھی پسند نہیں کرتے یہ پیشہ کے ساتھ
بد دیانتی ہے۔
ثاقب:۔ شہر میں ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہے مجھ پر ہی کیا منحصر ہے۔
نصرت:۔ بالکل منحصر ہے (غصے سے) میں نے تم جیسا نامعقول انسان
آج تک نہیں دیکھا۔
ثاقب:۔ (طنزیہ ہنس کر) تو تم بھی گالیاں دینے پر اتر آئے۔
نصرت:۔ دل دکھتا ہے تو زبان بھی چلتی ہے۔ تم میرے بچپن کے دوست
ہو ورنہ۔
ثاقب:۔ (مسکرا کر) مجھے گولی مار دیتے۔ زہر دیتے
نصرت:۔ یہ تو نہیں کرتا مگر تم سے علیحدہ ہو جاتا (سمجھانے کے انداز
میں) میں نے مانا کہ تم اپنی ماں کے فرمانبردار ہو اور یہ اچھا
ہے۔ تمہاری ماں اس کو پسند نہیں کرتی تم نے اس سے ملنا
جلنا چھوڑ دیا۔ چھوڑ دو لیکن ایسی صورت میں جبکہ وہ
بیمار ہے تمہیں اس کو ضرور اٹینڈ کرنا چاہئے۔
(ثاقب خاموش رہتا ہے نصرت کچھ سوچ کر) تم نے وہ تصویر
حاصل کی۔
ثاقب:۔ نہیں۔ جانے ماں نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے۔
نصرت:۔ اس تصویر کا حاصل ہونا بے حد ضروری ہے۔ سارا راز اسی
تصویر کا ہے جب تک وہ تصویر نہیں ملے گی تمہاری ماں
معمہ بنی رہے گی اور یہ راز فاش نہ ہو سکے گا۔
ثاقب:۔ لیکن ماں اتنا موقع ہی نہیں دیتی کہ اس کو تلاش کر سکوں
ہزار بار اس سے تصویر کے متعلق پوچھا مگر وہ کچھ نہیں
بتاتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں میرے لئے وہ تصویر
ایک اور الجھن بن گئی ہے۔
نصرت:۔ آج بہت دیر تک عزیز الحسن صاحب سے اس سلسلہ میں
گفتگو ہوتی رہی وہ خود حیران ہیں کہ آخر اس تصویر میں ایسی
کونسی

کونسی بات ہے کہ اسے اتنے عرصے چھپایا گیا۔ کیا تم نے
ماں سے نہیں پوچھا۔
ثاقب:۔ پوچھا کیوں نہیں مگر وہ کچھ بتائے بھی۔
نصرت:۔ عزیز الحسن صاحب کا خیال ہے کہ اس تصویر سے متعلق
کوئی کہانی ہے جس سے وہ واقف ہیں اسی لئے تمہاری ماں
نے وہ تصویر ان سے چھپائی تھی (سوچتے ہوئے) بڑی عجیب
بات تو یہ ہے کہ تمہاری ماں نے تمہیں تمہارے باپ کے
متعلق بھی کچھ زیادہ نہیں بتایا۔
ثاقب:۔ ہاں جب کبھی بات چھڑتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو
آجاتے ہیں مگر بات ٹال جاتی ہے میں حیران ہوں کہ آخر وہ
ایسا کیوں کرتی ہے۔
نصرت:۔ بیس سال سے تمہاری ماں ایک منٹ کے لئے گھر سے
نہیں نکلی یہ ایک اور حل طلب مسئلہ ہے عزیز الحسن صاحب
کا خیال ہے کہ وہ خود کو چھپائے رکھنا چاہتی ہے۔ کوئی
بڑا راز ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے والد کا انتقال
ہو چکا ہے۔
ثاقب:۔ انتقال تو یقیناً ہو چکا ہے اگر زندہ ہوتا تو ماں کبھی نہ کبھی
کوئی ایسی بات کہتی جس سے ان کے وجود کا شک ہوتا۔
نصرت:۔ بہر حال جس طرح بھی ہو وہ تصویر حاصل کرلو۔
(گلریز تیز تیز قدموں سے کمرہ میں داخل ہو کر ثاقب سے)
گلریز:۔ ڈاکٹر بیڈ [illegible] کے مریض کی حالت خراب ہو گیا ہے۔ تم
اسے جلدی اٹینڈ کرو۔
(ثاقب اٹھ کر تیزی سے چلا جاتا ہے نصرت گلریز سے)
نصرت:۔ سسٹر اس وقت تو آپ ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔
گلریز:۔ نہیں۔ ہم ادھر سے گزرا تو ڈیوٹی کی نرس نے ہم سے بولا ہم
ادھر چلا آیا ڈاکٹر کو خبر کرنے۔ بالکل [illegible]
نصرت:۔ (مسکرا کر) سسٹر اب تم کسی سے عشق کرلو۔
گلریز:۔ او ڈاکٹر تم ہم سے بدمعاشی کی باتیں کرتے ہے۔
نصرت:۔ کیا تم عشق نہیں کرو گی۔

گلریز :۔ ہم عشق نہیں کرے گا

نصرت :۔ کیوں نہیں کرو گی۔ جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو پھر کون تم سے عشق کرے گا۔

گلریز :۔ ہم مریضوں کی خدمت کرے گا (مسکرا کر) تم ہمیشہ عشق کی بات کیوں بولتا ہے

نصرت :۔ ہم تمہارے عشق کے بعد ایک شاندار پارٹی کھانا چاہتا ہے

گلریز :۔ اوہ! ڈاکٹر تم صرف پارٹی کھانے کے لئے ہمارا عشق کرانا چاہتا ہے ڈاکٹر تم بہت شریر ہے اگر تمہارا دوست عشق کرے گا تو ہم تم کو ایک شاندار پارٹی دے گا۔

نصرت :۔ سسٹر کبھی تم نے کسی کو عشق کے لئے پسند کیا ہے۔

گلریز :۔ اوہ ڈاکٹر تم ہمارا پرائیویٹ لائف کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے

نصرت :۔ (مسکرا کر) ہم تمہارا دوست ہے سسٹر۔ کیا تم ہم سے اپنے لوّر کا بات چھپانا چاہتی ہو۔

گلریز :۔ ہمارا لوّر گدھا تھا وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔

نصرت :۔ اب وہ تمہیں یاد نہیں آتا۔

گلریز :۔ وہ ایکدم گدھا تھا۔ سب مرد گدھا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ثاقب بھی گدھا ہے کیا اچھا لڑکی ہے کیا اچھا فیملی ہے مگر وہ اسے چھوڑ رہا ہے

نصرت :۔ مگر اس کی ماں اس لڑکی کو پسند نہیں کرتی۔

گلریز :۔ کیوں پسند نہیں کرتا شادی ڈاکٹر کرے گا یا اس کی ماں۔

(ڈاکٹر ثاقب منہ لٹکائے ہوئے داخل ہوتا ہے اور خاموش ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ کمرہ پر خاموشی چھا جاتی ہے ڈاکٹر نصرت اور گلریز اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہیں کچھ دیر بعد ثاقب ٹھنڈی سانس بھر کر)

ثاقب :۔ وہ چلی گئی

گلریز :۔ (کراس کا نشان بنا کر) کتنا نیک تھا۔ گاڈ بلیس ہم (سب کراس کا نشان بناتے ہے۔ پورے کمرے پر ایک اداس ماحول [illegible] جاتا ہے سب خاموش رہتے ہیں)

([illegible])

نشاط

تیسرا منظر

منظر :۔ (اسپتال کا ڈیوٹی روم۔ چند دن بعد عزیز الحسن اور نصرت بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں)

عزیز الحسن :۔ ڈاکٹر! یہ سسٹر گلریز کس قسم کی عورت ہے۔

نصرت :۔ بہت نیک ہے اس جیسی نرس پورے اسپتال میں نہیں

عزیز الحسن :۔ کل یہ ہمارے گھر آئی تھی بہت دیر تک شائستہ سے باتیں کرتی رہی۔

نصرت :۔ وہ ثاقب کا بہت خیال رکھتی ہے کل کہہ رہی تھی کہ اگر ڈاکٹر اس کے گھر نہیں جاتا ہے تو وہ شائستہ کو یہاں لے کر آئے گی

عزیز الحسن :۔ (سوچتے ہوئے) وہ کچھ زیادہ چالاک تو نہیں ہے۔

نصرت :۔ (مسکرا کر) نہیں وہ ایسی عورت نہیں ہے۔

عزیز الحسن :۔ اس تصویر کا کچھ پتہ چلا؟

نصرت :۔ جی نہیں۔

عزیز الحسن :۔ یہ بات تو بالکل طے ہے کہ ثاقب کی ماں کوئی بڑا راز پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے

نصرت :۔ میں بچپن سے اس کے ساتھ رہا ہوں اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی ذات سے کسی برائی کی توقع نہیں ہے۔

عزیز الحسن :۔ کیا اس کی پیدائش یہیں کی ہے یا یہ خاندان کسی اور جگہ سے یہاں آکر آباد ہوا ہے۔

نصرت :۔ (سگریٹ کا کش لے کر) میں نے ہوش سنبھالا ہے ان کو اس مکان میں رہتے دیکھا ہے یہ ان کا آبائی مکان ہے۔

(ڈاکٹر ثاقب کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور عزیز الحسن کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے۔ عزیز الحسن مسکرا کر)

عزیز الحسن :۔ آؤ ثاقب، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

ثاقب :۔ مجھے اب شائستہ بیگم کا مزاج کیسا ہے۔

عزیز الحسن :۔ قدرے بہتر ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس تصویر کا پتہ چلا۔

ثاقب :۔ (عزیز الحسن کا چہرہ غور سے دیکھ کر) جی نہیں۔

عزیز الحسن :۔ میں سمجھتا تھا کل تم نے مجھے چھپایا [illegible]

ثاقب:۔ جو ایک [illegible] کے جہیز میں ملا تھا (شکوک نظروں سے عزیز الحسن کو دیکھ کر) آپ یہ سب کیسے بیان فرما رہے ہیں؟

عزیز الحسن:۔ کوئی خاص بات نہیں۔ تم اسی مکان میں پیدا ہوئے ہو

ثاقب:۔ جی ہاں۔ ماں کہتی ہیں کہ وہ اس مکان میں دلہن بن کر آئی تھیں

عزیز الحسن:۔ (سوچتے ہوئے) سمجھ گئے ہوتے۔ چونکہ یہ مکان تمہاری ماں کو جہیز میں ملا تھا اس لئے وہ اس میں دلہن بن کر ہی آ سکتی تھیں (مسکرا کر) ہمارے یہاں دولہا دلہن کو بیاہ کر اپنے گھر لے جاتا ہے

ثاقب:۔ (سوچتے ہوئے) میں نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا۔

عزیز الحسن:۔ دیکھو ڈاکو کا خزانہ ہے جس کو تمہاری ماں تم سے چھپا رہی ہے۔ جب تک یہ راز نہیں کھلے گا تمہاری ماں یونہی معمہ بنی رہے گی اور تم یونہی پریشان رہو گے۔ اس راز کا فاش ہونا بے حد ضروری ہے۔

ثاقب:۔ میں مجبور ہوں کچھ نہیں کر سکتا۔ ماں کچھ بتلانا نہیں چاہتی۔ آپ ہی بتلائیے میں کیا کروں۔

عزیز الحسن:۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں (کچھ سوچ کر) جس قیمت پر بھی ہو وہ تصویر حاصل ہونا چاہئے۔

ثاقب:۔ ماں نے کہاں چھپا رکھی ہے مجھے علم نہیں اور پھر دن بھر وہ گھر کی چوکیداری کرتی رہتی ہے۔

عزیز الحسن:۔ تمہاری ماں تمہارے ساتھ ظلم کر رہی ہے۔ تمہیں تباہ کر رہی ہے۔

ثاقب:۔ نہیں خانصاحب ایسا نہ کہئے وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے۔

عزیز الحسن:۔ اور یہی محبت تمہارے لئے مصیبت بنی ہوئی ہے تمہارا باپ کوئی ڈاکو نہیں تھا۔ چور نہیں تھا۔ قاتل نہیں تھا جس کی زندگی کو اس نے تم سے یوں پوشیدہ کر رکھا ہے (ثاقب بے چینی کے عالم میں کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے) اور اگر وہ یہ سب کچھ تھا تو اس کی سزا تمہیں نہیں بھگتنا چاہئے۔ اگر وہ اس دنیا میں نہیں ہے تو پھر وہ اپنا کردار یا سلیقہ اعمال اپنے ساتھ لے گیا۔

ثاقب:۔ لیکن باپ کے کئے کی سزا بیٹے کو بھگتنا پڑتی ہے یہ ایک پرانا اصول ہے۔

عزیز الحسن:۔ یہ سب خبط ہے۔ اس بے اعتنائی کے گرداب میں تم پیدا ہوئے تھے (کچھ دیر خاموش رہ کر) میں تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں (ثاقب کوئی جواب نہیں دیتا اسی طرح کمرہ میں ٹہلتا رہتا ہے۔ عزیز الحسن دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) اچھا میں چلتا ہوں جب تمہیں میری ضرورت ہو ضرور میرے پاس آنا (عزیز الحسن چلے جاتے ہیں۔ ثاقب کمرہ میں ٹہلتا رہتا ہے۔ نصرت سگریٹ کے دو چار کش لے کر)

نصرت:۔ کل سہ پہر کو میں شائستہ کے گھر گئی تھی (ثاقب کوئی جواب نہیں دیتا۔ نصرت اس کا چہرہ دیکھ کر) وہ وہاں سے بہت ناامید ہو کر آئی ہے۔

ثاقب:۔ کیسی ناامید ؟

نصرت:۔ اس نے تم سے ہمیشہ کے لئے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔

ثاقب:۔ یہ بھی اچھا ہو گیا۔ (نصرت سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہے) کیا معلوم میرا باپ چور ڈاکو یا قاتل رہا ہو۔

نصرت:۔ تمہاری ذات کا اس کے افعال سے کیا تعلق ہے۔

ثاقب:۔ (طنزیہ مسکرا کر) ایک چور ڈاکو اور قاتل کی اولاد چور ڈاکو یا قاتل ہی ہو سکتی ہے۔

نصرت:۔ بہکی بہکی باتیں نہ کرو۔ میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم شائستہ سے جا کر مل لو۔

ثاقب:۔ میں ہرگز اس سے نہیں ملوں گا۔

نصرت:۔ لیکن تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔

ثاقب:۔ یہ جھوٹ ہے فریب ہے مجھے کسی سے محبت نہیں رہی ہے میں یہ بات تم سے کہہ چکا ہوں پھر جانے کیوں تم بار بار اس مسئلہ کو چھیڑتے ہو۔

نصرت:۔ ثاقب! بد اخلاق دنیا میں ہم نے اس کا [illegible] کیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اسے کوئی [illegible] نہیں ہے لیکن اگر تمہارا

بھی تو یہ ساتھ ایک دن سے روٹی بھی ہو سکتی ہے۔

ثاقب :۔ تو پھر مجھ جیسا انسان، جس کی قسمت ہی میں کچھ نہ لکھا ہو کر سکتا ہے۔

نصرت :۔ غلط ہے ہم اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کو اپنی قسمت کا نام دیتے ہیں۔

ثاقب :۔ (جھنجھلا کر) یہ تم ناصح مشفق کب سے بن گئے ! یہ نصیحتیں میں نہیں سننا چاہتا۔

نصرت :۔ (کھڑے ہو کر) اور تم کو اس وقت تک سننا پڑیں گی جب تک تم اپنا رویہ تبدیل نہ کر لو۔

ثاقب :۔ میں اپنا رویہ تبدیل کرنے کو تیار نہیں ہوں۔

نصرت :۔ (غصے سے) تو پھر مجھے اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑے گا اور کہنا پڑے گا کہ تم خود غرض ہو، بزدل ہو، جس میں نہ ہمت ہے نہ جرأت۔

ثاقب :۔ (زور سے چیخ کر) نصرت ! خاموش رہو ورنہ ۔ [گلریز کمرے میں داخل ہوتی ہے]

گلریز :۔ اوہ بابا۔ تم دونوں اتنا چیخ چیخ کر کیوں باتیں کر رہا ہے

نصرت :۔ (آہستہ سے) کچھ نہیں سسٹر۔ مردوں کو انجکشن لگانا فضول ہے

گلریز :۔ کیا ڈاکٹر ثاقب نے پھر کیس بگاڑا۔ (نصرت کوئی جواب نہیں دیتا اور کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ گلریز ثاقب کو دیکھ کر) ڈاکٹر آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔

ثاقب :۔ (اسی طرح غصے سے چیخ کر) میں پاگل ہو گیا ہوں۔ پاگل ہو گیا ہوں۔

گلریز :۔ اوہ ڈاکٹر! تم برا بات زبان سے نکالتا ہے، ہم تو تمہارا بھلا چاہتا ہے۔

ثاقب :۔ (کسی قدر نرمی سے) جو بھی میرا بھلا چاہتا ہے وہ ایک دن مجھے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ شائستہ چلی گئی۔ عزیز الحسن چلے گئے۔ نصرت چلا گیا (طنزیہ مسکرا کر) ایک روز تم بھی چلی جاؤ گی۔

گلریز :۔ ہم ایسے دغا باز نہیں ہے ڈاکٹر۔ ہم نے تمہارا جیسا [illegible] کبھی نہیں دیکھا، ہم تم کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

شہاب

ثاقب :۔ سب ہی یہی کہتے ہیں مگر ایک دن چھوڑ جاتے ہیں (ٹھنڈا سانس بھر کر) شائستہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔ عزیز الحسن مجھے چور، ڈاکو اور قاتل کی اولاد سمجھتے ہیں، نصرت مجھے غیر حساس، بددیانت، لاپرواہ اور بے مروت سمجھتا ہے (پریشان ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ میں کیا ہوں ؟

گلریز :۔ تم ایک شریف انسان ہے۔ ٹھیک آدمی ہے، ہم تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ ڈاکٹر ہم تمام زندگی تمہارے ساتھ رہے گا۔ تمہاری خدمت کرے گا۔

ثاقب :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) شکریہ ! (ناکامی کی مسکراہٹ سے) جب میں مروں گا تو میرا کوئی دوست نہیں ہو گا۔

گلریز :۔ اوہ ڈاکٹر تم مرنے کی بات سوچتا ہے اتنا نیک ہو کر (آنکھوں میں آنسو بھر کر) تم ایسا بات نہ بولو ڈاکٹر ہم بہت دکھی ہو جائے گا

ثاقب :۔ (حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ کر) تمہاری آنکھوں میں آنسو۔

گلریز :۔ کیوں ڈاکٹر ہم انسان نہیں ہے کیا ہم کسی کے دکھ سے دکھی نہیں ہو سکتا۔ ہم تمہارا دکھ بانٹ لینا چاہتا ہے۔

ثاقب :۔ (اپنے ہاتھ سے اس کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر) آج میں نے دنیا کے سب سے قیمتی آنسو دیکھے ہیں۔ تم نے میرے دکھ پر دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ لٹا دیا ہے۔ میں اس کا بدلہ نہیں دے سکتا۔

گلریز :۔ ہم بدلہ نہیں چاہتا ڈاکٹر۔ جب ہم اسکول میں پڑھتا تھا ہمارا باپ مر گیا ہم دکھی رہنے لگا۔ ہمارے بھائی نے دوسرا [illegible] ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہمارا [illegible] وہ بھی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہم جانتا ہے کہ [illegible] ترس رہتا ہے۔

ثاقب :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) تمہاری کہانی بہت دکھ بھری ہے۔

گلریز :۔ ڈاکٹر تم ہم کو بہت بھلا آدمی لگتا ہے ہم تم کو دکھی نہیں ہونے دے گا۔

ثاقب :۔ تم کس قدر اچھی ہو شائستہ سے بھی زیادہ اچھی [illegible]

خرمن

(یہ ڈرامہ ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہو چکا ہے)

پہلی بار . . . . ۹ جولائی ۱۹۶۶ء

دوسری بار . . . . . . ۱۱ مارچ ۱۹۶۷ء

تیسری بار . . . . . . ۱۹ اپریل ۱۹۶۸ء

۔ کردار ۔

واجد	ایک متوسط گھرانے کے بزرگ
خانم	واجد کی بیگم
ثمینہ	واجد کی بڑی شادی شدہ لڑکی
میمونہ	واجد کی منجھلی لڑکی جو افسانہ نگار اور مصور ہے۔
نجمہ	میمونہ کی چھوٹی بہن
احسن	واجد کے بچپن کے دوست
شہاب	ایک نوجوان ڈاکٹر
روبینہ	شہاب کی منگیتر
شاہد	ثمینہ کا شوہر
فراست	شاہد کا بے تکلف دوست
دو لڑکیاں	نجمہ کی سہیلیاں

[ابتدائیات۔ موسلا دھار بارش کا شور، بجلی کی کڑک۔ اسے سن کر خانم کی چیخ سنائی دیتی ہے۔]

خانم:۔ (بہت ڈری ہوئی) میرے! میری بچی۔

واجد:۔ (گھبراہٹ سے) خانم۔ خانم۔ کیا ہوا؟

خانم:۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) کون ہو تم؟

واجد:۔ (پریشان کن لہجے میں) تمہیں تو کچھ ہوا۔ میں ہوں میں۔

لاحول ولا قوۃ۔ ارے بھئی میں تمہارا واجد!

خانم:۔ (چونک کر) اوہ۔ آپ! میمونہ کہاں ہے؟

واجد:۔ میمونہ اور نجمہ چھوٹے کمرے میں سو رہی ہیں۔ بلاؤں انہیں۔

خانم:۔ (آہستہ سے) نہیں بلانے کی ضرورت نہیں۔

واجد:۔ تو پانی پیو۔ (چھوٹی سی خاموشی)

خانم:- آپ پریشان سے ہیں، پلکیں آرام کیجئے۔

واجد:- (رنجیدگی سے) کیا بات تھی؟ (پس منظر میں بارش کا شور)

خانم:- (آہستہ سے) میں نے خواب میں دیکھا۔ میمونہ تصویر بنا رہی ہے۔ اچانک بجلی گری۔ (بجلی کی کڑک)

واجد:- (جلدی سے بات کاٹ کر) لاحول ولا قوۃ۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ رات کو کھانا جلدی کھا لیا کرو۔ تاکہ معدے پہ بوجھ نہ رہے۔

خانم:- آج تو بھوک ہی نہیں لگی۔ ٹھیکیدار صاحب کے یہاں کی عورتوں کے جانے کے بعد سے دل میں عجیب سا درد ہونے لگا تھا۔

واجد:- ہزار بار کہہ چکا ہوں اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر نہ لیا کرو۔

خانم:- (غمگین لہجہ میں) کیسے اثر نہ لوں۔ انسان ہوں پتھر نہیں (بجلی کی کڑک) یہ دسویں بار ہوا ہے کہ لڑکے والوں نے مونا کو دیکھ کر رائے بدل دی اور چھوٹی کے لئے سوال کیا۔

واجد:- (ٹالتے ہوئے) یہ تو کوئی خاص بات نہیں۔

خانم:- (ٹھنڈی سانس لے کر جذباتی لہجے میں) کیا میری مونا کے سہرے کے پھول کبھی نہیں کھلیں گے۔ کیا میری بچی کی مانگ میں افشاں نہیں بھری جائے گی۔ (پس منظر میں بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج)

واجد:- خانم ایسی مایوسی کی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔

خانم:- (غمگین لہجہ میں) جب میں مہمانوں کے لئے چائے لے کر آ رہی تھی تو میں نے اپنے کانوں سے سنا۔

واجد:- (سوالیہ لہجہ میں) کیا سنا؟

خانم:- (دکھی لہجہ میں) ٹھیکیدار صاحب کی بڑی لڑکی حامد سے کہہ رہی تھی۔ امی یہ تو سیاہ چاند ہے۔

واجد:- (غصہ ضبط کرتے ہوئے) پست ذہنیت کے لوگوں کی بات کا اتنا گہرا اثر نہیں لینا چاہئے۔ تم تو خاصی سمجھدار ہو۔

خانم:- (غمگین لہجہ میں) ثمینہ کی شادی کو چار سال ہو گئے ہیں۔ اللہ رکھے وہ دو بچوں کی ماں بھی ہو گئی لیکن پچھلے چار برس میں میمونہ کے لئے کوئی رشتہ نہیں آیا۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) نہ جانے اس لڑکی کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟

واجد:- (بات کاٹتے ہوئے) مجھے میمونہ کی شادی کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ایم۔ اے کر لے۔

خانم:- (ٹھنڈی سانس لے کر) اس کی وجہ سے نجمہ بیٹھی ہے۔ نجمہ کے لئے تو تحصیلدار صاحب کی بیوی میری جان کو آ گئی ہیں۔

واجد:- میں تو تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ نجمہ کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤ۔

خانم:- (سنجیدہ لہجہ میں) یہ کیسے ممکن ہے کہ بڑی بیٹی رہے اور چھوٹی کی شادی کر دوں۔ دنیا والے کیا کہیں گے؟

واجد:- (تلخی سے) دنیا والوں کو بکنے دو۔ یہ کبھی خوش نہیں رہتے۔

خانم:- (رقت سے) ثمینہ اور نجمہ کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرتا کہ میمونہ ان کی سگی بہن ہے۔

واجد:- (شکایتی لہجہ میں) خانم! تم بھی دنیا والوں کی طرح صرف ظاہر دیکھتی ہو۔ تم نے ماں ہو کر بھی (اپنی بیٹی) کا باطن نہیں دیکھا (نہ دیکھ سکیں) تمہیں نہیں معلوم اس سیاہ جسم کے اندر کتنی شفاف اور اجلی روح ہے۔

خانم:- (غمگین لہجہ میں) میں جانتی ہوں وہ دوسری لڑکیوں سے بالکل الگ ہے۔ اسے نہ پہننے اوڑھنے کا شوق ہے نہ کھانے پینے کا شوق۔

واجد:- (تیز لہجے میں) تم کچھ نہیں جانتیں۔ تم نے اس انسان کو نہیں دیکھا جو اس میں چھپا ہوا ہے۔ تم نے کبھی اس کی کہانیاں نہیں پڑھیں۔ کبھی اس کی تصویریں نہیں دیکھیں۔ تمہیں کیا معلوم وہ کیا ہے؟ وہ صرف

بھیجنا بھی ضروری کیا ہے؟

خانم :- (سوالیہ لہجے میں) لیکن آپ اسے کب تک ٹھکراتے رہیں گے؟

واجد :- (ناصحانہ لہجے میں) خانم! وہ آرٹسٹ ہے۔ افسانہ نگار ہے۔ اس کے محسوسات بڑے نازک ہیں۔

خانم :- (بات کاٹ کر) میں جانتی ہوں میری حسن بہت حساس ہے۔ [بجلی کی کڑک]

واجد :- (اداسی سے) اسی لئے میں نہیں چاہتا کہ وہ زندگی کے کسی مرحلے میں احساس کمتری کا شکار ہو۔

خانم :- (آہستہ سے) آپ سمجھتے نہیں کہ اسے ان حالات کا اندازہ نہیں ہے۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ لڑکے والیاں اسے دیکھ کر کیوں پسند نہیں کرتیں؟ کیوں اس کے مقابلے میں نجمہ کو پسند کیا جاتا ہے؟

واجد :- (تلخی سے) اسی لئے تو کہتا ہوں کہ تم آنے جانے والوں کے سامنے اسے نیلام کے مال کی طرح نہ پیش کیا کرو۔ (جذباتی لہجے میں) خدارا اسے یہ محسوس نہ ہونے دو کہ تم اس کی شادی کے لئے پریشان ہو۔

خانم :- (آہستہ سے) میری خاموشی سے کیا ہوتا ہے؟ (ٹھنڈی سانس لے کر) عزیز و اقارب اور محلے والوں کی زبان تو میں نہیں روک سکتی۔ (گھڑی چار بجاتی ہے)

واجد :- اوہ! چار بج گئے۔ خانم اب تم سو جاؤ۔ [بادلوں کی گرج]

خانم :- (غمگین لہجے میں) جس ماں کے سینے پر دو دو سلیں دھری ہوں اس کی آنکھوں میں نیند کہاں۔

واجد :- (بات ٹالتے ہوئے) لاحول ولا قوۃ۔ بالکل ہی بھول گیا۔ میرے کمرے کی کھڑکی کھلی ہے۔ میز پر کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ دیکھ آؤں کہیں بھیگ نہ جائیں۔

[قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے]

منظر بدلتا ہے

[ہلکی ہلکی پرسکون موسیقی کے درمیان ایک مترنم آواز سے قہقہے کی گونج۔ پھر ایک مترنم آواز ابھرتی ہے]

میمونہ :- (خوشگوار لہجے میں) میں سمجھ گئی ابو۔

واجد :- (ہنستے ہوئے) کیا سمجھ گئیں؟

میمونہ :- (ہنستے ہوئے) یہی کہ یہ تصویر آپ کو پسند نہیں آئی۔

واجد :- (سنجیدہ لہجے میں) تصویر تو اچھی ہے۔ مگر اس میں تم! زندگی کے حقائق کو پوری طرح جذب نہیں کر سکی ہو۔

میمونہ :- (سنجیدہ لہجے میں) میں نے اس تصویر میں زندگی سے مایوس انسان کے جذبات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

واجد :- (سنجیدہ لہجے میں) فن کے شعلے کو اور تیز کرو۔ اس تصویر کی طرح جو تم نے نمائش میں بھیجی ہے۔

میمونہ :- (انکسار سے) تصویر تو وہ بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں دولہا بھائی نے اسے اس قابل سمجھا۔

واجد :- (سنجیدہ لہجے میں) اس تصویر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی صداقتوں کی مظہر ہے۔

خانم :- (آواز دور سے) میمونہ۔ مونی! اپنے ابو سے کہو افضل بھائی آئے ہیں۔

واجد :- (زور سے) کریم سے کہیے بڑے کمرے کا دروازہ کھول دے (میمونہ سے مخاطب ہو کر) اچھا بھئی اب باقی تصویریں کل دیکھیں گے۔

میمونہ :- (آہستہ سے) ابو! آج میرے رنگ لانا نہ بھول جائیے گا۔

واجد :- (ہنستے ہوئے) اچھا کیا جو تم نے یاد دلا دیا (قہقہہ لگا کر) میں تو واقعی بھول گیا تھا۔

(قدموں کی چاپ بتدریج بلند ہو کر ہلکی ہو)

خانم :- (تیز لہجے میں) آپ اس لڑکی کو اور غارت کر رہے ہیں۔

واجد :- (چونک کر) کیا فرمایا؟ میں غارت کر رہا ہوں میمونہ کو!!

خانم :- (تیز لہجے میں) اور جو کچھ کمی تھی وہ شاہد میاں نے پوری کر دی ہے۔

واجد :- (سوالیہ لہجے میں) آپ چاہتی کیا ہیں؟

خانم :۔ (اپنے بچپن ... [illegible] ...) اب میرے چاہنے کیا ہے ۔ پھول تو
لئے دیمک بنا دیا۔

واجد :۔ (ہنستے ہوئے) دیمک ؟

خانم :۔ (تلخی سے) اور نہیں تو کیا پہلے دن رات کمرے میں گھسی
کتابیں چاٹا کرتی تھی ۔ اب تصویریں بنایا کرتی ہے۔

واجد :۔ (زور دے کر) تم نہیں جانتیں خانم ۔ میمونہ ہیرا ہے ہیرا !
ہنستے ہوئے فخر کرو کہ تم اس کی ماں ہو۔ (قہقہہ)

خانم :۔ (تلخ لہجے میں) وہ آپ کی نظر میں ہیرا ہے ۔ مگر دنیا کی نظر میں
تو پتھر ہے ۔ کوئی بھی تو اس ہیرے کا طلب گار نہیں ۔

[قدموں کی چاپ ابھرتی ہے]

نجمہ :۔ (خوشگوار لہجے میں) ابو ، چلئے باہر بھیج دی ہے ۔

واجد :۔ (محبت بھرے لہجے میں) جا رہا ہوں بیٹی ۔

خانم :۔ (آہستہ سے) آپ اغنی بھائی سے کہئے کہ وہ حکیم صاحب
کے لڑکے کے بارے میں معلومات کریں ۔

واجد :۔ (بیزاری سے) پیام تو آنے دو ۔

خانم :۔ (زور دے کر) ان کے یہاں کی عورتیں میمونہ کو دیکھنے آنا
چاہتی ہیں ۔

واجد :۔ (بیزاری سے) اچھا کبھی کہہ دوں گا (قدموں کی چاپ)

اغنی :۔ کیا بات ہے واجد بھائی آج آپ کچھ بجھے بجھے نظر
آ رہے ہیں ۔

واجد :۔ کیا بتاؤں اغنی صاحب ۔ آپ کی بھاوج سے عاجز ہوں
انھیں بس ایک رٹ لگی ہوتی ہے ۔ میمونہ کی شادی
میمونہ کی شادی !!

اغنی :۔ (خوشگوار لہجے میں) بھابی سے کہہ دیجئے کہ بہت جلد ان کی
یہ فکر دور ہو جائے گی (ہنستے ہوئے) دیر آید درست آید

واجد :۔ (فکر مند لہجے میں) اغنی صاحب ! اچھے لڑکے ملتے کہاں
ہیں ۔؟

اغنی :۔ (خوشگوار لہجے میں) لڑکا تو بہت اچھا مل گیا ہے اللہ
[illegible] قسم کی لڑکی چاہتا ہے صرف اتنی میمونہ اس معیار
پر پوری اترتی ہے ۔

واجد :۔ (اشتیاق سے) کون ہے وہ لڑکا ؟

اغنی :۔ (بے نیازی سے) وہی اپنا ڈاکٹر شہاب ۔ بڑی بیا پا کا
بہن کا لڑکا ۔

واجد :۔ (پست لہجے میں) وہ لڑکا تو بہت اچھا ہے ۔ مگر میمونہ
اس کے لائق نہیں ہے ۔

اغنی :۔ (تعجب سے) کیوں ؟ کیا مونا پڑھی لکھی نہیں ہے
خاندان اچھا نہیں ہے ۔ واجد بھائی میمونہ کے افسانے
شہاب کو بہت پسند ہیں ۔

واجد :۔ اغنی صاحب ، آج کل کے نوجوان تعلیم کے ساتھ ساتھ
دولت بھی چاہتے ہیں ، اور چاند سی صورت بھی ۔

اغنی :۔ یہ پرستان نہیں ہے کہ یہاں کی ہر لڑکی پری ہو ۔ اور شہاب تو
آج کل کے لڑکوں سے بالکل مختلف ہے واجد بھائی ۔

واجد :۔ باہر سے جو لڑکے پڑھ لکھ کر آتے ہیں ۔ باتیں تو وہ بڑی
لمبی چوڑی کرتے ہیں ۔ وسیع النظری کا اظہار بھی کرتے ہیں مگر
شادی کے معاملے میں عام نوجوانوں کی سطح پر آ جاتے ہیں ۔

اغنی :۔ اگر شہاب کے سوچنے کا یہ انداز ہوتا تو وہ اپنے ماموں کی
لڑکی سے شادی کر لیتا ۔

واجد :۔ (تعجب سے) ماموں کی لڑکی سے ۔

اغنی :۔ جی ہاں ۔ انتہائی خوبصورت ہے ۔ پڑھی لکھی ، ہزاروں کا
جہیز لائے گی (قہقہہ لگا کر) دن رات اسے گھیرے رہتی ہے
مگر وہ اسے خاطر میں نہیں لاتا ۔ شادی کے نام پر کانوں پر
ہاتھ رکھتا ہے ۔

واجد :۔ کیا وجہ ہے ؟

اغنی :۔ میں نے جب اس سے انکار کی وجہ پوچھی تو ہنس کر بولا
اغنی ماموں ! وہ بینہ زندگی بھر گڑیا بن کر رہنا چاہے گی
میں اسے وہ خوشیاں نہیں دے سکتا جو اسے مطمئن
کر سکیں ۔

واجد :۔ (سنجیدہ لہجے میں) وہ کیسی لڑکی چاہتا ہے ؟

ذہنی[illegible] ہوئے، بالکل[illegible] کی طرح کھو یا کھویا سا لگتا ہے۔

واجد :۔ (آہستہ سے) تو پھر میرا مطلب ہے۔ آپ نے میمونہ کے سلسلے میں کوئی بات کی۔

افق :۔ کی تو ہے مگر ادھوری اور نامکمل۔ اچھا اب چلئے کہیں ایسا نہ ہو مرزا صاحب چلے جائیں۔

(قدموں کی چاپ موسیقی میں تحلیل ہو جاتی ہے)

منظر بدلتا ہے

(ہلکی ہلکی پرسکون موسیقی کے درمیان لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں۔ پھر میمونہ کی آواز ابھرتی ہے)

میمونہ :۔ (ہنستے ہوئے) بس بھئی اب مجھے اجازت دو۔

نجمہ :۔ (خوشگوار لہجے میں) نہیں اپیا! ابھی آپ نہیں جائیں گی۔ اب غزالہ ایک غزل سنائے گی۔

میمونہ :۔ (خوشگوار لہجے میں) بس بھئی بہت ہو چکا۔

نجمہ :۔ (خوشگوار لہجے میں) غزالہ۔ میر کی غزل سنائے گی۔ میر تو آپ کا پسندیدہ شاعر ہے اپیا!!

پہلی لڑکی :۔ اپیا۔ آپ تو مہمان خصوصی ہیں۔

دوسری لڑکی :۔ سچ اپیا آپ کو ہماری خوشی کا اندازہ نہیں۔

میمونہ :۔ (خوشگوار لہجے میں) تم لوگ تو ضرورت سے زیادہ خوش ہو رہی ہو حالانکہ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔

نجمہ :۔ (خوشی کے لہجے میں) خاص بات کیسے نہیں ہے۔ اگر میری کسی تصویر پر پانچ ہزار روپے انعام ملتا تو میں زمین پر پیر نہ رکھتی۔

پہلی لڑکی :۔ سچ میں تو ہوا میں اڑی اڑی پھرتی۔

دوسری لڑکی :۔ میں تو خوشی سے پاگل ہو جاتی۔

میمونہ :۔ (سنجیدہ لہجے میں) یہ تو فن کے صحرا میں پہلا نخلستان ہے [illegible] منزل نہیں!!

چھپا تھا جب بھی آپ نے کہا تھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔

دوسری لڑکی :۔ (سوالیہ لہجے میں) اپیا! اگر یہ کوئی خاص بات نہیں ہے تو تین دن سے سارے اخبارات آپ کی بنائی ہوئی تصویر کی اسقدر تعریف کیوں کر رہے ہیں؟

نجمہ :۔ (سنجیدہ لہجے میں) ڈاکٹر شہاب نے تو آج اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ میمونہ نے رنگوں میں جذبے کے اظہار کے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے۔

پہلی لڑکی :۔ (جلدی سے) اور یہ بھی تو لکھا ہے کہ اس طریق اظہار میں میمونہ اپنے ہمعصروں کو بہت پیچھے چھوڑ گئی ہے۔

نجمہ :۔ (زور دے کر) ملک کے سب سے بڑے مصور خیال نے کہا ہے کہ یہ تصویر فن مصوری کا شاہکار ہے۔

میمونہ :۔ (ہنستے ہوئے) بڑے فن کار چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ایسے ہی بیان دیتے ہیں۔

پہلی لڑکی :۔ (سوالیہ لہجے میں) یہ ڈاکٹر شہاب کون ہیں؟

دوسری لڑکی :۔ (ہنستے ہوئے) سبحان اللہ۔ جواب نہیں ہے آپ کا۔ اخبار پڑھتی ہیں اور آپ کو یہ نہیں معلوم؟

نجمہ :۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) کہ ڈاکٹر شہاب نے اپیا کی تصویر ایک ہزار روپے میں خریدی ہے۔

پہلی لڑکی :۔ (شرما کر) یہ تو مجھے معلوم ہے، میرا مطلب تھا کیا ڈاکٹر شہاب بھی مصور ہیں؟

نجمہ :۔ (سنجیدہ لہجے میں) وہ ڈاکٹر ہیں۔ ہارٹ اسپیشلسٹ۔

(دروازے پر دستک)

پہلی لڑکی :۔ نجمہ جا کر دیکھو شاید ناہید آئی ہے۔

نجمہ :۔ اپیا کو نہ جانے دینا۔ میں ابھی آئی (قدموں کی چاپ)

پہلی لڑکی :۔ (سوالیہ لہجے میں) یہ بتائیے اپیا! آپ اتنی اچھی تصویر کیسے بنا لیتی ہیں؟

دوسری لڑکی :۔ (رشک سے) [illegible] پیارے لگ رہے ہیں۔

نجمہ :۔ [illegible] کے لہجے میں) آہا۔ آپا۔ دولہا
بھائی آئے ہیں۔
میمونہ :۔ (چونک کر) اوہ۔ دولہا بھائی (قدموں کی چاپ کے
درمیان خود سے) میں جانتی تھی کہ دولہا بھائی ضرور آئیں گے
(قدموں کی چاپ)
شاہد :۔ (انتہائی خوشی کے لہجے میں) مبارک ہو مونی !۔ مبارک
ہو۔ کچھ بھی اب تو مانتی ہو کہ۔
؎ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
میمونہ :۔ (خوشی کے لہجے میں) میں تو حیران ہوں۔ دولہا بھائی کہ
انعام کیسے مل گیا۔ تصویر تو اس لائق نہیں تھی۔
شاہد :۔ (ہنستے ہوئے) انکسار فرما رہی ہیں (چونک کر) ارے
میں تو بھول ہی گیا۔ تسلیم خالہ جان۔ مبارک ہو۔
خانم :۔ (خوشگوار لہجے میں) جیتے رہو بیٹے۔ تم کو بھی مبارک ہو۔
(سوالیہ لہجے میں) ثمینہ نہیں آئی۔
شاہد :۔ وہ تو آنے کے لئے بیتاب تھیں مگر گڈو کو بخار آ رہا ہے
خانم :۔ (بیتابی سے) اب کیسا ہے میرا گڈو ؟
شاہد :۔ بخار تو اتر گیا ہے، کمزوری باقی ہے۔
نجمہ :۔ (سوالیہ لہجے میں) باجی تو بے انتہا خوش ہوں گی۔
شاہد :۔ ان کی خوشی کا کیا پوچھنا۔ اخبار میں خبر پڑھتے ہی کہنے لگیں
دل چاہتا ہے کہ اڑ کر کراچی پہنچ جاؤں۔ اور اپنی مونی
کے ہاتھ چوم لوں۔
نجمہ :۔ (شرارت سے) کاش بے چاری کے پر ہوتے۔ [مشترکہ
قہقہہ]
خانم :۔ (خوشی کے لہجے میں) میمونہ پر تو وہ بچپن ہی سے جان
چھڑکتی ہے۔
نجمہ :۔ (شرارت سے) واہ امی ! جان نہ ہوئی عرق گلاب ہو گیا
(مشترکہ قہقہہ)
شاہد :۔ خالو جان کہاں ہیں ؟
خانم :۔ [illegible] کے ساتھ کہیں گئے ہیں۔

نجمہ :۔ (ہنستے ہوئے) دولہا بھائی ! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی
یہ بتلائیے کہ اس ڈبے میں کیا ہے ؟
شاہد :۔ (ہنستے ہوئے) خالہ جان سچ کہتی ہیں، مشتاق
کبھی چھپا کر رکھو پہنچ تی اس تک پہنچ ہی جاتی۔
نجمہ :۔ (ترنم سے) ؎ بڑی دیر میں ہے بڑی عاقلہ ہے
خانم :۔ (خوشگوار لہجے میں) اس کی کیا فرصت تھی
میاں ؟
میمونہ :۔ (خوشگوار لہجے میں) دولہا بھائی آپ بھی رسمی [illegible]
کے قائل ہیں۔
شاہد :۔ (خوشگوار لہجے میں) بھئی یہ تو کوئی تحفہ نہیں۔ مشتاق
ثمینہ نے بھیجی ہے اور جواب مجھ سے طلب ہو رہا ہے
نجمہ :۔ (معصومیت سے) اور یہ بھی تو دیکھئے۔ باجی نے مشتاق
بھیجی ہے وہ بیچاری خاموش ہے۔
شاہد :۔ (ہنستے ہوئے) آئینہ دیکھا ہے آپ نے ؟
نجمہ :۔ (معصومیت سے) آئینہ تو کریم نے توڑ دیا ہے۔ [illegible]
دو دن سے کنگھی نہیں کی ہے [مشترکہ قہقہہ]
(قہقہوں کے درمیان قدموں کی چاپ بلند ہو کر قریب
واجد :۔ (چونک کر) اوہ ! شاہد میاں، کب آئے بھئی ؟
شاہد :۔ اسلام علیکم خالو جان۔
واجد :۔ (خوشگوار لہجے میں) تمہاری خالہ جان نے ڈاکٹر
شہاب کے پیام کے بارے میں تو۔
خانم :۔ (جلدی سے تیز لہجے میں) کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ بچیاں
بیٹھی ہیں (غصے سے) آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اور [illegible]
دیتے ہیں۔
واجد :۔ (گڑبڑا کر) ارے بھئی خفا کیوں ہو رہی ہو میں نے دیکھا
نہیں تھا کہ میمونہ بیٹھی ہے۔
شاہد :۔ (بات ٹالتے ہوئے) جی ہاں مجھے ڈاکٹر شہاب کا [illegible]
بہت پسند آیا فن مصوری کا پاس شخص کی [illegible]
خانم :۔ (جھنجھلا کر) شاہد میاں پہلے جا کر منہ ہاتھ دھو لیں

باتیں [illegible] سارا وقت بیٹھا ہے۔ (زور سے)
نجمہ! ذرا بھائی کے لئے چائے بنا کر لاؤ۔ شاہد میاں
کیا سوچ رہے ہو جاؤ منہ ہاتھ دھولو۔
(قدموں کی چاپ پس منظر میں ڈوب جاتی ہے)

منظر بدلتا ہے

(پس منظر میں پیانو کی آواز۔ پھر ایک لڑکی کے
گانے کی آواز پیانو کی آواز کے ساتھ
بلند ہوتی ہے)

روبینہ :۔ (مغربی دھن میں)

ONE DAY MY DARLING
THE WEDDING BELLS
WILL BE RUNG

شہاب :۔ (بیزاری سے) بس روبینہ! اب ختم کرو۔
روبینہ :۔ (اٹھلاکر) کیوں؟
شہاب :۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے روبینہ۔
روبینہ :۔ (اٹھلاکر) روبینہ نہیں۔ روبی کہو شہاب ڈیئر تمہارے منہ سے روبی بہت سوئٹ لگتا ہے۔
شہاب :۔ (بیزاری سے) ہر وقت بچوں کی طرح ضدیں نہ کیا کرو۔
روبینہ :۔ (اٹھلاکر) تمہیں کیا ہوتا جارہا ہے شہاب ڈیئر تم بہت بدل گئے ہو۔
شہاب :۔ (سنجیدہ لہجے میں) وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ آدمی بدلتا رہتا ہے۔
روبینہ :۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ جب سے تم نے یہ تصویر نمائش سے خریدی ہے تم کھوئے کھوئے رہتے ہو۔
شہاب :۔ اس تصویر کی یہی خوبی ہے کہ آدمی اس میں کھو کر رہ جائے (کھوئے ہوئے لہجے میں) یہ رنگ یہ خطوط۔
روبینہ :۔ (ناز سے) اگر یہ بات ہے تو یہ تصویر میں یہاں سے ہٹادوں گی۔
شہاب :۔ (نخوت سے) [illegible]
روبینہ :۔ (نخوت سے) میں ہٹا سکتی ہوں۔
شہاب :۔ (جھنجلاکر) مجھے پریشان نہ کرو روبی۔
روبینہ :۔ (محبت سے) ایک بار پھر مجھے روبی کہہ کر پکارو شہاب ڈیئر پلیز۔
شہاب :۔ تم تو بعض اوقات چھوٹی سی بچی بن جاتی ہو۔
روبینہ :۔ (قہقہہ لگاکر) ممی اور ڈیڈی تو مجھے اب بھی بے بی کہتے ہیں شہاب۔
شہاب :۔ تمہیں اور کوئی کام نہیں ہے؟
روبینہ :۔ (چونک کر) خوب یاد دلایا۔ ممی اور ڈیڈی کے ساتھ مجھے سیما کے یہاں جانا ہے۔ آج اس کا برتھ ڈے ہے
شہاب :۔ تو پھر جاتی کیوں نہیں ہو؟
روبینہ :۔ (ادا سے) اکیلی نہیں جاؤں گی۔ تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔
شہاب :۔ (بیزاری سے) اس وقت میں نہیں جاؤں گا۔
روبینہ :۔ (سوالیہ لہجے میں) کیوں نہیں جاؤ گے۔؟
شہاب :۔ (آہستہ سے) پانچ بجے اغن ماموں آئیں گے۔
روبینہ :۔ پانچ تو بج چکے۔
شہاب :۔ آتے ہی ہوں گے۔
روبینہ :۔ (ہنستے ہوئے) بہت بور ہے انکل اغن (قہقہہ لگاکر) ہنڈریڈ مائیل کی اسپیڈ سے باتیں کرتا ہے۔
شہاب :۔ (کرخت لہجے میں) روبینہ! وہ میرے بزرگ ہیں۔ زندگی کے ہر دور میں ان کے دل کے دروازے میرے لئے کھلے رہے ہیں۔
روبینہ :۔ تم! یہ دروازے بند کردو ڈیئر مجھے وہ اولڈ مین بالکل اچھا نہیں لگتا۔
شہاب :۔ (سختی سے) روبی تم کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔
روبینہ :۔ (قہقہہ لگاکر) اگر آ[illegible] مجھے تو کل یہ حق حاصل

ہو جائے گا۔

شہاب :۔ (سنجیدہ لہجے میں) تمہیں یہ حق کبھی حاصل نہیں ہوگا۔

روبینہ :۔ (تعجب سے) یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

شہاب :۔ (سنجیدہ لہجے میں) یہی کہ جو خواب تم دیکھ رہی ہو وہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے۔

روبینہ :۔ (گھبرا کر) تم میری توہین کر رہے ہو شہاب۔

شہاب :۔ نہیں۔ تمہاری غلط فہمی دور کر رہا ہوں۔

روبینہ :۔ (زور سے) شہاب!

شہاب :۔ (سنجیدہ لہجے میں) ہم دونوں کی منزل ایک نہیں ہو سکتی روبینہ۔ ہم دونوں زندگی بھر قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے۔ ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔

روبینہ :۔ (غصے سے) یہ بات ہے۔ میں ابھی ڈیڈی سے جا کر کہتی ہوں (غصے سے پیر پٹختی ہے)۔

(تیز تیز قدموں کی چاپ۔ پھر کار روانہ ہونے کی آواز)

شہاب :۔ (خود سے) بے وقوف لڑکی نہ جانے اپنے کو کیا سمجھتی ہے؟ (کال بیل بجتی ہے) شاید اغن ماموں آگئے۔

(قدموں کی چاپ۔ دروازہ کھلنے کی آواز میں مدغم ہو جاتی ہے۔)

اغن :۔ شہاب میاں معاف کرنا۔ مجھے چند منٹ کی دیر ہو گئی۔

شہاب :۔ (خوشگوار لہجے میں) کوئی بات نہیں آیئے۔

اغن :۔ (گہری سانس لے کر) بڑی مشکل سے واجد بھائی کو آمادہ کیا ہے۔

شہاب :۔ (خوشی کے لہجے میں) اچھا!

اغن :۔ (بات ان سنی کرتے ہوئے) بھابی نے تو انتہائی مخالفت کی۔ اور ہے بھی یہ بات۔ ان کی خاندانی روایات کے خلاف کہ شادی سے پہلے لڑکی لڑکے کے سامنے آئے۔

شہاب :۔ (شرماتے ہوئے لہجے میں) یہ کوئی ناپسندیدہ بات تو نہیں ہے۔ اور اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے۔

اغن :۔ (سنجیدہ لہجے میں) لیکن پرانے خاندانوں نے ابھی زمانے کے نئے تقاضوں کو اس حد تک قبول نہیں کیا ہے۔

شہاب :۔ (سنجیدہ لہجے میں) اگر امی زندہ ہوتیں تو شاید میں ضد نہ کرتا (جذباتی لہجے میں) مگر وہ تو میرے سہرے کی تمنا لئے ـــــ

اغن :۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) بہرحال اتوار کو چھ بجے تم واجد بھائی کے یہاں چائے پر مدعو ہو۔

شہاب :۔ (آہستہ سے) میرا مطلب ہے (چند لمحے رک کر) مس میمونہ بھی ہوں گی۔

اغن :۔ ہاں بھئی یہ سن لو وہ بہت شرمیلی لڑکی ہے۔ میری تو گود میں کھیلی ہے مگر میرے سامنے بھی بڑی مشکل سے آتی ہے اس لئے طے یہ پایا ہے۔

شہاب :۔ (بیتابی سے) کیا؟

اغن :۔ وہ چائے لے کر آئے گی اور رکھ کر لوٹ چلی جائے گی۔ تم اسے مخاطب نہ کرنا سمجھ گئے۔

شہاب :۔ (زور دے کر) اچھی طرح۔

اغن :۔ اب میں چلا۔ چھ بجے ایک صاحب سے ملنا ہے۔

شہاب :۔ (شائستہ لہجے میں) چائے تو پی لیجئے۔

اغن :۔ (ہنستے ہوئے) چائے تو اب میمونہ بیٹی آکر پلائے گی۔ اچھا۔ خدا حافظ۔

[قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے]

منظر بدلتا ہے

(اضطراب انگیز موسیقی کے درمیان خانم اور واجد کی سرگوشیاں۔ پھر خانم کی آواز ابھرتی ہے)

خانم :۔ ابھی وقت ہے۔ پھر ایک بار سوچ لیجئے۔

واجد :۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) میں نے پورے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا ہے۔

خانم :۔ (آہستہ سے) مجھے تو اس خیال سے رات بھر نیند نہیں آئی۔

واجد :۔ (گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے) خانم یہ کوئی معیوب بات

ہیں ہے البتہ روایت سے بغاوت ضرور ہے

:- (مضطرب لہجے میں) میرے منہ میں خاک کہیں ایسا نہ ہو کہ بجمہ کو دیکھ کر شہاب کی رائے بدل جائے۔ نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔

:- (سنجیدہ لہجے میں) خدا میمونہ کے حق میں بہتر کرے (سوالیہ لہجے میں) حسن اور نجمہ کہاں ہیں ؟

:- (آہستہ سے) حسن اپنے کمرے میں ہے۔ نجمہ باورچی خانے میں۔ کریم کو میں نے بازار بھیج کر ٹالا ہے۔

:- (سراسیمگی سے) میمونہ کو تو کچھ نہیں بتایا۔ ؟

:- (آہستہ سے) اس سے تو میں کہوں گی۔ اغن صاحب بیٹھے ہیں ان کے لئے چائے لے جاؤ۔

:- (آہستہ سے) اغن صاحب پروگرام کے مطابق بہادر کرکے ٹل گئے ہوں گے۔ اب دیر نہ کرو کہیں ایسا نہ ہو وہ آ جائیں۔

:- (آہستہ سے) آپ میرے ساتھ آئیے [قدموں کی چاپ]

:- (درشت لہجے میں) میں پوچھتا ہوں یہ عین وقت پر کریم کہاں چلا گیا۔ ؟

:- (شکایتی لہجے میں) ابو وہ تو جہاں جاتا ہے وہیں کا ہو رہتا ہے۔ پان لینے گیا ہے آدھا گھنٹہ ہو گیا۔

:- نجمہ بیٹی! وہ کشتی اٹھا دو جس میں پھل رکھے ہیں۔ یہ آپ لے جائیے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہیں۔

:- میں۔

:- ہاں۔ آپ۔ لیجئے۔ (قدموں کی چاپ چند لمحے سنائی دے)

:- (آہستہ سے) یہ چائے کی کشتی کون لے جائے گا۔ ؟

:- (آہستہ سے) یہ تم لے جاؤ۔

:- (ٹھٹک کر) ہائی اللہ مجھے تو غیر آدمی کے سامنے جاتے شرم آ رہی ہے۔

:- (مسکراتے ہوئے) یہ تو بڑا اچھا موقع ہے تم شہاب کو دیکھ لو گی۔ اور مجھے اچھا پیار کرتا سکو گی۔

نجمہ :- ہم کشتی رکھ کر لوٹ آئیں گے رکیں گے نہیں۔

خانم :- میں کب کہہ رہی ہوں رکنے کو۔ چلنے کی کشتی اٹھاؤ۔ چلو۔ دروازے تک میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔

(قدموں کی چاپ بتدریج بلند ہو پھر دروازے پر دستک)

واجد :- (زرا زور سے) لے آؤ۔ آ جاؤ بھئی۔ کریم کیا سو رہے ہو۔ (قدموں کی چاپ)

نجمہ :- (مرتعش لہجے میں) تسلیم !

واجد :- (چونک کر) اوہ۔ تم ! (حالت پر قابو پاتے ہوئے) کریم کہاں چلا گیا ؟

نجمہ :- (آہستہ سے) بازار گیا ہے۔

واجد :- (گھبرائے ہوئے لہجے میں) اب تم جاؤ بیٹی۔ چائے ہم خود بنا لیں گے (قدموں کی چاپ)

شہاب :- (گھبرائے ہوئے لہجے میں) اغن ماموں ابھی تک نہیں آئے۔

واجد :- (پرسکون لہجے میں) عجیب آدمی ہیں کہ میں اندر گیا اور وہ غائب ہو گئے۔

شہاب :- (پرسکون لہجے میں) جی یہ کہہ کر گئے تھے کہ میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔

واجد :- (مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے) میں سمجھ گیا یہ حضرت کہاں گئے ہیں ؟ تم چائے پیو وہ آ جائیں گے۔

شہاب :- (گھبرا کر) قبلہ آپ تکلیف نہ کریں۔ میں بناتا ہوں چائے (قدموں کی چاپ)

اغن :- (ہنستے ہوئے) معاف کرنا شہاب میاں سگریٹ ختم ہو گئے تھے۔

واجد :- (ہنستے ہوئے) جناب میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اب منہ کیا دیکھ رہے ہیں ہاتھ بڑھائیے۔

اغن :- (خوشگوار لہجے میں پیالہ بڑھاتے ہوئے) ارے میاں شرماؤ نہیں۔ وہ جو بسکٹ وغیرہ رکھے ہیں

: ــ (حقہ گڑگڑاتے ہوئے) [illegible]
صرف ہم ہی اس پر عمل کر سکتے ہیں۔
واجد :۔ (ہنستے ہوئے) جی ہاں اس کا ثبوت یہ ہے کہ سگریٹ ختم ہو گئے تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔
افق :۔ (ہنستے ہوئے) آپ سے کہنے کے یہ معنی تھے کہ ایک گھنٹے تک سگریٹ کے خلاف آپ کی پرمغز اور فکر انگیز تقریر سنتا (قہقہہ لگا کر) اور پھر تان اس پر ٹوٹی کہ حقہ پیا کرو۔
(مشترکہ قہقہے)
(قہقہے موسیقی کی تیز لہروں میں ڈوب جاتے ہیں)

منظر بدلتا ہے

(اندھیری رات۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں
پھر واجد کی آواز ابھرتی ہے)

واجد :۔ (تلخ لہجے میں) خانم! تم نے زندگی کی یہ سب سے بڑی غلطی کی ہے۔
خانم :۔ (انتہائی غمگین لہجے میں) اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں تھی۔
واجد :۔ (دردناک لہجے میں) یہ دھوکا ہے۔ فریب ہے۔
خانم :۔ (روہانسے لہجے میں) اگر شہاب میمونہ کو دیکھ لیتا تو وہ شادی نہ کرتا۔
واجد :۔ (بےچینی سے) لیکن! اس لغزش کے نتائج اس سے زیادہ اندوہناک برآمد ہوں گے۔
خانم :۔ (پر امید لہجے میں) مجھے یقین ہے کہ موُن اپنی خدمت سے شہاب کو اپنا بنا لے گی۔
واجد :۔ (سنجیدہ لہجے میں) اگر شہاب نے شرافت کی بنا پر تمہارے اس سنگین جرم کو معاف بھی کر دیا تو ـــ
خانم :۔ (جلدی سے) خدا کے لئے کوئی بری بات منہ سے نہ نکالئے۔
واجد :۔ (گھبراتے ہوئے لہجے میں) دونوں زندگی بھر یہی محسوس کریں گے کہ وہ کسی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑے ہیں۔
:۔ (رقت [illegible]) [illegible] کسی چیز کے ٹوٹنے

کی آواز)
واجد :۔ (چونک کر) کون ہے۔ یہ آواز کیسی آئی۔
خانم :۔ (آہستہ سے) کوئی نہیں۔ بلی ہوگی۔ دودھ کی [illegible] گھڑونچی کے پاس رکھی ہے۔
واجد :۔ خانم میں ضمیر کی ملامت برداشت نہیں کر سکتا۔
(کتے زور زور سے بھونکتے ہیں)
خانم :۔ (روہانسے لہجے میں) مجھے خود رہ رہ کر رونا آ رہا ہے۔
واجد :۔ (کربناک لہجے میں) خدایا۔ میں کیا کروں۔
(اضطراب انگیز موسیقی کی لہریں وقفے وقفے سے ابھر کر معدوم ہوں)
خانم :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) میرے خدا۔ یہ کیا ہوا۔؟
واجد :۔ (وحشت ناک آواز میں) خانم! میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میرا دل رو رہا ہے۔ میری روح فریاد کر رہی ہے۔ میرا ضمیر چیخ رہا ہے۔
خانم :۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) میں گنہگار ہوں۔ میں گنہگار ہوں
(تیز سسکیاں)
(خانم کی سسکیاں موسیقی کی لہروں میں ڈوب جاتی ہیں)

منظر بدلتا ہے

(مختلف آدمیوں کے باتیں کرنے کی ملی جلی
آوازیں، پھر افق صاحب کی آواز ابھرتی ہے)

افق :۔ (فکرمند لہجے میں) لیکن یہ گمنام ہمدرد کون ہو سکتا ہے؟
واجد :۔ (پریشان کن لہجے میں) یہی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ [illegible] خطوط کون بھیج رہا ہے۔؟
شاہد :۔ (تعجب سے) کمال یہ ہے کہ سب خطوط اردو میں ٹائپ کئے ہوئے ہیں۔
خانم :۔ میمونہ تو یہ خطوط پڑھ کر بری طرح گھبرا گئی ہے اس نے مجھ سے کہہ دیا کہ وہ شہاب سے شادی نہیں کرے گی۔
افق :۔ بھابھی آپ نے موُن کو یہ خطوط کیوں دکھائے؟
شاہد :۔ افق چچا موُن کے نام تو براہ راست خط [illegible]

خالوجان نے یہ سمجھ کر کہ رسائل کے درمیان سے ہوں گے

[illegible] خالوجان کے نام روز جو لفافہ

لفافہ آتا ہے۔

خانم :۔ (پریشان کن لہجے میں) اور وجہ کچھ نہیں لکھی ہوتی بس

سوائے اس کے کہ شادی نہ کرو۔ لڑکی خوش نہیں رہے گی۔

واجد :۔ میری تو عقل کام نہیں کر رہی۔ سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے؟

شاہد :۔ (سنجیدہ لہجے میں) پولیس کیس بنتا نہیں کیونکہ خطوط

میں کوئی دھمکی نہیں دی گئی ہے۔ مشورہ دیا گیا ہے۔

افتی :۔ (سوالیہ لہجے میں) آپ کے عزیزوں میں تو کوئی اس

رشتے کے خلاف نہیں ہے۔

خانم :۔ کوئی نہیں۔ سمجھ کی بات ہوتی تو کسی پر شبہ بھی کیا جا سکتا تھا۔

شاہد :۔ (زور دے کر) خالوجان کا بظاہر کوئی دشمن نہیں ہے۔

واجد :۔ اول تو میرا کوئی دشمن نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو وہ اتنا

کینہ نہیں ہو سکتا۔

افتی :۔ (فیصلہ کن لہجے میں) بہرحال میمونہ کے نام اب جو خط

آئیں وہ اس تک نہ پہنچیں۔

شاہد :۔ (آہستہ سے) افتی چچا آپ تو جانتے ہیں کہ مونا کتنی حساس

لڑکی ہے۔

واجد :۔ ہاں افتی صاحب وہ بہت زیادہ متاثر ہے۔ خاموش

بیٹھی نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہے۔

خانم :۔ کیا بتاؤں۔ اس نے تو مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ

اسے یہ رشتہ منظور نہیں۔

افتی :۔ ابھی عمر ہی کیا ہے گھبرا گئی ہے بیچاری۔

شاہد :۔ (آہستہ سے) اس نے اپنی باجی کو بھی خط لکھا تھا اور

مجبور کیا تھا کہ وہ اس رشتہ کی مخالفت کریں۔

خانم :۔ جب ہم لوگوں کے اوسان جاتے رہے ہیں۔ تو وہ تو

بچی ہے افتی بھائی۔

افتی :۔ (فیصلہ کن لہجے میں) میں شہاب کے پاس جاتا ہوں۔

پھر کوئی رائے قائم کروں گا۔

(شہاب

(دونوں کو ہیر... [illegible])

منظر بدلتا ہے

(اضطراب انگیز موسیقی کے درمیان

افتی صاحب کی آواز ابھرتی ہے۔)

افتی :۔ (سوالیہ لہجے میں) خط تم نے دیکھ لیا۔ اب کیا رائے

ہے؟۔

شہاب :۔ (پریشان کن لہجے میں) اب تو معاملہ اور بھی الجھ گیا۔

افتی :۔ سوال یہ ہے کہ پس پردہ کون ہے؟

شہاب :۔ افتی ماموں! میں خود حیران ہوں کہ کون ہمدرد ہے

جو مجھے ٹیلیفون کر کے روز مشورہ دیتا ہے کہ شادی

نہ کرو۔

افتی :۔ اور وہاں روز دو خطوں کا اوسط ہے جو اردو

ٹائپ میں ہوتے ہیں۔

شہاب :۔ میں سمجھا نہیں۔

افتی :۔ ایک خط واجد بھائی کے نام آتا ہے اور ایک میمونہ کے نام

شہاب :۔ (سوالیہ لہجے میں) خط کا مضمون مختلف ہوتا ہوگا۔

افتی :۔ واجد بھائی کے نام جو خطوط آتے ہیں ان میں لکھا ہوتا

ہے شہاب سے شادی نہ کرو ورنہ لڑکی کی زندگی تباہ ہو جائیگی

وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔ کیوں لڑکی کے دشمن ہوئے ہو

شہاب :۔ (سوالیہ لہجے میں) اور میمونہ کے خط کا مضمون کیا

ہوتا ہے؟

افتی :۔ مطلب یہی ہوتا ہے صرف جملوں کی ترتیب بدلی ہوئی

ہوتی ہے۔ مثلاً کیوں جان بوجھ کر زندگی تباہ کر رہی

ہو۔ شہاب کے ساتھ تم خوش نہیں رہ سکو گی۔ اگر تمہیں

اپنی زندگی عزیز نہیں ہے تو اپنے بوڑھے ماں باپ

پر رحم کرو۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔

شہاب :۔ (سوالیہ لہجے میں) سب خط ٹائپ میں ہوتے ہیں۔

دستخط کسی کے نہیں ہوتے؟

افتی :۔ دستخط کسی کے نہیں ہوتے خط کے آخر میں لکھا ہوتا ہے

شہاب :۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) تقریباً اسی قسم کی گفتگو شیلیؔہ
سے مجھ سے ہوئی ہے۔
(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)
اغن :۔ دیکھو بھئی کون ہے؟ یہ ٹرن ٹرن تو بات بھی نہیں
کرنے دے گی۔ (قدموں کی چاپ)
شہاب :۔ فرمایئے۔ جی میں شہاب بول رہا ہوں (ہنستے ہوئے) آج
تو آپ نے بڑے موقع سے ٹیلیفون کیا ہمدرد صاحبہ۔ جی
کیا فرمایا [اغن کے کھانسنے کی آواز] ایک بزرگ ہیں۔
نہیں آپ مخل نہیں ہوئیں ۔ میری رائے ہے کہ کیوں نہ آپ
میرے بزرگ سے گفتگو کر لیں۔ ان کو سمجھایئے ۔ میں
بلاتا ہوں۔ جی ہاں اگر وہ حکم دیں گے تو میں شادی
نہیں کروں گا۔ ابھی بلاتا ہوں (زور سے) اغن ماموں
یہاں آیئے (قدموں کی چاپ۔ آہستہ سے) وہ ہیں آپ
بات کیجئے۔
اغن :۔ زور سے ہیلو۔ میں اغن بول رہا ہوں۔ شہاب کا ماموں
فرمایئے۔ خاموش کیوں ہیں؟ (زور سے) یہ کیا (چیخ کر)
بولو نا۔ خدانخواستہ کیا قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ ارے
بھئی یہ منہ میں گھنگنیاں کیوں بھر لی ہیں۔ بولو نا۔ ہیلو۔
ہیلو ۔ ارے ریسیور رکھ دیا۔
(زور سے ریسیور رکھنے کی آواز)
شہاب :۔ (تعجب سے) پہلے تو آپ سے بات کرنے پر آمادہ تھیں۔
اغن :۔ (غصے سے) بزدل! ۔ پھر ڈر کر بھاگ گئی (سوالیہ لہجے
میں) یہ لڑکی کون ہو سکتی ہے؟
شہاب :۔ کیا عرض کروں۔
اغن :۔ (انتہائی سنجیدہ لہجے میں) بھئی یہ بھی تو ہو سکتا ہے معاف
کرنا کوئی لڑکی تم کو پسند کرتی ہو۔ وہ ۔
شہاب :۔ (متانت سے) جی نہیں آج تک کسی لڑکی کی حوصلہ افزائی
نہیں کی۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تمیز برقرار ہے۔
مطلب ہے کہ یہ ٹیلیفون روبینہ ہی کر سکتی ہے
شہاب :۔ روبینہ کی آواز میں پہچانتا ہوں اغن ماموں!
اغن :۔ (جرح کے انداز میں) تم نے اپنے ماموں جان کو موجودہ
رشتے کے بارے میں جو خط لکھا تھا۔ اس کا کیا ردعمل ہوا؟
شہاب :۔ (آہستہ سے) پہلے تو روبینہ آکر مسلسل دو دن تک
لڑتی رہی۔ پھر روئی۔ خوشامدیں کیں۔
اغن :۔ (بات کاٹ کر) روبینہ کی بات چھوڑو۔ محترم ماموں
جان کا کیا رویہ تھا۔؟
شہاب :۔ کئی دن تو وہ خاموش رہے۔ پھر گھر بلا کر بھائی
جان نے خوب سمجھایا۔
اغن :۔ میں پوچھ رہا ہوں تمہارے ماموں جان کیا بولے؟
شہاب :۔ پھر وہ خود آئے۔ جس قدر برا بھلا کہہ سکتے تھے کہا۔
اور پھر یہ کہہ کر چلے گئے۔ اب زندگی بھر میری صورت وہ
نہیں دیکھیں گے۔
اغن :۔ میرا مطلب ہے کوئی دھمکی تو نہیں دی تھی۔
شہاب :۔ (آہستہ سے) غصے میں یہ تو کہا تھا کہ میں دیکھوں گا یہ
شادی کیسے ہوتی ہے؟
اغن :۔ (فیصلہ کن لہجے میں) تو معاملہ صاف ہو گیا۔ یہ کھیل انہیں
کے اشارے پر ہو رہا ہے۔
شہاب :۔ (سنجیدہ لہجے میں) ماموں جان کے متعلق میری رائے
کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ پھر بھی میں یہ توقع نہیں
کر سکتا۔
اغن :۔ تم ابھی بچے ہو۔ میں انہیں خوب جانتا ہوں۔ معاف
کرنا وہ انتہائی خود غرض ہیں۔
شہاب :۔ (تاسف بھرے لہجے میں) یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں پھر بھی
وہ میرے بزرگ ہیں۔
اغن :۔ (جذباتی لہجے میں) جب بہن بیوہ ہو گئی تو پوچھا تک نہیں
بے چاری کہاں رہے گی۔ کیا کرے گی۔ کہاں سے کھائے گی

اخق :۔ [illegible] ان کی چال کی کاٹ اسی سے اختلاف کریگے
[illegible] طرح میں تمہارا داخلہ ہوا تھا ان کے
دل میں بہن کے لئے محبت کا سوتا پھوٹ پڑا۔ کیوں ؟
صرف اس لئے کہ زوبیہ کی تم سے شادی ہو سکے
شہاب :۔ چھوڑیئے اخق ماموں اس تکلیف دہ ذکر کو۔
اخق :۔ (فیصلہ کن لہجے میں) تم مانو یا نہ مانو بہر حال مجھے سو
فیصدی یقین ہے کہ یہ ساری کارروائی ان کی ہے۔
شہاب :۔ (سوالیہ لہجے میں) لیکن اس سے ان کو فائدہ کیا ہوگا۔؟
اخق :۔ (ہنس کر) فائدہ یہ کہ کسی طرح یہ رشتہ ختم ہو جائے تو
ان کی صاحبزادی کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔
شہاب :۔ (زور دے کر) یہ کبھی نہیں ہوگا۔ (آہستہ سے) آپ
قبلہ ماجد صاحب کو مطمئن کر دیں۔
اخق :۔ میں ماجد بھائی سے کہہ دوں گا کہ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ
یہ شادی نہ ہو۔ اچھا خدا حافظ۔
(قدموں کی چاپ)
شہاب :۔ (زور سے) اخق ماموں میری طرف سے یہ یقین
دلا دیجئے گا (زور دے کر) یہ شادی ہر قیمت پر ہو گی!!
(شہاب کے الفاظ موسیقی میں ڈوب جاتے ہیں)

منظر بدلتا ہے

(پرسکون موسیقی کے درمیان خانم کی آواز ابھرتی ہے)
خانم :۔ (فیصلہ کن لہجے میں) یہ شادی ہر قیمت پر ہو گی۔
نجمہ :۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) اپیا کسی طرح تیار نہیں ہیں امی
خانم :۔ (تیز لہجے میں) اس کا تو دماغ خراب ہے۔
نجمہ :۔ (آہستہ سے) میں تو انہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی
امی !
خانم :۔ میں نے ثمینہ کو بلایا ہے۔ وہ سمجھائے گی۔
[illegible] :۔ (خوش ہو کر) باجی کی بات تو اپیا فوراً مان لیں گی۔ انھیں
بہت چاہتی ہیں۔

(آ جاتے ہیں)
(تیز تیز قدموں کی چاپ)
اخق :۔ تسلیم بھابی!۔
خانم :۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟
واجد :۔ (تیز لہجے میں) آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو۔ اخق
بھائی ہیں۔ کل شہاب کے پاس گئے تھے۔
خانم :۔ (سوالیہ لہجے میں) کچھ پتہ چلا ؟
اخق :۔ وہ بیچارہ بھی پریشان ہے۔ فرق یہ ہے کہ آپ کے نام
خط آتے ہیں۔ اور اس کے پاس ٹیلیفون۔
خانم :۔ (سوالیہ لہجے میں) وہ کیا کہتا ہے ؟
واجد :۔ (ہنستے ہوئے) وہی جو اخق صاحب کی رائے ہے۔
خانم :۔ (سوالیہ لہجے میں) کیا ؟
واجد :۔ (طنزیہ لہجے میں) یہی کہ محترم ماموں جان شعبدے
دکھا رہے ہیں۔
خانم :۔ (مضطرب لہجے میں) ہو گا کیا ؟
اخق :۔ (ہنستے ہوئے) پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شہاب
نے کہلوایا ہے کہ شادی ہر قیمت پر ہوگی۔
خانم :۔ (خوشی کے لہجے میں) آپ کے منہ میں گھی شکر !
واجد :۔ (سوالیہ لہجے میں) اب تو خوش ہو ؟
خانم :۔ (فکرمند لہجے میں) مگر میمونہ تو ان خطوط سے اتنا ڈر
گئی ہے کہ کسی صورت ہاں نہیں کرتی۔
اخق :۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ پر بھروسہ رکھیے (ہنستے
ہوئے) آیئے واجد بھائی ایک ایک بازی ہو جائے۔
خانم :۔ (ہنستے ہوئے) اب ذرا اطمینان ہوا ہے تو اخق بھائی کو
شطرنج کی سوجھ رہی ہے۔
واجد :۔ (ہنستے ہوئے) کل تک حضرت کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں
خانم :۔ (محبت بھرے لہجے میں) [illegible]
اخق :۔ (ہنستے ہوئے) بھائی اگر شطرنج نہ آتی ہوتی تو ہم ماموں

واجد :۔ (دیکھتے ہوئے) اب تو انشاء اللہ شادی کی بات ہو گئی (ہنستے ہوئے) اں محترمہ میمون جان کو یہ نہیں معلوم ہے کہ ہم کھلاڑی ہیں۔

اشفی :۔ (جلدی سے) اور وہ اناڑی۔

(مشترکہ قہقہے موسیقی میں ڈوب جاتے ہیں)

منظر بدلتا ہے

{ پس منظر میں ریڈیو پر کسی مغنّیہ کے گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے }

ثمینہ :۔ (ذرا زور سے) یہ پیالیاں لے جاؤ اور جا کر گڈو کا دودھ گرم کرو۔

نجمہ :۔ (محبت بھرے لہجے میں) آپ کے لئے چائے اور لاؤں باجی؟ (پس منظر میں ریڈیو کی آواز)

ثمینہ :۔ نہیں۔ اور ریڈیو بند کر دو۔

نجمہ :۔ (شوخی سے) باجی۔ ٹاٹا۔

(قدموں کی چاپ۔ ریڈیو کے گانے کی آواز معدوم ہو)

ثمینہ :۔ (آہستہ سے) میمون! یہ تماشہ کب تک ہوتا رہے گا؟

میمونہ :۔ (کھوئے ہوئے لہجے میں) باجی مجھے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

ثمینہ :۔ (زور دے کر) میمون تم تشکیک و بے یقینی کا شکار ہو۔

میمونہ :۔ (زور دے کر) باجی یہ بات نہیں ہے۔

ثمینہ :۔ (محبت بھرے لہجے میں) اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر زندگی سے تمہاری چاہت کیوں ختم ہوتی جا رہی ہے؟

میمونہ :۔ (آہستہ سے) میں اپنے مستقبل سے مایوس ہوں (زور دے کر) زندگی سے نہیں۔

ثمینہ :۔ (سمجھاتے ہوئے) مستقبل سے مایوسی کا مطلب یہ ہے کہ تم زندگی سے خوفزدہ ہو۔

رعنائیوں کا اندازہ تو نہیں ہوتا باجی!

ثمینہ :۔ (خوشگوار لہجے میں) اس لفظ میں تو زندگی کی رعنائیاں سموئی ہوئی ہیں۔ شادی تو ایک ایسا پل ہے جس سے گزرنے کے بعد زندگی کو مسرتوں اور خوشیوں کا ایک نیا راستہ مل جاتا ہے۔

میمونہ :۔ (مرتعش لہجے میں) میں کیسے کہوں باجی؟

ثمینہ :۔ (سمجھاتے ہوئے) یہ تمہاری زندگی کا سوال ہے۔ تمہیں جرأت و ہمت سے کام لینا چاہیئے۔ تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو پوری صفائی سے کہو۔

میمونہ :۔ (جذباتی لہجے میں) باجی۔

ثمینہ :۔ (جذباتی لہجے میں) بیوقوف مجھ سے شرما رہی ہے ارے میں تو تیری باجی ہوں (انتہائی جذباتی لہجے میں) وہی باجی جس کے ساتھ تو نے گڑیاں کھیلی ہیں، رسّی کودی ہے۔ ہنڈکلیا پکائی ہے۔ جس سے تم نے آج تک کوئی بات نہیں چھپائی۔

میمونہ :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) میری اچھی باجی!

ثمینہ :۔ (منت کرتے ہوئے) مجھ سے نہ چھپا میری میمون۔ میں تیری ماں جائی ہوں۔ تیرا غم میرا غم تیری خوشی میری خوشی ہے۔ اپنا دل مجھ پر کھول دے میری بہن!

میمونہ :۔ (کانپتے ہوئے لہجے میں) میں شہاب سے شادی نہیں کروں گی باجی۔

ثمینہ :۔ (آہستہ سے) کیوں؟

میمونہ :۔ (اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے) میرے ذہن میں شریکِ حیات کا جو تصوّر ہے۔

ثمینہ :۔ (پرسکون لہجے میں) کہو میمونہ شرماؤ نہیں۔

میمونہ :۔ (آہستہ سے) شہاب اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔

ثمینہ :۔ (تعجب سے) یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔

میمونہ :۔ (آہستہ سے) میں شہاب کے ساتھ خوش نہیں رہ

ثمینہ :۔ (سمجھا[illegible]) شہاب ایک صاحب [illegible] کی طرح ہے
[illegible] موجودہ آمدنی ہزاروں روپے سے کم نہیں۔
میمونہ :۔ (پرسکون لہجے میں) باجی روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔
ثمینہ :۔ (جلدی سے) آمدنی کے اظہار سے میرا یہ مطلب تھا کہ تم
اس کے ساتھ اطمینان و سکون کی زندگی گزار سکو گی۔
میمونہ :۔ (آہستہ سے) باجی! مجھے اطمینان و سکون کی زندگی نہیں
چاہئے (سنجیدہ لہجے میں) زندگی عبارت ہے کشمکش،
اضطراب اور جد و جہد سے۔
ثمینہ :۔ (خوشگوار لہجے میں) مونی! اس قسم کے جملے صرف کتابوں
میں اچھے لگتے ہیں۔ عملی زندگی میں ان کا کوئی مفہوم
نہیں ہے۔
میمونہ :۔ (زور دے کر) باجی میں آپ سے سچ کہتی ہوں۔ مجھے
روپیہ نہیں چاہیئے۔ بے مہری کے ماحول میں روپے
کا کوئی مصرف نہیں۔
ثمینہ :۔ (سمجھاتے ہوئے) تمہارے دولہا بھائی کی رائے ہے کہ
شہاب ایک مخلص اور ذہین نوجوان ہے۔
میمونہ :۔ (سنجیدہ لہجے میں) صرف ذہانت اور خلوص کافی نہیں
ہے باجی۔ مجھے تو ایسے رفیقِ حیات کی ضرورت ہے ــ
ثمینہ :۔ شرماؤ نہیں میمونہ کھل کر بات کرو۔
میمونہ :۔ (آہستہ سے) جو زندگی کا واضح شعور رکھتا ہو جس کے سامنے
مستقبل کا اجالا ہو۔ جس کے پیشِ نظر اپنی ذات نہیں بلکہ
دوسروں کی زندگی ہو۔
ثمینہ :۔ (سنجیدہ لہجے میں) اور کیا خوبیاں ہوں۔؟
میمونہ :۔ (سنجیدہ لہجے میں) جو اقبال کے تفکر کا پرستار، غالب
کی عظمت کا قائل اور میر کے غم کا امین ہو۔
ثمینہ :۔ (جذباتی لہجے میں) اتنی بلندی تک اڑنے کی کوشش
نہ کرو میمونہ! جہاں تک پہنچتے پہنچتے طاقتِ پرواز ختم
ہو جائے۔
میمونہ :۔ (آہستہ سے) شادی کے سلسلے میں اور لڑکیوں کے کیا

لیکن میری زندگی میں اس قسم کے رفیقِ حیات کا تصور
دور دراز درخشاں ستاروں کی جھلکیوں کی طرح
افقِ خیالی پر نمودار ہوتا رہا ہے۔
ثمینہ :۔ (پرسکون لہجے میں) اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم کو عمر بھر
کے لئے لفظ شادی کو بے معنی سمجھ لینا ہوگا۔
میمونہ :۔ (تلخی سے) مگر آپ لوگ تو مجھے اس کا بھی حق نہیں دیتے۔
ثمینہ :۔ (دردمندانہ لہجے میں) میمونہ ہوش میں آؤ۔ شادی میں
صرف آٹھ دن رہ گئے ہیں۔ یہ خاندان کے وقار کا سوال ہے
میمونہ :۔ (زور دے کر) باجی خاندان کے وقار کی خاطر میں
اپنے نظریات کا خون نہیں کر سکتی۔
ثمینہ :۔ (تلخ لہجے میں) تم اس ماحول سے بغاوت ضرور کر سکتی ہو
میمونہ! مگر جیت نہیں سکتیں۔
میمونہ :۔ (پر اعتماد لہجے میں) باجی! میں ان لڑکیوں میں سے نہیں
ہوں جو آسانی سے شکست قبول کر لیتی ہیں۔
خانم :۔ (آواز دور سے) ثمینہ! اب آ بھی جاؤ۔ دونوں وقت مل
رہے ہیں۔
ثمینہ :۔ (محبت بھرے لہجے میں) چلو چلو منہ دھو لو (ہنستے ہوئے)
المناکیوں اور آنسوؤں کا نام زندگی نہیں ہے۔
میمونہ :۔ (کھوئے ہوئے لہجے میں) میں جانتی ہوں زندگی کیا ہے۔
ثمینہ :۔ (خوشگوار لہجے میں) زندگی تو بہت حسین ہے میمونہ!
(محبت بھرے لہجے میں) تو تصور ہو کر زندگی کے حسین
رنگوں کو دھندلا کر رہی ہے۔ اٹھو باہر چلو۔
میمونہ :۔ (آہستہ سے) آپ چلئے۔
ثمینہ :۔ (زور دے کر) یہاں گھٹن اور اندھیرا ہے باہر اجالا
اور کھلی ہوا۔
میمونہ :۔ (آہستہ سے) میں یہ کتاب [illegible]
خانم :۔ (آہستہ سے سوالیہ لہجے میں) [illegible]؟
ثمینہ :۔ تاویلات کر رہی ہے۔

شاہد :۔ (چونک کر) مگر خالہ جان نے تو مجھے اس بارے میں کچھ
نہیں بتایا۔

ثمینہ :۔ (تعجب سے) کیا انہوں نے بھی کبھی آپ سے اس کا ذکر نہیں کیا؟

شاہد :۔ (تعجب سے) کبھی ایک لفظ نہیں کہا۔

میمونہ :۔ یہ بات آپ سے وہ کیسے کہہ سکتی تھیں۔

شاہد :۔ (تعجب سے) کیوں ؟

میمونہ :۔ (تلخی سے) اس لئے کہ اب آپ بھانجے نہیں داماد ہیں
(شہنائی کی چیخ)

شاہد :۔ (سنجیدہ لہجے میں) واقعی یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔

ثمینہ :۔ (جلدی سے) امی کہنا بھول گئی ہوں گی۔

شاہد :۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) ثمینہ! جس طرح بھی ممکن ہو
میمونہ کو ڈرائنگ روم کے برابر والے کمرے میں لے آؤ۔
میں شہاب کو لاتا ہوں۔

میمونہ :۔ (جذباتی لہجے میں) دولہا بھائی!

ثمینہ :۔ (سوالیہ لہجے میں) مگر آپ دولہا کو محفل سے کیسے اٹھائیں گے
بڑی بدنامی ہوگی۔

شاہد :۔ (پرسکون لہجے میں) بدنامی کے خوف سے میمونہ کو مایوسی
اور بے یقینی کے مضطرب سمندر میں غرق نہیں کیا جا سکتا
[قدموں کی چاپ دور ہوتی ہے]

منظر بدلتا ہے

(اضطراب انگیز موسیقی کے درمیان
قدموں کی چاپ)

شاہد :۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) آپ یہاں تشریف رکھیں۔ میمونہ
دروازے کے اس طرف بیٹھی ہیں۔

شہاب :۔ (انتہائی گھبرائے ہوئے لہجے میں) شاہد بھائی میں آپ کا
مقصد نہیں سمجھا۔

شاہد :۔ (مضطرب لہجے میں) میمونہ وقت بہت کم ہے۔ تمہیں فوری
طور پر کوئی فیصلہ کرنا ہے۔ تم جرأت و ہمت سے کام لو۔

شہاب :۔ (بے چینی سے) آپ کہاں جا رہے ہیں شاہد بھائی ؟

شاہد :۔ (پرسکون لہجے میں) آپ لوگوں کو اپنی زندگی کا سب سے
اہم فیصلہ کرنا ہے۔ اس لئے میری موجودگی غیر ضروری
ہے۔ (قدموں کی چاپ)

شہاب :۔ (لرزتے ہوئے لہجے میں) میں ہمہ تن گوش ہوں۔
مس میمونہ۔

میمونہ :۔ (مرتعش لہجے میں) شرم و حیا نے میرے ہونٹ سی
رکھے ہیں۔ مگر وقت بہت کم ہے

شہاب :۔ (چونک کر) آپ!! مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا ہے

میمونہ :۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) وقت بہت کم ہے ہمیں ایک
لمحہ ضائع کئے بغیر اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنا ہے۔

شہاب :۔ (بے چینی سے) کیا میں یقین کر لوں کہ ہمدرد اور سہیلی
کے روپ میں آپ تھیں۔

میمونہ :۔ (آہستہ سے) جب میری آواز نے یہ راز افشا کر دیا ہے
تو اب اس کی صراحت کی کیا ضرورت ہے۔

شہاب :۔ (تعجب سے) کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں
کہ اس ڈرامے کا مقصد کیا تھا ؟

میمونہ :۔ (مرتعش لہجے میں) یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے (ایک
لمحے کے توقف کے بعد) اس وقت میں نے آپ کو صرف
اسلئے تکلیف دی ہے کہ میں آپ سے ایک بار پھر درخواست
کروں کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔

شہاب :۔ (پرسکون لہجے میں) آپ اپنے تفصیلی خط میں سب کچھ لکھ
چکی ہیں اب نظر ثانی کا کوئی جواز نہیں ہے۔

میمونہ :۔ (آہستہ سے) آپ سمجھتے ہیں ازدواجی زندگی صرف
پھولوں سے عبارت ہے۔

شہاب :۔ (سنجیدہ لہجے میں) جی ہاں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی
سمجھتا ہوں کہ ان پھولوں تک پہنچنے کے لئے کانٹوں سے
گذرنا پڑتا ہے۔

میمونہ :۔ (مضطرب لہجے میں) وقت بہت کم ہے مختصر یہ کہ اگر
میں آپ کی زندگی میں شریک ہوگئی تو دکھ سہتے ہوئے

[illegible] وہ نازک نازک خواب جو آپ کی آنکھوں
میں مچل رہے ہیں بکھر جائیں گے۔
شہاب :۔ (پر اعتماد لہجہ میں) آپ میرے حسین خوابوں کی حسین
تعبیر ہیں۔ (شہنائی کی آواز)
میمونہ :۔ (سنجیدہ لہجہ میں) آج کے ہر نوجوان کی طرح آپ جس
خوبصورت لڑکی کو ڈھونڈ رہے ہیں (زور دے کر)
وہ آپ کو میرے افسانوں میں ملے گی۔ میری تصویروں میں
نظر آئے گی (آہستہ سے) لیکن حقیقی زندگی میں اس کا کوئی
وجود نہیں ہے۔
شہاب :۔ (زور دے کر) میں نے آپ کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ (پر
اعتماد لہجہ میں) میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔
میمونہ :۔ (تلخی سے) لیکن انسان ـــ
شہاب :۔ (بات کاٹ کر بیتابی سے) آپ کیا کہنا چاہتی ہیں ؟
میمونہ :۔ (پست لہجہ میں) صرف یہ ـ کہ جسے آپ نے دیکھا ہے ـ
وہ میں نہیں ہوں [شہنائی کی تیز آواز]
شہاب :۔ (چونک کر) جی ـ تو ـ وہ ـــ
میمونہ :۔ (جلدی سے) وہ ـــ وہ [اٹک اٹک کر] وہ ـــ کوئی اور
ہے ـــ کوئی اور [زور سے شہنائی اور ڈھولک کی آوازیں]
شہاب :۔ (تعجب سے) تو ـ وہ ـ میرا مطلب ہے وہ آپ نہیں تھیں
(سوالیہ لہجہ میں) تو آپ ـــ
میمونہ :۔ (کربناک لہجہ میں) میں کیا ہوں ـ دیکھیں گے آپ ؟
شہاب :۔ (گھبرا کر) جی ہاں ـــ جی ـــ
میمونہ :۔ (جلدی سے) میں کیا ہوں ؟ [زور سے دروازہ کھلنے کی
آواز] دیکھئے ـ غور سے دیکھئے ! یہ ہوں میں !
[چند لمحے غمگین موسیقی کی لہریں ابھر کر تبدیلتک معدوم ہوں]
شہاب :۔ (کربناک لہجہ میں) یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
میمونہ :۔ (گلوگیر لہجہ میں) کبھی ماں ممتا اندھی بھی ہو جاتی ہے ـــ
شہاب :۔ (بات کاٹ کر طنزیہ لہجہ میں) اور بیٹی ؟
میمونہ :۔ (گلوگیر لہجہ میں) بیٹی! سقراط کی طرح مسکراتے ہوئے زہر کا
اثر ...

پیالہ لبوں سے لگا لیتی ہے (کربناک لہجہ میں) اب آپ
جا سکتے ہیں (زور دے کر) برات واپس لے جائیے (سسک
کر) آج افسانہ نگار مر گیا۔ مصور کا گلا گھونٹ دیا گیا
(انتہائی جذباتی لہجہ میں) اب صرف میمونہ باقی ہے (غصے
جس کی دنیا کو ضرورت نہیں (ہذیانی لہجہ میں) میمونہ !
ہنسو ـ خوشی مناؤ ـ (چیخ کر) برات واپس جا رہی ہے
برات واپس جا رہی ہے [زور سے قہقہہ لگا کر پاگلوں کی
طرح] تمہاری برات واپس جا رہی ہے میمونہ ! [شہنائی
کی آواز] نہیں نہیں یہ شہنائی کی آواز نہیں ہے (زور سے)
یہ افسانہ نگار کی چیخ ہے ـ یہ مصور کی کراہ ہے (ہذیانی
لہجہ میں) میں نہیں سنتی ـ نہیں سنتی (چیخ کر) میں نے
کان بند کر لئے [زور سے قہقہے لگا کر پاگلوں کی طرح] میری
برات واپس جا رہی ہے ! [قہقہے]
[وحشت ناک موسیقی کے درمیان تیز تیز قدموں کی چاپ]
واجد :۔ (پریشان کن لہجہ میں) مون ! میری بچی ـــ
شاہد :۔ (زور سے) خالو جان ـــ (تیز لہجہ میں) میمونہ اندر جاؤ۔
[زور سے] مون سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں اندر جاؤ۔
میمونہ :۔ (کربناک لہجہ میں) دولہا بھائی ! افسانہ نگار مر گیا۔
مصور کا گلا گھونٹ دیا گیا [سسکیاں]
شاہد :۔ (زور سے) مون اندر جاؤ ـــ جاؤ ـ [قدموں کی چاپ]
شہاب :۔ (دکھتے ہوئے لہجہ میں) میمونہ ! افسانہ نگار نہیں مر
سکتا۔ مصور کو زندہ رہنا ہوگا [انتہائی جذباتی لہجہ میں]
یہ مر جائیں گے تو دلوں کے اندھیروں میں اجالا کون کریگا !
[دروازہ بند ہونے کی آواز]
واجد :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) شہاب ! وہ معصوم ہے ـ وہ
بے گناہ ہے ـ میں تمہارا مجرم ہوں ـــ میری بیوی
گنہگار ہے [انتہائی جذباتی لہجہ میں] میمونہ تو ہیرا
ہے ہیرا !
شاہد :۔ (کربناک لہجہ میں) نہیں خالو جان ! وہ پتھر ہے !

شہاب :۔ (آہستہ سے) جی نہیں زور دے کر بولیے۔
شاہد :۔ (تعجب سے) کیا کہہ رہے ہو شہاب ؟
شہاب :۔ (آہستہ سے) یہی کہ میں اس ہیرے کی قدر و قیمت سے واقف ہوں۔
شاہد :۔ (ہکلاتے ہوئے) تو کیا ۔ تم ۔۔
شہاب :۔ (بات کاٹ کر آہستہ سے) شاہد بھائی !

ع۔ حسن معنی بھی ہے صورت ہی نہیں !

واجد :۔ (رقت بھرے لہجہ میں) شہاب میاں ۔ تم ۔ تم ۔
شاہد : (خوشی کے لہجہ میں) تم واقعی انسان ہو ۔ ایک عظیم ۔
شہاب :۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) چلئے شاہد بھائی ۔ قاضی صاحب آگئے ہوں گے ۔
شاہد :۔ چلئے خالو جان ۔
واجد :۔ (انتہائی خوشی کے لہجہ میں) شہاب ۔ بیٹے ! تم ۔ تم ۔

{واجد کی آواز شادی کے موقع پر گائے جانے والے گیتوں میں ڈوب کر تحلیل ہو جاتی ہے اور گانے کی آوازیں تیز ہو کر شہنائی کی آواز میں مدغم ہو جاتی ہیں}

(فیڈ آؤٹ)

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

بادلوں کا سایہ ——— صفحہ ۲۶۳ کا بقیہ

گلریز :۔ یہ شائستہ ایک دم بور لڑکا ہے ہم نے اس کو بہت سمجھایا ڈاکٹر اس نے ہمارا بات نہیں سنا۔ ہم کو بہت ڈس اپائنٹ کیا ہم اس سے ایک دم ناراض ہو گیا۔ ہم اس کو ایسا سبق سکھلائے گا کہ تمام زندگی یاد رکھے گا (ثاقب خاموش رہتا ہے) ہم نے اس کو سمجھایا کہ تم کو معاف کر دے پر وہ کچھ سننا نہیں چاہتا بلکہ اس نے ہمارا بھی انسلٹ کیا ہم کو افسوس ہوا بھلا تم اس کو کیوں چاہتا ہے (ثاقب اب بھی خاموش رہتا ہے) تم خاموش کیوں ہے کیا تم اس کو نہیں چاہتا۔
ثاقب :۔ میں اس سے اب ملنا نہیں چاہتا۔
گلریز :۔ پر تم دکھی نہ رہا کرے۔ ہم دکھی ہو جاتا ہے۔ مریض دکھی ہو جاتا ہے۔ بولو اب تو تم دکھی نہیں رہے گا۔
ثاقب :۔ نہیں اب میں دکھی نہیں رہوں گا۔ تم میرے دکھ پہ آنسو بہاتی ہو۔ اب میں یہ قیمتی آنسو بہنے نہیں دوں گا۔

(پردہ) (باقی آئندہ)

ناقابلِ فراموش

نوشتہ: میری سرجے

تلخیص و ترجمہ: اختر ملیح آبادی

صحرائے سینائی کی فتح کا راز

اسرائیل نے یہودی لڑکیوں کے دستے طلب کئے۔ یہ فوجی لڑکیاں مصری سپاہیوں کے منہ سے جوتے اتروا لیتی تھیں اور انھیں قاہرہ کیطرف بھگا دیتی تھیں۔ اس لئے کہ ہزار ہا قیدیوں کو سنبھالنا اسرائیل کے بس کا روگ نہ تھا۔

نومبر ۱۹۵۶ء میں برطانیہ فرانس اور اسرائیل نے نہر سوئیز کو قومیانے کے ردِّعمل میں جو مشترکہ جارحیت کی تھی اس کا حیران کن باب صحرائے سینائی تھا جہاں چشم زدن میں اسرائیلی فوجوں نے مضبوط مصری فوجوں کے ہاتھ پیر پھلا دیئے مصری مورچوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور صرف چار دن کے اندر اندر نہ صرف سینائی پر قبضہ کیا بلکہ اسرائیلی فوجیں نہر سوئیز کے مشرقی کنارے تک پہنچ کر خیمہ زن ہو گئیں ۔۔۔!

صحرائے سینائی میں اسرائیلیوں کی ان عظیم فتوحات پر دنیا دنگ رہ گئی اور سنجیدہ جنگی مبصر بھی سوچ میں ڈوب گئے۔ ساری دنیا میں اسرائیلی برتری کی دھاک بیٹھ گئی ۔۔۔ لیکن حقیقت کیا تھی؟ دنیا کو اس سے جان بوجھ کر واقف ہونے نہیں دیا گیا اور جواب بھی بڑی حد تک دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ ہی ہے ۔۔۔!

۱۹۵۶ء میں اسرائیل کو صحرائے سینائی میں جو فتوحات حاصل ہوئیں، اس کے تین اسباب ہیں ۔۔۔ اوّل یہ کہ مصری کمانڈروں نے صحرائے سینائی کے دفاع میں جو غلطیاں کیں ان کا پورا پورا فائدہ یہودی کمانڈر انچیف موشے دایان نے اٹھایا۔ دوم یہ کہ موشے دایان نے جو نقشۂ جنگ بنایا تھا اس میں طاقتور مصری افواج وہیلنگ بردار دستوں سے بالمقابل کی جنگ کے بجائے عقبی حملے بنیاد تھے تاکہ مصری افواج کو دہشت زدہ کر دیا جائے۔ سوم یہ کہ فرانس کی وہ عظیم امداد جس کے بغیر اسرائیلی فوجیں فتوحات حاصل کرنا تو در کنار سینائی کی سرحد بھی پار نہیں کر سکتی تھیں۔

غرضیکہ اسرائیل اکتوبر ۵۶ء میں جارحانہ حملہ کے لئے کیل کانٹے سے تیار ہو گیا۔ فرانس و برطانیہ کو خفیہ طور پہ حکومت اسرائیل نے آگاہ بھی کر دیا۔ وزیر اعظم اسرائیل نے ایم، گائی مولٹ وزیر اعظم فرانس کو بذریعہ ٹرنک کال مطلع کیا۔ مولٹ نے سرانتھونی ایڈن وزیر اعظم برطانیہ کو اطلاع دی۔ اسکیم یہ تھی کہ پہلے اسرائیل حملہ آور ہو اور صحرائے سینائی کو روندتا ہوا نہر سوئیز پہنچے۔ پھر برطانیہ و فرانس اسرائیلی حملے کو بہانہ بنا کر مصر پر لشکر کشی کر دیں گے تاکہ دنیا کو باور کرا سکیں کہ وہ دونوں ممالک حملہ آور نہیں بلکہ پولیس ایکشن کے ذریعے بین الاقوامی بحری راستے کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہ آڑ اس لئے ضروری تھی تاکہ امریکہ روس اور دوسرے ممالک کو باور کرایا جا سکے کہ لشکر کشی سوچی سمجھی اسکیم نہیں بلکہ مفادِ عالم کیلئے ضروری فی الفور اقدام ہے۔

لیکن جملہ تیاریوں کے باوجود اسرائیل نے صحرائے سینائی پر حملہ نہیں کیا۔ تب، گائی مولٹ نے پیرس سے ٹرنک کال کیا اور وزیر اعظم اسرائیل سے تاخیر کی وجہ پوچھی۔ وزیر اعظم اسرائیل نے صاف کہہ دیا کہ اسرائیل کو جب تک دفاع کے لئے فضائی چھتریاں نہیں ملیں گی۔ اس وقت تک اسرائیل کا حملہ ممکن نہ ہو سکے گا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ وزیر اعظم اسرائیل کو معلوم تھا کہ سینائی میں اقدام کرتے ہی مصری مگ طیارے اگر ایک اڑان بھی کر گئے تو اسرائیل کی اینٹ سے اینٹ یقیناً بج جائیگی۔ اس لئے کہ مشرق وسطیٰ کی سب سے مضبوط فضائی طاقت مصر

کے پاس تھی۔ پانچسو مگ طیارے اگر ایک ساتھ اڑتے تو اسرائیل کا بچنا محال تھا کیونکہ اسرائیلی فضائی طاقت بس برائے نام تھی، لہٰذا حملہ کی تیاری کے باوجود مصری فضائی بیڑے کی دہشت نے قدم اٹھانے نہیں دیا۔ وزیر اعظم فرانس ایم گائی مولٹ نے اسرائیل کو جب اس درجہ خوف زدہ دیکھا تو خود فضائی چھتریاں مہیا کرنے کا وعدہ کر لیا۔

سوال یہ ہے کہ اسرائیلی وزیر اعظم نے فرانس سے سوال کیوں کیا؟ برطانیہ سے امداد کا طالب کیوں نہیں ہوا۔ جب کہ برطانیہ بھی لشکر کشی میں اس کا اتحادی تھا۔ نہر سوئیز کے غم کے علاوہ فرانس کو مصر سے شکایت زیادہ تھی۔ ویسے تو سر انتھونی ایڈن ذاتی طور پر کرنل ناصر کو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن ایم گائی مولٹ کے دل کا زخم اس لئے گہرا تھا کہ فرانس کئی سال سے الجیریا میں قوم پرستوں سے نبرد آزما تھا اور کرنل ناصر الجیریا کے باغیوں کی نہ صرف امداد کر رہے تھے بلکہ والنٹیر و اسلحہ بھی فراہم کر رہے تھے مصر میں الجیریا کے قوم پرستوں کے ٹریننگ سنٹر کھلے ہوئے تھے۔

وزیر اعظم فرانس ایم گائی مولٹ نے، سرائیل کی درخواست اس لئے بھی بے چون و چراں قبول کر لی کیونکہ پورٹ سعید سے فرانسیسی چھاتہ بردار فوج کو نہر سوئیز کے مشرقی کنارے پر قبضہ کرنا تھا۔ لہٰذا فرانسیسی فوج اسی وقت محفوظ ہو سکتی تھی جب سینائی پر اسرائیل کا قبضہ ہو۔ ورنہ عقب سے فرانسیسی جارح فوج کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔ یہ خطرات اس وقت محدود ہو سکتے تھے جب اسرائیل کو پیش قدمی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور وہ تیزی سے نہر سوئیز کے مشرقی ساحل تک جا پہنچے۔

اسرائیل وزیر اعظم کی درخواست قبول کرتے ہی مولٹ نے اسی وقت تین فرانسیسی لڑاکا و بمبار طیاروں کے اسکواڈرن تل ابیب پہنچا دینے کے احکامات جاری کر دیئے۔ اس کے علاوہ فرانس نے چار قوی ہیکل ٹرانسپورٹ طیارے بھی اسرائیل کو دیدیے۔ اس کے علاوہ فرانس نے اسرائیل کو یقین دلا دیا کہ حملہ کے بعد جملہ ذمہ قسم کی سپلائی کی ذمہ داری فرانس پہ ہوگی اور اسکواڈرن نہ صرف اسرائیل کا فضائی دفاع کریں گے۔ بلکہ برطانیہ و فرانس کی مشترکہ فضائی طاقت جوں ہی مصری فضائی طاقت کا خاتمہ کر دے گی۔ تب فرانسیسی ہوائی اسکواڈرن پیش قدمی کرنے والی اسرائیلی فوجوں کی عملی امداد کریں گے۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو وزیر اعظم فرانس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ تین فرانسیسی فضائی اسکواڈرن ڈیجت اور سینٹ ڈیمونر کے ہوائی مستقروں سے اڑے۔ چار گھنٹوں میں بحر روم پار کیا۔ قبرص پہنچے اور پھر وہاں سے اڑ کر تل ابیب کے فضائی مستقر جا پہنچے۔ ان کا تل ابیب میں بڑا گرم جوش استقبال ہوا۔

صبح یعنی ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسرائیلی فوجوں نے اچانک صحرائے سینائی پر حملہ کر دیا جو محض فضائی دفاع کے نہ ہونے سے متروکہ ہو رہا تھا۔ قبل اس کے کہ صحرائے سینائی کی جنگ اور وہاں کے معاندوں کا انکشاف کیا جائے۔ یہ بہتر ہوگا کہ اسرائیلی فوج کی ترتیب؛ تربیت وسائل اور طاقت پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے ــــ اسرائیل اپنے حدود اربعہ وسائل آبادی کے لحاظ سے ایک انتہائی حقیر ریاست ہے۔ لہٰذا اس کے وسائل بھی ارد گرد کی عرب ریاستوں سے میل نہیں کھاتے۔ اپنے حالات کی وجہ سے اسرائیل باقاعدہ فوج رکھ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا ایک قلیل باقاعدہ فوج کے علاوہ اسرائیل کی تین چوتھائی فوج محفوظ فوج تھی۔ جس میں ہر پیشے کے لوگ شامل تھے۔ اسرائیل نے جوں ہی فرانس و برطانیہ کے ساتھ مل کر خفیہ طور پر حملہ کا فیصلہ کیا۔ اسی وقت سے محفوظ فوج طلب کی جانے لگی۔ اس فوج میں کلرک، کسان دھوبی، موچی، قصاب، بیرے، تاجر طالب علم غرضیکہ ہر پیشے کے لوگ شامل تھے۔ ان کے لئے کیمپ کھول دیئے گئے تھے۔ تاکہ قواعد ہوتی رہے اور نئے اسلحہ چلانے کی تربیت ملتی رہے۔ حملے سے تین دن قبل ڈیڑھ لاکھ مردوں و عورتوں کو کیمپوں میں بلا کر مسلح کیا جا چکا تھا۔ اس محفوظ فوج کے پاس وردیاں تک نہ تھیں۔ احساس کمتری کو دور کرنے کے لئے اسرائیلی سپریم کمانڈر موشے دایان کو کہنا پڑا:۔ ”نہ شرماؤ نہ گھبراؤ ــ جنگ گنتی کے چند دنوں میں ختم ہو جائے گی“۔ اس فوج کو دیکھ کر جو صحرائے سینائی فتح کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی فرانسیسی جنرل انتہائی مایوس تھے۔ ان کی نظر میں اسرائیلی فوج دراصل فوج ہی نہ تھی بلکہ ایک ہتھیار بند بھیڑ تھی اور بس۔ اس کے برخلاف مصری افواج قدیم افواج تھیں۔ باقاعدہ افواج ان کی اپنی جنگی تاریخ تھی۔ پس منظر تھا۔ باقاعدہ تربیت یافتہ تجربہ کار ٹھوس فوج تھی۔ ایک ایک مصری سپاہی کو صحرائے سینائی کی گرد اور

ش سے بچانے کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ ان کے آرام و آسائش پر
میں روپیہ صرف کرنے کے مقابلے مصری فوجوں کے پاس جدید اعلیٰ ہتھیا
بڑی مدت پر جینے اور آرام کرنے کا اچھا بندوبست تھا۔

صحرائے سینائی کے دفاعی لائن کو کرنل ناصر نے ۱۹۵۳ء
سے بنانا شروع کیا تھا۔ پہلے دور میں ناصر نے جرمن مشیروں سے کام لیا بعد میں
۱۹۵۵ء میں روسی مشیروں کو بلا کر دفاعی لائن کو مضبوط کیا۔ صحرائے سینائی
میں کرنل ناصر نے دو دفاعی لائنیں قائم کی تھیں۔ پہلی مصری دفاعی لائن
اسرائیلی سرحد سے ملحق تھی۔ دوسری دفاعی لائن جو بہت اہم تھی وہ درہ
متلا میں قائم تھی جو نہر سوئیز کے مشرقی ساحل کا گیٹ تھا۔ کیونکہ درہ متلا
کے بعد نہر سوئیز کے مشرقی کنارے تک پہنچنا انتہائی آسان تھا۔ وہاں سے
نہر سوئیز صرف تیس چالیس میل رہ جاتی تھی۔ وہ بھی بغیر کسی دفاع کے۔
لہذا کرنل ناصر نے درہ متلا کو مورچہ بند کر رکھا تھا۔ حملہ آور افواج ہوں
یا پسپا ہونے والی افواج درہ متلا ہی سے ہو کر گزر سکتی تھیں۔ اسی وجہ
سے درہ متلا میں سینائی کی خاص دفاعی لائن قائم کی گئی تھی۔ اور درہ
متلا سے اگلی دفاعی لائن تک قریب سو میل کا صحراء بغیر دفاع کے یونہی
کھلا پڑا تھا۔ لہذا موشے دایان نے اسرائیلی حملہ کا جو نقشہ بنایا وہ مصری
دفاعی لائنوں کے نقائص پر مبنی تھا۔ اسرائیلی نقشہ جنگ کی خصوصیت
یہ تھی کہ وہ اسرائیلی افواج کو مصری افواج سے ٹکراؤ کے بجائے کترا کر نکلنے
کے مواقع فراہم کرتا تھا۔ موشے دایان کو معلوم تھا کہ اسرائیلی فوج مصر کے
مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتی۔ لہذا ٹکراؤ قطعی نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اچانک اور
بھرپور وار شب خون کے رنگ پر ہو تاکہ مصری افواج غیر مفید ہو کر رہ جائیں۔ اسی
داؤں پر اسرائیلی کامیابی کا دارومدار تھا۔ لہذا موشے دایان نے اسرائیلی سرحد
کے قریب مضبوط مصری مورچوں سے ٹکرانے کی بجائے یہ بہتر خیال کیا
کہ خاص دفاعی لائن کو منہدم کر دیا جائے۔ لہذا نقشہ جنگ میں پہلا وار درہ
متلا کے مورچہ پر تھا۔

۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسرائیل نے علی الصباح صحرائے سینائی
پر حملہ کرتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا، مضبوط مصری مورچوں سے کچھ
دور ہٹ کر اپنی چھاتہ بردار فوج اتار دی اور درہ متلا کو گھیر لیا اور اس
کی اطلاع ریڈیو سے قبرص میں فرانسیسی سپلائی مرکز کو دے دی گئی۔

چھاتہ بردار دستے اترنے کی اطلاع ملتے ہی فرانسیسی جنرل نے حکم دیا کہ
"جملہ سپلائی فراہم کرنے کی مہم کا فوری آغاز ہو" اور اسی رات یعنی
۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو فرانسیسی سپلائی یونٹ کے طیارے فوراً پرواز کرنے
لگے اور چھاتہ بردار فوج کو سامان سپلائی کرنے لگے۔ یہ فرانسیسی طیارے
قبرص کے ٹیمبو ہوائی اڈے سے اڑتے رہے اور پانی۔ غذا۔ پٹرول ہتھیار
گولہ بارود کے علاوہ ٹینک شکن توپوں سے مزین جیپیں تک اتارنے
لگے۔ اس طرح فرانس نے اپنی غیر محدود امداد کا آغاز ۲۹ر اکتوبر ہی سے
کر دیا۔ ۲۹ر اکتوبر کا اسرائیل کا غیر متوقع حملہ کرنل ناصر کو انگشت بدنداں
کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس لئے کہ انہیں معلوم تھا کہ اسرائیل اس
طرح بڑھ کر ہاتھ مارنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ اس اچنبھے کی وجہ
شاید یہ بھی تھی کہ اسی رات کو ریڈیو "عربوں کی آواز" سے اعلان ہوا تھا کہ
"..... آج کا دن اسرائیل کے لئے اس لئے منحوس ثابت ہوا کیونکہ مشترکہ
فوجی عرب کمانڈ کی تشکیل ہو گئی اور جنرل حکیم عامر مشترکہ چیف آف
کمانڈ کا تکملہ کرنے کے بعد خاموشی سے شام سے قاہرہ پہنچ گئے تھے۔
لیکن دوسری صبح کو اسرائیل کا بھرپور حملہ ہو گیا۔ ۲۹ر اکتوبر کو موشے دایان
نے نہ صرف درہ متلا کو چھاتہ بردار فوج کے ذریعہ گھیر لیا تھا بلکہ سبک رفتاری
سے اسرائیلی چھاتہ بردار یونٹ دوسرے مورچوں پر بھی اتر گئے تھے۔ سرحد
نجف بن کنتیلا" کے مورچے کو اسرائیلی موٹر کالم نے صرف بیس منٹ میں
تہس نہس کر دیا تھا۔ اس مورچے پر قابض ہو کر اسرائیلی کالم ایک کارواں
کے روپ میں درہ متلا کے سامنے اترنے والے اسرائیلی چھاتہ بردار بٹالین
سے جا ملنے کے لئے چل پڑا۔ ادھر انبائے عقبہ میں بھی اسرائیلی پیش قدمی
ہوئی۔ بندرگاہ ایلاٹ سے ایک اسرائیلی کالم تھامد درے کی طرف بڑھا
اس اسرائیلی کالم کی رفتار اس لئے سست تھی کیونکہ مصریوں نے سرنگیں
بچھا کر راستے کو ناقابل گزر بنا رکھا تھا۔ دوسری طرف قریب کی پہاڑیوں
پر مصری توپ خانہ پوزیشن لئے اور اسرائیلیوں پر جم کر موثر گولہ باری کر
رہا تھا۔ مصریوں کے پاس چیکوسلواکیہ کی اعلیٰ توپیں تھیں۔ یہاں ایک
خونریز معرکہ ہوا اور آخر یہ مورچہ اسرائیل نے فتح کر لیا۔ وسطی سینائی میں
اسرائیلی پیش قدمی کی مزاحمت زیادہ سخت نہیں ہوئی۔ تمثل کے مقام پر
مصری فوج نے معمولی مزاحمت کی اور پھر پیچھے ہٹ گئی۔

اشتہار

لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ درہ متلا کی مورچہ بندی تو تھی لیکن دفاعی انتظام ہلکا تھا۔ مثلاً درہ متلا میں بڑا توپ خانہ نہ تھا۔ اور جب درہ کے سامنے اسرائیلی چھاتہ بردار اتر گئی۔ تب بھی مصری توپ خانہ کو وہاں تک پہنچنے میں پورے تیس گھنٹے لگ گئے۔ اس کے علاوہ اسرائیلی حملہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن مصری فضائیہ کے مگ طیارے نہ اب اڑ رہے تھے نہ جب اڑ رہے تھے۔ جبکہ فوراً اڑان اور حملوں کی ہر ایک کو امید تھی۔ لیکن مصری فضائی طاقت کیوں محو خواب تھی۔ کسی کو علم نہ تھا۔ جنگی مبصرین دیکھ رہے تھے کہ تل ابیب میں اگرچہ تین فرانسیسی لڑاکا دبمبار اسکواڈرن فضائی حفاظت کی غرض سے پہنچ چکے ہیں۔ لیکن وہ چار پانچ سو مگ جہازوں کے مقابلے میں ہرگز ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ اسی لئے جنگی مبصرین کو خدشہ تھا کہ مصری مگ اگر فوری طور پر اسرائیل پر لپک لیں گے تو فرانسیسی اسکواڈرن ہی تباہ ہوں گے بلکہ سلطنت اسرائیل کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ بہت تاخیر سے چار مصری بمباروں نے درہ متلا کے قریب اترنے والے اسرائیلی چھاتہ بردار بٹالین پر بمباری کی لیکن وہ مگ نہ تھے بلکہ پرانے ویمپائر تھے جن میں سے تین کو دو اسرائیلی جہازوں نے گرا لیا۔ اس وقت مصری فضائی طاقت کی کمزوری کا راز کھلا کہ مگ طیاروں کو مصری ہوا باز اڑانے کے اہل نہ تھے۔ اس کے کئی گھنٹے بعد قاہرہ کے ہوائی مستقر سے چھ مگ طیارے اٹھے اور درہ متلا پر پہنچے اگرچہ ان کی تعداد کم تھی مگر ان چھ مگ طیاروں نے آتے ہی اسرائیلی چھاتہ بردار بٹالین کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ ان کی بمباری سے پریشان ہو کر اسرائیلیوں نے طے کیا کہ وہ پہاڑیوں کو عبور کریں اور اس درّے میں پہنچ جائیں جہاں سے مصری توپ خانہ دھواں دھار گولہ باری کر رہا ہے تا کہ مگ طیاروں سے نجات ملے۔ یہودی نے پہاڑیوں پر دھاوا کیا لیکن مگ طیاروں نے ان کی کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ یہ وقت چھاتہ بردار بٹالین کے لئے بہت بھاری ثابت ہوا اس لئے کہ فرانسیسی بمبار لڑاکا بھی جو اسرائیل کی ملکیت تھے مگ طیاروں کے سامنے بے بس بن چکے تھے۔ شام کو مگ طیارے کامیاب جنگ کے بعد واپس جا چکے تھے۔ لیکن اپنی درگت یہودیوں کو یاد رہی۔ انھوں نے یقین کر لیا کہ دن کی روشنی میں ان کے سارے خواب دفن ہو جائیں گے۔ لہٰذا اسرائیلی شبخون کی تیاری کرتے رہے بعد تین بجے رات کو جملہ اسلحہ چھوڑ کر صرف گرینیڈ اور چاقو لے کر مصری کمین گاہوں پر ٹوٹ پڑے۔ درّے کے اندر دو گھنٹہ جم کر دست بدست جنگ ہوئی۔ نتیجہ میں میدان اسرائیلیوں کے ہاتھ رہا۔ مصریوں کے دو سو آدمی کام آئے بیس کا اعلان اسرائیلیوں نے کیا جو درہ متلا کی اہمیت کے پیش نظر کچھ بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ اسی درّے پر قبضے کے معنی یہ تھے کہ اب نہر سویز کا پھاٹک ان کے لئے کھل گیا تھا۔ درہ متلا پر قابض ہوتے ہی اسرائیلی فوج نے آگے بڑھ کر پورٹ توفیق پر قبضہ جما لیا اور ایک کالم جنوبی نہر سویز کی طرف بڑھ گیا۔ ۳۰ نومبر ۱۹۵۶ء کو نہر سویز کے پٹرولی کنوؤں کے مقام ثاہر چھاتہ بردار دستہ اتر گیا اور دن بھر گھمسان کا رن پڑتا رہا۔ دوسری طرف خلیج عقبہ محاذ میں اسرائیلیوں نے شرم الشیخ پر قبضہ کیا۔ وہاں سے ایک اسرائیلی کالم درہ متلا ہو کر بغیر مزاحمت نہر سویز پہنچ گیا۔

خلیج عقبہ محاذ پر اسرائیلیوں نے اگرچہ شرم الشیخ پر قبضہ کر لیا تھا لیکن ان کا مقصد ابھی نامکمل تھا۔ شرم الشیخ وہ مقام ہے جہاں سے مصری لمبی مار توپیں جزیرہ تہران کے تنگ آبی راستے کو کنٹرول کرتی تھیں اور اسرائیلی جہازوں کا اس آبی راستے سے گزرنا ناممکن بنا دیتی تھیں۔ لیکن شرم الشیخ کا قلعہ راس نصرانی ابھی تک مصری قبضے میں تھا اور یہودیوں کو پریشان کر رہا تھا۔ لہٰذا اس قلعے پر یہودیوں نے عقب سے حملہ کیا۔ تھوڑی مزاحمت کے بعد مصری فوج نے قلعہ خالی کر دیا اور شرم الشیخ کی طرف بڑھی۔ یہاں پہلے ہی سے پندرہ سو مصری فوج موجود تھی اور شدید گولہ باری کر رہی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر اسرائیلیوں نے اپنی فضائی فوج کو سگنل دیا کہ شرم الشیخ پر نیپام بموں سے حملہ کیا جائے آخر نیپام بموں سے جہازوں نے اس مورچے پر بمباری کی نتیجہ میں مصری فوج بھاگ کر جزیرہ سانومن پہنچی تا کہ وہاں سے سعودی عرب کے ساحل پر اتر جائے۔ لیکن اسرائیلیوں نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا اور آٹھ سو چالیس مصری فوج قید کی۔

ادھر مغربی سینائی محاذ پر جو سڑک قاہرہ سے سوئز اسماعیلیہ ہوتی ہوئی بیت شلم جاتی تھی اور جہاں ایلٹ بندرگاہ والعریش سے سڑکیں آ کر ملتی تھیں۔ وہاں کرنل ناصر نے جرمن مشیروں کی مدد سے مضبوط مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ اس سڑک کے کنارے ایک مصری گاؤں ابو اغلیہ تھا۔ اس کے سامنے ام کیف کی پہاڑیاں تھیں لہٰذا

مصر نے اس چوراہے کے سامنے والی پہاڑیوں اور راستے کو سرنگوں اور خار دار تاروں سے گھیر رکھا تھا۔ اس مضبوط مصری مورچہ پر اسرائیل نے حملے کے دوسرے دن یعنی ۳۰ اکتوبر کو حملہ کیا لیکن یہ حملہ مصری توپ خانے نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ دوسرے دن اسرائیلیوں نے دو ٹینک ڈویژن آگے بڑھائے اور توپ خانہ بھیج دیا۔ مصری توپوں نے بیس شرمن یہودی ٹینک توڑ ڈالے اور تیرہ فرانسیسی لے' ایم' ایکس ٹینک کام آئے۔ یہودی ابواغیلہ کے مصری مورچے سے سر ٹکراتے اور پھوڑتے رہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر اسرائیلیوں نے مضبوط مصری مورچے کو توڑنے کے لئے نیپام بموں کی بارش کر دی۔ تب جاکر ۲۱ اکتوبر کو یہ مورچہ یہودیوں کے ہاتھ لگا۔ حقیقت یہ تھی کہ ۲۹ اکتوبر کو جب اچانک اسرائیلی حملہ ہوا تب کرنل ناصر نے اسے محض اسرائیلی تماشا سمجھا — پہلے دن ان کی یہ قطعی رائے تھی کہ اسرائیلی حملہ صرف سرحدی چھاپہ ہے۔ اور بس — ادھر مصری جنرلوں نے اس خود فریبی کو اور مستحکم کر دیا جو ہر محاذ سے فتوحات کی جھوٹی خبروں والے تار بھیج رہے تھے اور اس قسم کے بلیٹن نکل رہے تھے "ہر محاذ پر یہودیوں کو روک دیا گیا — تباہ کر دیا گیا —!"

لیکن حملے کے تیسرے دن جب کرنل ناصر حقیقت سے آشنا ہوئے تو انھوں نے ڈیلٹا سے اپنی بہترین فوج طلب کر لی۔ جس کے پاس موٹری توپ خانہ بھی تھا۔ ۲۱ اکتوبر کو یہ فوج قاہرہ کی سڑک پر تھی اور کرنل ناصر انڈونیشیا کے سفیر کے ساتھ کھانا کھانے ابھی میز پر بیٹھے ہی تھے کہ سارا قاہرہ دھماکے سے گونج گیا۔ برطانوی و فرانسیسی مشترکہ فضائی فوج نے قاہرہ اور اس کے گرد و نواح کے ہوائی مستقروں پر بمباری شروع کر دی تھی —!

مصری ہوائی طاقت کے مفلوج ہوتے ہی تل ابیب میں مقیم تین فرانسیسی ہوائی اسکواڈرن دفاعی خدمت سے آزاد ہو گئے اور حکومت فرانس کے وعدے کے بموجب اب اسرائیلی پیش قدمی کرنے والی فوج کا ہاتھ بٹانے اور مصری فوجوں پر بمباری کرنے لگے۔ غازہ پٹی کے عقب میں ساحل کی طرف رفہ میں القنطرہ کی سڑک پر کرنل ناصر نے مضبوط مورچہ بنا رکھا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رفہ کا ساحلی مورچہ مضبوط ترین مورچوں میں سے ایک تھا۔ یہاں ٹینک ڈپو موجود تھے ہوائی اڈہ تھا۔ رفہ ٹرانسپورٹ پول بھی تھا۔ اس مضبوط مورچے کی خندقوں میں دو مصری کمپنیاں پوزیشن لئے رہتی تھیں جو دو ڈویژن کے حملوں کو بڑی آسانی سے روک سکتی تھیں۔ اس مورچے کی خندقوں کو خار دار تاروں سے محفوظ کر دیا گیا تھا اور ہر طرف سرنگوں کا جال بچھا تھا۔ ۳۰ اکتوبر کی شب میں ایک اسرائیلی کمانڈر دستہ سرنگوں اور تاروں کو ہٹا کر راستہ بنانے کے لئے بھیجا گیا۔ لیکن مصری توپ خانے سے اسے قریب نہیں آنے دیا۔ یہودیوں نے ۳۱ اکتوبر کی شب میں پھر کوشش کی جس کا حشر بھی وہی ہوا۔ اس ناکامی سے فرانسیسی جنرل پریشان تھے۔ اس لئے کہ قبرص میں فرانسیسی جنرل گی لیس اور فضائی جنرل برو ہون فرانسیسی چھاتہ بردار فوج کو نہر سوئیز کے علاقے میں اتارنے کی تیاری کر رہے تھے۔ لہٰذا اسرائیل کی ناکامیوں نے انھیں بدحواس بنا دیا تھا۔ فرانسیسی چھاتہ بردار فوج کے عقب میں غازہ پٹی میں مضبوط مورچہ کا برقرار رہنا ہر لحاظ سے خطرناک تھا۔ لہٰذا جوں ہی موشے دایان اسرائیلی کمانڈر انچیف نے قبرص کے فرانسیسی سپریم کمانڈر امیر البحر بار جوٹ سے بحری امداد طلب کی۔ اس کی درخواست فوراً قبول کی گئی اور امیر البحر بار جوٹ نے فرانسیسی کروزر جارجیس لے گوئیس جو اسرائیلی ساحل پر لنگر انداز تھا۔ فوراً رفہ کے ساحل پر پہنچنے کا حکم دیا۔ فرانسیسی کروزر جارجیس جونہی رفہ کے قریب پہنچا تو جٹ طیاروں کا ایک دستہ اوپر سے اڑان کرنے لگا۔ فرانسیسی کروزر کے توپچیوں نے پوزیشن سنبھال لی۔ لیکن یہ محض اتفاق تھا کہ یہ گولہ باری نہیں ہوئی۔ اگر گولہ باری شروع ہو جاتی تب فرانس اور امریکہ میں یقیناً ٹھن جاتی اس لئے کہ وہ جٹ طیارے امریکی چھٹے بحری بیڑے کے تھے جو بحر روم میں لنگر انداز تھا۔ فرانسیسی کروزر جارجیس لے گوئیس نے یکم نومبر ۱۹۵۶ء کی صبح چار بجے ایکسو باون ملی میٹر کے دہانوں کی توپوں سے مصری مورچے پر اندھا دھند گولہ باری شروع کی اور مسلسل دو گھنٹوں کی گولہ باری میں چار سو وزنی گولے مصری مورچہ پر پھینکے جو مصری مورچہ اسرائیلیوں سے فتح نہیں ہو سکا تھا وہ فرانس کی مدد سے فتح ہو

گیا۔ چھ بجے صبح اسرائیلی ٹینکوں نے حملہ کیا جنکی مدد بمبار طیارے بھی کر رہے تھے۔ فرانس کی مدد سے رفح کے مورچے پر اسرائیل قابض ہو گیا یہاں بہت مال غنیمت ہاتھ لگا۔ رفح پر قبضہ کرتے ہی اسرائیلی کمانڈ لاسکو فوراً غازہ کی طرف بڑھا۔ غازہ میں مطلق مزاحمت نہیں ہوئی۔ ہر گھر سے سفید کپڑا باہر نکلا۔ غازہ میونسپلٹی کی کونسل نے شہر یہودیوں کے حوالے کر دیا۔ اور اس طرح اسرائیل کے دل کا وہ کانٹا نکل گیا جو برسوں سے کھٹکا کرتا تھا۔ غازہ میں یہودی کمانڈر نے یہودی خزانچی بٹھا دیئے جو مصری نوٹ لے کر یہودی نوٹ بدلنے لگے۔ یہودی سپاہیوں نے جی کھول لوٹ مار کی۔ غازہ سے بڑھکر اسرائیلی یونٹ آگے بڑھے اور العریش پر قابض ہو گئے۔ یہاں بھی بے شمار اسلحہ حتیٰ کہ ٹی ۳۴ ماڈل کے بہت سے ٹینک خودکار روسی رائفل، ٹرک، سرنگیں اور ٹینک شکن سرنگیں بھی ہاتھ لگیں اور اس طرح ۲ نومبر کو اسرائیلی یونٹ القنطرہ پہنچ گئے۔ جہاں فرانسیسی چھاتہ بردار فوج ایکشن کرتی ہوئی انھیں ملی۔

اب کرنل ناصر نے صحرائے سینائی میں کھیلے جانیوالے اسرائیلی ڈرامے کو پوری طرح سمجھ لیا تھا۔ ان کی خفیہ سروس تو ان کی آنکھوں کے سامنے ایک پردہ تانے ہوئے تھی۔ لیکن قاہرہ کے ہوائی اڈے پر برطانوی و فرانسیسی حملے نے ڈرامے کو ہی نہیں سمجھا دیا بلکہ انھوں نے اس جارحانہ حملے کے ڈرامے کے ایکٹروں کو بھی پہچان لیا تھا۔

فرانسیسی فوج کو علم تھا کہ ٹی ۳۴ ماڈل مصر کے پاس ہیں۔ لیکن اسرائیلیوں نے ان پر قبضہ کر لیا اور انھیں لے کر نہر سوئیز کے علاقے میں پہنچے تو فرانسیسی فوج نے ان پر گولہ باری کی۔ جب غلط فہمی کا ازالہ ہوا تب فرانسیسی جنرلوں نے یہودیوں کو امتیازی نشان پینٹ کرنے کا مشورہ دیا چونکہ اسرائیلی نشان سات رخی تارہ تھا جب کہ مصری نشان پانچ رخی تارہ تھا۔ لہذا اڑتا ہوا طیارہ پانچ رخی و سات رخی تارہ میں غلطی کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ اسرائیلی ٹینکوں پر صلیب احمر کا پینٹ کر دیا جائے۔

اسرائیلیوں نے یہودی لڑکیوں کے دستے طلب کئے تھے ان کے ذمہ جنگی قیدیوں کے کیمپ کی نگرانی تھی۔ عورتوں کے دستے میدان جنگ بھی بھیجے گئے۔ مصری سپاہیوں کی جامہ تلاشی کے لئے، یہودی فوجی لڑکیاں مصری سپاہیوں کی تلاشی لیتی تھیں ان کے موزے اور جوتے اتروالیتیں اور انھیں قاہرہ کی طرف بھگا دیتی تھیں۔ اس لئے کہ ہزاروں قیدیوں کو کھلانا اسرائیل کے بس کا روگ نہ تھا۔

۲۹ راکتوبر ۱۹۵۶ء کے اسرائیلی حملے کے ٹھیک آٹھویں دن اسرائیل نے اقوام متحدہ کے حکم کو تسلیم کیا اور جنگ بندی قبول کی۔ جنگ نے اسرائیل کو بہت نوازا۔ پٹرول کا ذخیرہ اتنا ملا کہ ان کی پوری ضرورت کے لئے ایک سال کے لئے کافی تھا۔ ہزاروں ٹرک ملے۔ درجنوں مصری ٹینک مل گئے۔ تین سو توپ خانے پیادوں کے بلند اسلحہ کے ذخائر اور غذا کے ذخیرے اسرائیل کے ہاتھ لگے۔

جب اسرائیل صحرائے سینائی خالی کرنے لگے تو ہر چیز کو انھوں نے تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا۔ قلعے، سڑکیں، ریل کی پٹریاں ہوائی اڈے، پل، اسٹیشن غرضیکہ اسرائیلیوں نے پسپائی کے وقت کوئی چیز سلامت نہ چھوڑی۔

صحرائے سینائی میں اسرائیل کو جو خلاف توقع فتوحات حاصل ہوئیں وہ دراصل فرانس کی عملی امداد و تعاون کی مرہون منت ہیں لیکن اس امداد و تعاون کی کوئی رپورٹ فرانسیسی ہائی کمانڈ نے مرتب نہیں کی۔ کیونکہ فرانس دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ سینا کی فتوحات اسرائیل کی خود اپنی فتوحات ہیں۔ لیکن تمام کوششوں کے باوجود یہ راز راز نہ رہ سکا کہ سینائی میں اسرائیلی فتوحات کی بنیاد فرانس کی امداد تھی۔ یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو جب مصری ہوائی طاقت مفلوج ہو گئی اسوقت سے آخر تک فرانسیسی بمبار طیارے اور لڑاکا جہاز سینائی میں اڑتے رہے اور صرف بمباری ہی نہیں کرتے رہے۔ بلکہ مصری مورچوں کو تہس نہس بھی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ فرانس کی بحری طاقت بھی اسرائیلیوں کی عملی امداد کر رہی تھی۔ اگر اسرائیل کو فرانس کی غیر محدود امداد نہ حاصل ہوتی تب تنہا اسرائیل اپنی طاقت کے سہارے سینائی میں فتح تو در کنار سینائی کی سرحد بھی پار نہیں کر سکتا۔ خود موشے دایان نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "اگر فرانس ہماری پشت پناہی نہ کرتا تو ہمارا خواب پورا نہیں ہو سکتا تھا۔"

یہ تھا ۱۹۵۶ء میں اسرائیلی فتح کا راز!

نوشتہ: علاؤ الدین آزاد
ترجمہ: احمد سعدی

بنگالی کہانی

مالو ایک ہزار روپے نقد، پانچ سو کا زیور اور تین بیگھہ زمین لڑکی کے نام لکھ دینے کو تیار تھا لیکن اسکا ماموں تیار نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنوں میں لڑکی کی شادی نہیں کرنی چاہئے۔ غیروں میں شادی کرنے سے خاندان بھی بڑھتا ہے اور محبت بھی پیدا ہوتی ہے۔

تمام رات چاروں تاش کھیلتے رہے اور جب ساری رات ڈھل گئی اور چڑیاں چہچہا کر صبح کی آمد کا پیغام سنانے لگیں تو انھوں نے تاش کھیلنا بند کر دیا اور اٹھ کر سونے کے لئے چلے گئے۔

ان چاروں میں ایک کا قد بوٹا سا تھا اور وہ گول مٹول مگر بیحد مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ دوسرے کا قد درمیانہ تھا۔ اور باقی دو کا قد تقریباً یکساں طور پر لانبا تھا۔ لیکن جس کی چھاتی چوڑی اور کندھے بھاری تھے اور کلائی مضبوط تھی اور بل کھائی ہوئی مونچھ تھی، اس کا نام ابراہیم تھا اور وہ ایبو کے نام سے مشہور تھا اور لوگ اُسے ایبو غنڈہ کہتے تھے۔ ان چاروں میں وہی سردار تھا، یہ کوئی جماعت نہیں تھی، پھر بھی وہی سردار تھا کیونکہ جب چاروں اکٹھے ہوتے تو ایبو جو بھی فیصلہ کرتا، تینوں اسی پر عمل کرتے تھے، جس کا قد بوٹا سا تھا، اس کا نام جبار تھا اور وہ جبو کے نام سے مشہور تھا۔ وہ بیحد غصہ ور نڈر اور بیباک تھا۔ اس کی مثال کھلے ہوئے بچھڑے کی سی تھی۔ جب کبھی اس کی ضرورت پڑتی تو وہ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح مخالفوں کی صفوں میں گھس پڑتا تھا اور جس کا درمیانہ قد تھا اس کا نام ملک تھا اور وہ مالو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ معتدل مزاج کا آدمی تھا۔ باتیں بھی کم کرتا تھا اور دیکھنے میں بھی سنجیدہ نظر آتا تھا لیکن جب اسے غصہ آجاتا تو پھر اُسے کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ چوتھے کا نام کلیم تھا اور وہ کالو کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور بیحد خطرناک آدمی تھا، اُجڈ اور گنوار، خواہ کتنا ہی مشکل کام کیوں نہ ہو، اُسے سردار کے حکم کی تعمیل کرکے خوشی ہوتی تھی۔

ان چاروں کے تعلقات ایک دوسرے سے بہت خوشگوار تھے۔ وہ چاروں ہمیشہ اکٹھے ہی رہتے تھے اور شاید اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ ان چاروں کا کام ایک دوسرے کی مدد کے بغیر چلنا مشکل تھا اور شاید اسی ضرورت نے ان چاروں کو اکٹھے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کسی زمانے میں یہ چاروں علاقے بھر میں کبڈی کے مشہور کھلاڑی تھے۔ ایک بار ان چاروں نے فرید آباد کی ٹیم کے ساتھ کبڈی کھیل کر کانسی کی ایک کلسی بھی حاصل کی تھی اس کے علاوہ ان کی خاطر مدارت بھی خوب ہوئی تھی دعوتیں بھی ہوئی تھیں، جشن منایا گیا تھا۔

یہ چاروں بچپن ہی سے بے حد شریر تھے اور کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جب یہ کوئی نئی شرارت نہ کرتے ہوں۔ کوئی ہنگامہ، کوئی نیا فساد، کوئی جھگڑا غرض یہ کہ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے انھیں "چار غنڈے" کا خطاب بھدے رکھا تھا۔

پارچہ بافوں کی اولاد عموماً پارچہ باف ہی ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ چاروں تو ننٹوں کی اولاد کے بھی کان کتر رہے تھے، کبھی جاترا کرتے، کبھی گاؤں کی محفل جماتے، سینما دیکھتے اور دن رات اودھم مچاتے رہتے۔ ان پر نہ تو بڑے بوڑھوں کی نصیحتوں کا کچھ اثر ہوتا، نہ والدین کی مار اور تنبیہ کا، لوگ انھیں راہ راست پر لانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر کے تھک گئے۔ لیکن ان چاروں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ یہ چاروں اپنی من مانی کرتے رہے اور نت نئے ہنگاموں کو جنم دیتے رہے اور اسی طرح بچپن سے جوانی کی سرحد تک آپہنچے۔

اسی درمیان ایک ایسا سنگین حادثہ پیش آیا جس کے نتیجے میں ان چاروں کا اتحاد یقینی طور پر ختم ہو جانا چاہیئے تھا لیکن پھر بھی وہ چاروں متحد

ہی رہے اور یہ واقعی حیرت کی بات تھی۔

جبو مالو کی بہن بچی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اس پر اس بری طرح فدا تھا کہ برسوں اس کی ذات پر بے دریغ پیسے خرچ کرتا رہا اور صابن تیل، پوڈر، کنگھی کے علاوہ ایک قیمتی سی ساڑی بھی تیار کرا کے دی تھی۔ لیکن اتنا کچھ کرنے کے باوجود مالو نے اس کی منگنی کسی دوسرے لڑکے سے کر دی اور یہ بات جبو کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ مالو نے اس طرح جبو کی مردانگی کو چیلنج کیا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

"نمک حرام، بے ایمان!" جبو بھڑکے ہوئے سانڈ کی طرح دولتی جھاڑنے لگا تھا۔

اس نے مالو سے بدلہ لینے کیلئے ایک چھرا خریدا اور اس پر دھار چڑھا کر کئی دنوں تک اس کی تلاش میں گھومتا رہا۔

"میں جب تک اس چھرے سے اس کا پیٹ چاک نہ کر دوں مجھے چین نہیں ملے گا۔"

اور ایک روز شام کے وقت راستے میں اتفاق سے دونوں کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ مالو کو دیکھتے ہی جبو جیسے خونی درندے کی طرح اس پر جھپٹ پڑا لیکن مالو پہلے ہی سے ہوشیار تھا۔ اس نے طرح دے کر جبو کا وار خالی دے دیا۔ اور اس کی کلائی پکڑ کر بے بس کر دیا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دے مالو، میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ دھوکہ باز، بے ایمان!" جبو جیسے پھنکارنے لگا۔

لیکن مالو نے اپنے آپ کو سنبھال لیا — اس نے سمجھانے کے انداز میں جبو سے کہا —

"دیکھو جبو، زیادہ ہنگامہ نہ ہی کرو تو بہتر ہے، ورنہ اگر مجھے غصہ آگیا تو کہیں مجھے تمہارا خون نہ کرنا پڑے۔ بڑا آیا محبت کرنیوالا! اگر میں تم سے اپنی بہن کی شادی کر دیتا تو تم اُسے خوش رکھ سکتے؟ میں نے اس کی منگنی ایک خوش حال گھرانے میں کر دی ہے، وہاں وہ زیادہ خوش رہے گی۔ اگر تم اس سے سچی محبت کرتے ہو تو تمہیں خوش ہونا چاہیئے۔"

اور مالو کی بات سن کر جبو رو پڑا تھا — "خوش ہونا چاہیئے، جس کے دل میں آگ لگی ہو وہ خوش کیسے رہ سکتا ہے!

اور مالو نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا تھا — "میں سب سمجھتا ہوں لیکن اب رونے سے کوئی فائدہ نہیں، اب تو اس کی منگنی ہو چکی ہے، اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا، تم بچی کو بھول جاؤ!"

لیکن اسی رات جبو بچی کو اغوا کر کے اپنے گھر لے آیا تھا اور جب مالو ہاتھ میں چھرا لئے ہوئے جبو کے کمرے میں داخل ہوا تھا تو اس کے قدم یکایک جیسے شل ہو گئے تھے۔ جبو اس وقت بری طرح ہانپ رہا تھا اور ایک طرف بچی نئی نویلی دلہن کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ پھر جبو نے اس سے شادی کرلی تھی۔

کہتے ہیں جو دوسروں کیلئے کنواں کھودتا ہے، وہ خود ہی اس میں گرتا ہے۔ یہ بات بالکل سچ ہے۔ ورنہ ایسا کیوں ہوتا! دوسرے کو دھوکہ دینے والے کو خود بھی فریب کھانا پڑتا ہے۔ یہی قانون فطرت ہے۔ کم از کم مالو اس پر کامل یقین رکھتا تھا۔

مالو یوں تو دیکھنے میں بڑا سنجیدہ معلوم ہوتا تھا، کم گو تھا، لیکن اندر سے بڑا گہرا تھا۔ وہ اپنی ماموں زاد بہن سے محبت کرتا تھا۔ اس کے ماموں کو مالو پر بہت اعتماد تھا، وہ اُس سے بے حد پیار کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی لڑکی کی شادی کرنے پر تیار نہ ہوا حالانکہ مالو ایک ہزار روپے نقد، پانچ سو روپے کا زیور اور تین بیگھہ زمین لڑکی کے نام لکھ دینے کو تیار تھا، لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنوں میں لڑکی کی شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا، اس کے برعکس غیروں میں رشتہ کرنے سے خاندان بھی بڑھتا ہے اور محبت بھی دیرپا ہوتی ہے۔

اور جب مالو کو یہ خبر ملی تو وہ غم و غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا۔
اس نے کہا، یہ سراسر ظلم ہے، میں اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن سکینہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔

پھر ایک رات جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی وہ چاروں اکٹھے روانہ ہوئے تھے اور سکینہ کے گھر کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سکینہ رات کو اپنے چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ بڑے کمرے میں سوتی تھی اور اس وقت گہری نیند میں سوئی ہوئی تھی۔ برآمدے کی دیوار کاٹ کر مالو کمرے میں داخل ہوا تھا اور پھر اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کے بعد ایوب نے نیند ہی کے عالم میں اس کا ہاتھ باندھ دیا تھا اور منہ پر کپڑا لپیٹ کر اپنے کاندھے پر اٹھا لیا تھا۔ رات تاریک تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں گہری نیند سو رہے تھے۔ اسلئے کسی کو پتہ بھی نہ چلا اور ایوب

یٹے کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا کافی دور نکل گیا اور اس کے تینوں ساتھی پیچھے ہی رہ گئے تھے۔

اور پھر ایسا ہوا کہ رات کی تاریکی، سنسان راستہ اور بارش میں بھیگے ے ایک جوان عورت کے جسم کے نازک لمس نے ایبو کے جذبات میں ہلچل ری تھی۔ اس نے سکینہ کو لا کر اپنے بستر پر لٹا دیا تھا اور چراغ کی لو بڑھا کر ۔ اس کے قریب آیا تھا تو سکینہ کا سراپا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ سکینہ کا تمام پانی میں شرابور تھا اور ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی بھیگ کر اس کے جسم سے ے گئی تھی۔ سکینہ واقعی خوبصورت تھی، اس کا سڈول اور گداز جسم، سیاہ بال تواں ناک، یاقوتی ہونٹ اور اس کی بے داغ جوانی اور سفید رنگت ، ہیم جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا، اس نے اپنی زندگی میں بہت ساری لیاں دیکھی تھیں، لیکن سکینہ ان سبھوں سے مختلف تھی اور پھر ایبو کی نگاہوں وحشت اُبھر آئی اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اس نے سکینہ سنہ پر لپٹا ہوا کپڑا کھول دیا۔ سکینہ نے گھبرا کر ایبو کی طرف دیکھا، لیکن اسکے سوچنے اور سمجھنے سے پہلے ہی ایبو نے اُسے یوں اپنی باہوں میں دبوچ لیا ، وہ عورت نہ ہو۔ کمہار کے چاک پر رکھی ہوئی گیلی مٹی ہو اور سکینہ نے اسکی ہو اگرفت میں آکر صرف اتنا سوچا، آخر یہ کون مرد ہے! یہاں کیسے آگیا؟ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک ٹک دیکھتے ، اور شاید وہ دونوں اسی طرح ایک دوسرے کو نہ جانے کب تک تکتے شاید تمام رات، یا تو پھر تمام عمر، صدیوں اسی طرح تکتے رہے۔ لیکن اتنے ہ تینوں آگئے تھے اور کمرے میں داخل ہوتے ہی تینوں کے قدم جیسے زمین ڑ گئے تھے۔

انھوں نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی طوفان گزر چکا تھا اور اب بھی نہیں کیا جا سکتا، پھر وہ تینوں اُلٹے پاؤں دروازے کے باہر چلے گئے دن پھر ایبو نے سکینہ سے شادی کر لی تھی۔

مگر یہ ہنگامہ یہیں فرو نہیں ہوا تھا، پھر پنچایت بیٹھی تھی اور پنچایت ۔ بو کو اس جرم کی پاداش میں سخت سے سخت سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ تب بھری پنچایت میں خود سکینہ نے کھڑے ہو کر یہ کہا کہ وہ اپنی مرضی سے ہ ساتھ بھاگ کر آئی ہے اور اُسے اپنا شوہر تسلیم کر چکی ہے تو پنچایت کا دھرا کا دھرا رہ گیا۔ لیکن ایبو پر اس واقعہ کا اتنا زبردست اثر ہوا کہ اُس نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کی قسم کھائی۔ اُس نے ابتک شادی نہیں کی تھی یوں دیکھنے میں وہ سنجیدہ تھا لیکن اگر کسی بات پر اڑ جاتا تھا تو پھر زندگی بھر اسی پر قائم رہتا تھا۔

سکینہ جتنی خوبصورت تھی، اتنی ہی تند مزاج بھی تھی۔ جب اُسے غصہ آتا تو اس کے ہونٹ کانپنے لگتے اور اُس کی باتوں میں تلخی اور ترشی گھل جاتی لیکن ایبو کو اس کی جلی کٹی باتوں میں بڑا مزہ آتا۔ بظاہر ایبو ہمیشہ اس کے سامنے لئے دئیے رہتا تھا، لیکن بباطن وہ اس سے ڈرتا تھا اور ان باتوں سے احتیاط برتتا تھا جو سکینہ کو ناپسند تھیں۔ سکینہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی، لیکن آج بھی اس کے حسن پر وہی پہلے جیسی تر و تازگی اور نکھار تھا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد ایبو اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا تھا، بچے یوں تو خدا کی دین ہوتے ہیں، پھر ایبو کی خواہش تھی کہ اس کے یہاں اگر ایک بچی پیدا ہو جاتی تو اس کی باقی حسرت بھی پوری ہو جاتی۔

ایبو نے آہستہ آہستہ ساری بُری عادتیں ترک کر دی تھیں صرف ایک باقی رہ گئی تھی اور وہ تھی تاش کھیلنے کی عادت۔ مگر اس کیلئے وہ ہمیشہ مواقع پیدا کر لیا تھا تاکہ سکینہ کو اس کا پتہ نہ چل سکے۔

جب وہ کسی کام سے باہر جاتا تو ٹرین میں کھیلتا تھا، جہاز میں کھیلتا تھا اور جب گھر میں ہوتا تو اُس وقت کھیلتا تھا، جب سکینہ گہری نیند میں سوئی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ چپکے سے اُٹھ کر باہر آجاتا، مگر کہیں دور جانے کی بجائے بغل کے کمرے میں جس میں کرگھا تھا، چراغ جلا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے بیٹھ جاتا تھا۔

سسر کے مرنے کے بعد کرگھے والے کمرے میں چوہوں اور چمگادڑوں نے بسیرا کر لیا تھا، لیکن سکینہ اُسے جھاڑ پونچھ کر پھر صاف ستھرا بنا دیا تھا۔ پرانے تانتوں کی مرمت کی تھی اور ایک نیا تانت خرید کر بٹھا دیا تھا اور چھوٹے دیور ایبو اور دوسرے دو کاریگروں کے ذریعہ بُنائی کا کام چلا رہی تھی۔ اسکی آرزو تھی کہ اس طرح مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ پیدا کر کے آہستہ آہستہ اپنے شوہر کی توجہ بُرے کاموں سے ہٹا کر اچھائی کی طرف لے آئے — اس کے علاوہ اب اُسے اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر بھی ستانے لگی تھی۔

ایبو کرگھے پر کبھی نہیں بیٹھتا تھا۔ دو ایک بار وہ شوقیہ طور پر بیٹھا تھا لیکن اس سے کوئی کام نہ ہو سکا تھا۔ ادھر چرخہ چلا کر نلی تیار کر کے دھاگہ بھرنے کا طریقہ سکینہ نے سیکھ لیا تھا اور اس کے بعد ساڑی کے کئی نئے کنارے بھی تیار

کرتے تھے لیکن ایبو نے بچپن میں جو کچھ سیکھا تھا وہ بھی اب بھول چکا تھا اور اس کا دماغ بھی اس کے طور طریقے قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔

اس کے معنی یہ ہرگز نہیں تھے کہ ایبو کوئی کام ہی نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ جو کچھ کرتا تھا وہ بے حد خطرناک تھا وہ نرسنگھدی میں چند نامور تاجروں کو چور بازاری سے دھاگے فراہم کرنیکا کام کرتا تھا، وہ چاروں دن بھر پڑے سوئے رہتے اور رات کے وقت اپنے دھندے میں لگ جاتے اور یہی بات سکینہ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

اکھوڑہ بورڈر سے گزر کر اگرتلہ سے مال سمگل کرنا کتنا خطرناک کام تھا، وہ یہ بھی جانتی تھی۔ قدم قدم پر سرحدی چوکی تھی اور قدم قدم پر خطرہ ایک رات دریائے میگھنا کے راستے دھاگے سے لدی ہوئی کشتی لیکر آتے وقت ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی، لیکن ان چاروں میں خاص طور پر ایبو خود ڈاکوؤں کا سردار تھا، پھر وہ کیا مقابلہ کرتے؟ اس نے اکیلے ہی کشتی کھینے کے بانس کو نچا نچا کر انھیں ہتھیار ڈال کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ایبو بہت نڈر اور طاقتور تھا لیکن پھر بھی سکینہ مطمئن نہیں تھی۔ پہلے پہلے تو رات کے وقت ایبو کے گھر سے باہر نکلتے ہی اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگتا اور اس کی دونوں آنکھوں کے حلقے پھیل جاتے جیسے وہ کوشش کے باوجود بند نہ کر پاتی، لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنی اس حالت پر قابو پا لیا تھا پھر بھی اس کے دل کو اطمینان نہیں تھا۔

اور یہی وجہ تھی کہ جب بورڈر بند ہوگیا تو اس کی سب سے زیادہ خوشی سکینہ ہی کو ہوئی تھی۔

ایبو کے ہاتھ میں کوئی کام کاج تو تھا نہیں۔ وہ دن بھر بے چین بے چین سا رہتا، کسی کام میں دل نہ لگتا اور جب سوتے سوتے تھک جاتا تو تاش کھیلنے بیٹھ جاتا تھا۔

گزشتہ رات کمرے سے اٹھ کر جاتے وقت سکینہ کو محسوس نہیں ہوا تھا، ایسی بات نہیں تھی۔ کنڈی کھول کر باہر جانے کے بعد دروازہ بند کرتے وقت زور سے زنجیر بج اٹھی تھی اور اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی اور ساتھ ہی اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس کے پہلو میں نہیں ہے۔ لیکن بستر پہ ہاتھ پھیرنے اور تکیہ ٹٹول کر دیکھنے کے بعد بھی اس نے نہ تو کوئی ہنگامہ کیا اور نہ ہی اسے آواز دے کر بلایا۔ وہ جانتی تھی کہ کر گھے والے کمرے میں اپنے اڈہ پہ جا رہا ہے۔ اسلئے راتوں کو ادھر ادھر گھومنے سے یہ تو کہیں اچھا تھا، تاش کھیلتا ہے کھیلے، پھر بھی قریب ہی تو ہے۔ بہت زیادہ سختی برتنے سے اس کا الٹا اثر بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی کہ جوں جوں بچے کی پیدائش کے دن قریب آتے جا رہے تھے وہ انجانے خوف سے دن بدن گھلتی جاتی ہر مرتبہ ایسا ہی ہوتا تھا اور جب درد زہ اٹھتا ہے تو اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اب وہ زندہ نہیں بچے گی۔ اُسی گاؤں میں گزشتہ سال زچگی میں پانچ عورتیں مر چکی تھیں اور مرنے سے پہلے وہ سبھی اچھی بھلی تھیں۔ پھر زیادہ سختی برتنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ابھی وہ اس سے محبت ضرور کرتا ہے لیکن اسکے مر جانے کے بعد صرف تلخ یادیں اس کے دل میں باقی رہ جائیں گی۔ کھودی کے داماد نے چالیس دن کے بعد ہی دوسری شادی کر لی تھی۔ بہانہ کیا تھا کہ بچوں کی دیکھ بھال کے خیال سے اس نے ایسا کیا ہے۔ مردوں کا دل بھی بڑا عجیب ہے اور سبھی مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ اس کے مر جانے کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں وہ بھی دوسری شادی کرلے گا اور نئی بیوی کو بازوؤں میں سمیٹ کر کہے گا —— اُف! بڑی زبان دراز عورت تھی۔ جب تک زندہ رہی کبھی سکون کا سانس نہیں لینے دیا —— اس سے تو بہتر ہے کہ اُسے من مانی کرنے دی جائے۔ ہر وقت نگرانی کرنے کی بجائے چشم پوشی کرنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

پھر بھی اُسے ڈھیل دے دینے پر سکینہ کا دل آمادہ نہیں ہوا۔ شاید یہ اُس کی محبت کا قصور تھا، ایک ہی آدمی کے گرد سب کچھ سمٹ آیا تھا۔

آخر شب کو جب ایبو سونے کے لئے بستر پہ آیا، اس سے تھوڑی دیر قبل ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ جب وہ سو گیا تو اس نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر مرغا بانگ دینے لگا اور کچھ دیر بعد مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ دونوں لڑکوں کے جسم پہ چادر ڈال سکینہ بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھی۔ صبح کے وقت تھوڑی دیر تک آنگن میں چہل قدمی کرنے کی اس کی پرانی عادت تھی۔

جب اس نے چولہا سلگایا تو سورج طلوع ہو چکا تھا اس عرصے میں عارف کی ماں آکر آنگن میں جھاڑو دے کر واپس جا چکی تھی۔ اس نے پانی بھر کر پسے ہوئے چاول کو گڑ کے ساتھ مٹی کے تغار میں گوندھ کر چھوڑ دیا۔

چاول اس نے گزشتہ شام ہی کو پیس کر رکھ چھوڑا تھا۔ اب وہ اسی کا
پیٹھا پکانے جا رہی تھی۔

اتنے میں اس کا دیور ایبو منہ ہات دھو کر آ گیا اور ایک مونڈھا
کھینچ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ دھاگے کی کمی کی وجہ سے تقریباً دو ہفتے سے
تمام کرگھے بند پڑے تھے۔ اسی لئے وہ بیحد اداس تھا جب ذریعۂ آمدنی بند
ہو تو انسان کا اداس ہونا فطری بات ہے۔ ویسے ہر روز جس کے ہات میں
پیسے آتے ہوں اس کے ہات میں جب یکایک پیسے آنے بند ہو جائیں تو
اس کا کسی کام میں دل بھی نہیں لگتا۔ چولہے کی آگ سے بیڑی سلگا کر اس نے
کہا۔ "بھابی! آج دھاگہ ملے گا، یاد ہے نا؟"

"یاد ہے!" اس نے کڑھائی میں جلتے ہوئے تیل کو انگلی سے
چھو کر دیکھنے کے بعد جواب دیا۔ "تم جا رہے ہو نا! میں نے روپیہ نکال کر
رکھ دیا ہے۔"

ایبو نے بیڑی کا ایک طویل کش لیتے ہوئے جواب دیا۔

"روپے سے کیا ہوگا! بڑے بھائی کے گئے بغیر ڈیلر دھاگہ نہیں دیں گے۔
تم بڑے بھائی سے جانے کے لئے کہہ دو گی، وہ رات بھر تاش کھیلتے رہے ہیں
شاید آسانی سے جانے پر رضامند نہ ہوں۔"

"اچھی بات ہے، میں کہہ دوں گی" اس نے مٹی کا تغار سامنے
کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

جہاں تمام راستے جا کر مل گئے ہیں، اس جگہ کا نام نرسنگدی
بازار ہے۔ صبح ہوتے ہی قطار در قطار بچے، جوان بوڑھے اس راستے پر
چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسکے آس پاس تقریباً دس ہزار پارچہ بافوں کے
خاندان آباد تھے۔ ایک دن میں کم از کم پانچ سو پرمٹ پر دھاگہ دینا
ممکن تھا، اسی لئے بہت سے لوگ آدھی رات ہی سے قطاریں کھڑے
ہونے کیلئے گھر سے نکل پڑتے۔ حالانکہ ڈیلر دس بجے سے دھاگہ دینا
شروع کرتے تھے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، دو ہفتے سے تمام کرگھے بند
تھے۔ حالات ناقابل برداشت ہو چکے تھے۔ کرگھے چلیں گے تو زندگی کا نغمہ
ہی ابھرے گا لیکن جب کرگھے بند ہوں تو پھر موت کے سوا اور کیا چارہ ہے۔

سکینہ نے گرم گرم پیٹھا کھانے کے لئے ایبو کو گہری نیند سے جھنجوڑ کر
جگا دیا۔ لیکن نیند بھری سُرخ سُرخ آنکھیں کھول کر وہ بڑی مشکلوں سے
اٹھ کر بیٹھا اور بارہ پیٹھے کھانے کے بعد دو گلاس پانی پی کر وہ پھر سو گیا۔
اس کے بعد وہ دوپہر تک بے سُدھ پڑا سوتا رہا۔

اور جب عارف کی ماں دوپہر کا کام ختم کر کے گھر چلی گئی تو
سکینہ نے پھر اُسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"سن رہے ہو! اب کتنا سوؤ گے!"

"ہُم!" ایبو نے کروٹ بدل کر نیم وا آنکھوں سے سکینہ کی طرف
دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

"شام ہونے کو آئی۔ کھانا نہیں کھاؤ گے! بھات بھی رکھا رکھا
ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

"اچھا!" وہ بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ "تم نے مجھے اُٹھایا کیوں نہیں؟"

"کب سے جگا رہی ہوں! مگر تمہیں ہوش ہی کب تھا! باپ رے بابا!"
سکینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تاش نے تمہیں ناس کر دیا ہے، تاش کھیلے
بغیر تمہارا کھانا ہضم نہیں ہوتا! اب بیٹھے کیوں ہو؟ اٹھو، جلدی سے غسل
کر کے کھانا کھا لو اور اس کے بعد بازار جا کر دیکھو، دھاگہ ملتا ہے یا نہیں،
ایبو تو جانے پر تیار ہی نہیں ہو رہا تھا، بڑی مشکلوں سے اُسے بھیجا ہے۔"

اپنی بات ختم کر کے سکینہ ہانپنے لگی۔ وہ ان دنوں بے حد کمزور
ہو گئی تھی۔ بعض وقت تو اُسے اپنی کمزوری پر خود بھی حیرت ہوتی تھی۔ ذرا سی
دیر بات کرنے میں اتنی کمزوری!

ایبو نے ایک سگریٹ ہونٹوں سے چپکا کر ماچس کی تیلی جلائی اور
کچھ سوچنے لگا۔ سکینہ کی تجویز بُری نہیں، تھوڑی سی تفریح ہو جائے گی۔
اس کے علاوہ قطار کی کیا حالت ہے، وہ بھی دیکھنا ضروری ہے۔ ممکن ہے
مال پانی کا بھی ایک آدھ موقع مل جائے۔

گھونگھریلے بالوں میں تھوڑا سا تیل ڈال کر کندھے پر گمچھا
رکھے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ "تم کھانا تیار
رکھو میں ابھی آ رہا ہوں۔"

قریب ہی دریا تھا، سر راہ سے موڑ پر اس کی ملاقات دو
آدمیوں سے ہوئی جو شاید بازار سے لوٹ رہے تھے، نوشا اور موتی۔
ایبو نے کھڑے ہو کر پوچھا۔ "کیوں جی، اتنی جلدی لوٹ آئے؟ دھاگہ
کہاں ہے؟"

شجاع

"دھاگہ! دھاگہ لے کر کیا کروگے!" نوشا دانت نکال کر ہنس پڑا۔ "ایسے ہی تو فی پرمٹ دس روپیہ مل رہا ہے!"

"کیا مطلب!" اس نے سگریٹ کا آخری کش لیکر پھینکتے ہوئے تلخی سے پوچھا۔

"مطلب اور کیا" موتی نے جواب دیا۔ "ڈیلر بلیک کر رہے ہیں!"

"کرنے دو، ہمارا کیا ہے" نوشا خوشی سے چہکا۔ "دھاگہ خرید کر محنت کرو اور کپڑے تیار کر کے پچیس روپیہ کماؤ، اس سے تو بغیر محنت کا یہ دس روپیہ ہی بھلا ہے ــــ کیوں ایبو بھائی؟"

ایبو نے نفرت سے تھوک پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں کی پیٹھ پر کوڑے لگانے کی ضرورت ہے، تم لوگ بے ایمان ہو! تم نے یہ بھی سوچا کہ جو دھاگہ تم دس روپیہ لے کر چھوڑ آئے ہو، وہی دھاگہ وہ لوگ تمہارے ہی بھائی بندوں کے ہاتھوں دگنی اور تین گنی قیمت پر بیچیں گے؟"

نوشا کا چہرہ افسردہ ہو گیا، اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ــ "کیا کروں ایبو بھائی، ان لوگوں نے ہمیں مجبور کر دیا۔ اگر روپیہ نہ لیتے تو وہ دھاگہ بھی نہیں دیتے، اسی لئے سوچا کہ دھاگہ بھی نہیں ملے گا، روپیہ بھی نہیں ملے گا، اس سے اچھا ہے....."

"بس، بس رہنے دو، میں تمہاری صفائی سننا نہیں چاہتا، دھاگہ نہیں ملتا تو نہیں ملتا، تم خالی ہاتھ واپس آجاتے، جو دس کی حالت ہوتی وہ تمہاری بھی ہوتی!" ایبو اتنا کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دریا کی طرف چلا گیا، اس کے جانے کے بعد وہ دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے، وہ دونوں اپنے کئے پر سخت نادم تھے۔ واقعی یہ انھوں نے اچھا نہیں کیا، لیکن چونکہ دوسرے لوگ بھی لے رہے تھے۔ اسی لئے انھوں نے بھی لے لیا تھا!

"ایبو بھائی! ناراض ہو گئے ہیں، معافی مانگ لو، ورنہ خیریت نہیں ہے! موتی نے آہستہ سے کہا۔

نوشا سانپ کی طرح پھن جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے! نہ تم پہلے روپیہ لیتے نہ مجھے لینا پڑتا!"

موتی بھی بپھر اٹھا۔ "دیکھو نوشا، بات مت بڑھاؤ، مجھ سے تمہارا ایک سر دکار رہے، میں کنویں میں گر جاؤں گا تو تم بھی گر جاؤگے!" پھر کچھ سوچ کر وہ نرم پڑ گیا۔ "لیکن جو بھی کہو، ہم دونوں نے بہت برا کیا ہے، اِس سے تو کہیں اچھا تھا کہ ایبو بھائی کے ہاتھ سے دو چار تھپڑ کھا لیتے!"

ایبو نے دریا میں اُتر کر جھٹ پٹ دو تین غوطے مارے اور کنارے پر آگیا۔ وہ دونوں دریا کنارے بیٹھے رہے، جب ایبو کپڑے بدلنے لگا تو دونوں پھر اس کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ موتی نے آہستہ سے کہا۔ "ایبو بھائی! ہم سے واقعی غلطی ہو گئی ہے، تم ہم دونوں کو معاف کر دو، سچ کہتا ہوں یہ بات اُس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی"

ایبو نے اسی طرح رکھائی سے جواب دیا۔ "میں تمہیں معاف کرنے والا کون ہوتا ہوں! میں نے دس کی بھلائی کی ہے، تم نے دس آدمیوں کا نقصان کیا ہے!" پھر اس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا ــ "دھاگہ ملنا شروع ہو گیا؟"

نوشا نے بے دلی سے جواب دیا۔ "نہیں! وہ لوگ تو سبھوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ دھاگہ لینے کی بجائے روپیہ ہی لے لو! کہاں تک قطار میں کھڑا رہا جا سکتا ہے! بہت سے لوگ تنگ آکر ہماری ہی طرح مجبور ہو کر روپیہ لے رہے ہیں جب تھوڑے لوگ رہ جائیں گے تو شاید تھوڑا بہت دے دے!"

وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ایبو نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور خاموشی سے بازار کی طرف چل پڑا۔ وہ دونوں اس کا منہ تکتے رہ گئے۔

شادی کا پتہ نہیں اور دلھن کے ہاتھوں میں مہندی! ڈھائی بج رہے تھے، لیکن ابھی تک گدام میں تالا لگا ہوا تھا، حالانکہ لوگ آدھی رات سے قطار میں کھڑے تھے! کافی بھیڑ تھی اور ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ کوئی بیڑی کے کش لگا رہا تھا، کوئی پان چبا رہا تھا اور کوئی ہنگامہ کر رہا تھا، شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی، پھر اچانک چند لوگوں نے مل کر گیدڑ کی بولی بولنا شروع کیا۔ کچھ لوگوں نے بل ڈاگ کی آواز نکالنی شروع کی۔ ایک طرف سے آواز آئی ــ "دروازہ کھولوگے یا توڑ دیں؟"

تین دلال متواتر چکر لگا رہے تھے اور لوگوں کو بہلا پھسلا کر گدام کے پیچھے لے جاتے تھے، جہاں انہیں دس روپیہ دے کر پرمٹ پر اندراج کر دیا جاتا تھا ــ چلئے ایک مہینے کی فرصت ہو گئی۔ جو لوگ گدام کے پیچھے سے نکلتے، انہیں قطار میں کھڑے ہوئے لوگ بے تحاشہ گالیاں دیتے اور وہ سر جھکائے ہوئے تیزی سے چلے جاتے۔

جب ہنگامہ پورے شباب پر پہنچا ہوا تھا، ایسے وقت میں وہ

چاروں وہاں حاضر ہوگئے — چار غنڈے! قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو انھیں پہچانتا نہ ہو۔ انھیں دیکھتے ہی شور و غل بند ہوگیا۔ وہ چاروں خوفناک چہروں کے ساتھ گدام کے گرد تھوڑی دیر تک چکر لگاتے رہے، لوگوں کے دل یکایک بجھ گئے۔ کہیں یہ چاروں بھی دلالی کرنے تو نہیں آئے؟ — پھر وہ چاروں گدام کے پیچھے چلے گئے۔

قطار میں کھڑے ہوئے ایک آدمی نے کہا "بس ہوگیا، اب دھاگہ ملنا تو بڑی بات ہے دس روپے بھی گئے۔"

دوسرے نے کہا "ہماری قسمت ہی خراب ہے، ہر طرف عجیب ہی لگ رہا ہے۔ دس روپیہ ملنے سے کم از کم پانچ دن کا خرچ تو پورا ہوتا، چلو تو دیکھیں کیا بات ہے؟"

اور چند آدمی قطار سے نکل کر گدام کے پیچھے چلے گئے، لیکن وہاں ان چاروں میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔

نرشا اور موتی اپنے گھر جانے کی بجائے ان چاروں کے پیچھے پیچھے یہاں تک آگئے تھے۔ وہ دونوں دور ہی دور سے ان کا پیچھا کر رہے تھے لیکن یہاں آکر آدمیوں کے اژدہام میں نہ جانے وہ چاروں کہاں غائب ہوگئے۔ وہ دونوں مونگ پھلی کھاتے ہوئے انھیں ڈھونڈنے لگے۔ لیکن ان چاروں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ واپس چلے گئے کیا! لیکن نہیں، شام ہونے سے تھوڑی دیر پہلے وہ پھر نظر آئے۔ چاروں ساتھ ساتھ تھے۔ چار پتھر جیسے سخت چہرے! دونوں بھیڑ میں گھس کر اس کے قریب جا پہنچے مگر انھیں آواز دینے کی ہمت نہ ہوئی! تھوڑی ہی دور پر ایسو کھڑا تھا، اسکا چہرہ اُترا ہوا تھا اور وہ روہانسا نظر آرہا تھا۔ روپے کی پوٹلی اس کی کمر سے جھول رہی تھی۔ بھابی نے تین عدد چپاتیاں ایک رومال میں باندھ کر دیا تھا، وہ چبا چبا کر بہت دیر پہلے ہی کھا چکا تھا۔ اب اُسے بھوک لگ رہی تھی لیکن ریزگاری اُس کے پاس نہیں تھی کہ کچھ خرید کر کھاتا۔ بھیڑ اب بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام آدمی گدام کے دروازہ پر آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے ایک بات بلند کر کے کہا —

"بھائیو! ایک خاص مجبوری کی وجہ سے آج دھاگہ نہیں دیا جائیگا اب کل ...."

"خاموش! بدمعاش!" ایک کرخت آواز گونجی۔

سبھوں نے پلٹ کر دیکھا، وہ ایبو غنڈہ تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو دھکیلتا ہوا پاگلوں کی طرح آگے بڑھتا گیا اور اس کے پیچھے پیچھے تین غنڈے تھے۔ کالو، مالو اور جبو!

لمبے تڑنگے آدمی کے سامنے نچلے زینے پر پہنچ کر ایبو کی کرخت آواز ایک بار پھر گونجی۔

"یہ تمہارا باوا کا مال نہیں ہے، یہ ہمارے پرمٹ کا دھاگہ ہے، دھاگہ لئے بغیر ہم لوگ یہاں سے نہیں جائیں گے!"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ہم لوگوں کو دھاگہ ملنا چاہئیے!" اس کی تائید میں ایک شور اُبھرا اور پھر تمام لوگ قطار سے نکل کر گدام کے سامنے جمع ہوگئے۔

دلال نے کانپتے ہوئے دوبارہ اپنی آواز بلند کی — "نہیں مل سکتا، تم لوگوں کو دھاگہ نہیں مل سکتا!"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایبو جست بھر کر اوپر پہنچ گیا اور اس لمبے تڑنگے آدمی کو اُٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے جبو کے ہات سے لوہے کی سلاخ لے کر ایک ہی جھٹکے میں گدام کا تالا توڑ دیا، پھر اس نے لات مار کر دروازہ دھکیل کر کھول دیا۔ گدام میں دھاگے کی گانٹھیں بھری ہوئی تھیں۔

دوسرے دن کے اخبار میں شہ سرخیوں کے ساتھ ایک خبر شائع ہوئی۔ لوٹ کی واردات کی تفصیل کے بعد آخر میں درج تھا — جن چار نامی غنڈوں کی قیادت میں یہ لوٹ کی واردات ہوئی ہے۔ ان چاروں کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوچکے ہیں۔ چاروں فرار ہیں۔

آج کے شاعر

کے سامنے سب سے دشوار سوال یہ ہے کہ دنیا ایک تہذیبی انحطاط سے نکل کر انسانی اقدار کی نئی ترکیب تک لے جانے والے عبوری دور میں ہے اور ایسی بہت کم اصطلاحیں اور الفاظ باقی رہ گئے ہیں جو مشترک ہیں اور عام طور پر ایک ہی تصور کو ظاہر کر سکیں جن میں وزن ہو اور ایک ہی روحانی عقیدے یا لہر کو سب کے سینوں میں پیدا کر سکیں۔

(ہارٹ کرین)

سماع میں آتے تو ان کی عجیب حالت ہوتی تھی۔ استاد پر ایک
ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ خود کو بھی بھول جاتے تھے
آواز جادو جگاتی اور ان کی آنکھیں ساون بھادوں کا منظر پیش
کرتیں محفل کا رنگ بدل جاتا۔ اہل دل مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے
استاد پر روپیوں کی بارش ہو جاتی۔ لیکن استاد اس نذرانے کا ایک
پیسہ اپنے پاس نہ رکھتے اور درگاہ کے باہر بیٹھے ہوئے فقیروں کو مٹھیاں
بھر بھر کر سارا روپیہ بانٹ دیتے ——— استاد صحیح معنی میں دل کے
غنی تھے۔ لوگ غلط نہیں کہتے تھے کہ وہ قلندر ہیں۔ انہوں نے بلا مبالغہ
ہزاروں روپیہ کمایا لیکن ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے۔ لڑکی کی
شادی اس شان سے کی تھی کہ لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں،
ریاست کے نواب صاحب ہی نہیں دوسری ریاستوں کے مہاراجہ بھی
استاد کی لڑکی کی شادی میں شریک ہوئے تھے اور ہزاروں روپے
دولہا دلہن کو دیئے تھے۔ مجید کو یاد تھا کہ جب اس کا لنگر ہوا تھا تو
استاد نے ایک ہزار غریبوں کو کھانا کھلایا تھا مگر جب آزادی کے
بعد خون کے دریا بہنے لگے تھے تو استاد بیوی بچے کو لے کر جس وقت گھر
سے باہر آئے تو ان کی جیب میں صرف آٹھ آنے تھے۔ کوئی نہیں جانتا
تھا کہ ساٹھ برس کے بوڑھے نے اس خون کے دریا کو کیسے پار کیا۔
وہ کس طرح صحیح سلامت مع بیوی بچے کے پاکستان پہنچ گیا، پاکستان
کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی استاد نے دو رکعت نفل شکرانے کے
پڑھے تھے یہ بات مستیا کو اچھی طرح یاد تھی اور اسے یہ بھی
یاد تھا کہ لاہور آتے ہی استاد حمید نے مع بیوی بچے کے داتا کے
دربار میں حاضری دی تھی ——— اور بڑی دیر تک آنکھیں
بند کئے وہ نہ جانے کیا کیا دعائیں مانگتے رہے تھے ———
اور پھر جب انہیں کوئی فکر نہیں رہی تھی وہ کچھ دن تو ادھر ادھر مارے
مارے پھرے اور پھر گھومتے پھرتے اس چھوٹے سے شہر میں آگئے
تھے اور نئی کالونی میں ان کو ایک کوارٹر مل گیا تھا ———
استاد نے اس شہر میں خود اپنا پیشہ اختیار نہیں کیا۔
اب صرف مستیا کمانے والا رہ گیا تھا ———
استاد اس کو مختلف تقریبات میں گانے کے لئے
بھیجتے تھے ——— مستیا کو باپ جیسی شہرت نصیب نہیں ہوئی
نہ وہ روپے کی ریل پیل تھی ——— مستیا نے کئی بار باپ سے
کہا کہ وہ قوال نہیں بننا چاہتا وہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہے
مگر استاد اس کی یہ بات سن کر ہمیشہ مسکرا دیتے تھے اور آہستہ
سے کہتے تھے ———

"میرے دادا قوال تھے، باپ قوال تھے، میں قوال ہوں
تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تم اس پیشے کو چھوڑ دو"

شروع شروع میں تو حالات بڑے نازک رہے نا قابل برداشت
کھانے پینے کے لالے پڑ گئے ——— مگر رفتہ رفتہ مستیا کا کام
چل نکلا ——— چھوٹی محفلوں سے ہوتا ہوا وہ بڑی محفلوں تک
پہنچ گیا ——— لیکن اس کی وہ قدر افزائی نہ ہوئی جس کا وہ
مستحق تھا۔ کوشش کے باوجود ریڈیو پر گانے کا اسے موقع نہیں ملا۔

پھر نہ جانے استاد کو کیا سوجھی کہ ایک دن بیٹھے
بٹھائے ایک بیوہ کی لڑکی سے مستیا کی شادی کر دی۔ شادی
کیا تھی۔ کسی غریب کے جنازے کا منظر تھا۔ اس وقت مستیا
کو اپنی مرحومہ بہن کی شادی کا وہ منظر یاد آ گیا جس میں مالیر
کوٹلہ، نابھہ اور پٹیالہ کی موٹریں دوڑتی پھر رہی تھیں۔

دلہن سبز قدم ہے ——— یہ محلے والوں کی رائے تھی،
صرف اس لئے کہ شادی کے ایک ہفتہ بعد بہو کا گھونگٹ اٹھنے
سے پہلے ہی ساس گھر گرہستی کے جنجال سے آزاد ہو گئیں۔ نہ
بخار آیا نہ کھانسی ہوئی، بس چند منٹ کے اندر چٹ پٹ ہو گئیں،
——— مستیا نے رو رو کر گھر بھر دیا ——— بہو پر تو جیسے
فالج گر گیا تھا ——— صرف استاد حمید تھے جو اپنے آپ
کو سنبھالے ہوئے تھے ——— ان کی آنکھوں سے ایک
آنسو نہیں بہا ——— مگر جب بیوی کو دفن کر کے آئے
تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود بھی مر گئے ہوں ——— چہرہ
زرد تھا۔ چلنے میں پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ چہرے کی جھریاں

اضافہ ہو گیا تھا ــــــ اس وقت استاد خاموش رہے ــ ویسے مسیتا اور بہو کو وہ تسلی دیتے تھے۔ صبر کی تلقین کرتے تھے ــــــ زبردستی دونوں کو کھلاتے پلاتے تھے ــــــ

پر بہو نے دیکھ لیا تھا کہ استاد راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور خود سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں ــــــ

بہو نے جب یہ بات مسیتا کو بتائی تو اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"چالیس برس کا ساتھ تھا ــــ شہ لیفاں ان کا ــــــ وہ کیسے بھول سکتے ہیں ماں کو"

بہو اور مسیتا دیکھ رہے تھے کہ استاد بجھ گئے ہیں مسیتا نے ایک دن بیوی سے کہا ــــــ

"اگر ابا کا یہی عالم رہا تو خدانخواستہ ــــــ"

اور مسیتا کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے مسیتا کی دلہن نے زور سے کہا ــــــ

"خدا نہ کرے"

اس حادثے سے گھر کی فضا تو سوگوار تھی مگر یہ عجیب اتفاق تھا کہ ان ہی دنوں مسیتا کو خلاف امید کئی ایسی محفلوں میں بلایا گیا جہاں بڑے بڑوں کے چراغ نہیں جلتے تھے ــــــ سننے والوں کا بیان تھا کہ مسیتا کی آواز میں ایسا درد ہے کہ پتھر دل بھی موم ہو جاتے ہیں۔

مسیتا اپنی اس کامیابی پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ بظاہر استاد حمیدا بھی خوش تھے ــــــ وہ جب بھی مسیتا کی کامیابی کی کوئی خبر سنتے تو ٹھنڈی سانس لے کر کہتے۔

"یہ سب تیری ماں کی دعاؤں کا طفیل ہے"

باپ کی بات مسیتا کے دل کو بھی لگ گئی تھی اسی لئے اس نے ماں کا چالیسواں بڑی دھوم دھام سے کیا تھا ــــــ پچاس عزیزوں کو اس زمانہ میں پلاؤ زردہ کھلانا کھیل نہیں ــــ وقت کسی پرسکون دریا کی طرح گزرتا رہا ــــ استاد حمیدا بیوی کے غم کو بھلا نہ سکے وہ مسیتا کے کہنے سے اپنے ایک دوست کے پاس دو مہینے کے لئے کوئٹہ چلے گئے ــــــ

استاد کے جانے کے ایک مہینے بعد غم کے اس اندھیرے میں یکایک ایک چاند جگمگا اٹھا ــــــ

جب پوتا ہونے کی اطلاع تار سے استاد کو ملی تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا جیسے سارے جہان کی دولت انہیں مل گئی ہو اور انہوں نے اسی روز اپنے دوست کے ساتھ بازار جا کر اپنی سونے کی وہ انگوٹھی بیچ دی جو نواب صاحب مالیرکوٹلہ نے ایک سرکاری تقریب میں ان کا گانا سن کر دی تھی ــــــ یہ واحد چیز تھی جو وہ ہجرت کے وقت اپنے ساتھ لائے تھے دوست نے انگوٹھی بیچنے کو منع بھی کیا لیکن استاد نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ــــــ

"کمال کرتے ہو خالی ہاتھ کیسے جاؤں اپنے پوتے کا عقیقہ تو مجھے اپنی کمائی سے کرنا ہے"

دوست اس کے بعد کچھ نہ کہہ سکا ــــــ انگوٹھی میں ہیرا بھی لگا تھا وہ پرانے زمانہ میں بھی پانچ سو روپے سے کسی طرح کم کی نہیں تھی مگر بازار میں بدقت تمام اس کے تین سو روپے ملے چلتے وقت دوست نے سو روپے پوتے کی مٹھائی کے لئے دیئے دوسرے دن استاد روانہ ہو گئے۔

استاد کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا ــــ ننھے پوتے کو دیکھ کر وہ کسی پھول کی طرح کھل اٹھے تھے ــ ان کے چہرے کی جھریاں کم ہو گئی تھیں ہونٹوں پہ تبسم آنکھوں میں ایک نئی روشنی وہ بڑی دیر تک پوتے کو اپنی گود میں لئے بیٹھے رہے ــــــ

بہو کے شوربے کا سامان وہ خود بازار سے جا کر لائے تھے ــــــ فجر اور عشا میں وہ ہمیشہ سے پابندی سے وظیفہ پڑھتے مگر اب تو ہر نماز میں وہ وظیفہ پڑھتے تھے اور

ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گئے تھے ——— اکثر وہ بہو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ۔ اس مجبور ہاتھ میں محبت کی کتنی میٹھی لہریں ہوتی تھیں اسے بہو پوری طرح محسوس کیا کرتی تھی ———

میتا کے منع کرنے کے باوجود بہو کے عقیقہ کا انتظام استاد نے کیا تھا ۔

وہ گھر پھونک تماشہ دیکھ رہے تھے ۔ محلے کی عورتیں صبح ہی سے جمع تھیں ۔

رت جگے کا پروگرام بھی تھا مگر استاد نے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا کہ عقیقہ والے دن قوالی ہوگی ۔

پروگرام کے مطابق عقیقہ ہو گیا ——— شامیانہ تان کر اس کے نیچے دریاں اور اس پر چاندنی بچھائی گئی تھی رات کو نو دس بجے کھانا ختم ہونے کے بعد قوالی شروع ہوئی ———

چھوٹے سے شہر کے سارے قوال جمع تھے ۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس خوشی کے موقع پر میتا کے قوال دوست نہ آتے ——— پوری کالونی کے باشندے قوالی سننے کے لئے جمع ہوگئے تھے ———

شروع میں تو ایک دو لڑکوں نے جو ابھی نام کے قوال تھے گایا پھر ایک دو قوالوں نے گایا مگر رنگ نہیں جما ——— ٹھیک اس وقت جب میتا کا دوست ماسٹر شکور تخت پر آکر بیٹھا ۔ استاد ایک دم کھڑے ہوگئے اور بولے ۔

" آج ہم گائیں گے اپنی زندگی کا آخری گانا ——— نہ جانے پھر ایسی خوشیاں ہم دیکھ سکیں — یا نہ دیکھ سکیں ———"

سب خاموش ہوگئے ——— استاد نے ہارمونیم سے سُر ملائے طبلہ کی سنگت کے لئے ایک استاد آگے بڑھے تالیاں بجانے کے لئے میتا اور ماسٹر شکور بیٹھے ——— استاد نے گانا شروع کیا ——— وہ تقریباً ایک گھنٹہ گاتے رہے مگر محفل تھی کہ لوگ اُٹھ اُٹھ کر جانے لگے ———

یہ دیکھ کر استاد اٹھ آئے ——— اور اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئے ——— پھر شکور آیا اس نے آتے کے ساتھ ہی فلمی دھن میں ایک غزل شروع کی ——— بس پھر کیا تھا ۔ لوگوں کو حال آنے لگا ۔ شکور پر روپوں کی بارش ہوگئی ———

مگر جب محفل رنگ پر آئی تو اسی وقت استاد کے دل میں درد شروع ہوا ——— سب گھبرا گئے ———

میتا استاد کو اندر لایا ——— وہ تکلیف سے تڑپ رہے تھے اور اسی عالم میں انہوں نے میتا سے کہا ۔

" بیٹا اب راگ ختم ہوگیا ——— فن مر گیا ——— اب اس دنیا کو ہماری نہیں شکور کی ضرورت ہے ۔"

اس کے بعد وہ خاموش ہوگئے ——— اور نصف گھنٹے بعد ختم ہوگئے ———

——— اور زندگی میں پہلی بار آج میتا نے بھی نوجوانوں کی ایک محفل میں فلمی دھن میں غزلیں سنائی تھیں اسے اس محفل میں ڈیڑھ سو روپے ملے تھے ——— وہ بہت خوش تھا ——— مگر گھر میں داخل ہونے سے پہلے جیسے ہی اس کی نظر مکان پر لگی ہوئی تختی پر پڑی تو اس کے کانوں نے نہیں بلکہ ذہن نے سُنا کہ استاد حمید اس سے کہہ رہے ہیں ———

" آج میں دوسری بار مرا ہوں بیٹے ! میرے خون سے میتا تمہارے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں ۔"

ہماری کوشش

پروہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو ، آزادی کا جذبہ ہو ، حسن کا جوہر ہو ، تعمیر کی روح ہو ، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سُلائے نہیں کیونکہ زیادہ سونا موت کی علامت ہے ۔

(پریم چند)

شریف ادیب

انگارہ

آخر ایک روز تنگ کر میں نے اس کے سرخ سرخ گالوں پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ اس روز پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ وہ سراسیمگی کے عالم میں اپنا گال سہلاتی رہی۔

نوکر نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"جناب ہیری مر گئی"

"کون ہیری" ؟!

"ارے وہی گونگی پگلی لڑکی جو گلی میں پھرا کرتی تھی"

میرا کمرہ سڑک کی جانب تھا گلی سے گزرتے ہوئے لوگوں کی آوازیں سنکر میں نے جلدی سے اُٹھ کر سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی، پیپل کے درخت کے نیچے بہت سے لوگ جمع تھے۔ بچے بوڑھے جوان عورتیں لڑکیاں سب ہیری کی باتیں کر رہے تھے۔

"ہوں — تو ہیری بھی آج چل بسی" میں نے سوچا۔

چلو اچھا ہوا — ایک مخبوط الحواس اور بے یار و مددگار لڑکی کیلئے ایسی زندگی سے موت کہیں بہتر ہے۔ مجھے تو بچوں کے ہاتھوں اس کی دُرگت بنتے دیکھ کر بہت ترس آتا تھا۔ ہیری پندرہ سولہ سال کی ایک دراز قد لیکن ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ یہ المیہ تھا کہ وہ فاتر العقل بھی تھی اور قوتِ گویائی سے محروم بھی۔

سب لوگ اسے ہیری کے نام سے پکارتے تھے۔ نہ جانے یہ نام اس کا حقیقی تھا یا یوں ہی پڑ گیا تھا۔ اس کے ماضی کے متعلق کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔ کہتے ہیں کہ تقسیم ملک کے وقت وہ کسی قافلے کے ہمراہ پاکستان آئی تھی لیکن ہمارے محلے میں تو وہ پچھلے ایک سال سے آئی تھی اور اسی پیپل کے درخت تلے دن رات پڑی رہتی تھی۔

میں نے جو انفرادیت اس میں محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہ عام پاگلوں کی طرح ہنگامہ خیز نہیں تھی۔ وہ کافی خاموش رہتی۔ بچے جب اسے چھیڑتے تو وہ بعض دفعہ غصے میں ان کے پیچھے کوئی پتھر اٹھا کر چل دیتی لیکن اس نے آج تک کسی بچے کو نہیں مارا تھا بلکہ ان کی طرف گھور گھور کر دیکھتی رہتی اور بعض دفعہ کھل کھلا کر ہنس پڑتی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی میں نے دو ایک مرتبہ یونہی اس کی آنکھوں میں قریب جا کر جھانکنا بھی چاہا لیکن وہ حسب عادت کھل کھلاتی ہوئی بھاگ جاتی اور میں کھڑا سوچتا رہتا کہ

"کاش! یہ پگلی نہ ہوتی!"

لیکن کچھ عرصہ بعد خود مجھے اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا وہ میرے لئے وبال جان بن گئی۔ وہ بلا جھجک ہمارے گھر میں بھی آیا جایا کرتی تھی۔ گھر والے بھی اس سے مانوس ہو چکے تھے گلی میں سے گزرتے ہوئے اگر اس کی نگاہ مجھ پر پڑ جاتی تو کھل کھلا کر ہنس پڑتی اور گھر تک میرا تعاقب کرتی۔ میں کافی ڈانٹتا لیکن وہ کسی طور باز نہ آتی تھی۔

بھابی کو تو اس چڑیل سے اشارہ آمیز باتوں میں نہ جانے

اشتہار

نہ آتا تھا مگر مجھے اس سے نہ جانے کیوں گھن آتی. اس کے برخلاف مجھے دیکھ کر گلاب کے پھول کی طرح کھل جاتی. مجھ سے اتنی انسیت ہو گئی تھی. جب رات کو کسی جگہ سے گھر لوٹتا اور وہ بدقسمتی سے کہیں مل جاتی تو خاموشی میرے پیچھے پیچھے چلی آتی. میں جلدی سے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتا اور کواڑ کی اوٹ سے دیکھتا وہ کچھ دیر کھڑی رہتی پھر اپنے ژولیدہ بالوں کو جھٹکتی ہوئی چلی جاتی.

"خدایا! اس بلائے ناگہانی سے میرا پیچھا کیسے چھوٹے گا؟"

آخر ایک روز میں نے تنگ آکر اس کے سرخ گالوں پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر ہی دیا. اس روز پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے. وہ کچھ دیر تک کھڑی سراسیمگی کے عالم میں اپنے گال کو سہلاتی رہی اور پھر چپ چاپ چل دی. لیکن مجھے اپنی اس حرکت پر اس قدر ندامت محسوس ہوئی کہ رات بھر نہ سو سکا. توقع تھی کہ اس طمانچہ کے بعد وہ مجھ سے خفا ہو جائے گی مگر یہ توقع پوری نہیں ہوئی. وہ اب بھی مجھے ویسے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی تھی.

ایک دن جو گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہیری میرے کمرے میں موجود ہے اور کارنس میں لگی ہوئی میری تصویر کو عجیب محویت سے تکتے جا رہی ہے. میں دبے پاؤں اندر آیا اور چپکے سے اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا. اسے اپنے استغراق کے باعث میری موجودگی کا علم نہ ہو سکا.

وہ اس روز ایک گرد آلود ہ پھول کی طرح نظر آرہی تھی. اور اس کی آنکھیں تو واقعی کنول جیسی تھیں. لیکن ان سب باتوں کا احساس مجھے اس روز نجانے کیوں ہو رہا تھا. اس بدحال اور فاقہ کش زندگی کے باوجود اس کا جسم کتنا متناسب اور صحت مند تھا.

یکایک میرے دل کی دھڑکن بے اختیار تیز ہوتی چلی گئیں اور میرے جسم میں برقی لہریں سی دوڑنے لگیں. میں نے اس کی محویت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جونہی اس کے شانہ کو چھوا، وہ دیوانہ وار چیختی ہوئی بجلی کی سی پھرتی سے میرے کمرے سے بھاگ گئی. میں سہم گیا. میرا تمام بدن پسینے میں شرابور ہو گیا مجھے اپنی اس حرکت پر خود ہی ندامت محسوس ہونے لگی. لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس کے پاگل پن پہ شبہ ہونے لگا. کیا ایسے فاتر العقل لوگوں میں بھی اتنا شعور ہوتا ہے کہ وہ...

"جمیل صاحب" خیالات کا سلسلہ کسی آواز سے یکایک منقطع ہو گیا. میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو میرا ہمسایہ حامد سامنے تھا!

"فرمائیے حامد صاحب کیسے آنا ہوا؟" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا.

"وہ ہیری تھی نا. پگلی لڑکی۔ پچھلے چند دنوں سے بیمار تھی۔ گزشتہ رات بیچاری مر گئی۔ وہ سامنے لوگ اسی وجہ سے کھڑے ہیں" حامد نے ہجوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا— میں خاموش تھا. لیکن ضمیر نہ جانے کیوں ملامت کر رہا تھا. جیسے ہیری کی موت کا ذمہ دار میں تھا.

"ہم لوگ اس کی تجہیز و تکفین کیلئے چندہ اکٹھا کر رہے ہیں. ..... لہذا آپ....."

"حامد صاحب! خدارا اس کیلئے چندہ وندہ ہرگز اکٹھا نہ کیجئے گا۔ اس کا انتظام میں خود کر دوں گا۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا.

ہیری کو ایسا لباس شاید اس روز پہلی مرتبہ پہنایا گیا تھا. وہ اس لباس میں کتنی خوبصورت نظر آرہی تھی. بالکل ایک معصوم بچے کی طرح!! بہت سی عورتوں نے اسے گھیر رکھا تھا. میں ہجوم سے کچھ دور اس کے دودھیا چہرے کو کھڑا تک رہا تھا. اس روز ہیری کے چہرے سے ایک حسین اور پاکباز راہبہ کی سی طمانیت اور مسکراہٹ مترشح تھی ہیری کے چہرے کے اس آخری نظارے سے میرا دل ڈوبا جا رہا تھا جیسے کوئی کشتی گہرے سمندر میں طوفانی لہروں سے دوچار ہو.

آخر اسے منوں مٹی کے نیچے دبا کر ہم سب لوگ لوٹ آئے مگر میرے تصور میں، میری آنکھوں کی پتلیوں میں ہیری کی معصوم صورت بس گئی تھی. ہیری کی اس تصویر کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ مجھ سے شکایت کر رہی ہو. میں اس کے تصورات کی کشمکش میں الجھا چلا آرہا تھا کہ میری نظر اس درخت پر پڑی جس کے نیچے ہیری نے یہ آخری شب بسر کی تھی. اور میرے قدم یونہی اس درخت کی طرف اٹھ گئے.

بچھی ہوئی خشک گھاس۔ ایک بوسیدہ سی رضائی اور پتوں میں اُلجھے ہوئے روٹیوں کے چند ٹکڑے اس کی یادگار تھے جو دیکھتے ہی ایک بار پھر میری آنکھیں نمناک ہو گئیں یکایک میری نظر ان خشک پتوں کے اندر چھپی ہوئی ایک تصویر پر پڑی اور میں نے جھک کر اسے نکال لیا۔

خدایا یہ تصویر یہاں کیسے آئی؟ — یہ تصویر میری تھی:

میرا دماغ چکرانے لگا۔ میں نے جلدی سے خود پر قابو پاتے ہوئے اس تصویر کو توڑ مروڑ کر اپنی مٹھی میں دبا لیا اور تیز تیز قدموں کے ساتھ گھر کی جانب چل دیا۔ چند ہی قدم چلا تھا کہ مجھے مٹھی میں کیڑے سے ہوئے محسوس ہوئے جیسے کوئی جاندار شے میری مٹھی میں کلبلا رہی ہو۔ میں نے گھبرا کر مٹھی کھول دی اور تصویر کے پرزے پرزے کر دیئے۔

اس دن سے آج تک میری ہتھیلی میں ایک عجیب قسم کی جلن ہے۔ میں علاج کراتے کراتے تھک گیا ہوں مگر یہ جلن آج تک کم نہیں ہوئی۔

جب میری کا خیال آتا ہے تو نہ جانے کیوں ہتھیلی میں ایسی جلن ہونے لگتی ہے جیسے کسی نے دہکتا ہوا انگارہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ہو۔

خون:-

الیاس نے غصہ سے کہا "جاوید! میں بے اصولی برداشت نہیں کر سکتا میری رگوں میں انگریزی خون ہے"

جاوید نے جلدی سے سوال کیا "ماں کی طرف سے یا باپ کی طرف سے؟"

الیاس نے جھلا کر جواب دیا۔ "بے وقوف! بلڈ بنک کی طرف سے"

★

میں خود:-

نوکر نے آکر امجد سے کہا "صاحب مالک مکان پھر آیا ہے کرایہ مانگ رہا ہے"

امجد نے گھبرا کر پوچھا۔ "تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں"

نوکر نے جواب دیا "کہا تھا صاحب مگر وہ میری بات کا یقین نہیں کرتا۔"

امجد جلدی سے بولا۔

"اگر یہ بات ہے تو میرا نام لے کر کہہ دو کہ میں خود کہہ رہا ہوں"

★

خیال:-

ثبوت ختم ہونے کے بعد ملزم نے عدالت سے کہا۔

حضور عالی! میں اقبالِ جرم کرتا ہوں۔

مجسٹریٹ نے سخت لہجہ میں سوال کیا "تم نے بلاوجہ ہمارا وقت ضائع کیا۔ پہلی پیشی پر ہی تم نے اقبال کیوں نہ کر لیا؟"

ملزم نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

حضور! پہلے میرا خیال تھا کہ میں بے گناہ ہوں مگر استغاثہ کے گواہوں کے بیانات سن کر میرا خیال بدل گیا۔

★

احساس:-

پروفیسر نے اپنی بیوی کو بتایا آج کسی اچکے نے میرا سگریٹ کیس جیب سے نکال لیا۔

بیوی نے تعجب سے پوچھا۔ آپ کو اس کا ہاتھ اپنی جیب پر محسوس نہیں ہوا؟

پروفیسر نے کھوئے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

"ہوا تو تھا مگر میں سمجھا کہ یہ میرا ہی ہاتھ ہے"

تلخیص و ترجمہ۔ شاہدہ برنی

(آئرش کہانی)

ممتا

زلیخا گائے کا غم پوری طرح محسوس کر رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بے زبان کا غم کس طرح بٹائے، کس طرح اسے تسلی دے کیسے اس مجروح دل پر ہمدردی کے پھائے رکھے؟

زلیخا کتنی خوش تھی کہ اب اس کی گائے کے ہاں بچہ ہوگا گائے دودھ دینے لگے گی۔ اس کے بچے جو چٹنی یا پیاز سے روٹی کھاتے ہیں وہ دودھ میں روٹی بھگو کر کھائیں گے۔ اس نے کتنے چاؤ سے گائے اپنے زیور بیچ کر خریدی تھی۔ اس نے اور اس کے شوہر نے شیخ چلی کی طرح کتنے حسین خواب دیکھے تھے۔ گائے کا ہاں بچہ ہوگا اور یہ بچھڑا دو تین سال میں بیل بڑھ جائے گا۔ ایک گائے کے بجائے اس کے پاس دو گائیں ہوجائیں گی پھر دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانے کو ملے گا۔ اس کا شوہر اور بچے جو بناسپتی گھی کے لئے بھی ترستے ہیں، خالص گھی کھایا کریں گے۔ اس نے عہد کیا تھا کہ وہ کبھی گھی میں ملاوٹ نہیں کرے گی۔ اس کا چھوٹا سا کچا مکان جو بارش میں بری طرح ٹپکتا ہے پختہ مکان میں تبدیل ہوجائے گا۔ لیکن اس کے یہ سارے خواب ایک چھناکے سے ٹوٹ گئے۔ گائے کا بچھڑا مرا ہوا پیدا ہوا۔ واحد نے جب یہ منحوس خبر زلیخا کو سنائی تو اسے یقین نہیں آیا وہ کھیتوں کی منڈیر پر دوڑتی ہوئی اس جگہ چلی آئی جہاں گائے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے قریب ہی بچھڑا گردن موڑے پڑا ہوا تھا۔ کتنا خوبصورت تھا۔ سفید جسم پہ سیاہ اور ہلکے نیلے دھبے۔ گائے کے آس پاس کھیتوں میں کام کرنے والے کسان کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بوڑھے کسان سے پوچھا ——

"چاچا کیا بچھڑا مرا ہوا پیدا ہوا —— ؟"

بوڑھے کسان نے زبان سے کچھ نہیں کہا بس آہستہ سے اپنا سر ہلا دیا۔ اب کوئی شک و شبہ والی بات نہیں رہی تھی۔ بوڑھے چاچا کی بات سن کر زلیخا نے ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے کہا۔

"جو خدا کی مرضی"

زلیخا سے کچھ دور کھڑی گائے کراہ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں وہ بار بار اپنا سر زمین کی طرف جھکاتی اور پھر بچھڑے کو غور سے دیکھنے لگتی۔ چند لمحات کے بعد گائے بچھڑے کے قریب پہنچ گئی اور اسے زبان سے چاٹنے لگی۔ زلیخا یہ منظر دیکھ کر اور اداس ہوگئی اس نے گائے کے قریب جاکر آہستہ سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اسی لمحہ چند آنسو زلیخا کی آنکھوں سے گر کر زمین میں جذب ہوگئے۔

وہ پندرہ سال پیچھے چلی گئی —— جب اس کے ہاں بچہ ہوا تھا مگر گائے کے اس بچھڑے کی طرح مرا ہوا — لوگوں نے اس وقت اسے کتنا دلاسا دیا تھا اس کے شوہر واحد نے کہا تھا "خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئیں —— اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہوجاتا تو میں پاگل ہوجاتا" وہ اسی قسم کے محبت بھرے بولوں سے اس وقت تو بہل گئی تھی مگر پندرہ سال گزرنے کے باوجود وہ معصوم بچہ اب بھی ہمکتا نظر آتا —— کبھی کبھی وہ سوچتی تھی کہ اگر آج اس کا وہ پہلا لڑکا زندہ ہوتا تو کتنا بڑا ہوتا —— تقریباً جوان —— واحد کے کام میں ہاتھ بٹاتا ہوتا۔ ——

مردہ بچھڑے کو دیکھ اسے اپنا پہلا لڑکا آنٹ بری طرح یاد
آ رہا تھا ـــــ اس کے دل میں عجیب طرح کا درد ہونے لگا تھا
وہ اس درد پہ قابو پانے کے لئے اس جگہ سے کچھ دور ہٹ گئی،
اور گردن نیچی کرکے کھڑی ہوگئی تاکہ مردہ بچھڑے اور گائے پر
اس کی نظر نہ پڑے۔ اسے اپنا پہلا کچھ یاد نہ آئے۔ مگر یادوں کے
پھول تو آج کھل گئے تھے ـــــ اور ان کی خوشبو؟

کچھ دیر صلاح ومشورے کے بعد لوگوں نے گائے کو اس جگہ
سے ہٹا کر کھیت کے قریب والے نیم کے درخت سے باندھ دیا،
گائے مُردہ بچھڑے سے دور ضرور ہوگئی تھی مگر اس کی نظریں اسی
طرف تھیں اور وہ بار بار اپنے جسم پہ اپنی دم مار رہی تھی اور اس سمت
تیزی سے بڑھتی تھی مگر گردن میں پڑی رسی تن کر اس کے قدم
روک دیتی تھی ـــــ

گائے کو باندھنے کے بعد واحد اور دو کسان بچھڑے کو
ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے دریا کی طرف لے گئے ـــ گائے اپنے
بچھڑے کو لے جاتے دیکھ کر بری طرح ڈکرانے لگی ـــ گائے کی
آواز سن کر زلیخا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے کانوں
میں سیسہ پگھلا دیا ہو ـــــ

واحد اور اس کے ساتھی بچھڑے کو گھسیٹتے ہوئے دریا
کے کنارے لے آئے اور ایک چٹان پر کھڑے ہوگئے۔ یہ پہاڑی
حصہ تھا ـــ دریا پہاڑی حصہ کاٹتا ہوا بہتا تھا۔ چٹان کے
نیچے بھی چھوٹی چھوٹی سلسلہ وار چٹانوں کا سلسلہ تھا اور ان
سب کے نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ اوپری حصہ میں بارش ہونے کی
وجہ سے پانی اس طرح لہریں مار رہا تھا کہ اس پر سمندر کا گمان ہوتا
تھا ـــــ

واحد اور اس کے ساتھیوں نے بچھڑے کو چٹان کے کنارے
رکھا اور پھر واحد کے دوست راموں نے زور لگا کر اسے نیچے دھکیل
دیا ـــ لیکن بچھڑے کی لاش دریا میں گرنے کے بجائے پانی سے
ایک گز اوپر والی چٹان پر جا کر رک گئی ـــ سب نے یہ منظر
دیکھا مگر اس چٹان تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا ـــــ

اس لئے وہ لوگ یہ خیال کرکے واپس آگئے کہ جب بھی
کوئی بڑی لہر آئے گی تو وہ مردہ بچھڑے کو بہالے جائے گی ـــ
گائے ابھی تک وہیں تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر زلیخا ایک
درخت کے سائے میں بیٹھی نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی
ہوئی تھی ـــــ

اچانک گائے کے زور سے کراہنے کی آواز سنائی دی
زلیخا نے سر اٹھا کر گائے کو دیکھا۔

وہ رسی تڑا کر اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں کچھ دیر پہلے بچھڑا
پڑا ہوا تھا چند منٹ گائے اس جگہ سر جھکائے کھڑی رہی پھر اس
نے گردن گھمائی، ادھر ادھر دیکھا پھر تقریباً دوڑ کر اس نے کھیت
کا ایک چکر لگایا۔ اس کی آنکھیں بیتابی سے بچے کو تلاش کر رہی
تھیں ـــ بار بار وہ زمین کو سونگھتی ـــ اور پھر ادھر ادھر
تیزی سے دوڑنے لگتی ـــ پھر زور زور سے چیخنے لگتی ـــ

زلیخا ٹکٹکی باندھے گائے کو دیکھ رہی تھی۔ گائے کا غم
وہ پوری طرح محسوس کر رہی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا
کہ وہ اس بے زبان جانور کا غم کس طرح بٹائے۔ کسی طرح اسے
تسلی دے۔ کیسے اس مجروح دل پر ہمدردی کے پھاہے رکھے۔

گائے برابر زمین کو سونگھ رہی تھی ـــ لوگ جس سمت
سے بچھڑے کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے تھے وہاں گھسیٹنے کے نشانات
کافی نمایاں تھے۔ چند منٹ بعد گائے اس جگہ پہنچ گئی
اور جوں ہی اس نے زمین کو سونگھا وہ جیسے پاگل ہوگئی اور تیزی
سے اس راستہ پہ دوڑنے لگی جدھر سے بچھڑے کو لے جایا گیا
تھا ـــ راستہ کا اسے پتہ نہیں تھا مگر وہ ادھر ادھر
راستہ تلاش کر رہی تھی۔

اچانک اس نے بیقرار ہوکر ـــ درخت کے تنے
سے اپنا سر ٹکرا دیا۔

ایک بار نہیں دو تین بار اس کے سر سے خون بہنے
لگا پھر وہ بڑے زور سے چیخی ـــ بالکل اسی طرح جیسے
کوئی وحشی چیختا ہے ـــــ

یہ چیخ سن کر زلیخا کا دل دہل گیا ——— ایک ماں
بیقراری کا اندازہ ایک ماں ہی کر سکتی ہے۔ زلیخا کی آنکھوں
آنسو آگئے، وہ جلدی سے اٹھ کر گائے کی طرف دوڑی'
۔ اس کی رسی کسی درخت سے باندھ دے یا اسے گھر لے
ئے ———

مگر زلیخا ابھی اس تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ اچانک
ئے تیزی سے دریا کی سمت دوڑنے لگی ——— زلیخا نے بھی
ن کا پیچھا کیا ———

اسی چٹان کے قریب جہاں سے بچھڑے کو ڈھکیلا گیا
تھا گائے جا کر چپ چاپ کھڑی ہوگئی ——— وہ بار بار
بیقراری سے اِدھر اُدھر دیکھتی کبھی زمین کو سونگھتی ———
پنا سر تیزی سے اٹھاتی اور پھر دیوانوں کی طرح چٹان کے
اس پاس چکر لگاتی ——— زلیخا جس وقت وہاں پہنچی تو
ئے چٹان پر کھڑی ہوئی نیچے دریا کی طرف دیکھ رہی تھی۔
زلیخا کو گائے کی آنکھوں میں عجیب سی چمک محسوس ہوئی۔
——— جیسے اسے کچھ مل گیا ہے ——— کیا مل گیا ہے
یہ زلیخا نہیں سمجھ سکی ———

اچانک گائے نے چٹان پر کھڑے ہو کر بڑے غور سے
نیچے کچھ دیکھا ——— زلیخا نے اس چٹان پر پہنچ کر نیچے جھانکا
——— بہت نیچے ——— دریا بہہ رہا تھا ——— بڑی بڑی لہریں
کناروں سے ٹکرا رہی تھیں، بالکل وہی منظر تھا جو سمندر میں
جوار بھاٹے کے وقت ہوتا ہے ——— دریا کی سطح سے ایک گز اوپر
ایک چھوٹی سی چٹان پر بچھڑے کا مردہ جسم پڑا ہوا تھا۔
——— زلیخا یہ دیکھ کر سب کچھ سمجھ گئی ——— اس نے نظر
اٹھا کر گائے کو دیکھا جو اس سے کچھ دور کھڑی ہوئی تھی اور
اس کی نظریں اپنے بچے پر مرکوز تھیں ———

وقت کا پتہ نہیں چلا ——— شاید وقت بھی دریا
کی سی تیزی سے بہہ رہا تھا ——— گائے بار بار چیختی، وہ
چٹان پر کھڑی راستہ تلاش کر رہی تھی ——— دو چار قدم
پیچھے ہٹ کر وہ گردن گھماتی اور جب کوئی راستہ نظر نہیں
آتا تو وہ پھر آگے بڑھ کر نیچے جھانکنے لگتی۔ گائے کی طرح
زلیخا بھی مضطرب اور بے چین تھی ——— اس کی آنکھوں
سے اس وقت بھی آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر
گر رہے تھے ——— اچانک گائے انتہائی کرب سے چیخی اور اس
نے بیتاب ہو کر بڑے زور سے اپنے دونوں پیر چٹان پر مارے
——— زلیخا نے گائے کی بیتابی دیکھ کر نیچے دیکھا ———
بچھڑا اس چٹان پر پڑا تھا مگر لہروں کے زور سے
اس کے دونوں پاؤں چٹان سے باہر آگئے تھے ——— عین اسی
وقت ایک بڑی سی لہر اس چٹان سے ٹکرائی اور چٹان اس
میں ڈوب گئی ——— اور چند لمحے بعد جب چٹان پانی میں
سے پھر ابھری تو بچھڑے کا مردہ جسم چٹان پر سے غائب تھا۔
——— زلیخا نے گھبرا کر گائے کو دیکھا اور اسی لمحے گائے نے
چٹان پر سے نیچے چھلانگ لگا دی ——— زلیخا چکرا گئی
——— پھر اس نے بس اتنا دیکھا کہ دریا میں آگے آگے
بچھڑے کا مردہ جسم اور اس کے پیچھے پیچھے گائے اس طرح
بہہ رہی تھی جیسے دونوں رسی سے بندھے ہوں ——— پھر
کیا ہوا ——— زلیخا کو کچھ یاد نہیں رہا ——— اس کی
آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ——— جب اسے ہوش
آیا تو درختوں کے سائے لمبے ہو چکے تھے ——— اسے
یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کس طرح گھر پہنچی ——— اس کا چہرہ
ہلدی کی طرح زرد تھا ———

واحد نے اسے دیکھ کر گھبرا کر پوچھا۔

"کہاں تھیں تم ———"

تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکی اور واحد کے سینے
میں سر چھپا کر کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی
اور واحد تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا ———

ہندی کہانی

نوشتہ: کملیشور
ترجمہ: مسیح الزماں

کروٹ

پارٹی میں سب پڑوسیوں کو مدعو کیا گیا۔ رانی بڑی خوش تھی کہ اتنے دنوں بعد جانکی آنٹی اس کے گھر آئیں گی۔ پر اس لمحے اس کی خوشی کا یہ احساس منوں مٹی کے نیچے دفن ہوگیا جب کھانے کے نام پر آنٹی نے چمچہ تک چھونے سے انکار کردیا۔

"رانی ــــ دیکھ تجھے منّی کب سے بلارہی ہے۔!"

"اچھا ــــ آئی آنٹی!" اور سات برس کی رانی پھدکتی ہوئی چھجے سے نیچے اتر آئی۔

"آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر سرخی، گالوں پہ پاوڈر لگا کر سجی جانکی دیوی نے منی کو رانی کی گود میں دیدیا۔ اور رانی نے 'ہاؤ سویٹ' کہہ کر منّی کے گالوں کو چوم لیا۔ اور پھر اسے کندھے سے لگا آنگن میں لیجانے لگی۔ تب ہی جانکی دیوی نے پیار بھرے لہجہ میں سمجھایا۔

"رانی ــــ منّی کے گالوں کو نہ چوما کرو!"

"کیوں آنٹی ــــ؟ رانی نے حیرت سے پوچھا۔ پھر خود ہی بولی ــ "کتنی سویٹ ہے بے بی!"

"چومنے سے چھوٹے بچے بیار ہو جاتے ہیں، اس لئے......"

"ہے بابا ــــ تب تو میں منّی کے گالوں کو نہیں چوما کرونگی،" یہ کہکر رانی باہر نکل گئی۔ اور کافی دیر تک منّی کو لئے ادھر ادھر گھومتی رہی۔ پھر اسے وہ اپنے گھر لے آئی۔

فوراً بڑی بہن نے پکارا ــــ رانی ــــ"

رانی ایک دم وہاں پہنچ گئی۔

"کہاں تھی اتنی دیر سے ــــ؟"

"کہیں بھی تو نہیں، آنٹی نے بلایا تھا۔ منّی کو کھلا رہی تھی۔" پھر بہن سے منت کرتے ہوئے بولی۔ "میری اچھی دیدی، ذرا کھٹولا تو بچھا دو، میں ذرا بے بی کو سلا دوں، اونگھ رہی ہے میری گود میں ــــ"

"اسے اس کے گھر کیوں نہیں سلا کر آئی؟ تو کیا اس کی نوکر ہے؟" بڑی بہن نے ڈانٹا۔ اور پھر کھٹولہ نیچے بچھا کر اس پر اس کو ٹلیا ــــ جب منی لیٹ گئی تو رانی اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اور کسی بوڑھی عورت کی طرح تھوڑی کو انگلی پر ٹکا کر بولی۔ "ہاؤ سویٹ بے بی۔ کہیں بیار نہ پڑ جائے!"

"بیار کیوں پڑے گی؟" پاس کھڑی ہوئی بہن نے حیرت سے پوچھا

"آنٹی کہتی ہیں، گالوں کے چومنے سے بچے بیار پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے منّی کو کبھی مت چوما کرو۔" پھر ایک لمحہ رک کر بڑے معصوم لہجہ میں بولی "پر دیدی پہلے تو منّی کبھی بیار نہیں پڑی۔ میں نے کئی بار اسے کس کیا ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور بولی۔ رانی تو کتنی بھولی ہے؟ کچھ بھی نہیں سمجھتی"

"کیا نہیں سمجھتی؟ بتاؤ نا دیدی" رانی ضدی لہجہ میں ایک دم مچل گئی

"ارے ہم لوگ عیسائی ہیں نہ ــــ اس لئے آنٹی چاہتی ہیں کہ منی کے گالوں کو تو کبھی اپنے ہونٹوں سے نہ چھوئے۔"

کیوں ہم عیسائی کیوں ہیں؟" یکایک رانی بڑا بے تکا سوال کر بیٹھی

"جیسے آنٹی ہندو ہیں۔ ویسے ہم عیسائی ہیں، یہ ہندو اپنے علاوہ سب کو گندہ اور ناپاک سمجھتے ہیں۔ وہ ہم کو اچھوت مانتے ہیں۔"

"اچھوت ــــ؟" رانی فوراً برا مان کر بولی "آنٹی تو مجھے کبھی اچھوت نہیں مان سکتیں، کتنا پیار کرتی ہیں مجھ سے تم بڑی خراب ہو دیدی

نی کے لیے اتنی خراب باتیں بولتی ہو۔"

جوابا کچھ کہنے سے پہلے ہی اودے آگیا۔ اور دروازے سے ہی بولا

"منی کہاں ہے ؟"

"دیکھتے نہیں، سو رہی ہے" ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے رانی نے کہا۔

"ماں کہہ رہی ہے۔ منی کو لے آ ۔۔۔۔" رانی سے دو تین سال بڑے اودے نے رعب دار آواز میں اپنی ماں کا حکم سنایا۔

"منی کو اٹھائیں گے تو وہ جاگ جائے گی۔ جب وہ خود جاگے گی تو رانی خود لے آئے گی۔ آنٹی سے کہہ دینا، بھول"۔ ۔ ۔ ۔ بڑی بہن نے سمجھایا اور اودے واپس لوٹ گیا۔

اس کے جانے کے بعد بڑی بہن اپنے کام میں لگ گئی۔ اور رانی وہاں سے ہٹ کر اپنے مکان کے چھجے پر آ کھڑی ہوئی۔

یکبارگی منی کی رونے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اور رانی دھپ دھپ کرتی ہوئی چھجے سے نیچے آ گئی۔ سیدھی منی کے پاس پہنچی اور گود میں اٹھا لیا۔ پھر بڑی پیاری آواز میں بولی ۔۔۔۔ منی ۔۔۔۔ رانی کی آواز سن کر منی مسکرانے لگی۔ یہ دیکھ کر رانی کا بے اختیار جی چاہا۔ کہ وہ یکبارگی منی کے پھولوں جیسے گالوں کو چوم لے۔ مگر اس نے اسی وقت اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا کیونکہ اسے آنٹی کی بات یاد آ گئی تھی ایک ہلکی سی چپت لگا کر وہ منی کو آنٹی کے یہاں لے آئی۔

"منی" جانکی دیوی نے پیار بھرے لاڈ بھرے لہجے میں پکارا۔ "رانی بٹیا کے ساتھ گئی تھی"۔ اور منی کو رانی سے لے کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور پھر پاس بیٹھی ہوئی پڑوسن سے بولیں

"یہ ہماری رانی بٹیا تو منی کو اتنا پیار کرتی ہے کہ پوچھو مت۔!"

"اور تم کیا اسے کم کرو ہو!" پڑوسن نے تعریف کی۔ تب ہی اودے اندر آیا۔ اور خاموشی سے وہ بھی رانی کے قریب بیٹھ گیا۔

"اجی ہم کیا کرتے ہیں؟ یہ بیچاری لڑکی آ جاتی ہے۔ تو ہمارے دل میں بھی پیار امڈ آتا ہے۔ اور کیا ۔۔۔۔" پھر رانی کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔ "بیٹی رانی ۔۔۔۔ جا مہاراجن سے لے کر کھانا کھا لے بھوکی ہوگی"، پھر اودے سے بولیں۔ "چل بٹیا تو بھی پر سوا لے۔

"نہیں آنٹی مجھے آج بالکل بھوک نہیں ہے

اچھا اب میں جاتی ہوں" کہہ کر رانی بھاگ گئی۔ اور اودے یونہی گم سم بیٹھا رہا۔ جانکی دیوی سوچنے لگیں۔ کہ آج رانی نے جاتے وقت "تاتا" کیوں نہیں کہا۔ ادھر رانی دروازے پر پہنچ کر بھاگتے بھاگتے فوراً رک گئی۔ اور بڑے دروازے کے پیچھے چھپ گئی ۔۔۔۔ اس میں اس کے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔

"تم نہ جانے کیسے ان عیسائیوں کو برداشت کر لیتی ہو؟ مجھے تو بڑی گھن آوے ہے ان سے" پاس بیٹھی ہوئی پڑوسن نے رانی کے جاتے ہی کہا۔

"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ پر اس چھوکری سے نہ جانے کیوں پریم ہو گیا ہے۔ اور ہماری منی تو اس کے بغیر رہتی ہی نہیں۔ لیکن میں نے اس کے کھانے پینے کے برتن بالکل الگ کر دیئے ہیں بس چھوٹا موٹا سوکھا سا کام کروا لیتی ہوں اس سے ۔۔۔۔ باقی کام کا دھیان تو میں خود رکھوں ہوں!" منی کو اپنے سینے سے بھینچتے ہوئے جانکی دیوی نے پھر کہا۔ "اس سے میں نے کہہ دیا ہے کہ کبھی ہم تو چھوت کا مانتے ہیں۔ سو مجال ہے کہ کوئی میری رسوئی میں گھس سکے! یا میری پوجا کی کوٹھری میں کوئی جا سکے۔"

"ٹھیک کرو ہو تم ۔۔۔۔ اپنا دھرم اپنے ساتھ۔ اور دوسرے یہ لوگ رہویں بھی تو اتنے گندے کہ توبہ ہی بھلی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"خیر اور دل کی بات تو تم چھوڑ دو ۔۔۔۔" جانکی دیوی نے بات کاٹی ۔۔۔۔ ان کے یہاں تو تم کو ایسی صفائی ملے گی کہ کسی ہندو کے یہاں بھی کیا ہوگی؟ سچ جانو۔ ماس مچھلی بھی یہ لوگ نہیں چھوتے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "جانکی دیوی نے حقیقت بیانی سے کام لیا۔

"اچھا۔ اب میں تو چلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اچانک پڑوسن اٹھ کھڑی ہوئی، اور دروازے میں چھپی کھڑی رانی، جس کی آنکھیں آنسوؤں سے اس طرح بھر گئی تھیں۔ جیسے کٹورے میں پانی، اپنے گھر کو بھاگ گئی اور اسی وقت اودے نے اپنی ماں سے پوچھا۔

"ماں ۔۔۔۔ عیسائی کیا بچے بچارے ہوتے ہیں۔ پھر یہ رانی تو کتنی اچھی ہے۔ کیا وہ عیسائی ہے؟"

"چپ رہ" ـــــ جانکی دیوی نے ڈانٹا ـــ "تو ان باتوں کو نہیں سمجھتا" پھر اودے نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"اپنی رانی تو بڑی اچھی ہے" اور پھر تم اسے اچھوت کیوں مانتی ہو ماں؟" اودے نے سوال کیا۔

"کہاں سمجھتی ہوں اچھوت بچے؟" کہتی ہوئی وہ وہاں سے اٹھ گئیں۔

اور رانی ـــــ اگلے پورے ہفتے آنٹی جانکی دیوی کی حویلی میں نہیں گئی۔ لیکن گدگدانے پر بھی جیسے کھلکھلا کر ہنستی تھی۔ وہ... کھلکھلاہٹ اسے برابر کھینچتی رہی۔ اور پھر، ایک ہفتے بعد جب جانکی دیوی نے اسے بلوایا۔ تو کسی نامعلوم جذبے کے تحت اس نے کوئی بہانہ نہیں کیا۔ اور نئی فراک بدل کر سنہرے اور چمکیلے بالوں میں خوبصورت ربن لگا کر فوراً ہی آنٹی کے یہاں پہنچ گئی۔

"کہاں گئی تھی؟ میری رانی بٹیا؟ میں تو دنیا بھر میں تار بھجوا رہی تھی" اور پھر منی کو دکھاتی ہوئی بولیں۔ "اپنی سندر رانی کو تو دیکھ ـــ رو رو کر مری جا رہی تھی تیرے لئے ـــ اب لے جا۔ اپنی دیدی کے پاس" یہ کہہ کر منی کو انھوں نے مصنوعی غصہ سے ایک طرح سے دھکا ہی دیدیا اور پھر بھلا رانی، جانکی دیوی کے اتنے پیارے سلونے بول سنکر منی کو کیوں نہ سنبھالتی۔ اس نے ایک ہی لمحے میں سب کچھ بھول کر منی کو گود میں بھر لیا۔ اور جانکی دیوی نے زبردستی اس کی مٹھیوں میں پیڑے ٹھونس دیئے۔

پیڑے کھاتی ہوئی رانی منی کو لئے باہر چلی آئی۔

کافی دن گذر گئے۔

اس اثنا میں رانی بڑی بہن کی بتائی ہوئی ہر بات بھول گئی مگر ایک دن اتنے دنوں بعد دبی ہوئی بات کی سچائی پھر ابھر اٹھی۔ رانی کی بہن کی شادی تھی۔ شادی کی خوشی میں ایک شاندار پارٹی کا پروگرام تھا پارٹی میں سب ہی پڑوسیوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ رانی بڑی خوش تھی کہ اتنے دنوں بعد جانکی آنٹی اس کے گھر آئینگی۔ پر اس لمحے اس کی خوشی کا یہ احساس منوں مٹی کے نیچے دفن ہو گیا۔ جب کھانے کے نام پر انہوں نے چھچھ چھونے سے بھی انکار کر دیا اور سب سے بڑا دکھ اسے اس بات کا ہوا کہ انھوں نے اودے کو بھی کچھ نہیں کھانے دیا لیکن جب اودے شام کو چپکے سے ماں سے مانگ کر بہت سی چیزیں کھا گیا۔ تو رانی کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ مگر اس دن وہ اچھی طرح سمجھ گئی۔ کہ آنٹی سچ مچ اسے اچھوت مانتی ہیں۔ اور تب بے اختیار اس کا جی چاہا۔ کہ وہ اپنا ہندوانی نام رانی بدلکر کچھ اور نام رکھ لے لیکن اسوقت کی ضد پر افسوس ہونے لگا۔ جب اس نے میری کے بجائے اپنا نام بدل کر رانی رکھوایا تھا۔

اس واقعہ کے بعد اس کا دل اتنا دکھا کہ اس نے آنٹی کے یہاں جانا بالکل ختم کر دیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد جانکی دیوی نے اودے کے ذریعے اسے پھر بلا بھیجا۔ اور مجبوراً اسے آنا پڑا۔ وہ اودے کے اصرار پر مجبور ہو گئی۔ ورنہ۔ اس نے ان کے ہاں کبھی نہ جانے کا عہد کر لیا تھا۔

رانی کو دیکھتے ہی جانکی دیوی فوراً بولیں۔

"میری رانی بٹیا ـــ ایک کام تو کر ہمارا ـــ تیری لاڈلی منی یہیں کھیل رہی ہے۔ ذرا بیٹھ تو جا اس کے پاس ـــ میں ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں۔ اودے بھی میرے ساتھ جا رہا ہے۔ کوئی نہیں ہے گھر پر اودے کے پتا جی آتے ہونگے ان سے کہدیجیو، ہوں" جلدی جلدی سب کچھ کہہ کر اس کے گال تھپتھپا کر وہ اسطرح چلی گئیں، کہ اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جیسی آئی تھی۔ ویسی ہی کھڑی رہ گئی وہ سونی دوپہر تھی، اتنی بڑی حویلی میں وہ بالکل اکیلی تھی۔ رانی کو بڑا عجیب سا لگا کچھ اور نہ سوچا۔ تو وہ بلاوجہ ہی منی کو کھینچتی چھوڑ کر ادھر ادھر گھومنے لگی۔ پوجا گھر کے دروازے بولٹ تھے۔ جانکی دیوی کی دھوتی ایک کھونٹی پر لہرا رہی تھی۔ کچھ دیر تو گم سم سی کھڑی رانی ان سب چیزوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اچانک ہی باورچی خانہ میں جا گھسی۔ اور وہاں رکھا ایک ایک برتن چھو ڈالا۔ زمین پر پڑا ہوا الماری میں سجا ہوا۔ اور طاقوں میں رکھا ہوا۔ اس کے بعد وہاں سے نکل کر اس نے کھونٹی پر لٹکی دھوتی کو اتارا۔ اور پیروں سے خوب مل کر وہیں چھوڑ دیا۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح پوجا کی کوٹھری میں گھس گئی۔ اور سامنے رکھی ٹھاکر جی کی چاندی کی شیتل مورتی کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی دل قابو میں ہوا تو مورتی وہیں رکھدی۔ اور دیگر چیزوں کو چھونے لگی

ایک شام جب ایک حسرت زدہ گھنٹی کو دروسے سجایا تو نہ جانے کیوں اس کا دل سا گیا اور گھنٹی اس کی جگہ پر رکھ کر باہر بھاگ آئی۔

دن ختم ہوتا جا رہا تھا ـــــ مگر اب بھی سونا تھا۔ کیا کرے بدستور کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر اس الماری میں بند گیتا اور رامائن کو دیکھ لیا۔ جلدی سے اس نے انہیں اپنی جگہ رکھ دیا۔ اور بڑی دیر تک بیٹھی رہی ـــــ یہ سب کر کے اسے ایک عجیب سی راحت، روحانی سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

کسی کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے دونوں کتابوں کو ان کی جگہ پر رکھ دیا اور منی کے پاس آ بیٹھی۔ سامنے سے جانکی دیوی اور ادے آ رہے تھے۔

"یہ میری دھوتی کس نے مسلی ہے ـــ" دہیں سے ان کی نظر اپنی پوجا کی دھوتی پر پڑی۔ "کس نے نیچے گرایا ہے ؟"

رانی کا دل بڑے زور سے کانپا ـــ

"آنٹی میں نے ۔ ۔ ۔ ۔ " ایک دم اس کے ہونٹوں سے نکلا۔

"تو نے ـــ کیوں میری بچی ؟"

بھول سے ہی ایسا ہو گیا ہو گا یہ اندازہ لگا کر ہی جانکی دیوی کے لہجہ میں پیار کی مٹھاس گھل گئی تھی۔ مگر یہی مٹھاس رانی کے حلق میں زہر بن گئی اس لہجے نے اس کی ہمت بڑھا دی۔ اور اس نے معصومیت سے کہا۔

"آنٹی ـــــ آج میں آپ کے رسوئی گھر میں بھی گئی تھی۔ میں نے پوجا گھر میں جا کر ٹھاکر جی کو بھی خوب پیار کیا اور جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی تھپڑوں، لاتوں، گھونسوں، اور گالیوں نے رانی کی قوت گویائی سلب کر لی۔

"میرا دھرم نشٹ کر دیا۔ کمینی ۔ ۔ ۔ ۔ نکل میرے گھر سے ادھرم ۔ ۔ ۔ خبردار جو کبھی یہاں گھسی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ جھپٹ جھپٹ کر غصہ میں بھڑک بھڑک کر، رانی پر طوفانی حملے کر رہی تھیں اور ادے بچاتا ہوا پاگل ہوا جا رہا تھا۔

اس واقعہ کے بعد اس حویلی کے دروازے رانی پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔ رانی بھی یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی ڈیڈی کے پاس چلی گئی اور پھر کبھی نہ لوٹی۔

اودے تعلیم کے لئے کناڈا چلا گیا۔

پھر نہ جانے کتنی بہاریں، کتنے موسم گذرتے چلے گئے۔ اکثر جانکی دیوی کے جھروکوں سے رانی خزیں جھانک لگتی بھولا بھالا سا چہرہ پیاری رنگ کی گلابی سی بڑی بڑی کٹیلی آنکھیں، اور مسکراتے سلونے ہونٹ ـــــ رانی ذرا بھی تو عیسائی نہیں لگتی تھی، جانے کہاں سے خیال ان کے احساس کی دیواروں سے آ ٹکراتا۔ اور صرف ایکبار دیکھنے کی خواہش ان کے دل میں انگڑائی لینے لگتی۔

پرانے گھاؤ دھیرے دھیرے بھر گئے۔ گذری باتیں ایک بھولی بسری کہانی بن کر رہ گئیں۔ یہاں تک کہ جانکی دیوی کی جوانی بڑھاپے میں بدل گئی اور ان کی زندگی کا مقصد محض پوجا پاٹھ رہ گیا۔ ان کی صرف اب دو تمنائیں تھیں۔

منی اور اودے کی شادی ۔ !

اودے کی بہو آئے، اور اس سنسان حویلی کے سناٹے کو اپنی پائل کی جھنکار سے توڑ دے، اسی خیال سے رات دن گدی پر بیٹھے ہوئے نوٹوں سے کھیلنے والے سیٹھ جی سے ہمیشہ وہ یہی اصرار کرتی رہتیں اور سیٹھ جی سونے کی مرغی کی تلاش میں تھے۔

اودے کی ڈاکٹری کی پڑھائی کا یہ آخری سال تھا۔

آخر سیٹھ جی کو بڑی تگ و دو کے بعد سونے اور جواہرات سے لدی پھندی مرغی نظر آ گئی، اور وہ بے چینی سے اودے کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن جس شام انہوں نے یہ خوشخبری اپنی بیوی کو سنائی اس کے اگلی صبح پوسٹ مین نے آواز دی۔

جانکی دیوی کے پہنچنے سے پہلے ہی سیٹھ جی نے جلدی سے ایکسپریس رجسٹرڈ خط دستخط کر کے لے لیا۔ اور جانکی دیوی کو سنانے لگے۔

"پتاجی! آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ کل میں نے رانی عرف میری نام کی ایک عیسائی کلاس فیلو سے شادی کر لی ہے۔ آپ کی رائے لینے کا وقت نہ تھا۔ معاف کیجئے گا، ماتاجی سے معافی، ان کی بہو کے ساتھ وہیں پہنچ کر مانگ لونگا۔ براہ کرم پانچسو روپیہ بذریعہ تار بھیج دیجئے، دوستوں کو اس خوشی میں پارٹی دینا ہے۔"

اس کے بعد سیٹھ جی خط کا ایک لفظ نہ پڑھ سکے۔ ان کے ہاتھوں سے خط گر گیا۔

اشتیاق

کنڑی کہانی

سلیم تمنائی

> چراغ کی مدھم لو میں ریاض کو رازی کی غلافی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی نظر آجاتے۔ اور ریاض کچھ لمحوں کے لئے سب کچھ بھول کر اسے گلے لگا لیتا۔ وہ ان لمحات میں مجسم محبت بن جاتا اور رازی رونے لگتی۔

کاوش

رازی دھائیں دھائیں رو رہی تھی، آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی تھی اور اس کے متعلق جتنی زبانیں تھیں اتنی باتیں تھیں۔ جتنے دماغ تھے وہ حیرت واستعجاب کے ایٹم بم تخلیق کر رہے تھے، جتنی آنکھیں تھیں محوِ حیرت تھیں۔ لیکن ہلکے سے مسکرا بھی رہی تھیں۔

یہ عورت! رازی! سربستہ راز! روتی کیوں ہے مجازی خدا کے مرنے پر، شوہر کے دنیا سے منہ موڑنے پر، ظالم، شیطان، فرعون، شداد اور نمرود کے مرنے پر بھی کوئی روتا ہے؟ ارے یوم نجات منانا ہے رازی کو بھی منانا چاہیئے۔ لیکن پیٹ بھوکا پیٹ، ایمان کی دنیا بھی ڈگمگ ڈول جاتی ہے۔ لیکن اس ظالم بے رحم نے کب پیٹ بھر کھانے کو دیا۔ البتہ رازی کے نہ اس نے زیور بیچے اور نہ اس کے نام کا گھر جو اسے جہیز میں ملا تھا وہ اس کا کرایہ اسی کو دے دیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اپنی طرف سے بھی اس کی طرف کاغذ کے چند نوٹ پھینک دیا کرتا تھا۔

اس کی ساری بدتمیزی بس اپنی بیوی کے ساتھ تھی ویسے وہ بڑی حد تک شریف پڑوسی تھا۔ اس کے پڑوسی اس سے خوش تھے اور نہ ناراض۔ وہ صبح چلتے چلتے پڑوسن کے کھیلتے ہوئے بچے اور اس کی پریشان زلفوں والی ماں کو دیکھ کر مسکرا دیتا اور بچے کو پیار کرکے آگے بڑھ جاتا۔ لیکن اس کے برخلاف اسے اپنے بچے سے ذرا بھی محبت نہیں تھی۔ جب وہ روتا یا ضد کرتا تو وہ اپنی پسندیدہ گالی "کتے کے پلے" دے کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا۔ اور بیوی کی طرف کنکھیوں سے کبھی دیکھ بھی لیا کرتا۔ ایسے وقت رازی ہمیشہ دور خلا میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرتی اور ساری فضا دھندلی دھندلی سی ہو جاتی، آنسوؤں کی وجہ سے۔

"توبہ! وہ کرسی یا میز پر زور دار مکا رسید کرتا اور رازی بے قرار ہو کر اس کے ہاتھ کو سہلانے لگتی۔

"چوٹ تو نہیں آئی" وہ بھرائی ہوئی آواز میں پوچھتی۔

"نہیں!" وہ دانتوں میں ہونٹ دبا کر کہتا۔ اور باہر نکل جاتا۔

اس کے اس سلوک سے پڑوسیوں کو بڑا تعجب ہوتا۔ اکلوتی اولاد پھول سا مکھڑا۔ موتیوں سے دانت، گل سا نازک بدن دشمن کو بھی پیار آجائے لیکن وہ تو بھیڑیا تھا بھیڑیا۔

وہ اکثر شراب کے نشے میں دھت، رازی کو مار بھی بیٹھتا۔ اور چیخ چیخ کر ایسے ایسے سوال کرتا کہ وہ پانی پانی ہو جاتی اور سسک کر کہتی "میں کیا کروں، میں کیا کروں؟ وہ اس کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیتی "اتنا احسان کیا ہے وہاں مجھے مار دو، میں جنت پالوں گی۔ تمہارے ہاتھوں مرنے سے مجھے سکون مل جائیگا۔ مجھ پر یہ احسان کر دو۔"

وہ جھنجھلا کر باہر نکل جاتا۔ یا گلاس پر اشا رہ جاتا۔ لیکن جب نشہ اترتا تو یہ کہہ کر کہ "مجھے معاف کر دو" وہ باہر نکل جاتا۔

پڑوسی حیران تھے، چاند سا بچہ۔ اور اس پر یہ ظلم وہ سوال کرتے آخر تمہارا شوہر چاہتا کیا ہے۔

"میں کیا جانوں" وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے کہتی۔

"بڑا ظالم ہے تمہارا مردود!" پڑوسنیں فیصلہ صادر کرتیں۔

"نہیں نہیں" وہ قریب قریب چیخ پڑتی! آپ انہیں سمجھ نہیں سکتیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔

"تم کچھ بھی کہو، تمہاری جگہ میں ہوتی تو دونوں ہاتھ جوڑ کر خلع
لیتی۔ نان نفقے کے بغیر ہی الگ ہو جاتی۔" پڑوس کی ساری عورتیں اسے
بیوقوف اور مظلوم گردانتیں۔ ترس کھاتیں، اس کی بے وقوفی اور مظلومیت پر
ہمدردی جتاتیں ـــــ کچھ نہ بولتی۔ بس اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے
پڑوس کے ہر فرد کو بلا تفریق مذہب و ملت، مرد و عورت رازی پہ
ترس آتا تھا۔ ایک آدھ مرد میدان نے اسے سمجھانے کی بھی کوشش کی تو
محبت سے اس نے کہا۔
"جناب وہ میری بیوی ہے۔ ظلم کرتا ہوں تو محبت بھی کرتا ہوں
مارتا ہوں تو اکثر سینے سے بھی لگاتا ہوں۔ آپ اپنی بیگم سے کام رکھیے۔
دوسروں کے پھٹے میں پیر نہ اڑائیے۔"
بھلا کوئی اس موذی کے کیا منہ لگے۔
ریاض اکثر دیر سے گھر آتا۔ وہ ہمیشہ یہ دعا مانگتا ہوا آتا کہ اللہ
کرے رازی سو رہی ہو مگر وہ برابر اس کے آنے تک جاگتی رہتی۔ اس بات
پر اکثر اسے غصہ آ جاتا۔ جھنجلا پڑتا۔ بچہ پریشان ہو کر کبھی ماں اور کبھی باپ
سے لپٹ جاتا۔ ریاض بچے کو یوں الگ کرتا۔ جیسے وہ بچہ نہیں۔ بچھو ہو۔ پھر
وہ بغیر کھائے ہی سو جانے کی کوشش کرتا۔ بھوک کے باوجود کھانا نہ چاہتا
گو وہ یہ جانتا تھا کہ رازی اس کے بغیر بھوکی رہے گی۔ وہ پھر سونے کی کوشش
کرتا۔ اور رازی بچے کو سلا کر اس کے پیر دابنے لگتی۔ ریاض کو رازی کی یہ ادا
زہر معلوم ہوتی وہ جھلا کر کہتا
"میرے پیر درد نہیں کر رہے ہیں" وہ پیر کھینچ لیتا۔
"کیا آپ کے پیار کے احسانوں کے بدلے مجھے اتنی خدمت کا بھی
حق نہیں" وہ کربناک لہجہ میں پوچھتی۔
وہ رازی کے سوال کا جواب نہ دیتا۔ اور آنکھیں بند کیے پڑا
رہتا۔ مگر رازی جانتی تھی کہ وہ جاگ رہا ہے اس لیے اس کے پیر دابے جاتی
آخر ریاض کا غصہ فرو ہو جاتا اور وہ گرج کر کہتا
"کھانا لے آؤ" یہ جملہ سوکھے کھیت میں پانی کی طرح برستا۔ رازی
دھان کی ہری بھری بالیوں کی طرح لہرا کر کھانا لے آتی۔
"تم نے کھایا؟" وہ رازی سے پوچھتا۔
"نہیں" وہ آہستہ سے جواب دیتی

چاندنی کی مدھم سی لو میں ریاض کو رازی کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں
میں آنسوؤں کے موتی نظر آجاتے وہ سب کچھ بھول کر اسے گلے لگا لیتا اور
رازی رونے لگتی۔
"مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو"
ریاض کچھ لمحوں کے لیے سب کچھ بھول کر مجسم محبت بن جاتا۔
"یہ دنیا ہے رازی، دنیا۔ سب کچھ ممکن ہے۔ مجھے معاف کر دو"
ریاض اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہتا۔
ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں جیسے ایک دوسرے کے رازداں ہوں لوگ
ہزاروں رائیں ان دونوں کے بارے میں قائم کرتے۔ واقعات کی زنجیر بناتے
مگر کوئی کڑی اسطرح ٹوٹ جاتی کہ ساری زنجیر کی کڑیاں الگ ہو جاتیں
زنجیر کسی مالا کی طرح بکھر جاتی۔
ریاض کو جب بھی فرصت ہوتی، اس کا دماغ رازی کے بارے
میں سوچتا۔ بچے کے بارے میں اسے اپنے برتاؤ پر شرم آتی۔ لیکن کیا کرے جب
بھی بچے کا سامنا ہوتا تو وہ منہ پھیر لیتا۔ اسے اس کا رونا زہر معلوم ہوتا۔
اس کی معصوم ہنسی اسے اپنے پر طنز محسوس ہوتی۔
اس نے شادی سے پہلے کتنے حسین خواب دیکھے تھے۔ ایک حسین
شریک حیات کا حسین تصور اس کے چہرے کو حسین بنا دیتا۔ پہلی رات
رازی کتنی حسین و جمیل نظر آئی تھی۔ سرخ لباس، سرخ سفید رنگ، اسے
نہ گلاب کی تشبیہ پسند آئی اور نہ شفق کی، سیب کا رنگ بھی ماند تھا۔ بڑی
بڑی حسین غلافی آنکھوں میں اس نے جیسے اپنا ہنستا مسکراتا خوشی سے
تمتماتا چہرہ دیکھا
"تم کتنی حسین ہو" بیساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "میرے
خوابوں سے بھی بڑھ کر"
اس نے حقیقت کو پہلی بار خوابوں سے زیادہ حسین پایا تھا لیکن
رازی کو غیر معمولی سنجیدہ اور غمگین پایا۔
"تم اتنی سنجیدہ اور مایوسی کی حد تک خاموش کیوں ہو؟"
"میں آپ کے قابل نہیں" عجیب و غریب جواب ملا۔
"یہ میرا جواب نہیں ہے رازی"
رازی، راز بن کر رہ گئی۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ اس نے کچھ کہنا

چاہا۔ مگر اس کے ہونٹ اپنے ہونٹ کہاں تھے۔ ؟ وہ بے بس تھی لیکن رازی کا راز کھل کر رہا۔ شریفوں کی متجسس اور عقابی نظروں نے تحقیق کر ہی ڈالا۔

دونوں بزدل تھے رازی نے خود کو ہمیشہ کے لیے چھپا دینا چاہا، دنیا کی نظروں سے۔ لیکن زہر کی شیشی ہاتھ میں کانپتی رہی۔ تو یہ مرنا اتنا آسان کہاں ہے ؟ ریاض نے وہ شیشی چھین کر پھینک دی۔

"مرنا ہو تو کہیں اور جا کر مرو۔"

ریاض کے سارے خوابوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ وہ رحمدل ہونے کے باوجود رازی کو تھپڑ مار کر نکل گیا۔ لیکن کچھ سوچ کر جلدی لوٹ آیا۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا اور زہر کی شیشی دور پڑی تھی زہر کی ایک بوند بھی کم نہ ہوئی تھی۔

"آپ اتنے اچھے کیوں ہیں ؟ رازی نے روتے ہوئے اس دو زر ریاض سے پوچھا تھا۔

"نہیں نہیں" وہ پاگلوں کی طرح چیخ پڑا۔ "میں اچھا نہیں ہوں۔ میں کمینہ ہوں۔"

ساس سسر تو ساس سسر ہی تھے۔ خود اس کے والدین نے اس حرکت کو سخت ناپسند کیا اور زمین پھٹنے کی دعائیں مانگنے لگے۔ دنیا میں عزت بڑی چیز ہے۔ برائی ڈھکی چھپی ہو تو برائی نہیں۔ غرض معاملہ گھر سے محلے اور محلے سے گاؤں تک آ گیا۔ آخر جو راہے پر ہانڈی پھوٹ ہی گئی انصاف پسند اور عزت والوں نے پنچایت جمع کر دی۔ رازی منہ چھپائے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اور پنچ صاحبان ایک ہزار ایک سو ایک سوال کرنے کو تیار بیٹھے تھے، ریاض کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ مجبوراً رازی پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی اتنے میں کسی زخمی شیر کی طرح ریاض آ دھمکا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں۔ ؟"

"تمہاری بیوی دھبہ ہے اس گاؤں کے دامن پر۔ پنچ صاحبان نے کہا" گاؤں کی بہو بیٹیوں پر اس واقعہ کا برا اثر پڑے گا۔ کوئی قرار واقعی سزا اسے ملنی چاہیے۔

"سزا ؟ سزا دیں گے آپ ؟ ریاض نے کہا اور پھر چند لمحات کی خاموشی کے بعد کہا۔

مجلس پنچوں سے میری ایک درخواست ہے کہ وہ اس سے اتنا ضرور پوچھیں کہ اس گناہ کے پردے میں کون چھپا ہے کوئی لیڈر، کوئی تاجر، کوئی استاد، یا مکھیا۔ کوئی تیجا یا سرپنچ۔ تاکہ دونوں مجرموں کو عبرتناک سزا دی جا سکے۔ یہ ظلم ہے کہ آپ نے صرف پھل دیکھ لیا۔ جڑ کی کھوج نہیں کی پھل دار درخت کی خطا کم، مالی کی زیادہ ہوتی ہے۔ زمین بولتی نہیں سہتی ہے۔"

"میاں صاحبزادے ابھی تم بچے ہو" ایک معزز پنچ کو کالج کے طالب علم کی زبان درازی پسند نہیں آئی۔

"ہم دونوں کو سزا دینا چاہتے ہیں" سرپنچ نے بات کاٹی لیکن یہ لڑکی کچھ منہ سے تو بولے ـــــ یہ نہ منہ سے بولتی ہے نہ سر سے کھیلتی ہے"

رازی !! ! ریاض چیخ پڑا۔ "تم بتاتی کیوں نہیں۔ ؟"

جواب میں رازی کی آنکھوں سے سوتے پھوٹ پڑے۔

"میں گناہگار ہوں، مجھے مار ڈالو، مار ڈالو" وہ ہذیانی لہجہ میں بولی

"اب تک تجھے مر جانا چاہیے تھا۔ ایک معمر پنچ نے کہا۔

ریاض دھاڑا۔ "معزز پنچو ! یہ گناہگار لڑکی آپ کی بستی چھوڑ کر اپنی الگ بستی بسا لے گی۔ یہاں سے منہ کالا کر جائے گی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" عزت والوں نے نعرے لگائے۔

"لیکن یہ خوبصورت عورت اکیلی نہیں جائے گی" ریاض چیخا۔ "اس کے ساتھ اس کا یار بھی جائے گا جس کے گناہ کی سزا صرف اسے دی جا رہی ہے"

چوپال میں کھلبلی مچ گئی ہر کوئی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا

ریاض اٹھا اور کہا "اس گنہگار عورت کے ساتھ میں جا رہا ہوں" معززین نے انگلیاں تعجب سے دانتوں تلے دبا لیں

ریاض اٹھا لیکن رازی اس سے پہلے اٹھی اور اس کے قدموں پر گر کر بیہوش ہو گئی رازی کو اپنی باہوں میں اٹھا کر گاؤں سے باہر نکل آیا ہمیشہ کے لیے۔

رازی کا سب جسم اڑا جا رہا تھا۔ جیسے وہ خلا میں سفر کر رہی تھی ہلکا جسم اپنے بس میں نہیں تھا۔ ایک ویران اور سنسان مقام پر اس نے قہر و غضب کی مورتی بنے ریاض کو دیکھا۔ اور پھر ریاض نے آہستہ سے کہا

"کاش تم میرے بچے کی ماں ہوتیں۔"

سائنسی کہانی

-: نوشتہ :-
رابوٹ بلاک

تلخیص و ترجمہ
احمد صغیر صدیقی

بظاہر یہ کوئی اہم معاملہ نہ تھا پھر بھی بورڈن کافی فکر مند تھا کہ آخر اودم کے ساتھ اس کے معاملات کس حد تک درست چل سکیں گے۔

سفارت خانے کے دوسرے ملازمین وغیرہ کو پہلے ہی سے سب کچھ سمجھایا جا چکا تھا لیکن وہ لوگ بھی اودم کی شخصیت سے ابھی تک مانوس نہیں ہو سکے تھے۔ دراصل اودم کا معاملہ تھا بھی عجیب۔ ذرا ایک ایسے انسان کے بارے میں سوچئے جس کا سارا جسم فولاد سے بنا ہو اور دماغ خالص انسانی ہو ـــــ ہے نا عجیب سا معاملہ۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ "زوبی" سیارے کی یہ مخلوق بالکل ایسی ہی تھی ـــــ

یہی نہیں بلکہ اودم سامنے کے علاوہ اپنے پیچھے کی چیز بھی دیکھنے پر قادر تھا۔ اس کا منہ سوائے ایک بولنے والے آلے کے اور کچھ نہ تھا، اب رہی ناک ـــــ تو اس کے پاس بیک وقت کئی ناکیں موجود تھیں۔ جنھیں وہ موقع و محل کے مطابق ادلتا بدلتا رہتا تھا۔

آج ہی دوپہر میں، بورڈن کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کی منگیتر مارگریٹ اس سے ملنے آئی تھی یہ ایک غیر متوقع ملاقات تھی۔ بورڈن اس وقت اپنے کمرے میں جو سفارت خانے ہی میں واقع تھا اودم کے ساتھ محو گفتگو تھا۔

بورڈن کو اپنی منگیتر کے حسن پر ناز تھا۔ دراصل وہ تھی بھی بے انتہا حسین، اس کے علاوہ وہ ایک بہترین "پیانسٹ" بھی تھی۔

وہ بیچاری اودم کو دیکھ کر تقریباً گھبرا سی گئی تھی۔ اور اُس کی گھبراہٹ اس وقت اور بھی بڑھ گئی تھی جب کہ تعارف کے لمحوں میں ہی اودم نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے "ڈپلومیٹک بیگ" میں سے ایک عجیب و غریب سی ناک نکال کر اپنے منہ کے اوپر فٹ کرتے ہوئے اس سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ اب اس بیچاری کو کیا پتا تھا کہ اودم کی دنیا میں تعارف کراتے وقت ناک تبدیل کرنا ایک ایسی ہی رسم میں داخل ہے جیسے ہمارے ہاں دوسروں سے مل کر ہاتھ ملانے کا دستور ہے۔ سچ پوچھئے تو اودم کے تھیلے میں ایسی متعدد ناکیں موجود تھیں جنھیں وہ وقتاً فوقتاً تبدیل کرتا رہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ مارگریٹ کو موقع ملتے ہی سب کچھ بتا دے گا۔ اُسے یہ بھی بتا دے گا کہ اودم کبھی نہیں سوتا۔ اُس کا جسم کبھی بیمار نہیں ہوتا اور اسے کھانے پینے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ لے گی اور ان مجمع کے لوگوں کی مانند حرکتیں نہیں کرے گی جو اس وقت سفارت خانے کے دروازے پر جمع تھے اور "مشینی انسانوں سے نفرت" کے نعرے بلند کر رہے تھے ـــــ دراصل یہ بھی مخالف پارٹی کی ہنگامہ آرائی تھی۔ انھوں نے لوگوں کو ورغلا دیا تھا کہ یہ مشینی انسان ہم انسانوں کے لئے سخت خطرناک ہیں اور یہ کہ انھیں ہمارے احساسات کا کوئی پاس لحاظ نہیں ہے۔

ـیٹ اودم کو دیکھ کر گھبرا سی
گئی تھی اس کی گھبراہٹ اسوقت
بھی بڑھ گئی جب اودم ـــــ نے
ـیٹک بیگ سے ایک عجیب و
ـیب سی ناک نکال کر اپنے منہ پر

ٹیکنک کے اعتبار سے بڑی کامیاب ہیں۔ یہاں تو ہر نظم میں ذہن انسانی کا ارتقا۔ قوت عمل اور پیام امن و آزادی کے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن فنی عظمت اور شاعرانہ کیفیات بلند خیالی اور فکر کی تازگی "عروج آدم" میں اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے یہ اگر دوسری نظموں میں بھی نکھری ہوئی ملتی ہے لیکن بعض نظموں میں کمی اور رسا وٹ بھی محسوس ہوتی ہے رفعت سروش کی ان طویل اور تمثیلی نظموں میں اس بنتے ہوئے معاشرے اور بنتے ہوئے مزاج اور فکری رویوں اور شعور اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ملتا ہے۔ ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان سب کا محور انسان۔ اس کا ذہنی ارتقا اور فکر و شعور ہے۔ تسخیر کائنات ہو یا اندھیرے اجالے کا تصادم طبقاتی کشمکش ہو یا فات کا کرب ہر نظموں میں ان سب کے بیان میں کہیں بھی اکھڑا اکھڑا لہجہ یا کھردرے خیالات کا احساس نہیں ہوتا بلکہ شاعر کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ اس نے شاعرانہ انداز اور شعری صحتمند روایات کو بہت کر فن کی آبرو قائم رکھی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ چند طویل نظموں پر مشتمل مجموعہ آج کے صنعتی معاشرہ کا بہترین ترجمان ہے۔ کتابت طباعت معمولی اور قیمت مناسب ہے۔

(اشتیاق طالب)

پرانے موسموں کی آواز

مصنف :۔ .... کمار پاشی

ضخامت :۔ .... ۱۲۰ صفحات

قیمت :۔ .... دو روپے پچاس پیسے

پتہ :۔ نازش بک سینٹر ترکمان گیٹ دہلی ۶

آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ سب کچھ تے ہوئے بھی تنہائی اور مایوسی کا شکار ہے۔ اس نے دنیا کو رنگ رنگوں میں نہلایا۔ دلوں کو پیار و محبت سے معمور کیا۔ نغمے ۔ لیکن خود اس کے دل کی دنیا ویران اور تاریک ہے مسلسل کرب اور محرومی سے دوچار ہے۔ اس تضاد اور کشمکش سے گھبرا کر وہ جس قدر اپنے اندر سمٹنے کی کوشش کر رہا ہے اسی قدر پگھلتا اور بکھرتا جا رہا ہے۔ انسان کا یہی دکھ اور محرومی کا کی شاعری میں ملتی ہے۔

کمار پاشی کا تعلق ہماری جدید تر نسل سے ہے جو مختلف رنگ و روپ سرکشی، بے باکی، ناآسودگی اور تلخیوں کی وجہ سے جانی پہچانی جاتی ہے جو ہزارہا الزامات سے نوازی گئی ہے اور ہنوز عتاب میں ہے۔ حالات چاہے ناسازگار ہوں۔ بزرگ ناک بھوں چڑھائیں۔ لاکھ الزام عائد کریں لیکن ابھرنے والی قوت اور آواز کو نہیں دبا سکتے۔ ان ابھرنے والی آوازوں میں کمار پاشی کی بھی آواز ہے۔ جو نئی اور تازہ ہے جس میں رس بھی ہے اور لوچ بھی۔ للکار بھی ہے اور جھنکار بھی۔

کمار پاشی کا مزاج نظم کا ہے اسی لئے وہ غزل سے زیادہ نظم میں کامیاب ہے۔ پاشی کی نظموں کی کامیابی روزمرہ کے چھوٹے موٹے واقعات اور مسائل کی وجہ سے ہے، جنھیں اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن ان تمام باتوں کی قدر و قیمت ان کی نظر میں بڑی اہم ہے۔ یعنی کمار پاشی کی شاعری روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور مسائل کی شاعری ہے۔ بڑے تجربات اور گہرے مسائل نظر نہیں آتے۔ شاید یہی وجہ ہے جو ان کے یہاں تلخی پیدا نہیں ہو سکی اور جہاں جہاں تلخی پیدا ہوئی ہے اس کو انھوں نے بڑی آسانی کے ساتھ ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا انداز بیان نرم اور سبک ہے۔ اسی وجہ سے "پرانے موسموں کی آواز" بڑی حد تک غنیمت ہے۔ کتابت طباعت گوارا ہے۔ قیمت مناسب ہے۔ (اشتیاق طالب)

تقریب
کوئی بھی ہو
سب سے اچھا - سب سے سستا
نیشنل
ماڈل رینا ۳۴۰
۳ بینڈ، آل ویو
ڈیلکس ہائی فائی، پورٹیبل ریڈیو
پورے پاکستان میں
National
ڈیلرز سے دستیاب ہے۔
واحد تقسیم کنندگان:
رضوی برادرز لمیٹڈ
کراچی
رضوی چیمبرز
اکبر روڈ
فون: ۳۵-۳۱-۷۰۰۲
لاہور
۹ - شاہدین بلڈنگ
شاہراہ قائداعظم
فون: ۶۵۶۹۱
ڈھاکہ
۹ - ای، موتی جھیل
کمرشیل ایریا
فون: ۵۱۵۲۴
چٹاگانگ
متین بلڈنگ
ٹیمپل روڈ
فون ۸۳۸۳۲
ORIENT

ولیکا
کی صنعتیں
قوم کی خدمت
کے لئے وقف ھیں
VALIKA
انشورنس
وولنز
ٹیکسٹائل
کیمیکلز
آرٹ فیبرکس
جہاز رانی
سیمنٹ
ولیکا عوام پر اعتماد کرتے ہیں
اور عوام ولیکا پر
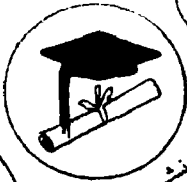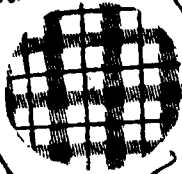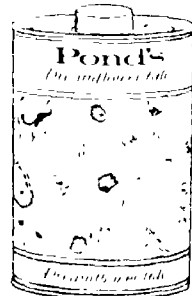
پونڈز
ڈریم فلاور ٹیلک
لطیف مہک اور اعلیٰ
معیار کا ٹالکم پاوڈر ہے
اتنی مناسب قیمت پر
سب ہی خرید سکتے ہیں
Pond's
Pond's
چیزبرو پونڈز انک کا پروڈکٹ
INLAB-4-68-R

A Times Press Publication—Mansfield Street Sadar-Karachi